BNHS301DCT

تاریخ ہندوستان

آٹھویں صدی کے وسط سے سولہویں صدی عیسوی کی ابتدا تک

History of India

Mid-8th Century to Early 16th Century CE

بی۔اے۔(آنرس)

چار سالہ پروگرام

تیسرا سمسٹر (تاریخ)

مرکز برائے فاصلاتی اور آن لائن تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدرآباد-32، تلنگانہ-بھارت

Copyright © 2026, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
All right reserved. No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronically or mechanically, including photocopying, recording or any information storage or retrieval system, without prior permission in writing form the publisher (registrar@manuu.edu.in)

ISBN : 978-81-687130-4-8
Course : History of India: Mid-8th Century to Early 16th Century CE
First Edition : July, 2026
Copies : 3500
Price : 305/- (The price of the book is included in admission fee of distance mode students)

Course Coordinator

Vidya Vachaspati **Shaik Mahaboob Basha**, Associate Professor (History), CDOE, MANUU

Editorial Board/Editors

Vidya Vachaspati **Shaik Mahaboob Basha**
Associate Professor (History), CDOE, MANUU

Dr Syed Meer Abul Hussain
Asst. Prof. of History (Cont.), CDOE, MANUU

Mr Mohd Aasim
Asst. Prof. of History (Cont.), CDOE, MANUU

Dr Ikramul Haque
Asst. Professor, Dept. of History, MANUU

Dr Zeyaul Haque
Asst. Professor, CAS, Dept. of History, AMU

Dr Daud Ibrahim
Asst. Prof. (Cont.), Dept. of History, MANUU

Dr Khursheed Ahmad Bhatt
Asst. Prof. of History (Cont.) Lucknow Campus, MANUU

Prof. S.M. Azizuddin Husain
Former Head, Dept. of History & Culture, JMI

Prof. Mushtaq Ahmad Kaw
Former Head, Dept. of History, MANUU

Prof. Perwez Nazir
Centre for Advanced Studies, Dept. of History, AMU

Prof. Danish Moin
Dept. of History, MANUU

Prof. Alauddin Khan
Head, Dept. of History, Shibli National College

Dr Samana Zafar
Associate Professor, Dept. of Woman Studies, MANUU

Dr Mohd Akmal Khan
Assistant Professor of Urdu (Cont.), CDOE, MANUU
(Language Editor)

Production

Prof. Nikhath Jahan
Professor (Urdu),
CDOE, MANUU

Mr P Habibulla
Assistant Registrar, Purchase & Stores Section, MANUU

Dr Mohd Akmal Khan
Assistant Professor of Urdu (Cont.),
CDOE, MANUU

Mohd Abdul Naseer
Section Officer, CDOE, MANUU

Shaik Ismail
UDC, CDOE, MANUU

Syed Faheemuddin, LDC
Purchase & Stores Section, MANUU

On behalf of the Registrar, Published by:

Centre for Distance and Online Education

Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad-500032 (TG), India
Director: dir.dde@manuu.edu.in *Publication:* ddepublication@manuu.edu.in
Phone Number: 040-23008314 Website: manuu.edu.in

CRC Prepared by **Mr. Mohd Aasim**, CDOE, MANUU, Hyderabad, Telangana
Printed at: **Print Time & Business Enterprises**, Hyderabad, Telangana

فہرست

پیغام		وائس چانسلر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی	6
پیغام		ڈائرکٹر، مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم	7
کورس کا تعارف		کورس کوآرڈی نیٹر (تاریخ)	8
اکائی نمبر	**اکائی کا نام**	**مصنف**	**صفحہ نمبر**
بلاک I	**ہندوستان کے سیاسی حالات: آٹھویں تا بارہویں صدی**		
1	ابتدائی عہد وسطی کے ہندوستان میں سیاسی حالات کی تفہیم	ڈاکٹر سید میر ابوالحسین	9
2	پال اور پرتیہار	محمد عاصم	25
3	راشٹر کوٹ	محمد عاصم	42
4	عربوں کی آمد	محمد عاصم	55
5	غزنوی اور غوری	محمد عاصم	67
6	سماج، ثقافت اور معیشت	ڈاکٹر سید میر ابوالحسین	93
بلاک II	**دہلی سلطنت—I: مآخذ اور سیاسی تاریخ**		
7	تاریخ نویسی کے مآخذ: ہند فارسی روزنامچے اور ملفوظ ادب	ڈاکٹر داؤد ابراہیم	110
8	مملوک خاندان	ڈاکٹر احمد	128
9	خلجی خاندان	ڈاکٹر احمد	144
10	تغلق خاندان	ڈاکٹر احمد	160
11	سید اور لودھی خاندان	ڈاکٹر احمد	176

بلاک III	**دہلی سلطنت—II: سیاست، سماج، معیشت اور مذہب**		
12	حکمران طبقہ: امراء، اقطاعدار اور دیہی اشرافیہ	محمد عاصم	189
13	نظم و نسق: مرکزی اور مقامی حکومتیں	پروفیسر علاؤالدین خان	204
14	معیشت: زرعی معیشت، نظام محصول، تجارت اور کاروبار	محمد عاصم	223
15	بھکتی تحریک	ڈاکٹر شیخ محبوب باشا	239
16	تصوف	ڈاکٹر شیخ محبوب باشا	253
17	سماج اور ثقافت	ڈاکٹر داؤد ابراہیم	271
بلاک IV	**دکن اور جزیرہ نما ہندوستان: سیاست، سماج اور معیشت**		
18	چول خاندان	ڈاکٹر خالد پونملا تھوڑی	289
19	کاکتیہ خاندان	ڈاکٹر سید میر ابوالحسین	304
20	وجے نگر سلطنت	ڈاکٹر سید میر ابوالحسین	323
21	بہمنی سلطنت اور اس کی جانشیں ریاستیں	محمد عاصم	338
	تجویز کردہ اکتسابی مواد		362
	نمونہ امتحانی پرچہ		366

مصنفین کی تفصیلات

(Writers' Details)

Dr Syed Meer Abul Hussain Asst. Prof. of History (Cont.), CDOE, MANUU	**ڈاکٹر سید میر ابوالحسین**، سی ڈی اوای، مانو، حیدرآباد
Mr Mohd Aasim Asst. Prof. of History (Cont.), CDOE, MANUU	**جناب محمد عاصم**، سی ڈی اوای، مانو، حیدرآباد
Dr Ahmad PGT, MANUU Model School Hyderabad	**ڈاکٹر احمد، پی جی ٹی**، مانو ماڈل اسکول، حیدرآباد
Dr Daud Ibrahim Asst. Prof. (Cont.), Dept. of History, MANUU	**ڈاکٹر داؤد ابراہیم** شعبہ تاریخ، مانو، حیدرآباد
Prof. Alauddin Khan Head, Dept. of History, Shibli National College	**پروفیسر علاؤالدین خان**، شعبہ تاریخ، شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ
Vidya Vachaspati **Shaik Mahaboob Basha** Associate Professor (History), CDOE, MANUU	**ودیاواچسپتی شیخ محبوب باشا**، سی ڈی اوای، مانو، حیدرآباد
Dr. Khalid Ponmulathodi Assistant Professor, Dept. of History, MANUU	**ڈاکٹر خالد پونملا تھوڑی**، شعبہ تاریخ، مانو، حیدرآباد

پروف ریڈرس (Proof Readers)

اول : جناب محمد عاصم

دوم : ڈاکٹر سید میر ابوالحسین

فائنل : ودیاواچسپتی شیخ محبوب باشا

ٹائٹل پیج (Title Page)

: ابراہیم اکرم صدیقی

پیغام

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (MANUU)، 1998 میں پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ کے ذریعے قائم کی گئی۔ یہ ایک مرکزی جامعہ ہے جس نے این اے اے سی کی جانب سے گریڈ A+ حاصل کیا ہے۔ اس جامعہ کے قیام کے مقاصد ہیں: (1) اردو زبان کا فروغ، (2) پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کو اردو میڈیم میں قابل رسائی اور دستیاب بنانا، (3) روایتی اور فاصلاتی طریقۂ تعلیم کے ذریعے تعلیم فراہم کرنا، اور (4) خواتین کی تعلیم پر خصوصی توجہ دینا۔ یہ وہ نکات ہیں جو اس مرکزی جامعہ کو دیگر تمام مرکزی جامعات سے ممتاز کرتے ہیں اور اسے ایک انفرادیت بخشتے ہیں۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی مادری زبانوں اور علاقائی زبانوں میں تعلیم حاصل کرنے پر زور دیا گیا ہے۔

اردو کے ذریعے علم کے فروغ کا مقصد یہی ہے کہ اردو جاننے والے طبقے کے لیے عصری علوم اور مضامین تک رسائی آسان بنائی جائے۔ ایک طویل عرصے تک اردو میں درسی مواد کی کمی رہی ہے۔ اردو یونیورسٹی کے پاس اب اردو میں 350 سے زیادہ کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے اور ہر سمسٹر کے ساتھ اس تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اردو یونیورسٹی این ای پی 2020 کے وژن کے مطابق مادری/گھریلو زبان میں تعلیمی مواد فراہم کرنے کے قومی مشن کا حصہ بننے کو اپنے لیے ایک اعزاز سمجھتی ہے۔ مزید یہ کہ اردو بولنے والا طبقہ اردو میں مطالعہ کے مواد کی عدم دستیابی کے سبب نئے اُبھرتے شعبوں اور جدید تر معلومات کے موجودہ میدانوں میں تازہ ترین معلومات واطلاعات کے حصول سے محروم نہیں رہے گا۔ مذکورہ بالا میدانوں میں مواد کی دستیابی کی بدولت حصولِ معلومات کا نیا شعور بیدار ہوا ہے جو یقیناً اردو داں طبقے کی دانشورانہ ترقی پر اثر انداز ہوگا۔
فاصلاتی اور آن لائن طلبہ کے لیے تعلیم وتدریس کے عمل کو سہل بنانے کے لیے یونیورسٹی کا سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن (CDOE) اردو اور متعلقہ مضامین میں خود اکتسابی مواد (SLM) کی تیاری کو یقینی بناتا ہے۔

MANUU فاصلاتی اور آن لائن لرننگ کے طلبہ کے لیے SLM بلامعاوضہ فراہم کرتا ہے۔ یہ مواد اُردو کے ذریعے علم حاصل کرنے میں دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کے لیے برائے نام قیمت پر دستیاب ہے۔ تعلیم تک رسائی کے دائرے کو مزید پھیلانے کے مقصد سے، اردو/ہندی/انگریزی/عربی میں eSLM یونیورسٹی کی ویب سائٹ پر مفت ڈاؤن لوڈ کے لیے دستیاب رکھا گیا ہے۔

مجھے بے حد خوشی ہے کہ متعلقہ فیکلٹی کی محنت اور مصنفین کے مکمل تعاون کی بدولت FYUG بی۔اے، بی۔ایس سی اور بی۔کام کی کتابوں کی اشاعت کا عمل بڑے پیمانے پر شروع ہو گیا ہے۔ فاصلاتی اور آن لائن لرننگ کے طلبہ کی سہولت کے لیے خود اکتسابی مواد (SLM) کی تیاری اور اشاعت کا عمل یونیورسٹی کے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم اپنے خود تعلیمی مواد کے ذریعے اردو جاننے والے ایک بڑے طبقے کی ضروریات کو پورا کرنے کے قابل ہوں گے اور اس یونیورسٹی کے مقصدِ قیام کو پورا کریں گے اور اپنے ملک میں اپنی موجودگی کو جائز ٹھہرا سکیں گے۔

نیک تمناؤں کے ساتھ!

پروفیسر سید عین الحسن
شیخ الجامعہ، مانو

پیغام

موجودہ دور میں فاصلاتی تعلیم کو دنیا بھر میں ایک نہایت مؤثر اور مفید طریقۂ تعلیم کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اور بڑی تعداد میں لوگ اس طریقۂ تعلیم سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے بھی اردو زبان بولنے والے عوام کی تعلیمی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے قیام کے وقت سے ہی فاصلاتی تعلیم کا طریقہ متعارف کرایا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے 1998 میں ڈائریکٹوریٹ آف ڈسٹنس ایجوکیشن (نظامتِ فاصلاتی تعلیم) کے ساتھ کام کا آغاز کیا اور 2004 سے باقاعدہ پروگرام شروع ہوئے، اس کے بعد مختلف شعبہ جات قائم کیے گئے۔

یو جی سی نے ملک میں نظام تعلیم کو مؤثر طور پر منظم کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ اوپن اینڈ ڈسٹنس لرننگ (ODL) موڈ کے تحت چلنے والے مختلف پروگرام، جو سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن (CDOE) میں چل رہے ہیں، یو جی سی-ڈی ای بی کے منظور شدہ ہیں۔ یو جی سی-ڈی ای بی نے فاصلاتی اور باقاعدہ تعلیم کے نصاب کو ہم آہنگ کرنے پر زور دیا ہے تاکہ فاصلاتی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کے معیار کو بہتر بنایا جاسکے۔ چونکہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ایک دُہرے طرز (ڈوئل موڈ) کی یونیورسٹی ہے جو فاصلاتی اور روایتی دونوں طریقۂ تعلیم کی خدمات فراہم کرتی ہے، اس لیے اپنے مقاصد کو یو جی سی-ڈی ای بی کے رہنما خطوط کے مطابق حاصل کرنے کے لیے اس نے چوائس بیسڈ کریڈٹ سسٹم (CBCS) متعارف کرایا گیا جس کا خود اکتسابی مواد (Self Learning Materials) یو جی سی کے قوانین اور کریڈٹ فریم کے مطابق نئے سرے سے تیار کیے جاچکا ہے۔

سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن (CDOE) کل انیس (19) پروگرام پیش کرتا ہے جن میں یو جی، پی جی، بی ایڈ، ڈپلومہ اور سرٹیفکیٹ پروگرام شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تکنیکی مہارتوں پر مبنی پروگرام بھی شروع کیے جارہے ہیں۔ سی ڈی اوای نے جولائی 2025 سے این ای پی-2020 کے مطابق چار سالہ یو جی پروگرام کا آغاز کیا ہے۔ بی اے، بی ایس سی اور بی کام کے آنرز پروگراموں کو این سی ایف کے مطابق ڈیزائن کیا گیا ہے جس سے طلبہ کو آنرز ڈگری حاصل کرنے میں مدد ملے گی۔ سال 2025-2026 سے ایم بی اے پروگرام او ڈی ایل موڈ میں متعارف کرایا گیا ہے۔

مانو نے طلبہ کی سہولت کے لیے نو ریجنل سنٹرز (بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگر) اور چھ سب ریجنل سنٹرز (حیدر آباد، لکھنؤ، جموں، نوح، وارانسی اور امراوتی) کا ایک وسیع نیٹ ورک قائم کیا ہے۔ اس کے علاوہ وجے واڑا میں ایک ایکسٹینشن سنٹر بھی قائم کیا گیا ہے۔ ان ریجنل اور سب ریجنل سنٹروں کے تحت ایک سو پچاس سے زیادہ لرنر سپورٹ سنٹر (LSCs) اور بیس پروگرام سنٹر بیک وقت چلائے جارہے ہیں تاکہ طلبہ کو تعلیمی اور انتظامی سہولیات فراہم کی جاسکیں۔ سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا بھرپور استعمال کرتا ہے اور اپنے تمام پروگراموں میں صرف آن لائن موڈ کے ذریعے ہی داخلے فراہم کرتا ہے۔

طلبہ کے لیے سیلف لرننگ میٹیریل (SLM) کی سوفٹ کاپی سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن کی ویب سائٹ پر دستیاب کرائی جاتی ہیں اور آڈیو و ویڈیو ریکارڈنگ کے لنک بھی ویب سائٹ پر فراہم کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ طلبہ کو ای۔ میل اور واٹس ایپ گروپ کی سہولت بھی فراہم کی جارہی ہے جن کے ذریعے انہیں پروگرام کے مختلف پہلوؤں جیسے کورس رجسٹریشن، اسائنمنٹ، کاؤنسلنگ، امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔ باقاعدہ کاؤنسلنگ کے علاوہ گزشتہ دو برسوں سے طلبہ کے تعلیمی معیار کو بہتر بنانے کے لیے زائد تدارکی (Remedial) آن لائن کاؤنسلنگ بھی فراہم کی جارہی ہے۔

امید کی جاتی ہے کہ سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن تعلیمی اور معاشی طور پر پسماندہ آبادی کو عصری تعلیم کے دھارے میں شامل کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرے گا۔ تعلیمی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے نئی تعلیمی پالیسی (NEP-2020) کے مطابق مختلف پروگرامز میں تبدیلیاں کی گئی ہیں اور توقع ہے کہ اس سے اوپن اینڈ ڈسٹنس لرننگ کے نظام کو مزید مؤثر اور کارآمد بنانے میں مدد ملے گی۔

پروفیسر محمد رضا اللہ خان

ڈائرکٹر، سی ڈی اوای، مانو

کورس کا تعارف

عزیز طلباء! آداب۔

کورس 'تاریخ ہندوستان: آٹھویں صدی کے وسط سے سولہویں صدی عیسوی کی ابتدا تک' میں خوش آمدید۔ این ای پی-2020 کے تقاضوں کے مطابق تاریخ کے مضمون پر یہ خود اکتسابی مواد، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے فاصلاتی تعلیم کے ان طلبا کے لیے تیار کیا گیا ہے جو چار سالہ یو جی پروگرام کے سمسٹر سوم میں داخل ہو چکے ہیں۔ اس میں، آپ ابتدائی عہد وسطیٰ کے ہندوستان کے سیاسی حالات سے لے کر دہلی سلطنت کے قیام اور زوال تک کا مطالعہ کریں گے۔ آپ اس دور کی نمایاں طاقتوں جیسے پال، پرتیہار، اور راشٹر کوٹ سلطنتوں کے ساتھ ساتھ عربوں کی آمد اور غزنوی و غوری حملوں کے اثرات کو سمجھیں گے۔ آپ دیگر چیزوں کے علاوہ، دہلی سلطنت (مملوک، خلجی، تغلق، سید اور لودی) کی سیاسی تاریخ، نظم و نسق، اور زرعی معیشت کا عمیق مطالعہ کریں گے۔ مزید برآں، یہ کورس آپ کو عہد وسطیٰ کے ہندوستانی سماج اور ثقافت پر بھکتی تحریک اور تصوف کے گہرے اثرات، اور دکن اور جزیرہ نما ہندوستان میں چول، کاکتیہ، وجے نگر اور بہمنی سلطنتوں کے عروج اور ان کے سماجی و اقتصادی اور ثقافتی پہلوؤں کو بھی سمجھنے میں مدد دے گا۔

حالیہ دور تک، تاریخ کو بادشاہوں اور شہنشاہوں کے عظیم کارناموں/بداعمالیوں کے طور پر سمجھا جاتا تھا۔ ملکائیں بھی زیادہ تر اپنے عظیم مردوں کے تعلق کی وجہ سے ظاہر ہوئیں۔ دوسرے لفظوں میں، تاریخ کو بادشاہوں اور ریاستوں، شہنشاہوں اور سلطنتوں، کے ناموں کی ایک لمبی فہرست سمجھا جاتا تھا۔ اس میں ان کے ذریعے لڑی جانے والی جنگوں اور ان کی محبوباؤں وغیرہ کا تذکرہ بھی شامل تھا۔ مختصراً، تاریخ کا مطلب سیاسی تاریخ تھا اور بدقسمتی سے یہ سوچ عام لوگوں کے ذہنوں پر ابھی بھی حاوی ہے۔ عام لوگ، محنت کش عوام، جو اصل تاریخ ساز تھے، شاید ہی کبھی تاریخ کے ڈرامے میں نظر آئے۔ لیکن، اب تاریخ کے بارے میں نقطہ نظر بڑی حد تک تبدیل ہو چکا ہے اور اسی لیے تاریخ لکھنے کا طریقہ بھی بدل گیا ہے۔ عام لوگ بشمول مرد و خواتین، نے تاریخ میں اپنے حصے کا دعویٰ کرنا شروع کر دیا ہے۔ اب تاریخ کی توجہ حکمرانوں سے رعایا کی طرف منتقل ہو رہی ہے۔ جیسا کہ تیلگو شاعر سری سری (سری رنگم سری نواس راؤ) نے اپنی نظم میں مناسب طریقے سے بیان کیا ہے، اب مورخین اس کی کھوج کرنا چاہتے ہیں اور 'تاریخ کے اندھیرے میں دبی پڑی سب کہانیوں پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ وہ پوچھنے لگے کہ دریائے نیل کی تہذیب میں عام زندگی کیسی تھی اور تاج محل کی تعمیر میں پتھر ڈھونے والے قلی کون تھے اور سلطنتوں کے باہمی جنگوں میں عام لوگوں کی بہادری کیسی تھی۔ ناوہ ڈولی گنتی کی تھی چڑھ بیٹھا جس پر راجا، اس کے واہک کلی کون تھے؟' یہ بے حد ضروری ہے کہ تاریخ کا مطالعہ عام لوگوں کے نقطۂ نظر سے کیا جائے۔ مشہور ادیب جارج اورویل نے تاریخ کو مختصر الفاظ میں بیان کرتے ہوئے کہا کہ: 'جو ماضی کو قابو کرتے ہیں وہی مستقبل کو قابو کرتے ہیں: جو حال کو قابو کرتے ہیں وہی ماضی کو قابو کرتے ہیں۔' ممتاز مورخ پروفیسر کے ایس ایس شیشن نے زور دیا کہ 'تاریخ کا سماج سے وہی رشتہ ہے جو یادداشت کا فرد سے ہے۔' ودیاواچسپتی ایس ایم باشا کے مطابق جو ماضی کو اچھے سے سمجھتے ہیں، وہ حال کو بہترین طریقے سے سمجھ سکتے ہیں؛ اور اسی طرح ماضی کو اچھے ڈھنگ سے سمجھنے کے لیے حال کا گہرا علم ضروری ہے۔

UGC-DEB کی ہدایات کے مطابق، مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے سیلف لرننگ مٹیریل لکھنے کے لیے بہترین مصنفین کو راغب کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ امید ہے کہ یہ نہ صرف آپ کی تعلیمی کارکردگی کے لیے کارآمد ثابت ہوگا بلکہ مختلف مسابقتی امتحانات کو اعتماد کے ساتھ دینے کے قابل بھی بنائے گا۔ ہم شعبہ تاریخ، مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم میں، آپ کی خدمت کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔ کورس میں ایک بار پھر خوش آمدید۔ میں آپ کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہوں۔

ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا

کورس کوآرڈی نیٹر

اکائی 1۔ابتدائی عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں سیاسی حالات کی تفہیم

(Understanding the Political Conditions in Early Medieval India)

اکائی کے اجزا

1.0	تمہید
1.1	مقاصد
1.2	تاریخی مآخذ
1.3	ہرش کے بعد کے حالات
1.4	علاقائی ریاستوں کا عروج
1.4.1	شمالی اور مغربی ہندوستان: راجپوتوں کا ظہور
1.4.2	مشرقی ہندوستان: پال سلطنت
1.4.3	دکن: راشٹر کوٹ سلطنت
1.4.4	جنوبی ہندوستان: چول سلطنت
1.5	قنوج اور سہ طرفہ جدوجہد
1.6	ریاست کی نوعیت
1.7	سامنتی نظام
1.8	انتظامیہ وفوج
1.9	سیاسی میراث
1.10	اکتسابی نتائج
1.11	کلیدی الفاظ
1.12	نمونہ امتحانی سوالات

1.0 تمہید (Introduction)

ہندوستانی تاریخ نویسی میں ابتدائی عہد وسطیٰ (Early Medieval Period) ایک انتہائی اہم، پیچیدہ اور طویل عبوری دور کی حیثیت رکھتا ہے، جسے عموماً قدیم سلطنتوں کے زوال اور عہد وسطیٰ کی اسلامی سلطنتوں (دہلی سلطنت) کے قیام کے درمیانی دور کے طور پر پہچانا جاتا ہے۔ ماضی کے بیشتر استعماری (Colonial) اور قوم پرست (Nationalist) مورخین اس دور کو ایک 'تاریک دور' (Dark Age) سے تعبیر کرتے تھے، جس میں ان کے نزدیک ہندوستان کی سیاسی وحدت مکمل طور پر پارہ پارہ ہوگئی تھی اور پورا برصغیر چھوٹی چھوٹی ایک دوسرے سے جھگڑنے والی ریاستوں میں بٹ کر زوال کا شکار ہو گیا تھا۔ ان مورخین کے مطابق، قدیم دور کی عظیم موریہ اور گپتا سلطنتوں کی مرکزیت کا خاتمہ دراصل ہندوستانی تہذیب کے زوال کی علامت تھا۔ تاہم، عصری تاریخ نویسی اور جدید تحقیق نے اس پرانے نظریے کو مکمل طور پر مسترد کر دیا ہے۔ اُپندر سنگھ اور بی۔ ڈی۔ چٹوپادھیائے جیسے نامور مورخین کی حالیہ تحقیقات نے اس دور کو زوال کے بجائے ساختی تبدیلیوں، ریاستی پھیلاؤ، اور نئے سماجی ارتقاء کا دور قرار دیا ہے۔

اس دور کی سب سے نمایاں اور بنیادی خصوصیت لامرکزیت (Decentralisation) یعنی سیاسی طاقت کی نچلی سطح تک منتقلی اور علاقائی طاقتوں کا زبردست عروج تھی۔ ہرش وردھن کی موت کے بعد جب شمالی ہندوستان کی سیاسی وحدت کا شیرازہ بکھرا، تو اس نے نئے ریاستی ڈھانچوں کی تشکیل کی راہ ہموار کی۔ یہ وہ دور تھا جب ریاست سازی (State Formation) کا عمل صرف گنگا کے میدانوں تک محدود نہیں رہا، بلکہ اس کا دائرہ کار ہندوستان کے ان دور دراز، قبائلی، اور بنجر علاقوں تک بھی پھیل گیا جو پہلے سیاسی نقشے پر نمایاں نہیں تھے۔ برہمنوں اور مذہبی اداروں کو دیے جانے والے زمین کے وسیع عطیات نے نئے علاقوں میں زراعت کو فروغ دیا اور مقامی قبائل کو مرکزی دھارے کے ذات پات پر مبنی زرعی معاشرے میں ملانے کا کام کیا۔ اس عمل کے نتیجے میں نہ صرف نئی علاقائی ریاستیں وجود میں آئیں، بلکہ ہندوستان کی موجودہ کئی علاقائی زبانوں، ثقافتوں اور شناختوں نے بھی اسی دور میں پروان چڑھنا شروع کیا۔

سیاسیات کے اعتبار سے، یہ دور ایک کثیر المرکزی (Multi-centric) نظام کی نمائندگی کرتا ہے جہاں اقتدار کا سرچشمہ کوئی ایک شہر یا ایک شہنشاہ نہیں تھا۔ شمال میں راجپوت ریاستیں، مشرق میں پال، دکن میں راشٹر کوٹ، اور جنوب میں چول اور پلو جیسی زبردست طاقتیں اس عبوری دور کے سیاسی منظر نامے کے اہم ستون تھے۔ یہ اکائی، اسی سیاسی رنگا رنگی، اقتدار کی رسہ کشی، اور اس دور کے پیچیدہ ریاستی ڈھانچوں کے سمجھنے پر زور دیتی ہے، تاکہ طلباء ان تاریخی عوامل کو سمجھ سکیں جنہوں نے جدید ہندوستان کے خدوخال مرتب کیے۔

1.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- ہندوستانی تاریخ کے ابتدائی عہد وسطیٰ کے سیاسی، سماجی، اور انتظامی رجحانات سے واقف ہو سکیں گے۔
- ہرش وردھن کی سلطنت کے خاتمے کے بعد پیدا ہونے والے سیاسی خلا اور اس کے نتیجے میں ابھرنے والی علاقائی طاقتوں کے عروج

وزوال کو بیان کر سکیں گے۔

- قنوج کے حصول کے لیے لڑی جانے والی تاریخی سہ طرفہ جدوجہد کے محرکات اور اثرات کو سمجھ سکیں گے۔
- 'سامنتی نظام' اور 'ٹکڑوں میں بنٹی ریاست' جیسے نظریات اور ان کے اثرات کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- قدیم سلطنتوں کی مرکزیت سے لے کر ابتدائی عہد وسطیٰ کی لامرکزیت کی باریکیوں کا موازنہ کر سکیں گے۔

1.2 تاریخی مآخذ (Historical Sources)

ابتدائی عہد وسطیٰ کی سیاسی، معاشی اور سماجی ساخت کا احاطہ کرنے کے لیے مورخین کو کثیر جہتی اور متنوع مآخذ پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ ان مآخذ کی تفہیم کے بغیر اس دور کی سیاسی پیچیدگیوں کو سمجھنا ناممکن ہے۔ ان مآخذ کو بنیادی طور پر دو وسیع زمروں میں تقسیم کیا جاتا ہے: ادبی مآخذ (جن میں مقامی سنسکرت ادب اور غیر ملکی سیاحوں کے بیانات شامل ہیں) اور آثار قدیمہ کے مآخذ (جن میں کتبات، سکے، اور عمارات شامل ہیں)۔ ادبی مآخذ کے زمرے میں سنسکرت ادب کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ ساتویں صدی عیسوی کی تاریخ جاننے کے لیے بان بھٹ کی تصنیف 'ہرش چرت' (Harshacharita) ایک کلیدی ماخذ ہے۔ بان بھٹ، جو کہ راجہ ہرش وردھن کے استھان کوی (درباری شاعر) تھے، نے اس کتاب میں نہ صرف ہرش کی زندگی اور اس کے خاندانی پس منظر کو بیان کیا ہے بلکہ اس دور کی درباری سازشوں، فوجی مہمات، اور سیاسی اداروں کی تفصیلی منظر کشی بھی کی ہے۔ اگرچہ اس میں مبالغہ آرائی کا عنصر پایا جاتا ہے، لیکن یہ شمالی ہندوستان میں اقتدار کی منتقلی کو سمجھنے میں بے حد مددگار ہے۔

اس دور کی سب سے مستند اور باقاعدہ تاریخی دستاویز، کشمیر کے برہمن عالم پنڈت کلہن کی سنسکرت تصنیف راج ترنگنی کو مانا جاتا ہے، جسے انہوں نے 1148 سے 1150 عیسوی کے درمیانی عرصے میں منظوم شکل میں لکھا۔ کلہن کے والد چنپک، کشمیر کے راجہ ہرش (1089-1101ء) کے دربار میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے، جس کی وجہ سے کلہن کو درباری سیاست کا قریبی مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔ راج ترنگنی، جس کا لغوی معنی ''راجاؤں کا دریا'' ہے، آٹھ ترنگوں (حصوں) پر مشتمل ہے۔ کلہن نے النکار شاستر کے قواعد کی پیروی کرتے ہوئے اس میں 'شانت رس' کو غالب رکھا ہے تاکہ یہ پیغام دیا جا سکے کہ دنیاوی شان و شوکت اور سیاسی طاقت عارضی ہے۔ کلہن کا کمال یہ ہے کہ اس نے اپنے پیشروؤں کے برعکس غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کیا اور واقعات کو زمانی ترتیب کے ساتھ پیش کیا۔ ساتھ ہی کتبات کا بھی استعمال کیا جس کی وجہ سے اسے بجا طور پر ہندوستانی تاریخ کا پہلا باقاعدہ مورخ تسلیم کیا جاتا ہے۔

عرب اور وسطی ایشیائی سیاحوں کے سفر نامے اور جغرافیائی تصانیف اس دور کے بیرونی روابط اور سیاسی حالات پر غیر جانبدارانہ روشنی ڈالتے ہیں۔ نویں صدی کے عرب سیاح سلیمان تاجر نے اپنی کتاب 'سلسلۃ التواریخ' میں راشٹر کوٹ سلطنت جسے وہ بلہارا یعنی ولبھ راجہ کہتے تھے، عظمت کا ذکر کیا ہے اور اس کا شمار دنیا کے چار بڑے حکمرانوں میں کیا ہے۔ اس کے علاوہ گیارہویں صدی میں ابوریحان البیرونی نے ہندوستان کا سفر کیا اور سنسکرت زبان سیکھ کر براہ راست ہندوستانی علوم، فلسفے، اور سماجی نظام کا مطالعہ کیا۔ البیرونی کی شہرہ آفاق کتاب 'تحقیق ما

للہند' (کتاب الہند) ہندوستانی معاشرے، ذات پات کے نظام، اور سیاسی بکھراؤ کی ایک ایسی معروضی اور سائنسی دستاویز ہے جس کی مثال اس دور میں نہیں ملتی۔ اس کتاب میں محمود غزنوی کے حملوں کے وقت ہندوستانی ریاستوں کی کمزوریوں اور آپسی چپقلش کا بخوبی تجزیہ کیا گیا ہے۔

دوسری جانب، آثار قدیمہ، بالخصوص کتبات (Inscriptions)، ابتدائی عہد وسطیٰ کی تاریخ کے سب سے مستند اور بنیادی ذرائع ہیں۔ یہ کتبات عموماً تانبے کی تختیوں (Copper Plates) اور مندروں کی پتھر کی دیواروں پر کندہ پائے گئے ہیں۔ تانبے کی تختیاں دراصل قانونی دستاویزات تھیں جو بادشاہوں کی جانب سے برہمنوں یا ریاستی عہدیداروں کو دیے گئے اراضی کے عطیات (Land Grants) کی تصدیق کرتی تھیں۔ ان کتبات کے دیباچوں (Prashastis) میں شاہی شجرہ نسب، فتوحات، اور عطیہ کی گئی زمین کے انتظامی، عدالتی، اور محصولاتی حقوق کی منتقلی کی تمام تفصیلات درج ہوتی تھیں۔ مثال کے طور پر جنوبی ہندوستان میں چول سلطنت کی دیہی اور شہری انتظامیہ کی تفصیلات، پرانتک اول کے اترامیرور (Uttaramerur) کتبات سے حاصل ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں، اس دور کے سکوں کا مطالعہ (Numismatics) بھی معاشی اور سیاسی حالات کی عکاسی کرتا ہے۔ سکوں کی ساخت، ان میں موجود دھات کی مقدار اور ان کے وسیع علاقوں میں چلن سے ریاستوں کے مالی استحکام، بیرونی تجارت، اور جاگیردارانہ نظام کی مضبوطی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ماخذ کی قسم	اہم کتاب/کتبہ	مصنف/سرپرست	تاریخی اہمیت
سنسکرت ادب	ہرش چرت	بان بھٹ (ساتویں صدی)	ہرش وردھن کی سوانح، فوجی مہمات، اور شمال ہند کی سیاست کا بیان۔
	راج ترنگنی	پنڈت کلہن (بارہویں صدی)	کشمیر کی مفصل تاریخ، زمانی ترتیب کی پابندی، درباری سازشوں کا حقیقت پسندانہ خاکہ۔
عربی سفرنامے	سلسلۃ التواریخ	سلیمان تاجر (نویں صدی)	راشٹر کوٹ سلطنت کی فوجی طاقت اور ہندوستان کی تجارتی شاہراہوں کا تذکرہ۔
عربی تصانیف	کتاب الہند	ابوریحان البیرونی (گیارہویں صدی)	ہندوستانی سماج، علوم، مذاہب، اور سیاسی بکھراؤ کا غیر جانبدارانہ اور انسائیکلوپیڈک تجزیہ۔
کتبات	اترامیرور کتبات	پرانتک چول اول	چول دیہی انتظامیہ، سبھا اور نمائندوں کے انتخابی نظام کی تفصیلی معلومات۔

1.3 ہرش کے بعد کے حالات (Post-Harsha Conditions)

ساتویں صدی عیسوی کا اوائل، شمالی ہندوستان کی سیاست میں مرکزیت کی بحالی کی ایک عارضی کوشش کا گواہ تھا۔ پشیا بھوتی (Pushyabhuti) خاندان کے ایک نوجوان حکمران، ہرش وردھن (590-647 عیسوی) نے شمالی اور مغربی ہندوستان کے ایک وسیع حصے پر اپنا تسلط قائم کیا اور گپت سلطنت کے بعد پیدا ہونے والے سیاسی خلا کو پر کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ ہرش نے اپنی راجدھانی کو تھانیسر (موجودہ ہریانہ) سے قنوج (اتر پردیش) منتقل کیا، جو کہ اس بات کی واضح علامت تھی کہ ہندوستان کا سیاسی اور اقتصادی مرکز اب پاٹلی پتر سے

منتقل ہو کر دریائے گنگا اور جمنا کے دوآب میں واقع قنوج کی طرف آ گیا ہے۔ تاہم، ہرش کی سلطنت کی بنیادیں کسی مستحکم افسر شاہی نظام پر استوار نہیں تھیں بلکہ اس کا انحصار اس کے ماتحت جاگیرداروں اور اتحادیوں کی وفاداری پر تھا۔ چنانچہ 647 عیسوی میں جیسے ہی ہرش کی وفات ہوئی، شمالی ہندوستان میں ایک وسیع سیاسی خلا پیدا ہو گیا۔ اس کا کوئی ایسا قابل جانشین نہیں تھا جو اتنی وسیع سلطنت کو ایک مرکز پر متحد رکھ سکتا۔ ہرش کے دور میں جو مقامی سردار اور جاگیردار مرکز کے وفادار تھے، انہوں نے فوری طور پر مرکز کی کمزوری کا فائدہ اٹھایا اور اپنے اپنے خطوں میں خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس کے نتیجے میں پورا شمالی ہندوستان سیاسی انتشار کا شکار ہو گیا، اور کئی آزاد ریاستیں وجود میں آ گئیں۔

ہرش کی موت کے بعد کے ادوار میں، قنوج نے ہندوستانی سیاست میں وہی مقام حاصل کر لیا جو قدیم دور میں مگدھ اور پاٹلی پتر کو حاصل تھا۔ قنوج پر قابض ہونا پورے شمالی ہندوستان پر اقتدار کی علامت بن گیا۔ آٹھویں صدی کے اوائل میں، قنوج میں یشوورمن (Yashovarman) نامی ایک طاقتور حکمران کا عروج ہوا، جس نے کچھ عرصے کے لیے امن و امان بحال کیا اور شمالی ہندوستان میں اپنا اثر ورسوخ قائم کیا۔ لیکن اسے کشمیر کے کارکوٹا (Karkota) خاندان کے زبردست فاتح حکمران للتادتیہ مکتاپیڈ کے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ للیتادتیہ نے نہ صرف قنوج کو فتح کیا بلکہ اپنی سلطنت کی سرحدیں وسطی ایشیا تک پھیلا دیں۔ اس طرح ہرش کے بعد کے حالات نے واضح کر دیا کہ ہندوستان کے سیاسی نقشے پر اب طاقت کا کوئی ایک مستقل مرکز باقی نہیں رہا تھا، بلکہ فوجی طاقت اور زمین پر کنٹرول نئی سیاسی تبدیلیوں کا تعین کر رہے تھے۔ یہ سیاسی خلا اور لامرکزیت دراصل ان طاقتور علاقائی ریاستوں کے عروج کا پیش خیمہ ثابت ہوئی جنہوں نے آنے والی صدیوں میں ہندوستان پر حکومت کی۔

1.4 علاقائی ریاستوں کا عروج (Rise of Regional States)

آٹھویں صدی سے لے کر بارہویں صدی عیسوی کا دور ہندوستانی تاریخ میں علاقائی طاقتوں کے ابھرنے اور ان کی ثقافتی و سیاسی بالادستی کا دور ہے۔ یہ علاقائی ریاستیں محض سیاسی اکائیاں نہیں تھیں، بلکہ ان کی سرپرستی میں مقامی زبانیں، فنون لطیفہ، اور مخصوص علاقائی شناختیں پروان چڑھیں۔ ان ریاستوں نے جغرافیائی حدود کے اندر مضبوط انتظامی ڈھانچے قائم کیے اور بیرونی و اندرونی خطرات سے نبرد آزما رہیں۔

1.4.1 شمالی اور مغربی ہندوستان: راجپوتوں کا ظہور

ابتدائی عہد وسطیٰ میں شمالی اور مغربی ہندوستان کی سیاست میں سب سے بڑی تبدیلی 'راجپوت' قبائل کا عروج تھا۔ تاریخ نویسی میں راجپوتوں کی اصل نسل اور ان کے ظہور کے بارے میں طویل مباحث موجود ہیں۔ بیشتر جدید مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ راجپوت دراصل وسطی ایشیا سے ہندوستان آنے والے ہن (Huns)، گرجر (Gurjaras) اور دیگر جنگجو قبائل کے اخلاف تھے۔ جب یہ خانہ بدوش قبائل ہندوستان کے زرعی معاشرے میں آباد ہوئے تو برہمنوں نے ان کی فوجی طاقت اور سماجی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں کھشتری (Kshatriya) کا درجہ عطا کیا۔ ان کی سماجی اور سیاسی حیثیت کو جائز قرار دینے کے لیے اگنی کل (Agnikula) جیسی داستانیں

وضع کی گئیں، جن کے مطابق چوہان، پرمار، سولنکی، اور پرتیہار خاندانوں کے بانی ماؤنٹ آبو پر کی گئی ایک قربانی کی آگ سے پیدا ہوئے تھے تاکہ وہ برائی کا خاتمہ کر سکیں اور ہندو دھرم کی حفاظت کر سکیں۔ ان راجپوت ریاستوں نے انتہائی جنگجو اور فوجی بنیادوں پر اپنی حکومتیں قائم کیں۔ اجمیر اور دہلی کے چوہان، مالوہ کے پرمار، گجرات کے سولنکی، اور بندیل کھنڈ کے چندیل ان میں نمایاں تھے۔ اگرچہ یہ ریاستیں ذاتی شجاعت اور بہادری میں بے مثال تھیں، لیکن ان کا سب سے بڑا المیہ ان کی باہمی عداوتیں اور مسلسل خانہ جنگی تھی۔ یہ ریاستیں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں مصروف رہیں جس کے باعث یہ ایک متحدہ محاذ بنانے میں ناکام رہیں، اور یہی ان کی وہ کمزوری تھی جس نے بعد ازاں ترک حملہ آوروں کے لیے راہیں ہموار کیں۔

1.4.2 مشرقی ہندوستان: پال سلطنت

آٹھویں صدی کے وسط (تقریباً 750 عیسوی) میں بنگال میں شدید طوائف الملوکی اور سیاسی بدامنی کا دور دورہ تھا جسے تاریخی اصطلاح میں مستیہ نیائے یعنی مچھلیوں کا قانون کہا جاتا ہے، جہاں بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے۔ اس افراتفری کو ختم کرنے کے لیے مقامی سرداروں نے مل کر گوپال نامی ایک شخص کو اپنا حکمران منتخب کیا، جس نے پال سلطنت کی بنیاد رکھی۔ پال حکمران، جن میں دھرم پال اور دیوپال جیسے عظیم فاتحین شامل تھے، بدھ مت کے سرپرست تھے۔ انہوں نے مشرقی ہندوستان کو ایک مضبوط سیاسی اکائی میں تبدیل کیا اور شمالی ہندوستان کی سیاست میں بھی بھرپور مداخلت کی۔ پال دور کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی تعلیمی اور ثقافتی سرپرستی تھی۔ انہوں نے نالندہ یونیورسٹی کی تجدید کی اور وکرم شیلا اور اودانتپوری جیسی عظیم یونیورسٹیوں کی بنیاد رکھی۔ ان کے جنوب مشرقی ایشیا، بالخصوص سری وجیا سلطنت (انڈونیشیا) کے ساتھ گہرے سفارتی اور تجارتی تعلقات تھے، جس نے مشرقی ہندوستان کی معیشت کو مستحکم رکھا۔

1.4.3 دکن: راشٹر کوٹ سلطنت

دکن کی سطح مرتفع میں آٹھویں صدی کے وسط میں دنتی درگا نے بادامی کے چالوکیوں کو شکست دے کر راشٹر کوٹ سلطنت کی بنیاد رکھی۔ راشٹر کوٹوں کی جغرافیائی پوزیشن ایسی تھی کہ وہ بیک وقت شمالی ہندوستان اور جنوبی ہندوستان کی سیاست کے درمیان ایک پل کا کام کرتے تھے۔ ان کے حکمران، جیسے گووندا سوم اور اموگھ ورش، اپنے دور کے عظیم ترین فاتحین اور مدبرین میں شمار ہوتے تھے۔ اموگھ ورش، جس نے قریباً ساٹھ سال تک حکومت کی، جین مت کا پیروکار تھا اور اس نے فن تعمیر اور ادب کی زبردست سرپرستی کی۔ ایلورا کا مشہور کیلاس مندر، جسے چٹان تراش کر بنایا گیا ہے، راشٹر کوٹوں کی فنی عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ راشٹر کوٹوں کی فوجی طاقت اتنی زبردست تھی کہ عرب سیاحوں نے ان کے حکمرانوں کو دنیا کے چار طاقتور ترین بادشاہوں (چین، بازنطین، اور اسلامی خلافت) میں شمار کیا ہے۔

1.4.4 جنوبی ہندوستان: چول سلطنت

جنوبی ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں نویں صدی کے اواخر میں وجیالیہ کی قیادت میں چول سلطنت کا از سر نو ابھرنا ایک عہد ساز واقعہ تھا۔ چولوں نے پلو سلطنت کو شکست دے کر اپنا دبدبہ قائم کیا۔ راجاراج اول (985-1014) اور راجندر چول اول (1012-1044)

کی قیادت میں چول سلطنت ایک عظیم طاقت بن گئی۔ چولوں کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی زبردست بحری طاقت تھی۔ انہوں نے نہ صرف پورے جنوبی ہندوستان کو اپنے پرچم تلے متحد کیا بلکہ اپنی بحری مہمات کے ذریعے سری لنکا، مالدیپ، اور جنوب مشرقی ایشیا کے سری وجیا سلطنت پر بھی فوجی دباؤ قائم کیا۔ چول دور میں تنجاور اور گنگائی کونڈہ چولاپورم جیسے شہر سیاسی، اقتصادی، اور مذہبی سرگرمیوں کے اعصابی مراکز بن گئے۔ ان کی تعمیر کردہ عظیم الشان دراوڑی مندر (جیسے بریدیشور مندر) ان کی دولت اور سیاسی نظریات کے مظہر تھے۔

1.5 قنوج اور سہ طرفہ جدوجہد (Kannauj and the Tripartite Struggle)

ابتدائی عہد وسطیٰ کی ہندوستانی سیاست کا مطالعہ اس عظیم جنگ کے بغیر نامکمل ہے جسے تاریخ میں 'سہ طرفہ جدوجہد' (Tripartite Struggle) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ کوئی ایک جنگ نہیں تھی بلکہ تقریباً دو سو سال (آٹھویں صدی کے اواخر سے لے کر دسویں صدی عیسوی تک) جاری رہنے والی کشمکشوں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ اس جدوجہد میں ہندوستان کی تین اس وقت کی سب سے طاقتور سلطنتیں، مغربی ہندوستان کے گرجر پرتیہار، مشرق کے پال، اور دکن کے راشٹر کوٹ، قنوج شہر اور اس سے ملحقہ علاقوں پر اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے برسرپیکار تھیں۔

یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان تینوں سلطنتوں کی نظر قنوج پر ہی کیوں تھی؟ ہرش وردھن کے دور کے بعد قنوج نے ہندوستانی سیاست میں وہی سامراجی اور علامتی اہمیت اختیار کر لی تھی جو صدیوں تک پاٹلی پتر کو حاصل رہی تھی۔ قنوج پر قبضے کا مطلب پورے شمالی ہندوستان کی خود مختاری پر دعویٰ کرنا تھا۔ مزید برآں، قنوج گنگا اور جمنا کے زرخیز ترین دوآب (میدان) کے بالکل وسط میں واقع تھا، جس کا مطلب یہ تھا کہ جو بھی اس پر قابض ہوتا، اسے زراعت سے حاصل ہونے والے بے پناہ ٹیکس تک رسائی مل جاتی۔ قنوج ان اہم تجارتی شاہراہوں کا مرکز بھی تھا جو شمالی ہندوستان کو مشرق، مغرب، اور جنوب سے جوڑتی تھیں، لہٰذا یہاں سے ہونے والی تجارت پر ٹیکس عائد کرنا خزانے کو بھرنے کا ایک زبردست ذریعہ تھا۔

اس طویل جنگ کا آغاز اس وقت ہوا جب گرجر پرتیہار راجہ وتس راج (Vatsaraja) اور پال راجا دھرم پال دونوں نے ایک ہی وقت میں قنوج پر کنٹرول کی کوشش کی۔ وتس راج نے ابتدائی جھڑپ میں دھرم پال کو شکست دی، لیکن اسی دوران دکن سے راشٹر کوٹ حکمران دھرو (Dhruva) نے تیزی سے شمال کی طرف پیش قدمی کی اور ایک ہی مہم میں پرتیہار اور پال دونوں فوجوں کو باری باری شکست دے کر قنوج پر عارضی قبضہ کر لیا۔ تاہم، چونکہ راشٹر کوٹوں کی اصل طاقت اور جغرافیائی مرکز بہت دور دکن میں تھا، اس لیے وہ طویل عرصے تک شمالی ہندوستان کے سیاسی حالات میں الجھ کر قنوج کو قابو میں نہیں رکھ سکتے تھے اور انہیں جلد ہی واپس لوٹنا پڑا۔ راشٹر کوٹوں کی اس واپسی نے پال راجہ دھرم پال کو سنبھلنے کا موقع فراہم کیا اور اس نے قنوج پر قبضہ کر کے اپنا ایک کٹھ پتلی حکمران (چکرایودھ) وہاں بٹھا دیا۔ لیکن یہ کامیابی بھی دیرپا ثابت نہیں ہوئی۔ پرتیہار سلطنت نے ناگ بھٹ دوم کی قیادت میں دوبارہ طاقت مجتمع کی اور قنوج پر زبردست حملہ کر کے اسے چھین لیا۔ یہ سیاسی آنکھ مچولی نسل در نسل جاری رہی۔ گووندا سوم (راشٹر کوٹ) نے بھی شمالی ہند پر حملے کیے، جب کہ پال سلطنت کی طرف



قنوج کے لیے سہ طرفہ جدوجہد

https://en.wikipedia.org/wiki/Tripartite_Struggle#/media/File:Indian_Kanauj_triangle_map.svg

سے دیوپال نے اس کشمکش میں حصہ لیا۔ بالآخر، نویں صدی کے وسط اور اواخر میں پرتیہار حکمرانوں، خاص طور پر مہر بھوج اور اس کے جانشین مہندر پال کے دور میں، گرجر پرتیہار سلطنت مکمل طور پر قنوج پر اپنا مستقل تسلط قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی اور قنوج باقاعدہ طور پر ان کی راجدھانی بن گیا۔

اگرچہ قنوج پرتیہاروں کے قبضے میں آ گیا، لیکن اس صدیوں طویل جنگ نے ان تینوں سلطنتوں پر تباہ کن اثرات مرتب کیے۔ مسلسل جنگوں نے ان سلطنتوں کے فوجی اور معاشی وسائل کو بری طرح نچوڑ لیا۔ جنگی اخراجات پورے کرنے کے لیے انہیں جاگیرداروں پر انحصار کرنا پڑا، جس کے نتیجے میں ان کے ماتحت جاگیرداروں (سامنتوں) کی طاقت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ دسویں صدی کے آخر تک یہ تینوں عظیم سلطنتیں اندرونی بغاوتوں اور معاشی بحرانوں کے باعث زوال کا شکار ہو گئیں۔

1.6 ریاست کی نوعیت (Nature of the State)

ابتدائی عہد وسطیٰ میں ریاست کا ڈھانچہ کس نوعیت کا تھا، یہ ہندوستانی تاریخ نویسی میں طویل عرصے سے بحث اور تحقیق کا ایک بڑا موضوع رہا ہے۔ چونکہ اس دور میں سلطنتیں کثیر المرکزی تھیں، اس لیے ریاست کی ساخت کو سمجھنے کے لیے مورخین نے مختلف علمی نمونے پیش کیے ہیں۔ اس موضوع کو تین بنیادی نظریاتی زاویوں سے سمجھا جاسکتا ہے۔

روایتی یا مرکزیت پسند نمونہ (Traditional Centralised Model)

بیسویں صدی کے اوائل کے بیشتر مورخین، جن میں کے۔ اے نیل کنٹھ شاستری (K.A. Nilakanta Sastri) نمایاں ہیں، کا نظریہ تھا کہ ابتدائی عہد وسطیٰ کی سلطنتیں، بالخصوص چول سلطنت، انتہائی مرکزیت پسند (Centralised) اور طاقتور ریاستیں تھیں۔ ان مورخین نے برطانوی اور بازنطینی ریاستوں کے ماڈل کو ہندوستانی تاریخ پر چسپاں کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ بادشاہ کے پاس مطلق العنان اختیارات تھے۔ ان کے مطابق، ریاست کو چلانے کے لیے ایک وسیع، پیچیدہ، اور منظم افسر شاہی موجود تھی، ایک بہت بڑی مستقل فوج بادشاہ کے براہ راست کنٹرول میں تھی، اور ٹیکس جمع کرنے کا نظام مکمل طور پر مرکز کے ماتحت تھا۔

انضمامی یا ریاستی پھیلاؤ کا نمونہ (Integrative Model)

پروفیسر بی۔ ڈی چٹوپادھیائے (B.D. Chattopadhyaya) اور ہرمن کلکے (Hermann Kulke) جیسے جدید مورخین نے روایتی نظریے کو مسترد کرتے ہوئے 'انضمامی نمونہ' پیش کیا۔ ان کا استدلال ہے کہ اس دور کو لامرکزیت اور زوال کا دور سمجھنا غلط ہے۔ اس کے برعکس، یہ دور ریاست کے پھیلاؤ کا دور تھا۔ ان کے نزدیک، جنگلوں میں رہنے والے قبائل کو زرعی معاشرے میں شامل کیا جارہا تھا، اور چھوٹی مقامی ریاستیں تشکیل پارہی تھیں۔ بعد ازاں، ان چھوٹی مقامی اکائیوں کو مندروں کی تعمیر، برہمنوں کو دیے گئے اراضی کے عطیات، اور مذہبی سرپرستی کے ذریعے ایک بڑی علاقائی ریاست (جیسے چول یا راشٹر کوٹ) کے ساتھ جوڑا (Integrate) جارہا تھا۔ یعنی طاقت مرکز سے باہر نہیں جارہی تھی، بلکہ باہر کی طاقتیں مرکز کے ماتحت ایک نظام میں شامل ہورہی تھیں۔

منقسم ریاست کا نمونہ (Segmentary State Model)

ہندوستانی ریاست کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے سب سے زیادہ زیر بحث، مشہور مؤرخ برٹن اسٹین (Burton Stein) کا پیش کردہ نمونہ، منقسم ریاست کا نظریہ ہے۔ اسٹین نے افریقی ماہر بشریات ایڈن ساؤتھ ہال (Aidan Southall)، جس نے افریقہ کے 'الور' (Alur) سماج کا مطالعہ کیا تھا، کے تصور کو ادھار لیا اور اسے جنوبی ہندوستان، خاص طور پر چول سلطنت کی سیاسی ساخت پر منطبق کیا۔ اسٹین کے اس نظریے نے نیل کنٹھ شاستری کے مرکزیت پسند نظریے کی مکمل نفی کی۔ اس نظریے کی بنیادی خصوصیات یہ تھیں:

1. طاقت کے منقسم حلقے (Segmented Circles of Power): اسٹین کے مطابق چول ریاست ایک مرکز کے زیر کنٹرول متحد علاقہ نہیں تھی، بلکہ اسے کثیر المرکزی (Multi-cantered) آزاد حصوں (Segments) میں تقسیم کیا گیا

تھا۔ یہ حصے چول دور میں ناڈو (Nadus) کہلاتے تھے، جو مقامی طور پر مکمل آزاد تھے۔

2. دوہرا اقتدار (Dual Sovereignty): یہ اس ماڈل کا سب سے اہم پہلو ہے۔ اسٹین نے استدلال کیا کہ بادشاہ کے پاس دو طرح کا اقتدار تھا: سیاسی (Political) اور مذہبی یا رسمی (Ritual)۔
3. قلب سلطنت (Core Zones) یعنی راجدھانی تنجاور اور اس کے اطراف جہاں بادشاہ کا براہ راست سیاسی اور فوجی کنٹرول تھا۔
4. درمیانی اور دور دراز کے علاقے (Intermediate and Peripheral Zones): ان علاقوں میں بادشاہ کا سیاسی کنٹرول نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہاں مقامی سردار (Chieftains) انتظامیہ، ٹیکس اور فوج کا نظام چلاتے تھے۔ تاہم، یہ سردار چول بادشاہ کی اعلیٰ مذہبی اور رسمی سیادت (Ritual Sovereignty) کو دل سے تسلیم کرتے تھے۔
5. نوکر شاہی اور فوج کی نوعیت: اسٹین کا دعویٰ تھا کہ چولوں کے پاس کوئی باقاعدہ، منظم افسر شاہی یا مستقل شاہی فوج نہیں تھی۔ انتظامی افسران دراصل مقامی زمیندار تھے، اور فوج کسانوں، سوداگروں اور کاریگروں کے رضاکار دستوں یعنی ملیشیا پر مشتمل تھی جو ہنگامی حالات میں جمع کی جاتی تھی۔
6. مذہبی رسومات کے ذریعے انضمام: چونکہ مرکز کے پاس سیاسی طاقت محدود تھی، اس لیے بادشاہ مقامی سرداروں کو اپنے ساتھ جوڑے رکھنے کے لیے رسومات، دیوتاؤں کے ساتھ اپنی وابستگی اور وسیع مندروں کی تعمیر کا سہارا لیتا تھا۔ راجاراج چول کا برہدیشور مندر دراصل اسی رسمی خود مختاری کے اظہار کا ایک آلہ تھا۔

برٹن اسٹین کے اس نمونے نے جنوبی ہند کی تاریخ نویسی میں اگرچہ انقلاب برپا کیا، لیکن ڈی۔ این جھا (D.N. Jha) اور نوبورو کاراشیما (Noboru Karashima) جیسے مورخین نے اس پر سخت تنقید کی ہے۔ ان کا موقف ہے کہ اسٹین کا ماڈل چول ریاست کی زبردست معاشی اور محصولاتی طاقت کو یکسر نظر انداز کرتا ہے، اور وہ ناڈو کو حقائق سے زیادہ خود مختار پیش کرتا ہے۔ کاراشیما کے شماریاتی مطالعے نے ثابت کیا کہ چول دور میں بادشاہوں نے زمینوں کی پیمائش اور ٹیکس جمع کرنے کا باقاعدہ نظام قائم کر رکھا تھا۔

1.7 سامنتی نظام (Feudal System)

ابتدائی عہد وسطیٰ کی ہندوستانی سیاست کا مطالعہ ہندوستانی جاگیرداری یا سامنتی نظام (Indian Feudalism) کو سمجھے بغیر کسی طور مکمل نہیں ہو سکتا۔ مارکسی تاریخ نویسی، جس کے سرخیل پروفیسر آر۔ ایس شرما (R.S. Sharma) ہیں، نے اپنی مشہور تصنیف *Indian Feudalism: C. 300-1200* میں یہ مدلل نظریہ پیش کیا کہ قدیم ہندوستانی سماج اور معیشت نے عہد وسطیٰ کے اوائل میں ایک ایسی جاگیردارانہ تشکیل کا تجربہ کیا، جو اپنے ڈھانچے میں یورپی جاگیرداری (European Feudalism) سے کافی مشابہت رکھتا تھا۔

ہندوستان میں جاگیردارانہ نظام کے بیج ساتواہن (Satavahana) دور میں بوئے گئے تھے، جب پہلی بار برہمنوں کو ٹیکس سے

مستثنیٰ اراضی کے عطیات دینے کا سلسلہ شروع ہوا۔ گپت دور میں یہ عمل تیز ہوا، اوران عطیات کو اگرہار (Agrahara) یا برہم دیہ (Brahmadeya) کہا جانے لگا۔ تاہم، ابتدائی عہد وسطیٰ (خاص طور پر ہرش کے بعد) میں اس عمل میں ایک بنیادی تبدیلی آئی۔ اب مرکزی حکومتوں نے سکوں کی کمی کے باعث اپنے اعلیٰ سول افسران، فوجی جرنیلوں اور وزراء کو نقد تنخواہیں دینے کے بجائے ان کی خدمات کے معاوضے کے طور پر ان کے زیر کنٹرول زمینیں عطیہ کرنا شروع کر دیں۔ جب بادشاہ کی طرف سے کسی فرد کو زمین دی جاتی تھی، تو اسے صرف اس زمین کا محصول اکھٹا کرنے کا اختیار نہیں دیا جاتا تھا، بلکہ انتظامی اور عدالتی حقوق بھی مکمل طور پر اس زمیندار کو منتقل کر دیے جاتے تھے۔ حکومت کے اہلکاروں کا ان زمینوں پر داخلہ ممنوع قرار دیا گیا۔ اس عمل کے نتیجے میں ریاست کی خود مختاری کمزور پڑ گئی اور طاقت کا مرکز بادشاہ کے دربار سے منتقل ہو کر مقامی جاگیرداروں، جنہیں 'سامنت'، 'مہاسامنت'، یا 'راؤت' کہا جاتا تھا، کے ہاتھوں میں مرتکز ہو گیا۔

سامنتی نظام کی نمایاں خصوصیات

پروفیسر آر۔ ایس شرما کے بیان کردہ ماڈل کے مطابق ہندوستانی سامنتی نظام کی چند بنیادی خصوصیات درج ذیل تھیں:

1. ذیلی جاگیرداری (Sub-infeudation): ایک 'مہاسامنت' یا بڑا جاگیردار، بادشاہ سے زمین حاصل کرنے کے بعد اپنے زیر اثر علاقوں کو مزید چھوٹے جاگیرداروں میں تقسیم کر دیتا تھا تاکہ وہ اس کے لیے فوج مہیا کر سکیں۔ یوں بادشاہ اور اصل کسان کے درمیان بچولیوں (Intermediaries) اور محصول خوروں کی ایک لمبی درجہ بندی (Hierarchy) بن گئی، جس کا سارا معاشی بوجھ کسان کو اٹھانا پڑتا تھا۔
2. کسانوں کی غلامی (Serfdom): جاگیرداری نظام کا سب سے تاریک پہلو کسانوں کا استحصال تھا۔ جب زمین کسی نئے مالک کو عطیہ کی جاتی تو اس زمین پر کام کرنے والے کسان بھی نئے مالک کی ملکیت تصور کیے جاتے تھے۔ کسانوں کو اپنی زمین چھوڑ کر جانے کی آزادی نہیں تھی اور انہیں اپنے جاگیردار کے کھیتوں پر بغیر معاوضے کے جبری مشقت جسے وشٹی (Vishti) یا بیگار کہا جاتا تھا، کرنی پڑتی تھی۔
3. معاشی گراوٹ اور شہروں کا زوال (Urban Decay): آر۔ ایس شرما کی تحقیق کے مطابق، 600 سے 1000 عیسوی کے درمیان بیرونی تجارت کو زبردست دھچکا لگا۔ رومی سلطنت کے زوال اور عربوں کے عروج نے پرانے تجارتی راستوں کو مسدود کر دیا۔ سکوں کا چلن انتہائی کم ہو گیا اور تجارت کے زوال کی وجہ سے شہر ویران ہو گئے۔ پوری معیشت ایک بند دیہی معیشت (Closed Village Economy) میں تبدیل ہو گئی، جہاں ہر گاؤں صرف اپنی ضرورت کے مطابق چیزیں پیدا کرتا تھا اور مقامی ضروریات، مقامی دستکاروں (Jajmani System) کے ذریعے پوری کی جاتی تھیں۔
4. سیاسی لامرکزیت: سیاسی طور پر، بادشاہ کی طاقت محض نام کی رہ گئی تھی۔ بادشاہ کا انحصار اپنے انہی سامنتوں پر ہو گیا تھا کہ وہ جنگ کے وقت اپنی ذاتی فوج لے کر اس کی مدد کو آئیں گے۔ سامنتوں نے رفتہ رفتہ بادشاہ کے مقابلے میں اتنی طاقت حاصل کر لی کہ وہ اپنے علاقوں میں آزادانہ فرمانروائی کرنے لگے۔

ہندوستانی جاگیرداری کے اس نظریہ پر ہربنس مکھیا(Harbans Mukhia)،بی۔ڈی۔چٹوپادھیائے اور ڈی۔سی سرکار جیسے مورخین نے سخت تنقید کی ہے۔ ہربنس مکھیا کا استدلال ہے کہ ہندوستان کی زرخیز زمین اور موسمی حالات کے باعث یہاں کے کسانوں کا استحصال اس حد تک ممکن نہیں تھا جیسا یورپ میں ہوا اور ہندوستان میں کسان ہمیشہ پیداوار کے عمل پر کنٹرول رکھتا تھا۔ دوسری طرف،بی۔ ڈی۔چٹوپادھیائے نے شہروں کے زوال کے دعوے کو رد کرتے ہوئے آثار قدیمہ کی بنیاد پر ثابت کیا ہے کہ نویں صدی کے بعد ہندوستان میں تجارتی سرگرمیاں دوبارہ عروج پر تھیں اور نئے شہری مراکز ابھر رہے تھے۔ تاہم،ان تمام تنقیدوں کے باوجود اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ابتدائی عہد وسطیٰ کا سیاسی ڈھانچہ سامنتوں کی موجودگی اور ان کی لامحدود طاقت پر ٹکا ہوا تھا۔

1.8 انتظامیہ وفوج (Administration and Military)

ابتدائی عہد وسطیٰ میں حکومتی اور فوجی انتظامات میں ہمیں دو متضاد رجحانات ملتے ہیں۔ایک طرف شاہی خطابات اور دعوے بہت شاندار اور دیومالائی ہو گئے تھے، تو دوسری طرف زمینی سطح پر بادشاہوں کے اصل اختیارات بہت محدود اور جاگیرداروں کے محتاج تھے۔ ریاست کا نظریاتی سربراہ ابھی بھی بادشاہ ہوتا تھا،جو خود کو ماتحت راجاؤں سے برتر ثابت کرنے کے لیے مہاراج ادھیراج (بادشاہوں کا بادشاہ)، پرم بھٹارک،اور پرمیشور جیسے پر شکوہ القابات اختیار کرتا تھا۔ دربار میں اعلیٰ عہدیداروں کی ایک مجلس ہوتی تھی جس میں مہاماتیہ (وزیر اعلیٰ)، سندھی و گراہک (وزیر برائے جنگ و امن)،اور اکشپٹلک (خزانچی اور ریکارڈ کیپر) نمایاں تھے۔ انتظامی سہولت کے لیے پوری سلطنت کو صوبوں میں تقسیم کیا گیا تھا، جنہیں شمالی ہندوستان میں عموماً بھکتی(Bhukti)اور جنوب میں منڈلم(Mandalam) کہا جاتا تھا۔صوبے اضلاع میں منقسم تھے جنہیں وشیہ(Vishaya) یا ناڈو(Nadu) کہا جاتا تھا،اور سب سے نچلی اکائی گاؤں (گرام/اُر) ہوتا تھا۔

دیہی اور مقامی خودمختاری (Rural and Local Self Government)

اس دور کی سب سے شاندار اور بے مثال انتظامی خصوصیت جنوبی ہندوستان، بالخصوص چول سلطنت کے تحت مقامی خودکار حکومتوں (Local Self-Government) کا قیام تھا۔ چول بادشاہوں نے مقامی انتظامیہ میں مداخلت کرنے کے بجائے اسے انتہائی منظم اور جمہوری انداز میں کام کرنے کی آزادی دی۔ اس دور کے کتبات، خصوصاً پرانتک اول کے اترامیور کتبات سے ہمیں گاؤں کے جمہوری ڈھانچے کی انتہائی شاندار اور تفصیلی معلومات ملتی ہیں۔ مقامی انتظامیہ بنیادی طور پر دو قسم کی اسمبلیوں پر مشتمل تھی:

1. اُر(Ur): یہ ان گاؤں کے عام لوگوں، کسانوں،اور غیر برہمنوں کی اسمبلی تھی جہاں زمین کی مشترکہ ملکیت عام لوگوں کے پاس ہوتی تھی۔
2. سبھا(Sabha) یا مہاسبھا: یہ خصوصی طور پر برہمنوں کو عطیہ کیے گئے گاؤں (برہمدیہ) کی اسمبلی تھی۔

اترامیور کتبات بتاتے ہیں کہ سبھا مختلف کمیٹیوں یعنی واریام(Variyam) کے ذریعے کام کرتی تھی۔ان کمیٹیوں میں آبپاشی کمیٹی، ٹیکس کمیٹی اور انصاف کی کمیٹی شامل تھی۔ سبھا کے اراکین کے انتخاب کے لیے باقاعدہ اہلیت مقرر تھی، جس میں ایک خاص حد تک

اراضی کی ملکیت، ویدوں کا علم اور اخلاقی کردار شامل تھا۔ بدعنوانی یا حسابات میں خرد برد کرنے والوں کو الیکشن لڑنے کے لیے نااہل قرار دیا جاتا تھا۔ نمائندوں کا انتخاب لاٹری یا پرچی کے نظام یعنی کداوولائی (Kudavolai) کے ذریعے ہوتا تھا۔ یہ اسمبلیاں اپنے علاقے کے جھگڑے نمٹانے، تالابوں کی کھدائی اور مندروں کی دیکھ بھال میں مکمل آزاد تھیں، جو سلطنت کے وفاقی اور جمہوری مزاج کی عکاسی کرتی ہیں۔

فوجی تنظیم (Military Organization)

فوجی لحاظ سے، قدیم دور کی مضبوط، مستقل اور مرکزی شاہی فوج کی جگہ اب سامنتی فوج (Feudatory Levies) نے لے لی تھی۔ بادشاہ کی اپنی مستقل فوج بہت چھوٹی ہوتی تھی اور جنگ کے وقت بادشاہ اپنے تمام ماتحت سامنتوں، راجپوت سرداروں، اور جاگیرداروں کو طلب کرتا تھا۔ ہر سردار اپنے اپنے دستے لے کر شاہی کیمپ میں جمع ہوتا تھا۔ اس جاگیردارانہ فوجی نظام کا سب سے بڑا نقصان یہ تھا کہ اس میں یکسانیت، مشترکہ مقاصد اور نظم وضبط کا فقدان ہوتا تھا۔ ہر فوجی دستہ ریاست کے بجائے صرف اپنے مقامی سردار کا وفادار ہوتا تھا۔ میدانِ جنگ میں اگر کوئی ایک سردار ناراض ہو کر واپس لوٹ جاتا یا مارا جاتا، تو باقی فوج کا حوصلہ بھی ٹوٹ جاتا۔ اس دور میں رتھوں (Chariots) کی اہمیت ختم ہو گئی اور ان کی جگہ تیز رفتار گھڑ سوار فوج (Cavalry) نے لے لی۔ اگرچہ راجپوتوں اور دیگر ہندوستانی ریاستوں نے جنگی ہاتھیوں پر اپنا انحصار بہت حد تک برقرار رکھا۔ تاہم جب گیارہویں اور بارہویں صدی میں وسطی ایشیا کے منظم اور برق رفتار ترک گھڑ سوار دستوں نے ہندوستان پر حملہ کیا تو راجپوتوں کی یہ بکھری ہوئی جاگیردارانہ فوجیں ان کی جدید فوجی تدابیر کا مقابلہ نہ کر سکیں، جس کے نتیجے میں ہندوستان کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

1.9 سیاسی میراث (Political Legacy)

ہندوستانی تاریخ میں ابتدائی عہد وسطیٰ کی سیاسی میراث انتہائی گہرے، پیچیدہ اور دور رس اثرات کی حامل ہے۔ اس چھ سو سالہ دور نے آنے والے عہد وسطیٰ کے ہندوستان کے خدوخال مرتب کیے۔ اس میراث کو درج ذیل نکات کے تحت سمجھا جا سکتا ہے۔ سیاسی لامرکزیت اور علاقائی درباروں کے قیام کا سب سے مثبت اور پائیدار پہلو یہ تھا کہ مختلف جغرافیائی خطوں کو اپنی مقامی ثقافت، فنون اور زبان کو پروان چڑھانے کا موقع ملا۔ آج کے ہندوستان کی کئی جدید زبانیں (جیسے مراٹھی، بنگالی، کنڑ، تلگو، گجراتی) دراصل اسی دور کے مقامی سامنتوں اور علاقائی راجاؤں کی سرپرستی میں سنسکرت کے غلبے سے نکل کر پروان چڑھیں۔

اس دور میں چونکہ مقامی سرداروں کے پاس اقتدار تو تھا لیکن انہیں عوامی سطح پر قانونی جواز (Legitimacy) درکار تھا، اس لیے انہوں نے اپنی سیاسی حیثیت کو جائز قرار دینے کے لیے برہمنوں، پروہتوں اور مندروں کا بے دریغ سہارا لیا۔ اسی دور میں بڑے بڑے اور عظیم الشان مندر جیسے کھجوراہو کے مندر، تنجاور کا بریدیشور مندر، اور اڑیسہ میں بھونیشور اور پوری کے مندر تعمیر ہوئے۔ یہ مندر محض جائے عبادت نہیں تھے بلکہ یہ سیاسی طاقت، ریاست کی دولت کی نمائش، اور زرعی و معاشی سرگرمیوں کے اعصابی مراکز بن گئے۔ سامنتی نظام، راجپوت سلطنتوں کی باہمی خانہ جنگی، قنوج کی طویل سہ طرفہ جدوجہد میں وسائل کے زیاں اور ایک مرکزی طاقت کی عدم موجودگی نے

ہندوستان کی شمال مغربی سرحدوں کو مکمل طور پر غیر محفوظ کر دیا تھا۔ محمود غزنوی کے تابڑ توڑ حملوں اور بعد ازاں شہاب الدین غوری کے ہاتھوں ترائن کی جنگوں (1191-1192 عیسوی) میں راجپوت سلطنتوں کی شکست اسی سیاسی تقسیم اور ناقص جاگیر دارانہ فوجی تنظیم کا براہ راست نتیجہ تھی۔ ابتدائی عہد وسطیٰ کا جاگیر دارانہ ڈھانچہ اچانک ختم نہیں ہوا۔ بعد میں آنے والے مسلمان فاتحین نے بھی مقامی ہندوستانی حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے اسی سامنتی ڈھانچے کو اپنی ضرورت کے مطابق ڈھال لیا۔ دہلی سلطنت کا اقطاع نظام (Iqta System) جس میں امراء کو زمینیں دی جاتی تھیں اور بعد ازاں وجے نگر سلطنت کا نایکارا نظام (Nayankara System) دراصل اسی جاگیر دارانہ اور منقسم ڈھانچے کی بدلی ہوئی اور بہتر شکلیں تھیں جس کی بنیاد ابتدائی عہد وسطیٰ میں رکھی گئی تھی۔

1.10 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

ابتدائی عہد وسطیٰ (600 تا 1200 عیسوی) ہندوستانی تاریخ کا ایک انتہائی متحرک، کثیر جہتی اور تبدیلیوں سے بھرپور دور تھا۔ ہرش وردھن کی موت کے ساتھ ہی ایک عظیم سیاسی وحدت اور قدیم سلطنتوں کی مرکزیت کا تصور ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا، اور شمالی و جنوبی ہندوستان بے شمار چھوٹی اور بڑی علاقائی سلطنتوں کے درمیان تقسیم ہو گیا۔ ان طاقتوں کے درمیان، خاص طور پر قنوج کے حصول کے لیے ہونے والی سہ طرفہ جدوجہد نے سیاسی عدم استحکام اور وسائل کے بے جا زیاں میں اضافہ کیا۔ اس دور میں ریاست کی نوعیت پر مورخین کے درمیان زبردست علمی اور نظریاتی بحثیں ہوئیں۔ جہاں ایک طرف آر۔ ایس شرما سے سامنتی نظام (Indian Feudalism) کا دور قرار دیتے ہیں، جس میں کسانوں کا استحصال ہوا، شہر ویران ہوئے اور سیاسی طاقت ماتحت جاگیرداروں (سامنتوں) میں بٹ گئی؛ وہیں دوسری طرف برٹن اسٹین نے جنوبی ہندوستان کی ریاستوں کو منقسم ریاست (Segmentary State) قرار دے کر یہ ثابت کیا کہ ریاست کی تقسیم ناڈو میں تھی اور مرکزی کنٹرول سیاسی کے بجائے محض مذہبی اور رسمی (Ritual) نوعیت کا تھا۔ بی۔ ڈی۔ چٹوپادھیائے جیسے جدید مورخین اسے زوال کے بجائے قبائل اور بنجر زمینوں کے ریاستی دھارے میں انضمام (Integration) کا دور تسلیم کرتے ہیں۔ چاہے اسے جاگیرداری کہا جائے، منقسم ریاست، یا انضمامی ریاست، یہ تاریخی حقیقت ہے کہ اس دور میں اقتدار اعلیٰ درباروں سے نکل کر مقامی زمینداروں اور سرداروں کے ہاتھوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ فوج کا ڈھانچہ سامنتی تھا جو ہنگامی صورتحال میں اور بیرونی حملہ آوروں کے سامنے انتہائی کمزور ثابت ہوا۔ بہر حال، ان تمام سیاسی خامیوں اور انتشار کے باوجود، یہ دور ہندوستان میں زراعت کی توسیع، مقامی اسمبلیوں (جیسے چول دور کی سبھا اور اُر) کے قیام، علاقائی زبانوں و ثقافتوں کے ظہور اور عظیم الشان دراوڑی اور ناگر طرز کے فن تعمیر کا سنہری دور ثابت ہوا۔ اسی دور کے بطن سے ان لسانی، ثقافتی اور معاشرتی اکائیوں نے جنم لیا جنہوں نے جدید ہندوستان کے تکثیری سماج اور تنوع کی مضبوط بنیاد رکھی۔

1.11 کلیدی الفاظ (Keywords)

سامنتی نظام: اراضی کے عطیات پر مبنی جاگیر دارانہ نظام، جس نے ریاست میں لامرکزیت پیدا کی اور مقامی سامنتوں کو طاقتور بنایا۔

سہ طرفہ جدوجہد: قنوج پر بالادستی کے لیے پال، پرتیہار، اور راشٹر کوٹ سلطنتوں کے درمیان دو صدیوں تک جاری رہنے والی طویل جنگ۔

منقسم ریاست: برٹن اسٹین کا نظریہ جس کے مطابق ریاست طاقت کے مختلف آزاد حصوں میں منقسم ہوتی ہے، جہاں بادشاہ کا کنٹرول سیاسی کے بجائے محض مذہبی اور رسمی ہوتا ہے۔

منڈلم اور ناڈو: چول سلطنت اور جنوبی ہندوستان کے علاقائی انتظامی یونٹ (صوبے اور اضلاع)۔

سبھا اور اُر: چول دور کی دیہی اسمبلیاں؛ اُر عام لوگوں کی جبکہ سبھا برہمنوں کی نمائندہ اسمبلی تھی جو آزادانہ مقامی انتظامیہ چلاتی تھی۔

اگنی کل: راجپوتوں کی ابتدا اور ان کے چھتری بنانے کا نظریہ، جس کے مطابق ان کے آباؤاجداد اگنی کنڈ سے پیدا ہوئے تھے۔

وشٹی: کسانوں کے ذریعے زمینداروں کے لیے کی جانے والی جبری اور بلا معاوضہ مشقت (بیگار)۔

کدا وولائی: چول دیہی اسمبلی (سبھا) کے نمائندوں کے انتخاب کے لیے استعمال ہونے والا لاٹری کا نظام۔

1.12 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

1.12.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. کشمیر کی تاریخ پر مبنی مشہور سنسکرت تصنیف 'راج ترنگنی' کا مصنف کون ہے؟

(a) بان بھٹ (b) البیرونی (c) پنڈت کلہن (d) سلیمان تاجر

2. ابتدائی عہد وسطیٰ میں لڑی جانے والی 'سہ طرفہ جدوجہد' (Tripartite Struggle) کا بنیادی مقصد کس شہر پر مستقل تسلط قائم کرنا تھا؟

(a) پاٹلی پتر (b) قنوج (c) تھانیسر (d) تنجاور

3. مورخ برٹن اسٹین (Burton Stein) نے جنوبی ہندوستان، خاص طور پر چول سلطنت کی ریاستی ساخت کو سمجھنے کے لیے کون سا نظریہ پیش کیا تھا؟

(a) مرکزیت پسند نمونہ (b) ریاستی انضمام کا نمونہ (c) منقسم ریاست کا نمونہ d)) سامنتی نظام

4. چول سلطنت کی دیہی اسمبلی (سبھا) کے نمائندوں کے انتخاب کے لیے استعمال ہونے والے لاٹری یا پرچی کے نظام کو کیا کہا جاتا تھا؟

(a) وشٹی (b) کدا وولائی (c) ناڈو (d) اگنی کل

5. کتاب "Indian Feudalism" لکھ کر ہندوستان میں جاگیرداری یا سامنتی نظام کا مدلل نظریہ کس مورخ نے پیش کیا؟

(a) آر۔ایس شرما (b) ہربنس مکھیا (c) بی۔ڈی چٹوپادھیائے (d) کے اے نیل کنٹھ شاستری

1.12.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. بان بھٹ کی تصنیف 'ہرش چرت' اور پنڈت کلہن کی 'راج ترنگنی' کی تاریخی اہمیت میں کیا بنیادی فرق ہے؟
2. راجپوتوں کے ظہور سے متعلق 'اگنی کل' (Agnikula) کا نظریہ کیا ہے؟

3. چول سلطنت کی دیہی انتظامیہ کے حوالے سے 'اُر'(Ur)اور 'سبھا'(Sabha)میں کیا فرق تھا؟

1.12.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. قنوج کے حصول کے لیے لڑی جانے والی 'سہ طرفہ جدوجہد' کے اسباب اور اس کے تباہ کن نتائج کا تفصیلی تجزیہ کریں۔
2. پروفیسر آر۔ایس شرما کے بیان کردہ ماڈل کے مطابق ہندوستانی سامنتی نظام(Indian Feudalism)کی نمایاں خصوصیات کیا تھیں؟

اکائی 2۔ پال اور پرتی ہار خاندان

(Palas, and Pratiharas)

اکائی کے اجزا

2.0 تمہید

2.1 مقاصد

2.2 پال خاندان کے حکمراں

2.2.1 گوپال اول

2.2.2 دھرم پال

2.2.3 دیو پال

2.2.4 درمیانی دور

2.2.5 مہی پال اول

2.2.6 رام پال

2.3 پال خاندان کا زوال

2.4 انتظام حکومت

2.5 پرتی ہار حکمراں

2.5.1 ناگ بھٹ اول

2.5.2 وتس راج

2.5.3 ناگ بھٹ دوم

2.5.4 مہر بھوج اول

2.5.5 مہیندر پال اول

2.5.6 مہی پال اول

2.6 سہ طرفہ جدوجہد اور زوال

2.7 اکتسابی نتائج
2.8 کلیدی الفاظ
2.9 نمونہ امتحانی سوالات

2.0 تمہید (Introduction)

ساتویں سے بارہویں صدی عیسوی تک کا عرصہ، جسے مورخین ابتدائی عہدِ وسطیٰ کے نام سے جانتے ہیں، ہندوستانی تاریخ کا ایک ایسا دور ہے جس میں عظیم حکمران ہرش وردھن کی موت کے بعد شمالی ہندوستان میں کوئی بڑی مرکزی طاقت باقی نہ رہی۔ اس خلا کو پر کرنے اور پورے شمالی ہندوستان پر حکمرانی کے خواب دیکھنے والی متعدد چھوٹی بڑی علاقائی ریاستیں ابھریں، جن کا اصل ہدف قنوج پر قبضہ کرنا تھا۔ ہرش کے زمانے سے ہی قنوج اقتدار اور بالادستی کی علامت بن چکا تھا۔ اسی اہمیت کے پیشِ نظر اس دور کی تین عظیم سیاسی طاقتوں—مشرقی ہندوستان کے پال، مغربی ہندوستان کے پرتی ہار، اور جنوبی ہندوستان کے راشٹر کوٹ کے درمیان قنوج پر تسلط کے لیے ایک طویل اور تاریخی جدوجہد ہوئی جسے تاریخ میں 'سہ طرفہ جدوجہد (Tripartite Struggle)' کہا جاتا ہے۔ اس اکائی کا بنیادی مقصد خاص طور پر پال اور پرتی ہار خاندانوں کے سیاسی پس منظر اور ان کی تاریخ کا جائزہ لینا ہے۔

مغربی اور شمالی ہندوستان میں ابھرنے والی پرتی ہار ریاست (جسے گرجر پرتی ہار بھی کہا جاتا ہے) نے راجستھان اور مالوہ سے اپنی طاقت کو وسعت دی۔ انہوں نے شمالی ہندوستان کے بڑے حصے پر اپنا اثر و رسوخ قائم کیا اور علاقائی توسیع و بالادستی کے لیے پالوں، کلچوریوں، چندیلوں اور راشٹر کوٹوں جیسی ہمعصر طاقتوں سے مسلسل جنگیں لڑیں۔ اگرچہ قنوج کے حصول کی کوششوں میں انہیں جنوبی ہند کے راشٹر کوٹوں کے ہاتھوں کئی بار شکست کا سامنا بھی کرنا پڑا، لیکن وہ اپنی سیاسی اہمیت برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔ پرتی ہار سلطنت کو ان کی جنگی فتوحات کے ساتھ ساتھ فنون لطیفہ، شاندار مجسمہ سازی اور مندروں کی تعمیر کے لیے بھی خصوصی طور پر جانا جاتا ہے۔ اپنے رقبے میں اتار چڑھاؤ کے باوجود یہ سلطنت آٹھویں سے گیارہویں صدی تک شمالی ہندوستان کی سیاست پر حاوی رہی۔

دوسری جانب مشرقی ہندوستان (بنگال اور بہار) میں پال سلطنت کے عروج سے قبل کا دور زبردست سیاسی کشمکش کا شکار تھا۔ گپت سلطنت کے زوال کے بعد مگدھ پر 'آخر گپت (Later Guptas)' خاندان کا قبضہ تھا، جن کا عظیم گپت خاندان سے نام کے سوا کوئی تعلق نہ تھا۔ اس خاندان نے قنوج کے موکھریوں کے ساتھ طویل دشمنی مول لی۔ پشیہ بھوتی خاندان کے ہرش وردھن نے کچھ عرصے کے لیے مگدھ میں ان کی حکومت کو اپنے ماتحت کے طور پر بحال کیا، لیکن ہرش اور اس کے ہمعصر بنگال کے آزاد حکمران ششانک کی موت (637 عیسوی) کے بعد اس خطے میں کوئی مضبوط طاقت نہ بچی۔ لگ بھگ ایک صدی تک بنگال اور بہار سیاسی اتھل پتھل کا شکار رہے؛ قنوج کے یشوورمن، کشمیر کے للتادتیہ، کامروپ کے حکمرانوں اور یہاں تک کہ تبتی و چینی فوجوں نے اس علاقے پر حملے کیے۔ بالآخر تقریباً 750 عیسوی میں یشوورمن کے ہاتھوں آخر گپتوں کے آخری حکمران جیویت گپت دوم کی شکست کے بعد خطے میں مکمل انتشار اور بدامنی پھیل گئی جسے

تاریخ میں 'متسیہ نیائے' (جنگل راج) کے نام سے جانا جاتا ہے۔

اسی سنگین بدامنی اور انتشار کا خاتمہ کرنے کے لیے 750 عیسوی میں بنگال کی عوام نے متفقہ طور پر ایک سپاہی کے بیٹے 'گوپال' کو اپنا حکمران منتخب کیا۔ دھرم پال کے 'کھالم پور' تانبے کے کتبے میں اس تاریخی انتخاب کا واضح ذکر ملتا ہے، جس نے بنگال میں ایک عظیم اور مستحکم 'پال سلطنت' کی بنیاد رکھی۔ 'پال' سنسکرت کا لفظ ہے جس کا مطلب 'محافظ' ہے اور اس خاندان کے تمام حکمران اپنے نام کے ساتھ یہی لفظ استعمال کرتے تھے۔ بدھ مذہب (خاص طور پر تانترک اور مہایان مکاتب فکر) کے ماننے والے ان پال حکمرانوں نے آٹھویں سے بارہویں صدی عیسوی تک، یعنی لگ بھگ چار صدیوں تک بنگال اور بہار کے وسیع علاقوں پر شاندار حکومت کی۔ ان کی ریاست میں وکرم پور، پاٹلی پتر، گوڑ، منگیر، سوم پور، رام وتی اور تامرلپتی جیسے اہم شہر شامل تھے۔ گوپال کے اس انتخاب نے نہ صرف مشرقی ہندوستان کو استحکام بخشا بلکہ دیکھتے ہی دیکھتے پالوں کو شمالی ہندوستان کی ایک ایسی عظیم طاقت بنا دیا جو اقتدار کی دوڑ میں دیگر بڑی سلطنتوں کے مدمقابل کھڑی تھی۔

2.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- پال خاندان کی ابتدا اور اس کے عروج و زوال کے بارے میں جان سکیں گے۔
- پال خاندان کے حکمرانوں کے بارے میں معلومات حاصل کر سکیں گے۔
- سہ طرفہ جدوجہد میں پال خاندان کے کردار کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- پرتی ہار خاندان کی ابتدا سے واقف ہو سکیں گے۔
- عظیم پرتی ہار حکمراں ناگ بھٹ اول اور مہر بھوج کے کارناموں کو جان سکیں گے۔
- پرتی ہاروں کے دور میں مذہبی، ادبی اور ثقافتی ترقی کے بارے میں جان سکیں گے۔

2.2 پال خاندان کے حکمراں (Rulers of the Pala Dynasty)

2.2.1 گوپال اول (Gopala-I)

پال حکومت کو بدھ مذہب کے پیروکار گوپال (770-750ء) نے قائم کیا۔ بنگال کے جاگیرداروں نے بنگال کی سیاسی کشمکش اور بدامنی کو ختم کرنے کے لیے گوپال کی قابلیت سے متاثر ہو کر اسے اپنا حکمران منتخب کیا۔ ان جاگیرداروں نے ریاست کے مفاد کے لیے اپنے ذاتی فائدوں کو ایک طرف رکھ دیا۔ تبتی مورخ تاراناتھ کے مطابق گوپال، پنڈرورد ھن (بوگرہ ضلع) کے ایک چھتری خاندان میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے جنگ کے ذریعے بنگال کو متحد کیا اور ایک مضبوط ریاست اور تنظیم کی بنیاد رکھی۔

2.2.2 دھرم پال (Dharmapala)

گوپال کا بیٹا دھرم پال (770-810ء) ایک نہایت لائق حکمراں ثابت ہوا اور اس نے بنگال کو شمالی ہندوستان کی اہم ریاستوں میں جگہ دلائی۔ دھرم پال کے دور میں شمالی ہندوستان میں قنوج پر قبضے کے لیے سہ طرفہ جدوجہد کی زمین تیار ہو چکی تھی۔ اسی سلسلے میں دھرم پال کا سامنا پرتی ہار حکمراں وتس راج سے ہوا جس کے ہاتھوں اسے شکست کھانی پڑی۔ وتس راج کی یہ فتح چند روزہ ثابت ہوئی، کیونکہ اسے راشٹر کوٹ حکمران دھرو کے ہاتھوں ہار کا منہ دیکھنا پڑا۔ راشٹر کوٹوں کے ہاتھوں پرتی ہاروں کی شکست سے دھرم پال نے فائدہ اٹھایا اور قنوج پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اس نے قنوج کے حکمران اندرایودھ کو ہٹا کر اس کی جگہ ایک کٹھ پتلی حکمراں چکرایودھ کو اپنی ماتحتی میں قنوج کا حکمراں بنایا اور اس طرح اپنے اقتدار اعلیٰ کا اعلان کیا۔ دھرم پال کے ذریعے منعقد کردہ اس دربار میں کئی ماتحت جاگیر دار حکمراں شامل



تصویر 3.1۔ وکرم شلا کے بدھ مہاوہار کے باقیات، انتی چک، بھاگل پور ضلع، بہار
Courtesy: Prataparya, https://en.wikipedia.org/wiki/Vikramashila#/media/File:Vikramshila_2012-08-10-17.14.08.jpg

ہوئے۔ دھرم پال کی حکمرانی کا بنیادی علاقہ بنگال اور بہار تھا۔ یہ علاقے براہ راست اس کی عملداری میں تھے۔ اس کے باہر قنوج کی ریاست اس کے زیر اثر تھی۔ علاوہ ازیں مغرب اور جنوب میں پنجاب کے حکمراں، مغربی پہاڑی علاقوں کے سردار، راجپوتانہ، مالوہ اور برار نے اس کے اقتدار کو تسلیم کیا۔ اس کے علاوہ بھی شمالی ہند کی متعدد چھوٹی چھوٹی ریاستوں نے اس کی برتری کا اعتراف کیا۔ سوینبھو پران (Suvayanbhu Purana) میں دی گئی تفصیلات کے مطابق نیپال بھی اس کی ایک ماتحت ریاست تھی۔ یہ کوئی اتفاق نہیں ہے کہ گیارہویں صدی کے ایک گجراتی شاعر 'سوڈھل' نے دھرم پال کو 'اتراپتھ سوامن' کہا ہے۔ اگر تبت کے مآخذ کو تسلیم کریں تو وکرم شلا کے بدھ مہاوہار (انتی چک، بھاگل پور ضلع، بہار) کی تعمیر دھرم پال نے ہی کروائی تھی۔ اس کے علاوہ واریندر کا سومپوری مہاوہار بھی اسی نے بنوایا تھا، جس کے قدیم باقیات راج شاہی ضلع کے پہاڑپور میں پائے گئے ہیں۔ اودنت پوری مہاوہار (بہار) کی تعمیر بھی تبتی متون میں دھرم پال سے منسوب کی جاتی ہے، حالانکہ دوسرے مآخذ کے مطابق اس کی تعمیر گوپال یا دیوپال نے کی تھی۔

اتناسب کچھ ہونے کے بعد بھی دھرم پال کی یہ فتح دیرپا ثابت نہیں ہوئی۔ کچھ ہی عرصے بعد وتس راج کے بیٹے ناگ بھٹ دوم نے قنوج کی گدی سے چکرایدھ کو بے دخل کرکے دھرم پال کے اقتدار کو چنوتی دی۔ قنوج پر قبضہ کرنے کے بعد پرتی ہار ناگ بھٹ پال ریاست کی راجدھانی منگیر کی طرف بڑھا۔ ادھر دھرم پال بھی اپنا لشکر لے کر مقابلے کے لیے تیار تھا۔ منگیر کے قریب دونوں میں ایک گھماسان جنگ ہوئی جس میں دھرم پال نے شکست کھائی۔ مجبور ہو کر دھرم پال کو راشٹر کوٹ حکمراں گووند سوم سے مدد طلب کرنا پڑی۔ گووند سوم نے شمالی ہند کے لیے کوچ کیا اور حملہ کرکے ناگ بھٹ دوم کو شکست دی۔ راشٹر کوٹ دستاویزوں سے پتہ چلتا ہے کہ چکرایدھ اور دھرم پال دونوں نے راشٹر کوٹوں کی بالادستی تسلیم کی۔ گووند سوم کے واپس دکن کوچ کرنے کے بعد پرتی ہار طاقت کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دھرم پال نے نہ صرف کھوئے ہوے سابقہ علاقے واپس حاصل کر لیے، بلکہ قنوج کے ساتھ ساتھ شمالی ہند کے کافی بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے پرمیشور، پرم بھٹارک، مہاراج دھراج دھرم پال کا عظیم لقب اختیار کیا۔

2.2.3 دیوپال (Devapala)

دھرم پال کا بیٹا دیوپال (850-810ء) اپنے باپ کی طرح ہی قابل اور اولوالعزم حکمراں تھا۔ پال ریاست کو منظم رکھنے کے ساتھ ہی اس نے لگاتار جنگوں کے ذریعے اپنی ریاست کو وسعت دی۔ اس نے پرتی ہار حکمراں ناگ بھٹ دوم کو قنوج سے کھدیڑنے میں کامیابی حاصل کی، جس نے دھرم پال کی موت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دوبارہ قنوج پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد دیوپال نے شمالی ہند میں مزید فتوحات حاصل کیں۔ اسے پال حکمرانوں میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اس کے جانشینوں کے کتبوں کے مطابق اس نے شمال میں ہمالیہ اور جنوب میں وندھیاچل تک حملہ کیا تھا۔ حالانکہ جدید مورخین کے مطابق یہ بیان پالوں کی جنگی طاقت کو دیکھتے ہوئے کافی مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے۔ اپنی مہمات کے دوران اس نے پراگ جیوتش (موجودہ آسام) پر حملہ کیا اور یہاں بغیر کسی خاص مزاحمت کے فتح حاصل کی۔ اس کے بعد اتکل (موجودہ اڑیسہ) کی طرف کوچ کیا۔ وہاں کا حکمراں دیوپال کے آنے کی خبر سن کر اپنی راجدھانی چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ اس طرح وقتی طور پر آسام اور اڑیسہ، پال ریاست کے ماتحت ہو گئے۔ ایسا پتہ چلتا ہے کہ پرتی ہار ناگ بھٹ کو ہرانے کے بعد دیوپال نے ہنوں کے خلاف پنجاب اور کمبوج میں بھی فوجی مہم چلائی تھی۔ دھرم پال اور دیوپال کی تبت سے بھی جنگوں کا ذکر کتبوں میں ملتا ہے، لیکن یہ صرف چھوٹی موٹی جھڑپوں سے بڑھ کر کچھ نہیں رہی ہونگی، کیونکہ کوئی بھی ہمالیہ کی عظیم چوٹیوں کو پار کرکے دوسرے کے ملک پر قبضہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ ناگ بھٹ دوم کے علاوہ اس نے مہر بھوج کو بھی شکست دی تھی۔ عرب سیاح سلیمان نے دیوپال کو پرتی ہار اور راشٹر کوٹ دونوں سے زیادہ طاقتور مانا ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ بنگال کو شمالی ہند کی ہمعصر سیاست میں ایک معزز مقام دلانے کا سہرا دھرم پال اور دیوپال کے سر ہے۔

2.2.4 درمیانی دور (The Interregnum)

دیوپال کی موت کے بعد اس کے سب سے بڑے بیٹے راجیہ پال نے گدی سنبھالی۔ راجیہ پال کے مرنے کے بعد اس کا سب سے بڑا لڑکا مہندر پال حکمراں بنا۔ ایسا تسلیم کیا جاتا ہے کہ ان دونوں نے ورثے میں ملی عظیم ریاست کو قائم رکھا اور غالباً مہندر پال نے تواتکلوں اور

ہنوں کے حملوں کا کامیابی کے ساتھ سامنا بھی کیا۔ مہندر پال کا چھوٹا بھائی شور پال اول اس کا جانشیں بنا۔ شور پال کے مرزاپور تانبے کے کتبے سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کی حکومت بنگال، بہار اور اتر پردیش تک پھیلی ہوئی تھی۔ شور پال اول کے بیٹے گوپال دوم کے دور حکومت سے متعلق کوئی جانکاری نہیں ملتی اور اس کی موت کے ساتھ ہی دھرم پال کے خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔

اس کے بعد پال ریاست کا تخت، دھرم پال کے چھوٹے بھائی واک پال کے خاندان کو ہاتھ آیا، جس کے ساتھ ہی آہستہ آہستہ ریاست کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ واک پال کے پوتے وگرہ پال اول نے ایک مختصر حکومت کے بعد گدی چھوڑ دی اور جوگی بن گیا۔ وگرہ پال کا بیٹا نارائن پال اول ایک کمزور حکمراں ثابت ہوا۔ اس کے 54 سالہ طویل دور حکومت کے دوران پرتی ہار حکمراں مہر بھوج نے پالوں کو شکست دی۔ پال ریاست کی کمزوری ظاہر ہوتے ہی پراگ جیوتش (موجودہ آسام) اور اتکل (موجودہ اڑیسہ) کی ریاستیں خود مختار ہو گئیں۔ نارائن پال کے بیٹے راجیہ پال کی حکومت تقریباً 32 سال تک رہی۔ اس نے عوام کی سہولت کے لیے متعدد عمارتیں اور مندر تعمیر کرائے۔ پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس کے بیٹے گوپال سوم کے دور حکومت میں بنگال ہاتھ سے نکل گیا اور اس کی حکومت صرف بہار تک محدود ہو گئی، لیکن بھاگلپور کتبے میں اس کے ذریعے شمالی بنگال کے 'پنڈر بردھن' بھکتی (ضلع) میں ایک برہمن کو دو گاؤں عطیہ کرنے کا ذکر ملتا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ بنگال اب بھی اس کی حکومت میں شامل تھا۔

اگلے حکمراں وگرہ پال دوم کو چندیلوں اور کلچوریوں کے حملوں سے نمٹنا پڑا۔ اس کی حکومت کے دوران پالوں کی قائم کردہ عظیم ریاست گوڑ (Gauda) ، رادھا (Radha)، انگ (Anga) اور ونگ (Vanga) جیسی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بنٹ گئی۔ مشرقی بنگال کے سامنت اور ہری کیلا خاندان کے حکمراں کانتی دیو نے اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی اور مہاراج دھراج کا لقب اختیار کیا۔ مغربی اور شمالی بنگال میں واقع گوڑ پر کمبوج- پال خاندان نے قبضہ کر لیا۔ اس خاندان کا بانی غالباً کوئی پال افسر تھا جس نے بشمول راجدھانی، پال ریاست کے ایک بڑے حصے پر اپنی حکومت قائم کی۔ آخر کار مہی پال اول نے ان کی حکومت کا خاتمہ کیا اور پھر سے پال ریاست کو متحد کیا۔

2.2.5 مہی پال اول (Mahipala I)

وگرہ پال دوم کے جانشیں مہی پال اول (978-1038ء) کی حکومت اس کی تخت نشینی کے وقت مگدھ یعنی جنوبی بہار تک محدود تھی۔ ابتدائی تین سالوں میں مہی پال اول مشرقی بنگال کی بازیابی میں مصروف رہا۔ لگاتار جنگوں کے ذریعے اس نے مشرقی، مغربی اور شمالی بنگال کو پال ریاست میں شامل کرنے میں کامیابی حاصل کی اور ریاست کی سرحدوں کو بنارس تک پھیلا دیا۔

پال ریاست کو کچھ ہی عرصے بعد چول ریاست کے راجندر چول اول اور کلچوری حکمراں کرن یا گانگیہ دیو کے حملوں کا سامنا کرنا پڑا، جس سے ریاست کی طاقت کو سخت دھکا لگا۔ اس کے باوجود بنگال اور بہار کے زیادہ تر حصے اب بھی مہی پال کے زیر اقتدار تھے۔ مہی پال نے محمود غزنوی کے حملوں سے بھی فائدہ اٹھایا جس نے پرتی ہار ریاست کی قوت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اس دوران اس نے شمالی اور جنوبی بہار کو اپنی ریاست میں شامل کر لیا۔ اس نے بنارس اور اس کے آس پاس کے علاقوں کو بھی فتح کر لیا تھا۔ اس کے بھائی استھر پال اور وسنت پال نے

بنارس میں کئی مقدس مقامات کی تعمیر اور مرمت کرائی۔ بعد میں کلچوری حکمراں کرن نے ونگ کے حکمراں کو شکست دے کر اس سے بنارس چھین لیا۔ انگ کا یہ حکمراں مہی پال کا بیٹا نے پال ہو سکتا ہے۔

مہی پال اول کے بیٹے 'نے پال' (1055-1038ء) کو کلچوری حکمراں کرن سے کافی دنوں تک جنگ میں مشغول رہنا پڑا۔ اس طرح کے بہت سے شواہد دستیاب ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بدھ راہب 'اتیس دیپنکر سری گیان' (Atisa Dipankara Srijnana) کے بیچ میں پڑنے سے دونوں ریاستوں کے درمیان امن قائم ہوا، جو کہ نے پال کی موت تک قائم رہا۔ نے پال کے بیٹے وگرہ پال سوم کو بھی کلچوری حکمراں کرن کا سامنا کرنا پڑا۔ اس جنگ میں اسے کامیابی حاصل ہوئی اور کلچوری حکمراں کو اپنی بیٹی یوانسری (Yuvanshri) کی شادی وگرہ پال سوم سے کرنی پڑی۔ وگرہ پال سوم کو بعد میں چالکیہ حکمراں وکرمادتیہ چہارم اور اڑیسہ کے سوم ومسی راجا مہاشیو گپت یتی کے حملوں کی بھی روک تھام کرنی پڑی۔ اس کے بعد حملوں کے ایک لمبے سلسلے نے پال ریاست کی چولیں ہلادیں، جس کی وجہ سے ریاست کے بہت سے حصے الگ ہو گئے۔ اسی دوران آسام کے ورمن حکمراں نے مشرقی بنگال کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس سب کے باوجود وہ کسی طرح گوڑ اور مگدھ کو اپنے قبضے میں رکھنے میں کامیاب رہے۔

وگرہ پال سوم کے بعد اس کی بیوی اور کلچوری شہزادی یوو ناشری کے بطن سے پیدا ہونے والے مہی پال دوم نے اقتدار سنبھالا۔ سندھیا کر نندی نے رام چر ترم (Ramcharitam) میں اس کی حکومت کا بڑی خوبصورتی سے تذکرہ کیا ہے۔ اس نے ایک قلیل مدت کے لیے ریاست کو طاقتور بنانے کی کوشش کی، لیکن اسے پہلے اپنے سگے بھائیوں سے نمٹنا پڑا۔ مہی پال دوم نے اپنے بھائی سور پال دوم اور رام پال کو اپنے خلاف سازش رچنے کے شک میں قید کر دیا۔ اس کے چند دنوں کے بعد ہی کائیبرت (Kaibarta) (مچھوارہ برادری) کے ماتحت سرداروں نے بغاوت کر دی۔ انہیں میں سے دویہ (Divya) یا دووو کا (Divvoka) نام کے ایک سردار نے مہی پال دوم کو قتل کر دیا اور وارینڈر کے علاقے پر قبضہ کر لیا، جس پر اس کے بعد اس کے جانشین رودک اور بھیم نے حکومت کی۔ پال حکمراں مہی پال دوم کے قتل سے مچی افراتفری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مہی پال دوم کے دونوں بھائی یعنی سور پال دوم اور رام پال جو قید میں تھے، بچ کر نکلنے اور مگدھ پہنچنے میں کامیاب رہے۔ مگدھ میں سور پال دوم ایک مختصر حکومت کے بعد مر گیا۔

2.2.6 رام پال (Ramapala 1077-1120 AD)

سور پال دوم کے بعد اس کا بھائی رام پال اس کی جگہ تخت نشیں ہوا۔ اس نے دویہ کے بھتیجے بھیم پر ایک زبردست فوجی حملے کی تیاری کی۔ اس جنگ میں راشٹر کوٹ خاندان سے اس کے ماموں مٹھانا (Mathana) اور سوراج دیو (Sivarajadeva) کے علاوہ جنوبی بہار اور جنوب مغربی بنگال کے کئی ماتحت سامنتوں نے رام پال کی مدد کی۔ نتیجتاً بھیم کو شکست ہوئی اور اسے اس کے خاندان کے لوگوں کے ساتھ بے رحمی سے قتل کر دیا گیا۔ پال ریاست کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش میں رام پال نے وارینڈری (شمالی بنگال) پر فتح حاصل کی اور ایک نئی راجدھانی، رام وتی (Ramvati) سے حکومت کی، جو کہ آخری وقت تک پال ریاست کی راجدھانی بنی رہی۔ اس نے 'کامروپ' اور 'راڑھ'

کواپنے قبضے میں لے کرآسام کے ورمن حکمراں کواپنی ماتحتی قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ وہ گنگا حکمرانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے اور انہیں اڑیسہ پر قبضے سے روکنے میں بھی کامیاب رہا، حالانکہ اس کی موت کے بعد یہ علاقہ گنگوں کے قبضے میں چلا گیا۔ گہڑوال خاندان کے حکمراں گووند چندر سے اپنی چچیری بہن کمار دیوی (Kumaradevi) کی شادی کرکے اسے اپنا اتحادی بنالیا اور پال ریاست پر حملہ کرنے سے روک لیا۔ اس نئے اتحاد سے اسے بہت فائدہ حاصل ہوا، جس سے وہ مغربی بنگال کے سردار نینودیو (Nanyadeva) کو روکنے میں کامیاب رہا، لیکن اس کوشش میں اسے متھلا (بہار کا انتہائی شمالی علاقہ) سے ہاتھ دھونا پڑا۔ رام پال نے چول حکمراں کلوتنگ کے ساتھ دوستانہ مراسم قائم کیے اور اس طرح اپنے دشمنوں گنگوں اور چالکیوں کے حملوں کی روک تھام میں کامیاب رہا۔ اس طرح رام پال نے اپنی مہارت اور تدبر سے ریاست کے زوال کی رفتار کم کرنے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ اس نے کھیتی باڑی کو بڑھانے، تجارت کو پھیلانے اور عوام کو خوش رکھنے کے لیے بھی اپنی بھرپور جدوجہد کی۔

2.3 پال خاندان کا زوال (Decline of Pala Dynasty)

رام پال اس ریاست کا آخری طاقتور حکمراں تھا۔ اس کی موت کے بعد اس کے بیٹے کمار پال نے پال ریاست کو متحد رکھنے کی کوشش کی۔ اس کے دور حکومت میں کامروپ میں ایک بغاوت پھوٹ پڑی جسے کمار پال کے وزیر ویدیہ دیو (Vaideyadeva) نے کچل دیا۔ اس کے علاوہ بھی ویدیہ دیو نے جنوبی بنگال میں ایک سمندری جنگ میں کامیابی حاصل کی۔ کمار پال کی موت تک ویدیہ دیو اس کے وزیر کے طور پر اس کا وفادار رہا، لیکن کمار پال کی آنکھ بند ہوتے ہی ویدیہ دیو نے عملی طور پر ایک علاحدہ حکومت قائم کی۔ حالانکہ وہ اب بھی رسمی طور پر پال اقتدار کو تسلیم کرتا رہا۔ راجب پور (Rajibpur) تانبے کے کتبے کے مطابق کمار پال کا بیٹا گوپال دوم کم عمری میں گدی پر بیٹھا اور اس کے چچا مدن پال نے نائب کے طور پر حکومت کا کاروبار سنبھالا۔

گوپال دوم یا تو کم عمری میں مر گیا یا پھر اس کے چچا مدن پال نے اسے مار ڈالا، یہ ابھی تک واضح نہیں ہے۔ بہر حال مدن پال نے پال ریاست کی باگ ڈور سنبھالی۔ اس کی دور حکومت میں مشرقی بنگال میں ورمنوں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور اڑیسہ میں مشرقی گنگوں سے بھی جنگ شروع ہو گئی۔ مدن پال منگیر کو تو گہڑوالوں سے واپس لینے میں کامیاب رہا، لیکن اسے سین حکمراں وجے سین کے ہاتھوں بدترین شکست ہوئی اور جنوبی اور مشرقی بنگال اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ سین خاندان جو بنگال کے رادھا علاقے میں پال ریاست کا ایک معمولی باج گزار تھا اب پوری پال ریاست کا حکمراں بن بیٹھا۔ گووند پال نام کے ایک حکمراں نے تقریباً 1162ء میں گیا پر حکومت کی لیکن پال حکمرانوں سے اس کے تعلقات کے کوئی پختہ ثبوت نہیں ملتے اور اس طرح عظیم پال خاندان کا خاتمہ ہوا۔

2.4 انتظام حکومت (Administration)

پال ریاست، شاہی طرز حکومت (monarchy) پر مبنی تھی جس میں حکمراں کو تمام اعلیٰ اختیارات حاصل تھے۔ پال حکمرانوں نے پرمیشور، پرم بھٹارک، مہاراجادھیراج جیسے بڑے بڑے القابات اختیار کیے تھے۔ پال ریاست میں حکمراں کے بعد سب سے اہم عہدہ

منتری یا وزیر کا ہوتا تھا۔ گرگ خاندان نے تقریباً سو سال تک پالوں کے وزیر اعظم کے طور پر خدمات انجام دیں۔

- گرگ (Garga)
- درواپانی یا درب ھپانی (Darvapani or Darbhapani)
- سومیشور (Someshwar)
- کیدار مسرا (Kedarmisra)
- بھٹہ گورو میسرا (Bhatta Guravmisra)

انتظامی اکائیاں اس طرح تھی۔

- بھکتی (Bhuktis) یعنی صوبہ
- وشیہ (Vishayas) یعنی ڈویزن
- منڈل (Mandalas) یعنی ضلع
- کھنڈل (Khandala)، بھاگ (Bhaga)، اورتی (Avritti)، چترک (Chaturaka) اور پٹک (Pattaka) وغیرہ ذیلی انتظامی اکائیاں تھیں۔

پالوں کے کتبوں میں متعدد عہدے داروں کا ذکر ہے

- راجا
- راجنیک
- رانک (ممکنہ طور پر ماتحت سربراہان)
- سامنت اور مہاسامنت (ماتحت باجگذار حکمراں)
- مہاسندھی وگراہیک (وزیر خارجہ)
- دوت (سفیر)
- راجستھانیہ (نائب)
- انگرکشک (محافظ)
- شششٹھاو گراہک (محصول جمع کرنے والا)
- دشاپرادھیک (جرمانوں کا جمع کرنے والا)
- تارک (دریا کا محصول کلکٹر)
- مہاپسپتال (محاسب اعلیٰ)

- جیشٹھ کایستھ (دستاویزوں کا ذمے دار افسر)
- کسیترپ (زمین کے استعمال کے محکمے کا سربراہ)
- پرماتر (زمین کی پیمائش کا سربراہ)
- مہادنڈ نایک یا دھرم ادھیکار (منصف اعلیٰ)
- مہاپرتیہار (محافظ اعلیٰ)

2.5 پرتی ہار حکمراں (Pratihara Rulers)

2.5.1 ناگ بھٹ اول (Nagabhatta I)

پرتی ہاروں کا ابتدائی اور مرکزی مقام عموماً بھن مال (Bhinmal)، 'اُجین' یا منڈور (Mandor) مانا جاتا ہے۔ ناگ بھٹ اول (730-760ء) پرتی ہار ریاست کا سب سے قابل ذکر اور تاریخی بادشاہ گزرا ہے۔ اس نے عربوں کو شکست دینے کی وجہ سے دوسرے ہم عصر حکمرانوں میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ گوالیار کے بادشاہ مہر بھوج اول کے دستاویزوں میں شجرہ نسب کے ساتھ ساتھ ہر حکمراں کی شخصیت کا مختصر سا ذکر موجود ہے۔ غالباً اس نے عربوں کو شکست دے کر انہیں زمین چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ دکن میں راشٹر کوٹ اپنی سرحدوں کی توسیع میں مصروف تھے۔ ظاہر ہے یہی بات دونوں بڑھتی ہوئی طاقتوں کے مابین جنگ اور تنازع کا باعث بنی۔ اس نے راشٹر کوٹوں کے ساتھ جنگ کی اور ناکام ہوا۔ راشٹر کوٹ دستاویز سے پتہ چلتا ہے کہ راجا دنتی درگ نے مالو، لتا، گنگ اور سندھ کے علاوہ جنوبی ہند کے کئی بادشاہوں پر اپنا تسلط قائم کیا۔ سنجن کے چاندی کے دستاویز ہمیں گرجر دیش (گرجر دیش کا حاکم) کی شکست کی جانکاری دیتے ہیں۔ لیکن یہ شکست کچھ بہت طویل نہیں تھی۔ 756 میں اس نے دوبارہ اپنا اقتدار واپس لے لیا اور اپنی سرحد بھر گوکچ (بھڑوچ) تک بڑھا دی۔ ناگ بھٹ کے بعد اس کے بھتیجے کاکشت اور اس کے بعد اس کے بھائی دیوراج نے 760 سے 775 تک حکومت کی۔

2.5.2 وتس راج (Vatsaraja)

دیوراج کے بعد وتس راج تخت حکومت پر بیٹھا اور بھنڈی یا بھٹی قبیلے کو شکست دی۔ وتس راج (775 تا 800) نے وسطی راجستھان کے بیشتر علاقوں پر قبضہ کیا اور گجرات میں اپنا دبدبہ قائم کیا۔ اس نے گوڑ کے پال حکمراں کو اسی کی سرزمین پر شکست دی۔ پرتھوی راج وجے میں دی گئی تفصیلات کے مطابق چوہان سردار درلبھ راج نے وتس راج کی مدد کی تھی اور پھر قنوج کی سیاست میں شامل ہو کر پالوں کو ہرایا اور ایودھ خاندان سے اپنے وفادار امیدوار کے لیے تخت حاصل کیا۔ حالانکہ اس کی توسیعی کوششوں پر راشٹر کوٹ حکمراں دھرو نے پانی پھیر دیا۔ اس نے وتس راج کو شکست دے کر اس سے مفتوحہ مقامات چھین لیے اور پرتیہاروں کو راجستھان کے صحرا کی طرف ڈھکیل دیا۔

2.5.3 ناگ بھٹ دوم (Nagabhatta II)

وتس راج کے بعد اس کا بیٹا ناگ بھٹ دوم (800 تا 833ء) اس کا جانشین بنا۔ اس کی تاج پوشی اس وقت ہوئی جب جاگیرداری

نظام اپنے عروج پر تھا۔ راشٹر کوٹوں سے جنگ سے متعلق دستاویزات کی اچھی خاصی تعداد غالباً اپنی طاقت کو واپس لینے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ناگ بھٹ نے چکرایودھ کو ہرا کر قنوج پر قبضہ کر لیا۔ اس کی یہ فتح پال حکمراں کے لیے اعلان جنگ تھی اور جس کے نتیجے میں مدگری (منگیر بہار) کے مقام پر دونوں میں جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں ناگ بھٹ نے اپنے جاگیر دار کاکا کی مدد سے پالوں کو ہرا دیا۔

اس نے سلطنت کے وقار کو واپس لانے کی کوشش کی اور اس طرح اس نے اپنے ایک طاقتور دشمن پال حکمراں کو مات دے کر اپنی حدود میں توسیع کرنے کی پوزیشن حاصل کر لی۔ اس کے مقابلے میں آندھرا، سندھ، ویر بھدر اور کلنگ کے بادشاہوں نے اپنے طور پر جدوجہد کی۔ ناگ بھٹ نے سب کو شکست دے کر انہیں اپنی ماتحتی قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ مزید یہ کہ اس نے آندھرا، مالوا، کیرت، ترشنک، وتس اور متسیوں کے پہاڑی قلعوں کو جبراً بند کر دیا۔ ناگ بھٹ نے پال حکومت کے شمال مغربی حصے کے علاوہ مشرق سے مغرب اور ہمالیہ سے نرمدا تک تمام علاقوں میں اپنی خود مختاری قائم کی۔ شاکمبھری کے چوہانوں نے بھی اس کی خود مختاری کا اعلان کیا۔ گجرات پر قبضہ کرنے کے دوران اس کا مقابلہ راشٹر کوٹوں سے ہوا اور بالآخر راشٹر کوٹ حکمراں گووندا نے ناگ بھٹ کو شکست دی جس کی وجہ سے گجرات اور مالوا اس کے ہاتھ سے چلا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد جب اس نے دوبارہ اپنی طاقت بحال کی تو اس نے اپنے کچھ کھوئے ہوئے علاقوں کو واپس حاصل کر لیا۔ اس نے ایودھ حکومت کے خاتمے کے بعد کنیا کبج (موجودہ قنوج) کو بھی اپنے تصرف میں لے لیا اور اسے اپنی راجدھانی بنایا۔

پربھاک چرت کے دستاویز سے معلوم ہوتا ہے کہ بھرد پاڑا کے مہینے میں ناگ بھٹ دوم گنگا کے مقدس پانی میں ڈوب گیا اور اس کی موت ہو گئی۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ فن کے ممتاز پرتی ہار نمونے صرف اسی کے دور میں ہی ملتے ہیں۔ ٹیسر اور نسریسر (اب مورینا) کے بڑے مندروں کے گروپ اور اس کے آس پاس کے اور دوسرے مندروں کو بنانے میں کئی عظیم سرپرستی کو اس کے حوالے کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ مہوا اور تیراہی کے شیو مندر میں پرتی ہار کے دور کی فن کاری کو دیکھا جا سکتا ہے۔ قدیم عمارتوں کے سائنسی تجزیے ارتقا کے مختلف میدانوں میں ہمعصر فن کاری کی کافی حد تک تصدیق کرتے ہیں۔

رام بھدر 833 میں اپنے والد کا جانشین بنا اور اس نے تین سال کی مختصر مدت کے لیے حکومت کی۔ اس کے دور میں گجرات اور کلنجر کے منڈلوں کا پرتی ہاروں کے ہاتھ سے نکل جانا اس کی سیاسی نااہلی کا ثبوت دیتے ہیں۔ پربھاک کریتا کے دستاویز نے اسے ایک علاحدہ شخص کے طور پر پیش کیا اور یہی وجہ ہے کہ اس کے بیٹے مہر بھوج اول نے اپنے والد کو قتل کر کے اس کی جگہ لے لی۔

2.5.4 مہر بھوج اول (Mihirbhoja I)

مہر بھوج اول (836 تا 889ء) کے دور حکمرانی کو پرتی ہار ریاست کی تاریخ میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ سب سے پہلے اس نے گجرات اور کالنجر منڈل کے دو علاقوں میں اپنے اقتدار کو واپس حاصل کیا۔ چندیلوں نے اپنے 954 عیسوی تک کے شاہی دستاویز میں اس کا اعتراف کیا ہے۔ مہر بھوج اول نے اپنی سرحدوں کو شمال میں ہمالیہ کی ترائی تک وسیع کر دیا یہاں تک کہ گہیلوں نے ان کی اطاعت قبول کر لی۔ کہا جاتا ہے کہ گورکھپور کے ایک کلچوری بادشاہ گنم بدھ دیو نے مہر بھوج اول سے زمین کا معاوضہ لیا اور گوڑوں کے سکون اور وقار کو

غارت کر دیا۔ غالب امکان ہے کہ اس نے پالوں کے بادشاہ دیو پال کے خلاف مہم میں بھوج کی مدد کی۔ لیکن بھوج نے پال ریاست پر کہاں تک قبضہ کر لیا یہ کہنا مشکل ہے۔

طاقتور دشمنوں کے خلاف بھوج کی فتح نے یقیناً اس کی توجہ دوسری طرف بھی مرکوز کی۔ اس نے جنوب مغربی علاقوں میں مہمات کی اور جنوبی راجستھان سے اونتی اور نرمدا کے آس پاس کے علاقوں پر راج کیا جس میں اس کے جاگیر دار چوہانوں نے اس کی مدد کی۔ پرتھوی راج وجے کے مطابق چوہان شہزادی کلاوتی نے دوسرے خواہش مند لوگوں کے مقابلے قنوج کے بادشاہ کو اپنے شوہر کی شکل میں منتخب کیا۔ دستاویز سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ازدواجی معاہدہ اس کی خوش حالی کا باعث بنا۔ اسکند پران کی یہ بات ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے کہ ''گرنار کے جنگلوں میں گھومنے والی ایک دوچہرہ والی دوشیزہ کے بارے میں ون پال (جنگلات کے محافظ) کے بیان کو سن کر بھوج نے اپنی فوج کے ساتھ جنگل کا رخ کیا اور دوشیزہ کو حاصل کر لیا اور اس طرح اس نے کنیا کبج حاصل کیا۔'' ہمیں اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ دستاویز سے ملنے والے اشاروں کے مطابق اس کی فوج سوراشٹر میں چلی گئی۔ ظاہر ہے یہ علاقہ اس کی حدود میں شامل ہو گیا تھا۔ بال ورمن اور اونی ورمن کے دستاویز بالواسطہ طور پر اس بات کی تصدیق کرتے ہیں۔

جنوب مغرب میں بھوج کی فتوحات نے اسے پرتی ہار سلطنت کے پرانے دشمن راشٹر کوٹوں کے نزدیک کر دیا اور اس طرح وہ راشٹر کوٹوں سے جنگ میں الجھ گیا۔ جنگ جاری رہی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلد ہی اس نے اپنے دشمن راشٹر کوٹ حکمراں کرشن دوم کو پسپا کر کے اس کے ملک کی طرف کھدیڑ دیا۔ لیکن کتبات سے ہمیں اس کے خلاف حوالہ ملتا ہے جس میں اسے راشٹر کوٹوں کے ہاتھ سے مات کھاتے دکھایا گیا ہے۔ بہر حال پرتی ہاروں نے گجرات اور مالوہ پر مضبوط فوجی قوت قائم رکھی۔

مہر بھوج اول نے دریائے ستلج کے کنارے مشرقی پنجاب کے کچھ حصوں کو اپنی حدود میں شامل کر لیا۔ پیہو دستاویز میں بھوج کے دور حکومت کے دوران گھوڑوں کے لین دین کے ثبوت کے موجود ہیں۔ راج ترنگنی نے بھی پنجاب کے باشندے تھکیا کے کچھ علاقوں میں حملہ ہونے اور قبضہ کیے جانے کی بات کہی ہے۔ مہر بھوج اول کا دور حکومت اتنا خوشحال، منظم، پرامن اور شاندار رہا کہ عرب سیاح سلیمان (851) نے اس کی فوجی قوت کے ساتھ ہی اس کے گھڑ سواروں کی بھی تعریف کی۔ اس نے اس بات کا تذکرہ کیا کہ اس کی سلطنت کی اس زمین پر مرکزی حیثیت ہے اور اس کے علاوہ ہندوستان کا کوئی دوسرا صوبہ لٹیروں سے محفوظ نہیں ہے۔ اس کے دور میں بہت سے مندر وجود میں آئے۔ *Pratihara Art in India* کے مصنف رحمٰن علی کے مطابق گوالیار قلعے کے اندر موجود چترجھج مندر اس بات کا ثبوت ہے۔ اس دور کی یادگار عمارتوں میں تیلی کا مندر، سورج مندر (گوالیار)، اندور کے گرگاج مہادیو مندر، برواسا گر کا جری مٹھ مندر وغیرہ قدیم پرتی ہار طرز تعمیر کی قابل ذکر مثالیں ہیں۔ زندگی کے آخری ایام میں بھوج نے اپنے بیٹے کی خاطر راج پاٹ ترک کر دیا اور سن 889ء میں سنہرے تالاب کے مقدس پانی میں ڈوب کر خودکشی کر لی۔ اس طرح مہر بھوج اول کی شاندار حکومت کا خاتمہ ہوا۔

2.5.5 مہیندراول (Mahendra I)

مہر بھوج اول کے بعد اس کا بیٹا مہیندر (890تا907ء) اس کا جانشین بنا۔ اس کے زمانے میں پرتی ہار سلطنت کو شمال مغرب میں مشکلیں آئیں لیکن جنوب اور مغرب میں اپنی حکومت کو برقرار رکھتے ہوئے مشرق کی جانب توسیع بھی ہوئی۔ جب مہی پال اول مشرقی مہم میں مصروف تھا تو کشمیر کے حکمراں شنکر ورمن نے پرتی ہار علاقے پر حملہ کیا لیکن پر تھوڈاک (ضلع کرنال) پر ان کی حکومت پھر بھی برقرار رہی۔ اس زمانے کے ایٹ کھوری (ہزاری باغ، بہار) اور راج شاہی (بنگلہ دیش) کے دستاویز میں مشرق میں اس کی شاندار فتح اور اقتدار کا تذکرہ ہے۔ گنیر یا دستاویز (ضلع گیا) میں لکھا ہے کہ اس نے ان تمام علاقوں پر اپنی حکومت کے نویں سال فتح حاصل کی۔ اسی طرح مغربی خطے میں اس کی حکومت سے متعلق کچھ غیر مستحکم ثبوت ملتے ہیں۔ مہیندر پال کی ریاست شمال میں ہمالیہ کی ترائی تک اور شمال مغرب میں پنجاب کے ضلع کرنال تک پھیلی ہوئی تھی۔ جنوب میں بندیل کھنڈ اور مشرق میں مگدھ اور راج شاہی ضلع کا شمالی حصہ بھی اس کی حکمرانی میں شامل تھا۔ مغرب میں سوراشٹر اور جنوب مغرب میں دریائے نرمدا کے نچلے حصے تک اس کی عملداری تھی۔

بھوج دوم (908تا913ء) اپنے والد کے مہندر پال اول کے بعد ان کا جانشین بنا۔ غالباً اس کے لیے اسے اپنے دو سوتیلے بھائیوں سے اندرونی جھگڑوں کا سامنا بھی کرنا پڑا جس کے دوران پال بادشاہ نرائن پال نے اپنی ریاست کے مغربی حصے کو واپس چھین لیا۔ اس طرح پرتی ہار سلطنت موجودہ اتر پردیش کی مشرقی حدود تک محصور ہو کر رہ گئی۔ اسی طرح کلچوری بادشاہ کوکال نے گرجر بادشاہ کا خزانہ لوٹ لیا۔ یوورا ج دیو کے بلہاری دستاویز میں لکھا ہے کہ بھوج دیو بہت عیش پسند تھا اور جس شخص کی وجہ سے لفظ بھوج کو شہرت ملی وہ یقیناً بھوج اول ہی تھا۔ جس بھوج کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے وہ یقیناً بھوج دوم ہی ہے جسے کوکالا نے شکست دی۔ اس طرح بھوج دوم کی ذلت آمیز حکومت کا 914 میں خاتمہ ہو گیا۔

2.5.6 مہی پال اول (914تا943عیسوی)

اگرچہ وہ اپنے والد کا جانشین بنا لیکن سیاسی لحاظ سے یہ فیصلہ بہت اچھا نہیں تھا۔ راشٹر کوٹ حکمراں اندر سوم نے کنیا کبج کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ واپس جاتے ہوئے کالپی میں اس نے دریائے یمنا کو پار کیا۔ اس مہم کے دوران اندر دوم کے جاگیر دار نرسمہا اور چوہان نے اس کی مدد کی۔ چونکہ اس نے گرجر راجا کے ہاتھوں سے فتح کی دیوی کو چھین لیا تھا اس لیے اس نے کرناٹک شبدانوشاسنا کے ذریعے اس کی توصیف کی۔ اس نے گنگا یا پریاگ کے سنگم تک مہی پال اول کا تعاقب کیا۔ 17-916 میں اندر سوم نے کچھ اور مہمات کیں۔ یہ بات واقعی حیرت کرنے کی ہے کہ مسلسل حملوں اور شکست کے بعد بھی مہی پال اول نے ہمت نہیں ہاری اور چندیل راجا ہرش کی مدد سے فوج تیار کی اور اپنا کھویا ہوا تخت واپس لے لیا۔ بال بھارت کے علاوہ چندیل دستاویز اس بات کا ثبوت ہیں کہ ڈرامہ نگار راج شیکھر نے فتح کی تصویر کو بڑے فخر کے ساتھ پیش کیا ہے۔ غالباً مہی پال اول نے کنتلا، مرلا اور کیرلا پر فتح حاصل کی۔ اپنی سلطنت کے لیے جانے کے لیے اس نے مشرقی گھاٹ کا رخ اختیار کیا اور کلنگ، میکال کو شکست دی اور اپنے علاقے کو پریاگ تک پھیلا دیا۔ اس کے بعد بندیل کھنڈ کی طرف مڑ گیا اور قنوج پہنچا۔ یہ بات

بھی قابل ذکر ہے کہ کچھ نامعلوم وجوہات کے باعث جنوبی مہمات کے دوران راشٹر کوٹوں کی طرف سے کوئی مزاحمت نہیں پیش آئی۔ شمال مغرب کی طرف اس نے کلوتا اور رامتھا کو ہرایا اور اس طرح اس نے شمال مغرب کی کھوئی ہوئی سلطنت کو واپس لے لیا۔

شمال مغرب میں مہی پال کے حصے میں سندھ کا بھی ایک حصہ شامل تھا، کیونکہ مسعودی نے اسے سندھ کا بادشاہ کہا ہے اور پنجاب کا ایک بڑا حصہ اور کلو ضلع، اور بیاس ندی کا بالائی راستہ پرتی ہاروں کے علاقے میں شامل تھا۔ جنوب میں بندیل کھنڈ کی رکاوٹ تھی جس پر چندیل آہستہ آہستہ قابض ہو رہے تھے۔ ان کی خود مختاری کو تسلیم کر لیا گیا۔ جنوب مغرب میں مہی پال نے مالوا کو دوبارہ فتح کر لیا۔ کالہا کے تانبے کے کتبے کے مطابق دھارا کی فتح میں گور کھپور کے بامن راجا اور کلچوریوں کے ایک جاگیر دار نے اس کا ساتھ دیا۔ مغرب میں سوراشٹر تابعداری پر قائم رہا۔ مہی پال اول کی حکومت کے آخری مرحلے میں اسے راشٹر کوٹ مہمات کا سامنا کرنا پڑا۔ کرشن سوم نے شمال پر حملہ کیا اور چتر کوٹ اور کالنجر کا قلعہ تشویش ناک حالت میں آگیا۔ چندیل بادشاہ یشوور من نے 954 میں کچھ دنوں کے لیے قلعے پر قبضہ کر لیا۔

قدرت کا قانون ہے کہ ہر ابتدا کی انتہا ہوتی ہے، مہی پال اول کی موت کے ساتھ ہی پرتی ہاروں کا شاندار دور ختم ہو گیا۔ ان کے کمزور جانشین حکومت کو موثر طریقے سے چلانے میں پوری طرح ناکام رہے۔ ماتحت حکمرانوں نے اپنی آزادی کو اولیت دی اور پرتی ہاروں سے اپنا تعلق منقطع کر دیا۔ دوسری طرف، پرتی ہار ریاست محمود غزنوی کے حملوں سے چور چور ہو گئی، جس کی بہادری نے ایک ہوا کے جھونکے کی طرح مغربی ہندوستان کی عظیم ریاست کو ختم کر دیا۔

آخری پرتی ہار حکمراں مہندر پال دوم (944 تا 948ء) نے 944 میں تخت حاصل کیا۔ وہ اور اس کے جانشین اپنے دور حکومت میں کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام نہیں دے سکے۔ ان حکمرانوں نے چھوٹے راجاؤں کی طرح حکومت کی اور ریاست کے زوال اور انتشار کو نہ روک سکے۔ حالانکہ 943-942 کے کورو کشیتر (گونا) کے ایک دستاویز سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے پانی کے مسائل کو دور کرنے کے پختہ انتظامات کیے جو ثقافتی سرگرمیوں میں ان کی دلچسپی کو ظاہر کرتا ہے۔

2.6 سہ طرفہ جدوجہد اور زوال (Tripartite Struggle and Decline)

پرتی ہار سلطنت کی توسیع کے دوران سہ طرفہ جدوجہد کے سلسلے میں ہمعصر طاقتوں مثلاً پال اور راشٹر کوٹ کے ساتھ قنوج کو لے کر مسلسل جھگڑے ہوتے رہے۔ پرتی ہاروں اور راشٹر کوٹوں میں بہت یکسانیت ہے۔ دونوں بالائی گنگا وادی اور مالوا پر قبضہ رکھنے کی کوششوں میں ناکام رہے۔ آٹھویں صدی کی شروعات میں جب راشٹر کوٹ اور پرتی ہار ریاستیں قائم ہوئیں تب سے مالوا اور گجرات پر قبضے کے ساتھ دشمنی شروع ہوئی۔ راشٹر کوٹ حکمران دھرو دھارا ورش (780 تا 793) اور گووندا سوم (793 تا 814) نے پرتی ہاروں کو شکست دی۔ المسعودی نے راشٹر کوٹ-پرتی ہار دشمنی کے بارے میں کہا ہے کہ یہ اس زمانے کا مزاج تھا۔ اگرچہ راشٹر کوٹ شمالی ہند پر کبھی قبضہ نہیں رکھ پائے۔ وہ آئے اور پرتی ہاروں کے لیے مشکلیں کھڑی کیں اور جو چاہا وہ حاصل کیا اور واپس چلے گئے۔ مؤرخ کے ایم منشی نے راشٹر کوٹوں

کے آنے کو ' جنوب سے آنے والے بھنور' سے تعبیر کیا جو پرتی ہار کو برباد کر کے چلا جاتا ہے۔اس نے یہ مشاہدہ کیا کہ برداشت کرنے کی طاقت کے ساتھ پرتی ہار شاہی تابے بانے کو بحال کرتے تھے لیکن اسی تیزی سے راشٹر کوٹ جنوب میں اپنا ماتحت بنا کر شمال کی جانب بربادی مچانے آجاتے۔

وتس راج پر دھرو کی فتح سے پالوں کو مدد ملی اور وہ کنیا کبج کو اپنے ماتحت کر سکے۔البتہ ،راشٹر کوٹوں کے واپس چلے جانے کے بعد ناگ بھٹ دوم اور بعد میں مہر بھوج نے اپنی سلطنت کو دوبارہ قنوج اور پرتی ہاروں کے پرانے علاقوں میں از سر نو قائم کیا۔راشٹر کوٹوں نے دسویں صدی کے دوران پرتی ہار حکمرانوں کے ساتھ لڑائی کی اور ان کو کئی بار شکست دی۔ جغرافیائی وسائل نے بھی انہیں دور دراز علاقے کے دشمنوں پر حملہ آور ہونے کا موقع دیا۔گنگا ندی سے منسلک علاقوں پر قبضہ ،بنگال سے وسطی ہندوستان تک پورے ملک کو ملانے والی شاہراہیں، زراعت اور تجارت کے ذریعے کسی بھی سلطنت کی خوشحالی کے لیے بہت اہم تھیں۔اسی طرح جنوب مغربی ہندوستان کی تجارت پر کنٹرول اور سمندری تجارت نے پرتی ہاروں کو گجرات پر حکومت کرنے میں مدد کی۔ جغرافیائی اعتبار سے شمالی ہند سے بہت دور جنوبی مقامات پر رہنے کی وجہ سے راشٹر کوٹ کبھی بھی شمال میں بہت لمبے عرصے تک نہیں ٹھہر پائے۔ان کی زیادہ تر مہمات اچانک حملے کی شکل میں ہوتی تھیں اور یہ سب حملے مال غنیمت، شاہی شان وشوکت اور ہندوستان کی طاقتور ریاستوں پر اپنا رعب وداب قائم کرنے کے لیے انجام دیے گئے۔

بھوج کے بعد پرتی ہاروں کی فوجی طاقت میں زوال آگیا اور ان کے جانشین یکے بعد دیگرے شکست کا منہ دیکھنے لگے۔راشٹر کوٹوں نے دسویں صدی کے اوائل میں شدید ہنگامہ مچایا جب اندر سوم (915تا928) نے مہی پال کو شکست دی اور کنیا کبج کو مکمل طور سے تباہ کر دیا اور اس کے بعد جب کرشن سوم (967-939) نے دوبارہ 963 میں حملہ کیا تھا۔ منشی نے لکھا ہے کہ پرتی ہاروں کے راجپوت جاگیر دار ایک علاحدہ خطرہ تھے۔مہر بھوج کی اولادوں کے پاس گجر دیش کا تھوڑا سا حصہ باقی تھا۔ہر جاگیر دار اپنی خود مختاری کی بنیاد پر سب سے بڑی طاقت بننے کا خواہاں تھا۔اس وقت ہندوستان کے تانے بانے میں تقریباً ہر بادشاہ محکوم ہو کر فاتح کا ماتحت ہو جاتا، لیکن مستقل طور پر بلا روک ٹوک آزادی حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہتا اور تھوڑا سا موقع ملنے پر حاصل کر لیتا تھا۔پرتی ہار بھی ان سے الگ نہیں تھے۔مرکزی طاقتوں کے کمزور ہونے اور دارالحکومت پر حملوں نے جاگیروں کی بنیاد ڈالی، اور صوبائی گورنر اپنی خود مختاری کا اعلان کرنے لگے جس کے نتیجے میں ، سلطنت منتشر ہو کر کنیا کبج کے اطراف تک محدود ہو گئی۔پرتی ہار سلطنت گیارہویں صدی کے اوائل تک اپنے وجود کو کسی طرح گھسیٹتی رہی جب تک کہ غزنوی ترکوں نے اسے فتح نہیں کر لیا۔تاہم ان کا قبضہ عارضی تھا اور وہ لوٹ پاٹ کر کے واپس چلے گئے۔بعد میں اس علاقے میں گہڑوال ریاست (1080تا1194 عیسوی) قائم ہوئی۔

2.7 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

پال ایک سنسکرت اصطلاح ہے جس کے معنی محافظ کے ہیں۔اس ریاست کے ابتدائی حکمراں اپنے نام کے بعد یہ لاحقہ جوڑتے تھے۔انہوں نے ہندوستان کے ابتدائی عہد وسطیٰ میں مشرقی اتر پردیش، بہار، بنگال، اڑیسہ اور کامروپ کے کچھ علاقوں پر حکومت کی۔اس کے

بانی گوپال کا تعلق ایک بہت ہی سادہ گھرانے سے تھا۔ایک مدت تک انتشار اور بد نظمی کے بعد بنگال کے سامنتوں نے گوپال کو حکمراں بنایااور پال ریاست وجود میں آئی۔ پال ریاست کو اپنے شروعاتی دور سے ہی ہمسایہ ریاستوں سے الجھناپڑا۔اس کے علاوہ وہ قنوج پر اقتدار قائم کرنے کے مقصد سے ہونے والی سہ طرفہ جدوجہد کا بھی حصہ رہی۔ دھرم پال اور دیو پال نے مسلسل جنگوں اور فتوحات سے اسے شمالی ہند کی ایک عظیم طاقت بنایا۔ کچھ مدت کی بد نظمی اور انتشار کے بعد مہی پال اول نے ریاست کو از سر نو منظم اور مضبوط بنایا۔ مہی پال کے بعد کئی دیگر حکمرانوں نے اسے قائم رکھنے کی کوشش کی، لیکن گہڑوالوں، گنگوں، چالوکیوں اور کلچوریوں کے حملوں سب سے اہم ماتحت سرداروں کی بغاوت نے اس سلطنت کمزور کر دیا۔ رام پال اس خاندان کا آخری طاقتور حکمراں تھا جس نے ریاست کو پہلے جیسی شان وشوکت واپس لوٹانے کی کوشش کی، مگر اس کی آنکھ بند ہوتے ہی ریاست سکڑنے لگی۔ کامروپ خود مختار ہو گیا۔اڑیسہ گنگوں کے قبضے میں چلا گیا۔سب سے آخر میں بنگال پر سین حکمرانوں کا قبضہ ہو گیا جنہوں نے سین خاندان کی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ آخر کار کمزور جانشین، خاندانی جھگڑے، باج گذار سرداروں کی سرکشی اور بیرونی حملے اس ریاست کے خاتمے کی وجہ بنے۔ پال ریاست بدھ مذہب کی سرپرست تھی اور اس نے بدھ علم وادب کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ نالندہ، وکرم شلا جیسے عظیم مہاوہاران کے دور اقتدار میں تعمیر ہوئے۔ جنوب مشرقی ایشیا میں بدھ مذہب کے مہایان مکتب فکر کے فروغ کا سہرا اسی خاندان کے حکمرانوں کے سر جاتا ہے۔

دوسری طرف ڈنڈکاوسیہ (جدید ددوان، راجستھان) کے باشندے پرتی ہار گجرات میں پہلی بار اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔پرتی ہاروں (8تا11ویں صدی) نے مغربی اور شمالی ہندوستان پر اپنا اثر ورسوخ قائم کیا۔ ناگ بھٹ اول (730تا760) کا زمانہ اس سلطنت کا عہد زریں کہا جاسکتا ہے جس نے عرب حملہ آوروں کو کامیابی کے ساتھ روک کر رکھا۔ بھوج یا مہر بھوج (836تا885) کو اس سلطنت کا سب سے مشہور بادشاہ مانا جاتا ہے۔پرتی ہار کو خصوصی طور پر ان کے فنون، مجسمہ سازی اور مندروں کی تعمیر کے لیے جانا جاتا ہے۔انہوں نے اپنی ہمعصر دشمن طاقتوں میں شمالی ہندوستان میں پال (8تا12ویں صدی) اور جنوبی ہند میں راشٹر کوٹوں (8تا10ویں صدی) سے مسلسل جنگ کی۔

2.8 کلیدی الفاظ (Keywords)

لفظ/اصطلاح	تاریخی اہمیت ومطلب
سہ طرفہ جدوجہد	قنوج پر قبضے کے لیے پال، پرتی ہار اور راشٹر کوٹ ریاستوں کے درمیان ہونے والی طویل جنگ۔
متسیہ نیائے	گپت سلطنت کے زوال کے بعد بنگال میں پھیلنے والا شدید انتشار جسے 'جنگل راج' بھی کہا جاتا ہے۔
قنوج	ابتدائی عہد وسطیٰ میں شمالی ہندوستان پر اقتدار اعلیٰ اور بالادستی کی علامت سمجھا جانے والا شہر۔
پال	سنسکرت زبان کا لفظ جس کے معنی 'محافظ' کے ہیں، جو مشرقی ہندوستان کے ایک عظیم خاندان کا نام پڑا۔
مہاوہار	عظیم درسگاہ یا یونیورسٹی؛ جیسے دھرم پال کا تعمیر کردہ 'وکرم شلا' اور 'سوم پوری' مہاوہار۔

گرجر پرتی ہار	مغربی اور شمالی ہندوستان کا طاقتور حکمران خاندان جس نے عرب حملہ آوروں کو شکست دی۔
سامنت/جاگیردار	ماتحت یا باجگزار حکمران جو مرکزی حکومت کے زیر اثر اپنے علاقوں کا نظام چلاتے تھے۔
واریندر/گوڑ	بالترتیب شمالی بنگال، اور مغربی و جنوبی بنگال کے قدیم تاریخی نام۔

2.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

2.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. ابتدائی عہدِ وسطیٰ میں تین بڑی طاقتوں کے درمیان ہونے والی 'سہ طرفہ جدوجہد' کا بنیادی مقصد کس شہر پر قبضہ کرنا تھا؟
(a) پاٹلی پتر (b) اجین (c) قنوج (d) واریندر
2. پال خاندان کے بانیوں نے اپنے نام کے ساتھ 'پال' کا لاحقہ استعمال کیا، سنسکرت زبان میں اس لفظ کا کیا مطلب ہے؟
(a) بادشاہ (b) جنگجو (c) محافظ (d) فاتح
3. گپت سلطنت کے زوال کے بعد بنگال میں پھیلنے والی شدید بدامنی اور انتشار کو تاریخ میں کس نام سے جانا جاتا ہے؟
(a) متسیہ نیائے (b) دھرم چکر (c) سامنت راج (d) گوڑ نیائے
4. مشہور تاریخی درسگاہ 'وکرم شلا مہاوہار' کس پال بادشاہ نے تعمیر کروائی تھی؟
(a) گوپال اول (b) دھرم پال (c) دیوپال (d) مہی پال اول
5. کس عرب سیاح نے پرتی ہار حکمران مہر بھوج اول کے دورِ حکومت، اس کی زبردست فوجی قوت اور گھڑ سوار دستوں کی تعریف کی تھی؟
(a) ابنِ بطوطہ (b) البیرونی (c) المسعودی (d) سلیمان

2.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. بنگال میں 'متسیہ نیائے' (جنگل راج) کے خاتمے اور گوپال کی تخت نشینی پر مختصر روشنی ڈالیے۔
2. مہر بھوج اول کے دور کو پرتی ہار سلطنت کا عہدِ زریں کیوں تسلیم کیا جاتا ہے؟
3. پال سلطنت کے انتظامی ڈھانچے اور اہم عہدیداروں کے بارے میں بتائیے۔

2.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. پال سلطنت کی توسیع میں دھرم پال، دیوپال اور مہی پال اول کے کردار پر تفصیلی مضمون قلمبند کیجیے۔
2. پرتی ہار خاندان کے آغاز کا سیاسی پس منظر بیان کیجیے اور اہم حکمرانوں کے سیاسی و عسکری کارناموں پر روشنی ڈالیے۔

اکائی 3۔راشٹر کوٹ خاندان

(The Rashtrakutas)

اکائی کے اجزا

3.0 تمہید

3.1 مقاصد

3.2 پس منظر

3.3 اصل

3.4 سیاسی تاریخ

3.4.1 بانی

3.4.2 کرشنااول

3.4.3 گووندادوم

3.4.4 دھروادھاراورشا

3.4.5 گووندادوم

3.4.6 اموگھورش

3.4.7 کرشنادوم

3.4.8 اندراسوم

3.4.9 اموگورشادوم

3.4.10 گووندا چہارم

3.4.11 کرشناسوم

3.4.12 کھوٹیگا

3.4.13 کرکادوم

3.5 اکتسابی نتائج

3.6 کلیدی الفاظ
3.7 نمونہ امتحانی سوالات

3.0 تمہید (Introduction)

قدیم ہندوستان کی تاریخ میں متعدد خاندانوں کے گزشتہ احوال موجود ہیں۔ چھوٹے بڑے خاندانوں نے جدید ہندوستان کے کئی حصوں پر حکومت کی۔ جنوبی ہند میں ستواہنوں، پلووں، چیراؤں، چولوں، پانڈیوں، چالکیوں اور راشٹر کوٹوں نے مختلف حصوں میں الگ الگ حکمرانی کی۔ بیشتر طاقتیں ایک دوسرے کی ہمعصر رہیں اور وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے پر برتری حاصل کر لینا ایک عام بات تھی۔ اس لحاظ سے راشٹر کوٹ، چالکیوں کے ماتحت تھے۔ مگر بعد میں چالکیوں کو ہرا کر خود بادشاہ بن گئے۔ بعد ازاں دو صدیوں کی مدت میں بادامی کے چالکیوں نے نئی قوت حاصل کرلی اور راشٹر کوٹوں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اس طرح راشٹر کوٹوں کا مطالعہ ایک طرح سے چالکیوں کی طاقت کے عروج وزوال کی داستان ہے۔ ان کا غلبہ آٹھویں سے دسویں صدی عیسوی کے درمیان رہا۔

3.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- راشٹر کوٹ خاندان کے پس منظر کو سمجھ سکیں گے۔
- اس خاندان کی اصل کے بارے میں جانیں گے۔
- راشٹر کوٹ حکمرانوں کے حالات سے واقف ہو سکیں گے۔
- اس حکومت کے زوال پر روشنی ڈال سکیں گے۔

3.2 پس منظر (Background)

راشٹر کوٹ دو الفاظ راشٹر اور کوٹ کا مرکب ہے۔ راشٹر کا مطلب ہے ایک علاقہ اور کوٹ کے معنی ہیں رہنما یا سربراہ۔ اس اصطلاح کے معنی ایک علاقائی تقسیم یعنی راشٹر کا سربراہ ہے۔ یہ اصطلاح اشوک کے دور سے ملتی ہے۔ قدیم ہندوستان میں اس نام سے متعدد خاندان بطور حکمراں پھلے پھولے۔ ان میں سے بیشتر مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، کرناٹک اور تلنگانہ کے کچھ حصوں کے حکمراں تھے۔ وہ بیتول کے راشٹر کوٹ، من پور کے راشٹر کوٹ اور پٹھاری کے راشٹر کوٹ تھے۔ تاہم ہمارے پاس ایسے پختہ ثبوت نہیں ہیں کہ ہم یہ ثابت کر سکیں کہ وہ ایک دوسرے سے متعلق تھے لیکن مانیا کھیت کے شاہی راشٹر کوٹ جن کا ہم تفصیل سے مطالعہ کریں گے اور گجرات پر حکومت کرنے والے لتا کے راشٹر کوٹ ایک دوسرے سے رشتے داری کے ذریعے جڑے ہوئے تھے۔

3.3 اصل (Origin)

راشٹر کوٹوں کے اصلی وطن کے بارے میں بہت سے نظریات ہیں، لیکن زیادہ قابل قبول نظریہ یہ ہے کہ وہ لاتور کے رہنے والے تھے جو مہاراشٹر کے موجودہ ضلع عثمان آباد کے نام سے جانا جاتا ہے۔ قدیم ہندوستان میں یہ علاقہ کنڑ بولنے والوں کا تھا لہٰذا کنڑ راشٹر کوٹوں کی مادری زبان تھی۔ راشٹر کوٹ خاندان کے لوگ بادامی کے ابتدائی چالکیوں کے علاقائی افسران تھے۔ ان کے خاندان کے بعض افراد جو برار ہجرت کر گئے تھے، 640 عیسوی میں جاگیرداروں کی حیثیت سے نمودار ہوئے۔

3.4 سیاسی تاریخ (Political History)

3.4.1 بانی (Founder)

دنتی درگ راشٹر کوٹ سلطنت کا بانی تھا۔ اس کے عروج کے وقت یہ خاندان گزشتہ چار نسلوں سے مہاراشٹر میں آباد تھا۔ وہ اِندرا دوم کا بیٹا تھا جو بادامی کے چالکیوں کے تحت ایلورا کے جاگیردار کے طور پر خدمت انجام دیتا تھا۔ اِندرا کے وقت تک چالکیوں کی طاقت کم ہونے لگی تھی اور وہ ایک اور جنوبی طاقت کانچی کے پلووں کے ساتھ مسلسل جنگ کر رہے تھے۔ مزید برآں چالکیوں کے اسی خاندان کی ایک شاخ نے مکمل آزاد ہو کر وینگی سے حکومت کرنا شروع کر دی تھی اور وہ بادامی کے چالکیوں کے مد مقابل بن گئے تھے۔ اِندرا نے چالکیوں کی ایک شہزادی کو اغوا کر کے اس سے شادی کر لی تھی۔ ایسے حالات میں پُرعزم دنتی درگ کو چالکیوں کی کمزوری نے اپنے ہی مالک سے لڑنے کا حوصلہ بخشا۔ اس نے اپنے مالک چالکیہ بادشاہ وکرمادتیہ دوم پر فتح حاصل کی۔ مجبوراً وکرمادتیہ نے اس کی شجاعت کی تعریف کی اور اسے بہت سے خطابات سے نوازا۔ اپنے ہی مالک کی مخالفت میں دنتی درگ کی بڑھی ہوئی بہادری نے چالکیوں کی مقبولیت میں کمی کر دی۔ پھر بھی دنتی درگ اپنے مالک کے سلسلے میں پوری طرح وفادار رہا لیکن جب مالک کی موت کے بعد کیرتی ورمن دوم چالکیہ تخت پر بیٹھا تو تھوڑی ہی مدّت میں اسے اپنے جاگیردار دنتی درگ کے ہاتھوں شکست ملی۔ اس فتح سے دنتی درگ سارے مہاراشٹر کا مالک بن گیا۔ تاہم کیرتی ورمن کو بخش دیا گیا۔

دنتی درگ نے کوشل، میرپور کے اُدائن اور رائے پور کے پرتھوی ویاگھرا جیسے اپنے مشرقی ہمسایوں پر حملے کر کے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ اس نے پلو خاندان کے نندی ورمن کے ساتھ معاہدہ کر کے ان مشرقی حکمرانوں پر بھی برتری حاصل کر لی۔ بعد ازاں اس نے بھڑوچ کے گرجروں اور گجرات کے چالکیوں کے خلاف کارروائیوں میں دلچسپی لی۔ اس نے ان پر حملے کیے اور کامیابی حاصل کی۔ ان کامیابیوں سے اس کے وسائل میں خاصا اضافہ ہوا اور اس نے وسطی اور شمالی مدھیہ پردیش کے بیشتر اضلاع حاصل کر لیے۔ اس نے سری سیلم (موجودہ کرنول) پر حکومت کرنے والے تیلگو چولوں کو محکوم بنایا۔ اگلے قدم کے طور پر وہ 750 عیسوی میں کانچی پورم کی جانب بڑھا اور اپنی طاقت کا مظاہرہ کر کے اس نے پلو حکمراں کے ساتھ معاہدہ کیا اور اس کی بیٹی کے ساتھ شادی کی۔ آخر میں اس نے اپنے شکست خوردہ دشمن کیرتی ورمن کی جانب رُخ کیا اور اس سے ماتحتی کا اقرار کرانے کے بعد مہاراج ادھیراج، پرمیشور، پدم بھٹارکا وغیرہ جیسے خطابات کے ساتھ اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اس طرح دنتی درگ راشٹر کوٹ خاندان کا حقیقی بانی تھا لیکن وہ محض 30 سال کی عمر میں 750 عیسوی میں لاولد انتقال کر گیا۔

3.4.2 کرشنااوّل (Krishna I)

چوں کہ دنتی درگ کے کوئی اولاد نہیں تھی لہٰذا اس کے مرنے کے بعد اس کا چچا کرشنا اول تخت نشین ہوا۔ اس وقت وہ 45 سال کا ایک تجربہ کار شخص تھا۔ کرشنا نے جنوبی کونکن کا علاقہ فتح کر لیا اور کیرتی ورمن کی جگہ سلہروں کو جاگیردار بنا کر چالکیہ طاقت کو مکمل طور پر ختم کر دیا۔ اس سے مہاراشٹر اور کرناٹک علاقوں میں اس کی پوزیشن مضبوط ہو گئی۔ سلہرا خاندان اپنے خاتمے تک راشٹر کوٹوں کا وفادار رہا۔ امن وامان کی ایک مختصر مدت کے بعد بلند ہمت کرشنا اپنی حکومت کو پھیلانے کے لیے متعدد جنگوں میں مصروف رہا۔ اس نے گنگاوتی (پرانا میسور) کے گنگا حکمراں سری پرشاپر حملہ کیا۔ گنگوں نے اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے بڑی دلیری سے جنگ کی اور بہت قربانیاں دیں لیکن کرشنا کامیاب ہوا اور 768 عیسوی ان کی راجدھانی مانیہ پور (بنگلور میں موجودہ منّے) پر قبضہ کر لیا۔ اس دور کی تانبے کی ایک پلیٹ پر کندہ عطیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کرشنا نے مانیہ پور کی دولت سے بہت سے خیراتی کام انجام دیے۔ بعدازاں اس نے وینگی کے چالکیوں کی جانب توجہ مبذول کی۔ نتیجتاً موجودہ تلنگانہ کا ایک بڑا حصہ راشٹر کوٹوں کے اقتدار میں آ گیا۔ کرشنا نے اپنے سب سے بڑے بیٹے گووندا دوم کو راشٹر کوٹ تخت کے لیے اپنا ولی عہد منتخب کیا۔ 772 تا 775 عیسوی کے درمیان اس کی موت واقع ہو گئی۔ کرشنا بلاشبہ ایک اہل حکمراں اور ایک ماہر جنرل تھا۔ اپنی حکومت کے 18 برسوں میں اس نے اپنی سلطنت کو کونکن، کرناٹک اور حیدرآباد کے ایک بڑے حصے کو فتح کر کے تین گنا بڑھا لیا تھا۔ کرشنا نے دکن میں اپنے خاندان کے لیے غالب حیثیت حاصل کر لی تھی اور اسی وجہ سے اس کے جانشینوں کو شمال کی سیاست میں حصہ لینے کا موقع ملا۔ علاوہ ازیں اسے عمارتیں تعمیر کرانے کا شوق تھا۔ اُس کے حکم پر ایلورا میں کیلاش کو پوری ایک چٹان کاٹ کر تعمیر کیا گیا تھا۔ لہٰذا اسے دنیا کا عجوبہ کہا جاتا ہے۔ ایک ماہر سیاستداں کے طور پر اس نے مفتوح خاندان کے کسی بھی رکن کو اپنی سلطنت میں کوئی اہم سیاسی پوزیشن حاصل کرنے کی اجازت نہیں دی۔

3.4.3 گووندادوم (Govinda II)

سب سے بڑے بیٹے کے طور پر گووندا 772 عیسوی کے قریب اپنے باپ کرشنا کے بعد تخت نشین ہوا۔ اسے اس کے والد نے اپنا جانشیں منتخب کیا تھا لیکن گووندا بہت آرام طلب تھا اور انتظامیہ سے زیادہ اسے دنیوی عیش وآرام میں دلچسپی تھی جب کہ اس کا چھوٹا بھائی دھروا تخت پر قبضہ کرنے کے لیے کوشاں تھا۔ گووندا شروع میں اپنے بھائی کے ارادوں کو نہیں سمجھ پایا اور اس نے سارا انتظامیہ دھروا کو سونپ دیا۔ دھروا نے اپنے نام سے لوگوں کو زمینیں دیں اور کئی بار اپنے بھائی سے اختلاف کیا۔ اس سے گووندا پر اپنے بھائی کے حقیقی ارادے منکشف ہوئے۔ نتیجتاً دھروا کو اس کے عہدہ سے برطرف کر دیا گیا اور ایک اجنبی کو اس کی جگہ نامزد کیا گیا۔ دریں اثنا گووندا نے پلووں، گنگوں، وینگی کے چالکیوں اور دیگر ہمسایہ طاقتوں کے ساتھ دوستی کی جس سے اس کے وزرا ناراض ہو گئے اور دھروا کی جانب راغب ہوئے۔ دھروا نے یہ اعلان کرتے ہوئے گووندا کے خلاف بغاوت کر دی کہ اس سے راشٹر کوٹ خاندان کو زوال کا خطرہ ہے۔ گووندا نے کانچی، مالوا، گنگاوتی اور وینگی کی مدد سے اپنے بھائی کی بغاوت کو کچلنے کی پوری کوشش کی۔ تاہم دھروا نے اپنے بھائی کو شکست دی اور 780 عیسوی میں تخت پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

3.4.4 دُھروادھاراورشا (Dhruva Dharavarsha)

دُھروا50سال کی عمر میں تاجدار بنالیکن اس کی بڑھتی ہوئی عمر اس کے فوجی عزائم کو نہیں روک سکی۔ جاگیرداروں کو اپنے مقام پر رکھ کر کچھ سال اپنی حالت کو مستحکم کرنے کے بعد دھروا نے اپنے ہمسایوں کی جانب رخ کیا۔ گووندا کے حریفوں کو سزا دینے کے خواہاں دھروا نے سوامارادوم کو جیل میں ڈال دیااور پلو حکمراں سے محصول کی شکل میں ہاتھی وصول کیے۔ بعد ازاں اس نے وندھیا پہاڑوں کو پار کیا اور 789عیسوی میں مالوا کے گرجرں کو ریگستان میں بھگادیا۔ اس مقابلے سے دھروا کو حوصلہ ملااور اس نے گنگا۔ یمنادوآب پر حملہ کیااور بنگال کے دھرم پال کو شکست دی۔ شمالی ہند میں دھروا کی جنگی مہم وگ وجے (فتح عظیم) تھی لیکن اس سے اسے مال غنیمت، عزت وشہرت کے علاوہ کوئی بڑافائدہ حاصل نہیں ہوا۔ وتس راج اور دھرم پال پر اس کی فتح کی بدولت حالانکہ اس کے علاقوں میں توسیع ہوئی لیکن وہ اپنی بنیاد سے دور تھااور اتنا بوڑھا ہو گیا تھا کہ قنوج کی افواج کو مکمل طور پر کچل نہیں پایا۔ چاہے حقیقی سبب کچھ بھی ہو، راشٹر کوٹ افواج نے بلاشبہ سلطنت کی شان میں اضافہ کیا تھا لیکن بہت کم علاقے کو سلطنت میں شامل کر پائیں۔ اب وہ جنوب کی جانب واپس لوٹنے کے لیے بے چین تھیں۔ اس کے بعد وینگی کے وشنوور دھن چہارم کی باری تھی جسے دھروا کے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے اپنے علاقے کا کچھ حصہ دھروا کے حوالے کیااور اپنی بیٹی سیلا مہادیوی کی دھروا کے ساتھ شادی کر دی۔ اس طرح جنوب کی جنگی مہم نے اس کی علاقائی سرحد میں اضافہ کیا۔ دھرواسارے ہندوستان میں ناقابل شکست رہا۔ وہ راشٹر کوٹ خاندان کا اہم ترین حکمراں تھا۔ 13 سال کی اپنی مختصر حکمرانی میں اس نے نہ صرف راشٹر کوٹوں کی طاقت میں اضافہ کیا بلکہ اسے ایک ہیبت ناک جنگی قوت میں تبدیل کر دیا۔ دھروا کے چار بیٹے تھے جن کے نام تھے کرک، استمبھ، گووندااور اِندر۔ ایسا لگتا ہے کہ کرکا اپنے باپ سے پہلے ہی فوت ہو گیا تھا۔ دھروا نے گووند سوم کو تخت کے لیے منتخب کیا تھا کیوں کہ وہ اس کی صلاحیت ومہارت سے استمبھ کے مقابلہ میں زیادہ متاثر تھا۔ استمبھ اپنے والد کے دور حکومت میں نومفتوحہ صوبہ گنگاوتی کا وائے سرائے تھا۔ کرکا اپنے باپ کے تاجدار بننے سے پہلے ہی خاندیش کا منتظم تھا۔ گووندا کو اس کے والد نے اپنے جانشیں کے طور پر منتخب کر لیا تھااور اندر کی اتنی اہمیت نہیں تھی۔ گووند کا انتخاب ایک رسمی تاجپوشی کے ذریعے ہوااور دھروا نے اپنا تخت چھوڑ دیا 793اور 794عیسوی کے درمیان اس کی موت ہو گئی۔

3.4.5 گووندااسوم (Govinda III)

گووند کی تخت نشینی تو پرامن طور پر ہو گئی تھی لیکن اس کا بڑا بھائی استمبھ بے عزتی کے احساس سے جل اٹھا۔ لہٰذا اس نے جلد ہی تخت تاج حاصل کرنے کے لیے بارہ راجاؤں کا ایک مضبوط اتحاد قائم کیا۔ اگرچہ ہمیں اس اتحاد کے اراکین کے بارے میں کچھ سراغ نہیں ملتا ہے لیکن پھر بھی ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ وہ ہمسایہ اور جاگیردار ہوں گے جنہیں بوڑھے بادشاہ دھروا نے دبایا ہوگا۔ گووند نے اس متوقع بغاوت کا بعض حلیف جاگیرداروں کی مدد سے سامنا کیا۔ چھوٹے بھائی اندرا نے پرجوش طریقے سے اس کی حمایت کی۔ گووندا نے استمبھ اور اس کے حلیفوں کو شکست دے کر اپنی پوزیشن کو محفوظ بنایااور انتہائی مددگار بھائی اندرا کو 'لتا (گجرات) کا وائسرائے مقرر کر دیا۔ مفتوح گنگا حکمرانوں کو قیدی بنا کراور 798عیسوی میں گنگاوتی کو راشٹر کوٹ سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ استمبھا کو دوبارہ گنگاوتی کا وائے سرائے مقرر کیا گیا

وہ802عیسوی تک اپنے عہدہ پر فائز رہا۔ نولم بواڈی نے گووند کے اقتدار کو تسلیم کیا۔ گووند نے شمال کی جانب رخ کیا۔مالوا کے گرجر رتیہار راجاناگ بھٹ نے بعض دیگر راجاؤں کے ساتھ اتحاد کر کے خود کو شمال کا ایک طاقتور حکمراں بنایا۔ گووندا کو شک ہوا کہ ناگ بھٹ اپنے بڑھتے ہوئے اثر کی وجہ سے راشٹر کوٹ علاقے پر حملہ کر سکتا ہے۔ لہٰذا اس نے محسوس کیا کہ اس سے قبل کہ ناگ بھٹ بہت زیادہ طاقتور ہو جائے ،اسے کچل دینا چاہیے۔ گووندا اپنی افواج کے ساتھ شمالی ہند میں داخل ہوا اور ناگ بھٹ نیز اس کے حلیفوں کو شکست دی اور مالوا کالتا کے ساتھ کچھ وقت کے لیے الحاق کر دیا۔ گووندا جیسے ہی شمال میں آگے بڑھا ویسے ہی قنوج کے حکمراں چکرایودھ نے رضاکارانہ طور پر اس کی برتری تسلیم کر لی۔ واپسی کے دوران اس نے نرمدا کے قریب سری بھاؤنا میں قیام کیا کچھ عرصہ وہاں رہنے کے بعد وہ پلووں کی راجدھانی کانچی پر حملہ آور ہوا۔ 803 عیسوی سے کچھ پہلے وہ کانچی کے پلوّ حکمراں دانتی ورمن کو ہرانے میں کامیاب رہا لیکن یہ شکست فیصلہ کن نہیں تھی کیوں کہ اسے اپنے اقتدار کے آخری دور میں ان پر دوبارہ حملہ کرنا پڑا۔

گووندا کی فوج کہیں سری لنکا پر حملہ نہ کر دے، یہ سوچ کر سری لنکا کے بادشاہ نے ایک سفیر بھیج کر گووندا کی اطاعت قبول کر لی۔ وینگی کے حکمراں وجے آدتیہ نے گووندا کی طاقت و عظمت کو محسوس کیا۔ دریں اثنا گووندا نے وجے آدتیہ کے سوتیلے بھائی بھیم کی حمایت کرتے ہوئے اسے وینگی کے تخت پر بٹھا دیا۔ بھیم ہمیشہ گووندا کا ایک وفادار اور سعادت مند جاگیر دار رہا۔ بلاشبہ گووندا راشٹر کوٹ خاندان کا ایک اہل ترین حکمراں تھا۔اس شاہی خاندان کی شان و عظمت بڑھانے اور علاقائی توسیع کا سہرا اس کے سر تھا۔اس نے شمال میں ناگ بھٹ اور دھرم پال کو شکست دی۔اس کے دور میں راشٹر کوٹوں کی طاقت سارے ہندوستان میں ناقابل شکست تھی۔اس کی کامیابی کا سبب اس کی شجاعت، حکمت اور تنظیم کی صلاحیت تھی۔اس نے اپنے بھائی اندرا کو گجرات کا وائسرائے بنا کر سلطنت کی شمالی سرحدوں کو محفوظ کر دیا جس کی بدولت اس کا کم عمر ولی عہد (اموگھ ورش) اس کے بعد پر امن طور پر تخت نشین ہو سکا۔

3.4.6 اموگھ ورش اول (Amoghavarsha I)

گووندا کے بعد اس کا بیٹا اموگھا ورش (880-814ء) جس کا اصلی نام 'سروا' تھا تخت نشین ہوا لیکن وہ سروا کی بجائے اپنے خطاب اموگھ ورش کے نام سے زیادہ مشہور ہوا۔ تاجپوشی کے وقت اس کی عمر صرف 14 سال تھی۔ کرک کو خاص طور پر گجرات سے اپنے چچیرے بھائی کی نیابت سنبھالنے اور انتظامیہ چلانے کے لیے بلایا گیا۔ 817 عیسوی میں نوعمر بادشاہ کے خلاف زبردست بغاوت ہوئی جس میں اموگھ ورش ملک چھوڑ کر بھاگ گیا تھا لیکن کرک نے بغاوت کو کچل دیا اور اموگھ درش کو واپس بلا کر 821 عیسوی میں اسے بحال کیا۔ مشرقی چالوکیہ راجا وجے آدتیہ دوم اور گنگ حکمراں راجا ملا دونوں نے بغاوت کی حمایت کی تھی اس لیے اموگھ ورش انہیں سزا دینا چاہتا تھا۔ اگرچہ وہ مشرقی چالکیوں کو ہرانے کے بعد وینگی پر قابض ہو کر اپنی بالادستی قائم کر چکا تھا لیکن 46-845 عیسوی کے قریب اس نے اسے کھو دیا۔اس وقت وجے آدتیہ سوم کے ایک جنرل پانڈورنگا نے راشٹر کوٹوں پر فتح حاصل کی اور 15 سال کے اندر ہی مشرقی چالکیوں نے وینگی کو دوبارہ حاصل کر لیا۔ گنگ حکمراں سیوامرا، جسے گووندا نے رہا کر کے پچھلی حیثیت پر بحال کر دیا تھا، وہ مشکل سے ایک سال تک ہی اموگھ ورش کا وفادار رہا اور

816 عیسوی میں اس نے نو عمر بادشاہ کے خلاف بغاوت کر دی لیکن سو مارا جنگ میں شکست کھا کر مارا گیا۔ بعد ازاں اس کا بھتیجا چاملّا حکمراں بنا جس نے راشٹر کوٹوں سے کچھ حصہ تو لے لیا لیکن اس کے لیے وہ تمام علاقے واپس لینا ناممکن تھا جس پر اموگھ ورش نے قبضہ کر لیا تھا۔ رچاملّا کے بیٹے ارایانے بھی جس نے 70-837 عیسوی کے درمیان حکومت کی، سلطنت کے دیگر جاگیر داروں کے ساتھ مل کر اموگھ ورش کے خلاف بغاوت کی۔ راشٹر کوٹ سپہ سالار بنکیا نے اگرچہ انتہائی موثر طور پر بغاوت کو دبا دیا تھا لیکن اسے اپنی مہم کو چھوڑ کر راجدھانی واپس جانا پڑا کیوں کہ وہاں ایک اور ہنگامہ ہو گیا تھا۔ اموگھ ورش کے ایک وفادار جاگیر دار گنگا وجے آدتیہ کو بنکیسا کے کام کو جاری رکھنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ اس نے نیتی مارگ کو دبایا اور اطاعت پر مجبور کیا۔ راجدھانی کے قریب ولی عہد کرشنا اور لتا کے حکمراں کرکا کے بیٹے دھرواول میں کشیدگی پیدا ہو گئی۔ اگرچہ دھرواول جنگ میں سپہ سالار بنکیا کے ہاتھوں مارا گیا لیکن اس کے بیٹے اکال ورش اور پوتے دھرودوم کے ساتھ یہ تنازع جاری رہا۔ جب 860 عیسوی میں گرجر پرتیہار حکمراں مہر بھوج نے دھرواد وم کو دھمکی دی تب دھرواد نے اموگھ ورش سے مصالحت میں ہی بہتری سمجھی۔ اس معاہدے کے بعد اموگھ ورش اپنے تمام دشمنوں سے نمٹنے میں کامیاب رہا اور 867 عیسوی تک اموگھ ورش نے تخت پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ اس طرح اموگھ ورش نے اگرچہ 66 سال کے طویل عرصے تک حکومت کی لیکن اپنے علاقے کے کچھ حصوں میں بھی اسے کبھی کبھی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

اموگھ ورش اول ایک امن پسند اور علم دوست حکمراں تھا۔ اسے مذہب اور ادب دونوں سے گہری دلچسپی تھی۔ اگرچہ اس نے رسمی طور پر ہندو مذہب کو ترک نہیں کیا تھا، تاہم جین مذہب سے اس کی خاص وابستگی تھی۔ سنسکرت زبان میں جین مذہب کی ایک اہم تصنیف پرشن اُتر رتن مالیکا (Prashnottara Ratnamalika) بھی اسی سے منسوب کی جاتی ہے۔ وہ ایک نامور شاعر اور عالم بھی تھا۔ اس نے کنڑ زبان کی قدیم ترین دستیاب ادبی تصنیف ''کوی راج مارگ (Kavirajamarga) '' تحریر کی، یا کم از کم اس کی تدوین و تصنیف میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ مذہبی اصولوں اور تعلیمات کو محض سننے تک محدود نہیں رکھتا تھا بلکہ ان پر عملی طور پر بھی عمل کرتا تھا۔ بعض اوقات وہ حکمرانی کے منصب سے عارضی طور پر سبک دوش ہو کر جین بھکشوؤں کے ساتھ وقت گزارتا تھا۔ ایسے مواقع پر اس کا ولی عہد کرشنا ریاست کے حکومتی امور سنبھالتا تھا۔

اموگھ ورش نے اپنی راجدھانی مانیہ کھیت (Manyakheta) میں ایک شاندار محل بھی تعمیر کروایا، جو اپنی خوب صورت طرزِ تعمیر کے لیے مشہور تھا۔ اس محل میں زنان خانہ (Harem) اور ایک تالاب بھی موجود تھا، جو اس دور کی شاہانہ زندگی اور تعمیراتی فن کی عکاسی کرتا تھا۔ اپنے عہدِ حکومت میں اسے مختلف القاب سے نوازا گیا، جن میں نرِپ تنگ (Nripatunga)، اتِشے دَھوَل (Atishaya Dhavala)، ویر نارائن (Vira Narayana)، رَٹّ مارتَنڈ (Ratta Martanda) اور شری وَلّبھ (Sri Vallabha) قابلِ ذکر ہیں۔ اموگھ ورش اول کے بعد اس کا بیٹا کرشنا دوم تختِ سلطنت پر بیٹھا اور 880ء میں راشٹر کوٹ سلطنت کا حکمران بنا۔

3.4.7 کرشنادوم (Krishna II)

اس لحاظ سے کرشنا خوش قسمت تھا کہ اپنے بیشتر پیشروؤں کی طرح اسے جانشینی کے لیے جنگ کا سامنا نہیں کرنا پڑا کیوں کہ وہ اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ تاہم اس وقت کے سیاسی حالات اس کے لیے سازگار نہیں تھے۔ کرشنا کو اپنے بیشتر ہمسایوں کے ساتھ جنگوں میں مصروف رہنا پڑا۔ جنوب میں اسے گنگاؤں اور نولمباؤں، مشرق میں وینگی کے چالکیوں اور شمال میں گجرات کے راشٹر کوٹوں اور گرجر پرتھیہاروں کے ساتھ جنگیں لڑنا پڑیں۔ اس نے چیدی حکمراں کوکل کے ساتھ، رشتہ ازدواج قائم کرکے اسے اپنا جنگی حلیف بنادیا۔ وینگی کے چالکیوں کے ساتھ اس کے سیاسی رشتے اچھے نہیں تھے۔ چالوکیہ راجا بھیم اول نے وینگی کے مفتوح علاقوں کو کرشنا دوم سے دوبارہ جیت لیا تھا لیکن جنگ کے دوران بھیم کا سب سے بڑا بیٹا لڑتے ہوئے مارا گیا تھا۔ اس کے باوجود کرشنا کی حکومت سب سے طاقتور تھی۔ اپنی تخت نشینی کے فوراً بعد 888 عیسوی کے قریب کرشنا کی بھوج سے جنگ ہوئی۔ اس لڑائی میں چیدی حکمراں 'اس کے اپنے جاگیر دار اور ولی عہد جگاتنگا شامل تھے۔ ان جنگوں سے کسی کو بھی مکمل کامیابی حاصل نہیں ہوئی اور گرجر پرتیہار ایک مضبوط شمالی طاقت بنے رہے۔ انہوں نے راشٹر کوٹوں کو شمال میں آگے بڑھنے سے باز رکھا۔ کرشنا اتنا کمزور تھا کہ وہ اپنے اجداد کی طرح عملی اقدام نہیں کرسکا اور بھیم اتنا بوڑھا ہو چکا تھا کہ وہ اپنے شمالی ہمسائے کے خلاف حملے نہیں کرسکتا تھا۔

نویں دہائی کے اختتام تک راشٹر کوٹ کی گجرات شاخ ختم ہو چکی تھی اور گجرات کے حکمراں یا اس کے جانشیں کو راجدھانی سے نکال دیا گیا تھا۔ کرشنا اپنے دادا کی طرح ایک باصلاحیت حکمراں نہیں تھا۔ اس کی واحد فوجی حصولیابی یہ تھی کہ اس نے گجرات میں راشٹر کوٹوں کی شاخ کو تباہ کردیا تھا لیکن یہ کوئی عظیم کارنامہ نہیں تھا۔ اس نے مہر بھوج اول اور بنگال کے مہیندر پال کے مقابلے میں خود کو بچائے رکھا۔ اس کا جھکاؤ بھی اپنے والد کی طرح جین دھرم کی جانب تھا اور آدی پران کے آخری پانچ ابواب لکھنے والے مشہور جین سنت گیانیشور اس کے رہنما تھے۔ 914 عیسوی تک کرشنا فوت ہو گیا تھا۔

3.4.8 اندراسوم (Indra III)

کرشنا دوم کے بعد اس کا پوتا اندراسوم راشٹر کوٹ کے تخت پر بیٹھا۔ جب اس کی تاج پوشی ہوئی تو وہ تقریباً 35 سال کا تھا اور اس نے صرف 5 سال حکمرانی کی لیکن اس کا دور حکومت شاندار رہا۔ اس نے گوردھن پر حملہ آور پرمار حکمراں اپیندر کو شکست دی۔ نتیجتاً پرمار احکمراں جو گرجر۔ پرتیہاروں کے جاگیر دار تھے، اب راشٹر کوٹوں کے باجگزار بن گئے۔ اس طرح اندرا کو گرجر پرتیہاروں سے نمٹنے کا موقع ملا۔ جب بھوج دوم اپنے باپ کے بعد تخت نشین ہوا تو دو برسوں کے اندر ہی اسے جانشینی کی جنگ کا سامنا کرنا پڑا۔ شاہی خاندان میں جھگڑوں سے جاگیر دار بھی دو پارٹیوں میں تقسیم ہو گئے تھے اور اس موقع کا اندرا نے فائدہ اٹھایا۔ اس طرح اس نے شمال میں اپنی برتری قائم کرلی۔ اس نے پہلے اجیّن پر حملہ کیا، بعد ازاں یمناندی کو عبور کرکے قنوج پر قبضہ کرلیا۔ گرجر پرتیہار راجا مہی پال کو اندرا کے سپہ سالار چالکیانر سمہا نے شکست دے کر محکوم بنالیا۔ تاہم یہ فتح اندرا کی اچانک موت کے باعث کم وقت تک ہی برقرار رہی۔

3.4.9 اموگھورش دوم (Amoghavarsha II)

اموگھ ورش دوم 917 عیسوی میں اپنے باپ کا جانشیں بنا لیکن ایک سال کے اندر ہی فوت ہو گیا۔ بعد ازاں اس کا بھائی گووندا چہارم 918 عیسوی میں اس کا جانشیں بنا۔

3.4.10 گووندا چہارم (Govinda IV)

بعض تانبے کی پلیٹوں پر کندہ عبارتوں میں لکھا ہے کہ وہ عشق کے دیوتا جیسا خوبصورت نظر آتا تھا۔ وہ 20 سالہ کا نوجوان تھا اور اپنی حکومت کا زیادہ تر وقت لہو و لعب میں گزارتا تھا۔ گووندا میں اپنے باپ کے مفتوحہ صوبوں کو سنبھالنے کی قابلیت نہیں تھی۔ اسی کے دور حکومت میں کسی وقت مہی پال نے قنوج کو دوبارہ فتح کر لیا اور راشٹر کوٹ فوج کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ مشرقی چالکیہ راجا بھیم دوم نے جو 934 عیسوی میں تخت نشین ہوا تھا، گووندا کو شکست دی اور اپنے علاقوں کو واپس لے لیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گووندا نے اپنے جاگیرداروں اور خود اپنے ہی وزرا میں عدم اعتماد پیدا کر دیا تھا۔ بالآخر اس کے چچا اموگھ ورش سوم کو جو کافی عمر دراز تھا' تخت نشین کرایا گیا۔ کرشنا سوم کو ولی عہد بنایا گیا اور اسے انتظامیہ کی نگرانی سونپ دی گئی۔ اموگھ ورش نے اپنی بیٹی کی شادی گنگا کے ولی عہد بٹوکا دوم سے کر دی۔ کرشنا اپنے بہنوئی کو گنگا کے تخت پر بٹھانا چاہتا تھا۔ اس نے دانتیگا اور وانگا کو، جو شاید نولمبا شہزادے اور اس وقت گنگا کے حکمراں رچاملّا کے جاگیردار تھے، مار ڈالا۔ بعد میں اس نے خود رچاملّا کو شکست دے کر قتل کر دیا اور بٹوکا کو گنگا کے تخت پر بٹھا دیا۔ اس کے بعد کرشنا نے شمال کی طرف پیش قدمی کی اور چیدی کے حکمراں کو شکست دی۔ راشٹر کوٹ فوج نے چنڈیل ملک کے قلب میں واقع قلعوں کالنجر اور چتر کوٹ پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہ تقریباً دس سال تک راشٹر کوٹوں کے قبضہ میں رہا لیکن بعد میں چنڈیل راجا سور من نے اسے دوبارہ فتح کر لیا تھا۔ جب اموگھ ورش فوت ہو گیا تو 40-939 عیسوی میں کرشنا سوم راشٹر کوٹ تخت پر بیٹھا۔

3.4.11 کرشنا سوم (Krishna III)

کرشنا پہلے ہی اپنے آپ کو ولی عہد ثابت کر چکا تھا لہٰذا اس کی جانشینی پر امن طور پر ہوئی۔ کرشنا نے جنوب کی جانب توجہ مبذول کی۔ اس کا بہنوئی بٹوکا، گنگاوتی کے تخت پر بیٹھا ہوا تھا اور بانا کا شہزادہ وکرم آدتیہ اس کا حلیف تھا۔ اسے صرف چول راجا پرانتک سے خطرہ تھا جو ایک پر عزم حکمراں تھا۔ پرانتک نے بنالڑی کو فتح کر لیا تھا۔ لہٰذا کرشنا نے اپنی حکومت کے تیسرے سال میں وکرم آدتیہ سوم کے تخت کو محفوظ بنانے کے نام پر چول حکومت پر حملہ کر دیا۔ اس کا خفیہ ایجنڈہ جنوب کے زیادہ سے زیادہ علاقوں کو فتح کرنا تھا۔ کرشنا نے سارے ٹونڈئی منڈلم کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔ اس جنگ کے بعد یہ علاقہ اس کے دور اقتدار میں اس کے قبضے میں رہا۔ فیصلہ کن جنگ 949 عیسوی میں شمالی ارکاٹ ضلع کے ٹکّولم (Takkolam) میں ہوئی۔ بٹوکا نے چول ولی عہد وکرم آدتیہ کو مار ڈالا اور چول راجدھانی پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح کرشنا نے چول سلطنت کے شمالی حصے کو اپنے علاقے میں ضم کرنے کی کوششیں کیں۔ کرشنا نے وینگی کے تخت پر اپنی حلیف طاقت کو لانے کی بھی کوشش کی۔ اسی دوران جب کرشنا جنوب میں مصروف تھا تو شمال میں مشکلات پیدا ہونے لگیں جہاں سور من کے دور میں چنڈیلوں کا عروج ہوا

اورانہوں نے کالنجر کے قلعہ کو دوبارہ فتح کر لیا۔ کرشنا نے اپنی سلطنت کی شمالی سرحدوں پر ایک بڑی جاگیر دارانہ طاقت کے طور پر پرماروں کو ابھرنے کی چھوٹ دے کر ایک بڑی سیاسی غلطی کی تھی، جس کی وجہ سے اس نے جتنا جنوب میں حاصل کیا تھا اس سے زیادہ شمال میں کھونا پڑا۔ وہ ایک لائق حکمراں اور باصلاحیت سالار تھا کیوں کہ اس کے بغیر یہ تمام حصولیابیاں ناممکن تھیں۔



3.4.12 کھوٹیگا (Khotega)

کرشنا کا ایک بیٹا تھا لیکن وہ اپنے باپ سے پہلے ہی وفات پا چکا تھا اور اس کا پوتا ابھی حکمرانی سنبھالنے کے لائق نہیں تھا۔ لہٰذا کرشنا کے چھوٹے بھائی کھوٹیگا کو 968 عیسوی میں تخت نشیں کرایا گیا۔ کھوٹیگا کے دور اقتدار سے راشٹر کوٹوں کے زوال کے شروعات ہوئی۔ شمال میں کبھی ناقابل تسخیر سمجھے جانے والے راشٹر کوٹوں کو شمالی ہند کے پرمار راجاؤں کے ہاتھوں پہلی ہار کا سامنا کرنا پڑا اور راشٹر کوٹ فوج کی طاقت کا بھرم ٹوٹ گیا۔ کھوٹیگا کے ہمعصر مالوہ کے حکمراں ہرش دیو نے حملہ کر کے راشٹر کوٹ راجدھانی کو لوٹ لیا اور خوب قتل وغارت مچائی۔ ایسا لگتا ہے کہ شاید 972 عیسوی کے آس پاس کھوٹیگا بھی جنگ میں مارا گیا اور کرکا دوم تخت سلطنت پر بیٹھا۔

3.4.13 کرک دوم (Karka II)

کرک، کرشنااور کھوٹیگا کے چھوٹے بھائی نروپما کا بیٹا تھا۔اس نے بمشکل 18 ماہ حکمرانی کی۔973 عیسوی کے وسط میں چالکیہ سلطنت کے تیلادوم نے کرکا کو شکست دی اور اس خاندان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔راشٹر کوٹ ریاست کا اچانک خاتمہ کوئی طویل سیاسی عمل نہ تھا، جس طرح ایک فتح سے اس کی شروعات ہوئی اسی طرح ایک شکست سے اس کا زوال ہوا، مگر یہ بیحد تیزی کے ساتھ ہوا۔967 عیسوی میں کرشناسوم ہر لحاظ سے طاقتور تھا لیکن پھر بھی 973 عیسوی میں راشٹر کوٹوں کا خاتمہ ہو گیا۔

3.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

دور قدیم میں راشٹر کوٹوں نے جنوبی ہند کے ایک بڑے حصے پر حکومت کی۔ابتدا میں راشٹر کوٹ، چالکیوں کے جاگیر دار تھے لیکن بعد میں ان کو شکست دے کر خود حکمراں بن گئے۔دو صدیوں بعد بادامی کے چالکیوں نے نئی طاقت حاصل کی اور راشٹر کوٹوں کا خاتمہ کر دیا۔ راشٹر کوٹوں کا تعلق لاتور (مہاراشٹر کے موجودہ ضلع عثمان آباد) سے تھا۔ان کی مادری زبان کنڑ تھی۔ بادامی کے چالکیوں کے ابتدائی دور اقتدار میں راشٹر کوٹ ضلع افسران تھے جو بعد میں برار ہجرت کر کے جاگیر دار بن گئے تھے۔دنتی درگ راشٹر کوٹ ریاست کا بانی تھا۔نوجوان اور پر عزم ہونے کے باعث دنتی درگ نے چالکیوں کی کمزوری کا فائدہ اٹھایا۔ بادامی کے کیرتی ورمن دوم کو شکست دے کر وہ مہاراشٹر کا مالک بن گیا۔اس نے کوسل، سرپور کے اُدین، رائے پور کے پرتھوی ویا گرہ، بھڑوچ کے گرجروں، گجرات کے چالکیوں اور تلنگانہ کے کو داس پر کامیابی حاصل کی اور پلووں کے ساتھ اتحاد کر کے وہ راشٹر کوٹ کا سلطنت کا حقیقی بانی بن گیا تھا۔ اس نے خود کو مہاراج ادھیراج کا کہلوایا۔756 عیسوی میں اس کے مرنے کے بعد کرشنا اول تخت نشین ہوا۔اس نے کونکن، کرناٹک اور تلنگانہ کے بڑے حصے کا اپنی سلطنت میں الحاق کر کے اپنا علاقہ تین گنا بڑھا لیا تھا۔اس سے پورے دکن میں راشٹر کوٹ خاندان کا دبدبہ قائم ہو گیا۔772 عیسوی کے قریب اس کا سب سے بڑا بیٹا گووندا دوم تخت نشین ہوا۔ گووندا کو انتظامیہ سے زیادہ دلچسپی عیش و عشرت میں تھی لیکن اس کے چھوٹے بھائی دھروا کی نظریں تخت پر لگی تھیں۔780 عیسوی میں دھروا نے گووند کو شکست دی اور خود حکمراں بن گیا۔وہ راشٹر کوٹوں کے اہل ترین حکمرانوں میں سے تھا۔اس نے جنوب میں راشٹر کوٹوں عظمت بخشی اور شمالی ہند میں مہم جوئی کر کے راشٹر کوٹوں کو کل ہند طاقت بنایا۔اس کے بعد اس کا تیسرا بیٹا گووندا سوم تخت نشین ہوا۔اس نے علاقہ میں توسیع کے ساتھ ساتھ سلطنت کے وقار میں بھی اضافہ کیا۔اس کے دور میں راشٹر کوٹ ہندوستان میں ناقابل شکست رہے۔اس کی کامیابی کے اسباب اس کی دلیری سیاسی حکمت اور تنظیم کی صلاحیت تھی۔ گووندا سوم کے بعد اس کا بیٹا اموگھ ورش تخت پر بیٹھا۔تاجپوشی کے وقت اس کی عمر صرف 14 سال تھی۔اس کے عہد میں بہت سی بغاوتیں ہوئیں لیکن اپنے حامیوں کی مدد سے وہ اپنے تخت کو بچانے اور بحال رکھنے میں کامیاب رہا۔880 عیسوی میں اس کے بعد اس کا بیٹا کرشنا حکمراں بنا۔ وہ اپنے پیشروؤں کی طرح ایک لائق حکمراں نہیں تھا۔اس کی موت کے بعد اس کا پوتا اندرا سوم تخت نشین ہوا لیکن اس نے صرف پانچ سال حکومت کی۔اپنی مختصر مدت اقتدار میں بھی اس نے بہت سی فتوحات حاصل کیں بعد ازیں اس کا بیٹا اموگھ ورش تخت سلطنت پر بیٹھا لیکن ایک سال کے اندر ہی اس کی وفات ہو گئی۔918 عیسوی میں اس کا بھائی گووندا چہارم تخت نشین ہوا مگر اسے زندگی کے عیش و آرام میں زیادہ دلچسپی تھی۔اس وجہ سے

راشٹر کوٹوں کے کچھ علاقے پر چالکیوں نے قبضہ کر لیا۔ گووندا کے بعد اس کی سلطنت اس کے چچا اموگھ ورش سوم کے پاس چلی گئی جس نے کچھ فتوحات کیں لیکن وہ جلد ہی وفات پا گیا اور اس کے بعد کرشنا سوم تخت نشین ہوا۔ اس نے چولوں کے ایک شمالی علاقے کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا لیکن اس کے ساتھ ہی اپنے شمالی علاقوں کو گنوا دیا۔ 968 عیسوی میں اس کا چھوٹا بھائی کھوٹیگا تخت پر بیٹھا جس کے دور میں راشٹر کوٹ حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

3.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

راشٹر	:	علاقہ
کوٹ	:	سر براہ یا رہنما
یووراج	:	شہزادہ
دِگ وجے	:	فتح عظیم

3.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

3.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. راشٹر کوٹ خاندان کا بانی کون تھا؟

(a) دنتی درگ (b) کرشنا اول (c) اموگھ ورش (d) گووند سوم

2. دنتی درگ کس خاندان کا ماتحت جاگیر دار تھا؟

(a) چالکیہ خاندان (b) پال خاندان (c) پلہو خاندان (d) گپت خاندان

3. کس راشٹر کوٹ حکمراں نے ایلورا میں کیلاش مندر تعمیر کرایا؟

(a) دنتی درگ (b) کرشنا اول (c) اموگھ ورش (d) گووند دوم

4. جین دھرم کی کتاب ''پرشن اتر رتن مالیکا'' کس سے منسوب ہے؟

(a) دنتی درگ (b) کرشنا اول (c) اموگھ ورش اول (d) اندرا سوم

5. مانیہ کھیت میں ایک نئی راجدھانی کس حکمراں نے بنوائی؟

(a) دنتی درگ (b) اموگھ ورش اول (c) کرشنا دوم (d) گووند سوم

3.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. راشٹر کوٹ خاندان کے پس منظر اور اصل کے بارے میں ایک مختصر نوٹ تحریر کیجیے۔
2. راشٹر کوٹ حکومت کی بنیاد پر ایک مختصر نوٹ تحریر کیجیے

3. کرشنااول کے بارے میں بتائیے۔
4. دھرواد ھاراور شاکی سیاسی کامیابیوں پر روشنی ڈالیے۔
5. کرشنادوم کے اوپر ایک نوٹ لکھیے۔

3.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. گووندا سوم کے عہد حکومت پر ایک تفصیلی مضمون قلم بند کیجیے۔
2. اموگھ ورش کی خدمات کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
3. راشٹر کوٹ سلطنت کی توسیع پر ایک تفصیلی مضمون تحریر کیجیے۔

اکائی 4۔ عربوں کی آمد

(Advent of the Arabs)

اکائی کے اجزا

4.0		تمہید
4.1		مقاصد
4.2		عرب وہند کے تعلقات
4.3		سندھ پر عربوں کے حملے
4.4		سندھ میں عرب حکومت
	4.4.1	محمد بن قاسم اور سندھ کی فتح
	4.4.2	سندھ کے دیگر والیان
	4.4.3	منصورہ کے عرب
	4.4.4	ملتان کی اسماعیلی ریاست
4.5		سندھ میں عرب انتظامیہ
4.6		عرب فتوحات کے نتائج
4.7		اکتسابی نتائج
4.8		کلیدی الفاظ
4.9		نمونہ امتحانی سوالات

4.0 تمہید (Introduction)

ہندوستان اور عرب کے درمیان قدرتی جغرافیائی محلِ وقوع کے باعث تجارتی اور ثقافتی تعلقات انتہائی قدیم دور سے قائم تھے۔ عرب تاجر زمانہِ قدیم ہی سے بحری اور خشکی کے راستوں سے ہندوستانی مال، جیسے مصالحے، کپڑے، اور دیگر قیمتی اشیا، عرب اور پھر وہاں سے یورپ تک پہنچاتے تھے۔ان تجارتی تعلقات کے ساتھ ساتھ علمی تبادلے کا بھی آغاز ہوا۔تاہم،اسلام کے ظہور اور عربوں کی ایک عالمی طاقت بننے کے بعد ان تعلقات میں ایک نیا سیاسی پہلو شامل ہو گیا۔سندھ کے بحری قزاقوں کی جانب سے اسلامی جہازوں کی لوٹ مار اور مقامی راجاؤں کی طرف سے باغیوں کو پناہ دینے کے واقعات نے عربوں کو سندھ پر فوجی کارروائی کرنے پر مجبور کیا۔اسی پس منظر میں 711ء میں محمد بن قاسم کی قیادت میں سندھ فتح ہوا۔اس اکائی میں ہم عرب و ہند کے قدیم تجارتی روابط، محمد بن قاسم کی مہمات، سندھ میں عرب گورنروں کے ادوار اور عربوں کے قائم کردہ روادارانہ انتظامی، معاشی اور عدالتی نظام کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔

4.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- عرب اور ہندوستان کے قدیم تجارتی، ثقافتی اور جغرافیائی تعلقات کی نوعیت اور وسعت کو سمجھ سکیں گے۔
- ہندوستان پر عربوں کے حملوں کے بنیادی اسباب اور محمد بن قاسم کی فتوحات کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- محمد بن قاسم کے بعد سندھ کے عرب گورنروں، منصورہ کے ہباری خاندان اور ملتان کی اسماعیلی ریاست پر روشنی ڈال سکیں گے۔
- سندھ میں عربوں کے وضع کردہ انتظامی ڈھانچے، معاہدہِ برہمن آباد کی اہمیت، اور غیر مسلموں (ذمیوں) کے ساتھ ان کی مذہبی رواداری کا جائزہ لے سکیں گے۔
- عربوں کے محصولاتی نظام (زکوٰۃ، عشر، جزیہ، خراج) اور مقامی عدالتی نظام کی خوبیوں کو بیان کر سکیں گے۔
- عرب فتوحات کے نتیجے میں برصغیر میں ہونے والے وسیع تر علمی و ثقافتی تبادلوں کے دوررس اثرات کو جان سکیں گے۔

4.2 عرب وہند کے تعلقات (Relations between Arabs and India)

ہندوستان کا جنوبی حصہ یعنی جنوبی ہندوستان قدرتی طور پر کچھ ایسا واقع ہے کہ اس کے سامنے بحر عرب کے دوسرے سرے پر عمان، اس کے دائیں خلیج فارس اور اس کے بائیں خلیج عدن ہے، عدن یمن کا پرانا بندر گاہ ہے اور حضر موت، گجرات کے سامنے واقع ہے جب کہ بحرین خلیج فارس کا بحری مرکز ہے۔پس ان طبعی سہولتوں کے باعث ہندوستان اور عرب میں تعلقات کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر ہے، چنانچہ تاریخی شہادتوں سے اس کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔یہ ملک عربوں کو اس قدر پیارا تھا کہ اس کے نام (ہند) کو انہوں نے عشق و عاشقی کا موضوع قرار دیا اور یہ حالت اغالباً تجارتی تعلقات کی کثرت کی بنا پر پیدا ہوئی ہو گی، کیوں کہ ہندوستان ہمیشہ سے قوموں کی نگاہوں میں تجارت کا مرکز رہا ہے، یہ تاجر ہندوستان سے تجارتی مال جہازوں کے ذریعہ ہندوستانی بندر گاہوں سے لے کر یمن پہنچاتے اور وہاں سے بحر احمر کے

کنارے کنارے خشکی کے راستہ یہ مال شام جاتا جہاں سے بحر روم ہو کر مصر اور یورپ میں فروخت ہوتا۔

2000ق م میں عرب تاجر جیسے کنعانی، آرامی اور فنیقی وغیرہ جہاز رانی کے ذریعہ تجارت کرنے میں بڑے ماہر تھے، دراصل یہ بحرین کے رہنے والے تھے، جو شام میں جا کر آباد ہو گئے، وہ بحر روم کے کنارے کنارے یونان پہنچتے اور وہاں سے یورپ چلے جاتے، اسی طرح مشرق میں بحرین، یا بحر احمر کے ذریعہ ایران اور ہندوستان کے ساحل بہ ساحل، چین تک اپنا مال لے جاتے اور پھر وہاں کی چیز یورپ پہنچاتے۔ 1000ق م میں یمن کی ایک قوم سبا نے بھی اس تجارت میں کافی حصہ لیا، جنوبی ہندوستان سے ان کے تجارتی تعلقات بڑے وسیع تھے، یہ ہندوستان سے چمڑا، زین، پوست، گلنگہ (ایک قسم کی خوشبو دار پتی) جاوتری، آبنوس، کچھوے کی ہڈی، کباب چینی، محمل، رانگا، لوبان، بید، مصبر، ہاتھی کے دانت، مختلف نباتات کے تاروں کا کپڑا، ہلدی، لونگ الائچی، سیاہ مرچ، دار چینی، ڈلی، ناریل، املی، خصوصیت سے لے جا کر غیر ممالک میں فروخت کرتے، چنانچہ بعض چیزوں کے نام جو عربی میں سنسکرت سے آئے ہوئے موجود ہیں، وہ اس کی شہادت میں پیش کئے جا سکتے ہیں، مثلاً مشک، فلفل، کافور. زنجبیل، صندل، نارجیل، قرنفل، جائفل وغیرہ

اسی طرح بعض ناموں کے ساتھ لفظ ہندی لگانے سے اس کا ثبوت ملتا ہے، جیسے عود ہندی، قسط ہندی، تمر ہندی، لوہے کے سامان میں سے خالص فولاد کی تلوار، ہندوستان ہی سے جاتی تھی، اس لئے عربی میں ہندی اور مہند تلوار کے وصف کے طور استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اور چیزیں بھی یہ تاجر ہندوستان سے باہر لے جاتے تھے، چنانچہ مورخ جوزیفس نے لکھا ہے کہ سوپارہ (متصل بمبئی) اور رورکھ (متصل بھروچ) بندرگاہ سے حضرت سلیمان کے عہد میں (950ق م) ہاتھی کے دانت بندر، مور وغیرہ کی فلسطین میں تجارت ہوتی تھی۔ کپڑوں کی تجارت بھی ان عربوں کا محبوب مشغلہ تھا، ہندوستانی کپڑوں میں ململ چھینٹ اور رومال خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، جن کو عربی میں قرفس (کرپاس یا کپاس) شیث اور فوطہ لکھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مصر کی ممی میں بعض کپڑے ہندوستان کے بنے ہوئے ہوئے ملے ہیں، جس سے ہندوستان کی وسیع پیمانہ پر تجارت کا پتہ چلتا ہے۔ بحری راستہ کے علاوہ خشکی سے بھی یہ لوگ تجارت کرتے تھے، چنانچہ سندھ سے بلوچستان اور وہاں سے ایران ہو کر یہ لوگ پہلے بابل پہنچتے اور پھر وہاں سے شام جاتے۔ ساتویں صدی ق م تک یہ تعلقات وسیع پیمانہ پر قائم تھے۔ ہندوستان سے بابل اور بابل سے ہندوستان بکثرت آمد و رفت تھی، جس کی شہادت آثار قدیمہ سے اب بکثرت مل رہی ہے۔

عربوں کے ہندوستان سے صرف تجارتی تعلقات نہیں تھے، بلکہ علمی بھی تھے، 800ق م سے پہلے ہندوستان میں لکھنے کا رواج نہیں تھا، یہی عرب تاجر جو خشکی (بابل) اور تری دونوں طرف سے حروف ہندوستان میں لائے اور اسی سبب سے خاندان موریہ اور خاندان آندھرا کے کافی کتبات آرامی حروف میں نظر آتے ہیں، اسی طرح حساب کا طریقہ بھی قدیم دور میں آرامی طرز کا تھا، اشوک کے کتبات اس کی شہادت میں پیش کئے جا سکتے ہیں، یہ حروف داہنے طرف سے بائیں جانب کو لکھے اور پڑھے جاتے تھے، ان کو "آرین پالی" کہتے ہیں اور خروشٹی بھی کہا جاتا ہے، ساتویں صدی ق م میں ہندوستان کے لوگ عربی سے بھی واقف تھے اور غالباً آمد و رفت کی کثرت اور تجارتی ضروریات کی بنا پر اس زبان سے کچھ لوگ آشنا تھے۔ عہد اسلام میں یہ تعلقات اور زیادہ وسیع ہو گئے، مسلمان عربوں نے بہت سی کتابوں کا

ترجمہ سنسکرت سے عربی میں کرایااور کیا۔ بغداد میں اس کے لئے خاص محکمہ قائم تھا، بڑے بڑے پنڈتوں اور ویدوں (حکیم) کو ہندوستان سے بغداد بلایا گیا، ان میں سے منکہ (مانک)، بجے کر، کلپ داے، سند باد، بہلہ کا بیٹا، اور دھنہ کا بیٹا مشہور لوگ تھے۔

سیاسی اعتبار سے یہ واقعہ بھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ شہنشاہ ایران کا بلوچستان اور سندھ پر اکثر قبضہ رہا تھا، اس تعلق سے بعض ہندوستانی جنگجو قبیلے ایرانی فوج میں بھرتی ہو کر ایرانیوں کے دوش بدوش دشمنوں سے لڑتے تھے۔ ان میں سندھ کی جاٹ اور مید قوم زیادہ ممتاز رہیں۔ چنانچہ ابتدائی اسلامی دور میں جب عربوں کی ایرانیوں سے لڑائی ہوئی تو ایرانی فوج میں یہ بھی شامل تھے۔ ایران کے فتح ہو جانے کے بعد یہ لوگ مسلمان ہو کر مسلمانوں کے قوت بازو بن گئے، غرض جب مسلمان ایران کے حکمراں بن گئے تو سرحدی معاملات اور اتفاقی امور کے علاوہ قدرتی طور پر ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ایران کے حکمراں ہونے کی حیثیت سے سندھ اور بلوچستان پر ان کا قبضہ رہے۔ تجارتی لحاظ سے بھی ایک بندرگاہ کی ضرورت تھی، جو عرب سے متصل ہو اور لنکا جانے والے تجارتی جہازوں کی حفاظت اس کے ذریعہ سے کی جا سکے، سندھ کا مشہور بندرگاہ 'دیبل' (کراچی) ان امور کے لئے بہت زیادہ موزوں تھا۔ اس کے علاوہ اکثر باغی اسلامی علاقوں سے بھاگ کر سندھ میں پناہ لیتے اور وہاں کا راجا ان کی مدد کرتا تھا، جس کے باعث ملک میں بد نظمی پیدا ہو جاتی۔ سندھ اور کاٹھیاواڑ کے سواحل پر بہت سے بحری ڈاکو تھے، جو اسلامی جہازوں پر چھاپے مارتے تھے، ان اسباب سے سندھ پر قبضہ کرنا عربوں کے لیے ضروری ہو گیا تھا۔

4.3 سندھ پر عربوں کے حملے (Arab Invasions of Sindh)

عرب کے ملک میں دنیا کے دو مشہور پاک شہر ہیں، ان میں سے ایک کا نام مکہ اور دوسرے کا نام مدینہ ہے، شروع میں اسلام کی طاقت انہیں دونوں شہروں میں پیدا ہوئی اور بڑھی۔ مکہ میں اسلام کے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا انتقال پہلے ہی ہو چکا تھا اور چند برس کے بعد آپ کی والدہ بھی وفات پا گئیں، اب آپ اپنے دادا عبد المطلب کے پاس رہنے لگے اور ان کے بھی رحلت کر جانے پر اپنے بزرگ چاچا ابو طالب کے ساتھ ایک عرصہ تک رہے۔ 25 برس کی عمر میں آپ نے حضرت خدیجہ سے شادی کی، چالیس برس کی عمر سے آپ پر قرآن اترنا شروع ہوا اور آپ پیغمبر ہوئے۔ اس دن سے آپ بارہ برس تک مکہ میں لوگوں کو خدا کا وعظ سنا سنا کر اسلام کی منادی کرتے رہے، جب مکہ میں مشرکوں اور کافروں نے آپ کو بہت ستایا تو خدا کے حکم سے آپ مدینہ چلے گئے۔ آپ کے مدینہ پہنچنے پر آہستہ آہستہ سارے مسلمان یہاں جمع ہو گئے اور انہوں نے مل کر بڑی طاقت پیدا کر لی۔ چنانچہ دس برس میں تمام عرب مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا، یہاں تک کہ پیغمبر اسلام نے 632 عیسوی میں مدینہ میں وفات پائی۔

آپ کی وفات کے بعد عام مسلمانوں کی رائے سے حضرت ابو بکر صدیق آپ کے جانشین یعنی خلیفہ ہوئے، اس وقت سے مسلمانوں نے عراق اور شام کے بادشاہوں پر حملہ شروع کیا۔ دو ڈھائی برس کے بعد جب حضرت ابو بکر نے بھی وفات پائی تو مسلمانوں نے حضرت عمر کو خلیفہ بنایا۔ ان کے زمانہ میں شام و مصر اور ایران کا بہت بڑا حصہ فتح ہوا۔ 636ء میں عمان اور بحرین کے گورنر عثمان ابن ابی عاص نے اپنے بھائی حکم ثقفی کو ہندوستانی بحری مہم کے لیے بھیجا، جہاں حکم نے پہلے تھانہ (علاقہ بمبئی) پر حملہ کیا اور پھر کچھ دنوں کے بعد بھروچ پر فوج کشی

کی۔اسی زمانہ میں مغیرہ نے دیبل (دیول سندھ کا بندرگاہ) پر حملہ کیا، تیسرے خلیفہ حضرت عثمان کے عہد میں حکیم ابن جبلہ سرکاری طور پر ہندوستان کے متعلق تحقیقات کر کے واپس چلے گئے۔

663ء میں امیر معاویہ نے مہلب کو بھیجا جنہوں نے بڑی خوبی سے سرحد کا انتظام کیا۔اس وقت سے سرحدی انتظامات کے لئے یہ ایک مستقل عہدہ ہو گیا، سرحد اور سندھ کے مفتوحہ علاقے ان کی نگرانی میں رہتے تھے، مہلب کے بعد یکے بعد دیگرے مختلف لوگ اس عہدہ پر مقرر ہوتے رہے۔705ء میں جب ولید بن عبدالملک دمشق میں بادشاہ ہوا، تو حجاج بن یوسف ثقفی عراق کا حاکم تھا، جس کے ماتحت بلوچستان ، مکران اور سندھ کے سرحدی علاقے بھی تھے۔اس وقت تک عرب حکومت، ایشیا، یورپ اور افریقہ میں پھیلی چکی تھی، اس لئے خلیفہ کے دربار میں ہر ملک کے بادشاہ ہدیہ کے ساتھ اپنے سفیر بھیجتے رہتے تھے۔ لنکا کا راجہ بھی انہیں میں سے تھا، جو دربار خلافت سے سیاسی یا اخلاقی ربط بڑھانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اتفاقی طور پر اس کو اس کا موقع مل گیا، یعنی لنکا میں جو عرب تاجر رہتے تھے ان کے مر جانے پر راجہ نے ان کی عورتوں کو اپنے تحفوں کے ساتھ حجاج بن یوسف کی درمیانگی سے خلیفہ کے پاس روانہ کیا۔ان جہازوں کو سندھیوں نے دیبل (کراچی) کے پاس لوٹ لیا۔جب اس کی خبر حجاج کو ملی تو اس نے سندھ کے راجہ داہر کو اس کی طرف توجہ دلائی اور شریف عرب خواتین کی واپسی کا مطالبہ کیا۔راجہ داہر نے جواب دیا کہ یہ کام بحری قزاقوں کا ہے اور وہ میرے دسترس سے باہر ہیں۔ایک روایت یہ ہے کہ اس نے کہا کہ جن لوگوں نے انہیں لوٹا ہے وہ تم سے بہت بڑھ کر ہیں۔بحر حال عرب اور سندھ میں جنگ ناگریز ہو چکی تھی۔

4.4 سندھ میں عرب حکومت (Sindh under the Arab Rule)

4.4.1 محمد بن قاسم اور سندھ کی فتح (Muhammad bin Qasim and the Conquest of Sindh)

حجاج نے سرحد کے افسر عبداللہ کو لکھا کہ دیبل کا بحری راستہ چونکہ مسلمانوں کے لئے خطرناک ہے، اس لئے فوج لے جا کر امن قائم کرو اور قیدیوں کو چھڑا کر لاؤ۔سندھیوں سے جنگ میں سالار عبداللہ شہید ہو گئے۔ان کی جگہ بدیل بجلی کو مقرر کیا گیا، مگر وہ بھی میدان جنگ میں گھوڑے کے ٹھوکر کھانے سے گر گئے جس کے بعد انہیں بھی دشمن نے قتل کر دیا۔تب حجاج نے محمد بن قاسم ثقفی کو پوری تیاری کے ساتھ شیراز کے راستہ سے روانہ کیا۔ محمد بن قاسم 711ء میں جمعہ کے دن دیبل پہنچا، سمندر کے راستہ سے بھی لڑائی کا سامان آ گیا اسی میں وہ منجنیق بھی تھی، جس کا نام 'العروس' تھا اور جس کو پرانے زمانہ کی توپ سمجھنا چاہئے۔وہ پانچ سو آدمی کی طاقت سے چلائی جاتی تھی۔سب سے پہلے محمد بن قاسم نے اسی منجنیق کے ذریعہ دیبل کا قلعہ فتح کیا۔ پھر آگے قدم بڑھا کر نیروں (موجودہ پاکستان میں حیدرآباد) کو فتح کیا، اس کے بعد آہستہ آہستہ اس نے سندھ پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ محمد بن قاسم تین برس کے اندر کشمیر کی حد سے لے کر ''کچھ ''تک اور سمندر (بحر عرب) سے سرحد مالوہ راجپوتانہ، مارواڑ اور دریائے راوی کے کنارے تک فتح کر کے کنوج (سندھ کی ایک چھوٹی سی ریاست) کی طرف بڑھا، اس وقت اس کے پاس پچاس ہزار فوج تھی جس میں زیادہ تعداد ہندوستانیوں کی تھی۔714ء میں خلیفہ ولید نے وفات پائی اور اس کی جگہ اس کا بھائی سلیمان تخت پر بیٹھا۔اس وقت تک حجاج تو مر چکا تھا جو مشرقی علاقہ کا والی تھا، مگر اس کے ماتحت حاکم، والی سندھ محمد بن قاسم، والی

ترکستان قتیبہ بن مسلم، والی افریقہ وفاتح سندھ موسیٰ وغیرہ زندہ تھے اور یہی وہ لوگ تھے، جو سلیمان کے خلیفہ ہونے کے مخالف تھے۔ سلیمان نے خلیفہ ہو کر ان سب سے بدلہ لیا، چنانچہ اس کے حکم سے 714ء میں محمد بن قاسم کو معزول کر کے واپس عراق بلالیا گیا اور فاتح سندھ کو اپنے تمام خاندان کے ساتھ 'واسط' کے قید خانہ میں عرصہ تک قید رکھ کر خلیفہ کے خلاف سازش کے جرم میں قتل کر دیا گیا۔ اسی سے معلوم ہوا کہ راجہ داہر کی دو بیٹیوں کا جو قصہ عام تاریخوں میں درج نظر آتا ہے وہ سرتاپا غلط ہے۔

4.4.2 سندھ کے دیگر والیان (Other Governors of Sindh)

محمد بن قاسم کے بعد ایک کے بعد ایک سندھ کے والی مقرر ہوتے رہے، ان والیوں میں جنید خاص کر ذکر کے قابل ہے۔ یہ 725ء میں سندھ کا والی ہوا۔ یہ بڑا بہادر اور مدبر تھا۔ سندھ کا معقول بندوبست کر کے سرحدی معاملات کے، کے قطعی فیصلے کے لئے گوجروں کے ملک کی طرف بڑھا۔ سندھ سے پہلے مرمد (ماڑوار) آیا اور یہاں سے مانڈل (ویرم گام) کے پاس اور پھر دھنج (پٹن کے پاس) پہنچا اور وہاں سے بھروچ بندرگاہ گیا۔ حبیب نامی جنید کے ایک افسر نے اجین (مالوہ) پر دھاوا کیا، وہاں سے بہریمد (سرحد ماڑوار) اور پھر بھیلمان (گوجروں کا پایہ تخت) کو فتح کرتے ہوئے مال غنیمت لے کر سندھ واپس آگیا۔ اسی عہد میں شہر چنپائت (بیاس ندی سے مغرب جانب دس میل پر) کی ریاست مطیع ہوئی اور سندھ کی مملکت میں مقبوضات کا اضافہ ہوا۔

جنید کے بعد تمیم اور پھر حکم بن عوانہ کلبی سندھ کے والی ہو کر آئے۔ حکم نے یہاں ایک نیا شہر 'محفوظہ' بسایا۔ حکم کے بعد محمد بن قاسم کا لڑکا عمر بن محمد بن قاسم سندھ آیا۔ اس نے دوسرا شہر منصورہ آباد کیا جو صدیوں سندھ کا پایہ تخت رہا۔ عمر بن محمد کے بعد یزید عرار سندھ کا حاکم ہوا۔ اسی زمانہ میں ایک شخص منصور بن جمہور باغی ہو کر سندھ پر قابض ہو گیا۔

749ء میں اموی خاندان کی جگہ عباسی خاندان برسر عروج ہوا جس نے ملک عراق میں بغداد کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ عباسی عہد میں سب سے پہلے مغلس کو سندھ بھیجا گیا، جو جلد ہی مارا گیا، پھر موسیٰ بن کعب تمیمی آیا، جس نے باغی منصور بن جمہور کو شکست دے کر سندھ پر دوبارہ قبضہ حاصل کیا۔ تمیمی کے بعد عیینہ اور پھر عمر بن حفص والی سندھ بنائے گئے۔ چونکہ یہ سادات کا بڑا حامی تھا اس لئے سندھ میں بھی ان کا اثر قائم ہو گیا اور شیعیت کی بنیاد اسی وقت سے سندھ میں پڑی۔ 757ء میں عباسی خلیفہ منصور کے حکم سے ہشام والی ہو کر آیا، جس نے عمر بن حمل کو جہازوں کے بیڑے کا کپتان بنا کر گجرات کے بندرگاہوں پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کیا۔ وہ لوٹ مار کر کے واپس آگیا۔ ہشام کو اس سے اطمینان نہ ہوا۔ وہ خود ایک بیڑا لے کر گندھار (متصل بھروچ) بندرگاہ پر حملہ آور ہوا اور اپنی فتح کی یادگار میں یہاں ایک مسجد بنوائی۔ یہ گجرات میں مسلمانوں کی پہلی مسجد ہے، واپس آکر اس نے کشمیر کا سرحدی علاقہ بھی فتح کر لیا۔ خلیفہ نے اس کی اعلیٰ لیاقت دیکھ کر کرمان کا صوبہ بھی اس کے سپرد کر دیا۔

775ء میں خلیفہ مہدی کے حکم سے عبدالملک نے گجرات پر حملہ کیا اور 760ء میں اس نے بھاڑ بھوت (متصل بھروچ) پر قبضہ کر لیا لیکن اتفاق سے یہاں وبا پھیل گئی، جس سے ایک ہزار مسلمان مر گئے۔ 777 میں کئی حاکموں کے بعد مصبح بن عمر تغلبی سندھ کا حاکم مقرر

ہوا،اسی کے عہد سے یمنی اور حجازی کا جھگڑا شروع ہوا جس نے سندھ کی عرب حکومت کو سخت نقصان پہنچایا۔780ء میں لیث سندھ کا حاکم بنا جسے دو برس تک جاٹوں نے بہت ستایا، 781 میں جب بصرہ سے تازہ دم عرب فوج آئی تب جا کر یہ فساد ختم ہوا۔786ء میں ہارون الرشید کے زمانہ میں طیفور حمیری حاکم ہو کر آیا۔اس کے عہد میں حجازیوں اور یمنیوں کا جھگڑا بہت بڑھ گیا،اس لئے اس کو معزول کر کے متواتر کئی حاکم بھیجے گئے، مگر کسی سے سندھ کا معقول بندوبست نہ ہو سکا۔ آخر میں 800ء میں داؤد مہلبی کو یہ علاقہ سپرد کیا گیا۔ پہلے تو اس کا بھائی مغیرہ آیا، مگر سندھی عربوں نے اس کی دال نہ گلنے دی، مجبوراً داؤد خود سندھ پہنچا اور تمام سندھ کا معقول بندوبست کیا۔اس نے نزاریوں (حجازی) کی طاقت توڑی اور ان کو ملک میں منتشر کر دیا۔اسی زمانہ میں ہارون الرشید کی طلب پر ہندوستان سے 802ء میں "کنگا" نامی ایک طبیب (وید) بغداد گیا تھا اور ایک اور طبیب منکہ نامی تھا جس کے علاج سے خلیفہ بیماری سے اچھا ہوا تھا۔

820ء میں بیس برس حکومت کر کے بڑی نیک نامی کے ساتھ داؤد بن یزید بن حاتم مہلبی دنیا سے رخصت ہو گیا۔ خلیفہ مامون الرشید نے اس کے لڑکے بشر کو باپ کی جگہ پر بحال رکھا،چند سال کے بعد اس نے باغیانہ رویہ اختیار کیا،اس لئے حاجب بن صالح کو روانہ کیا گیا جو ناکام واپس آیا۔آخر مامون نے عنسان تغلبی کو سندھ روانہ کیا، وہ 828ء میں منصورہ پہنچا۔ بشر نے اطاعت قبول کر لی۔عنسان نے تمام معاملات درست کر کے موسیٰ برمکی کو خلیفہ کے حکم کے مطابق سندھ سپرد کر دیا اور عراق چلا گیا۔835 میں موسیٰ مر گیا اور اس کا لڑکا عمران بن موسیٰ سندھ کا حاکم مقرر ہوا۔ عمران باپ کی جگہ مقرر ہو کر بڑی مستعدی سے سندھ کا انتظام کرنے لگا۔

قیقان کے جاٹ جو باغی ہو گئے تھے،ان کو تابعدار بنایا اور ان کی سرکشی روکنے کے لئے ایک چھاؤنی قائم کی۔اس کا نام "بیضا" رکھا، قندابیل کے سرکشوں کو بھی زیر کیا جس کے بعد دوبارہ جاٹوں کی خبر لی اور سخت سزا دے کر مید کی طرف روانہ ہونے کا فیصلہ کیا۔ عمران اس سرکش قوم کو زیر کرنے میں مصروف ہی تھا کہ پھر حجازی اور یمنی جھگڑا شروع ہو گیا۔ حجازیوں کا ایک سردار عمر بن عبدالعزیز ہباری اچانک والی سندھ پر آپڑا اور اسے قتل کر دیا۔ عمران کے مرنے پر 850ء میں عنبسہ بن اسحاق ضبی حاکم ہوا، مگر اس کا سارا وقت ان باغیوں سے لڑنے میں صرف ہوا، جو عمران کے قتل کے بعد سے متعدد علاقے دبائے بیٹھے تھے،اس نے اپنے آخری عہد میں ایک بڑا قید خانہ تیار کیا اور دیبل کی فصیل، سڑک اور مکانات کی درستی میں بڑی دلچسپی سے وقت صرف کیا۔851 میں ہارون سندھ کا حاکم ہوا، مگر اس نے حجازیوں اور یمنیوں کا توازن قائم نہیں رکھا،اس کا خطرناک نتیجہ یہ نکلا کہ 854 میں حجازیوں کے سردار عمر بن عبدالعزیز ہباری نے اس کو قتل کر دیا اور شہر پر قبضہ کر کے خلیفہ متوکل سے یہ درخواست کی کہ سندھ کا صوبہ اگر اس کے سپرد ہو تو اس کا بہترین انتظام کرے گا، چنانچہ خلیفہ متوکل نے اس کی درخواست قبول کر لی۔

4.4.3 منصورہ کے عرب (The Arabs of Mansura)

منصورہ کے ہباری خاندان کا باقی عمر بن عبدالعزیز بن منذر بن زبیر بن عبدالرحمن بن ہبار بن اسود ہے۔ عرصہ سے یہ خاندان سندھ میں آباد تھا اور سندھی عربوں میں سب سے زیادہ ممتاز تھا۔ منصورہ سے تھوڑے فاصلہ پر "بانیہ" ایک جگہ ان کا وطن تھا۔اس نے آہستہ آہستہ

طاقت پیدا کی، یہاں تک کہ 854ء میں سندھ کا حاکم بن گیا، جو برائے نام خلیفہ کا ماتحت تھا۔ اس نے اپنا پایہ تخت منصورہ ہی کو قائم رکھا 883ء میں اس کا لڑکا عبداللہ بن عمر تخت پر بیٹھا، لیکن 892ء میں ایک عام بلوہ ہو گیا اور صمہ جو بنو کندہ کا غلام تھا، سندھ پر قبضہ کر بیٹھا۔ کچھ دنوں کے بعد عبداللہ نے اپنی حالت سنبھالی اور اپنا موروثی ملک غاصب سے چھین کر پھر سندھ کا مالک ہو گیا۔ بنو سامہ کا خاندان عمان میں آباد تھا اس کی شاخ بنو منبہ ملتان میں بس گئی تھی، غالباً اس قسم کی بدامنی سے فائدہ اٹھا کر ملتان کے بنو منبہ نے 902ء میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا، اس وقت سے سندھ کے دو حصے ہو گئے، شمالی حصہ کا پایہ تخت ملتان ہوا اور جنوبی حصہ کا منصورہ 912ء میں ملتان کا حاکم ابوالملباب منبہ بن اسد قریشی تھا۔ 915ء میں عبداللہ کے بعد اس کا لڑکا عمر بن عبداللہ ہباری منصورہ میں تخت پر بیٹھا اور اسی طرح 985ء تک تک یکے بعد دیگرے کئی حکمراں ہوتے رہے لیکن اسی وقت سے اسماعیلیوں کا اثر بڑھنے لگ گیا تھا۔ تب بھی 1010ء تک یہ خاندان حکومت کرتا رہا۔

4.4.4 ملتان کی اسماعیلی ریاست (The Ismaili State of Multan)

اسماعیلی شیعوں کا ایک فرقہ ہے، جو اس زمانہ میں مصر اور شمالی افریقہ پر قابض تھا، ان کا امام مصر کے پایہ تخت قاہرہ میں رہتا تھا، نسب کے لحاظ سے وہ فاطمی یعنی حضرت فاطمہ کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ ان کے داعی اور مبلغ عباسیوں کے دور دست صوبوں میں جا کر اپنا مذہب پھیلاتے تھے۔ 883ء میں مصر کے فاطمی حکمراں عبیداللہ المہدی کے زمانہ میں ہیثم نامی ان کا پہلا داعی سندھ میں آیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے داعی آتے رہے اور ملک کو انقلاب کے لئے تیار کرتے رہے، یہ لوگ اپنا کام بہت ہی مخفی طور پر انجام دیتے تھے۔ ان کو قاہرہ سے تمام احکام ملتے تھے۔ یہاں تک کہ فاطمی حکمراں عبدالعزیز باللہ فاطمی المتوفی کے عہد میں جلم بن شیبان کو فوجی مدد کے ساتھ سندھ بھیجا گیا، جس نے اچانک سندھ میں حملہ کر کے بنو سامہ قریشی سے 977ء میں ملتان کی حکومت چھین لی اور خود وہاں کا حکمراں بن بیٹھا۔ سندھ میں پہلا اسماعیلی حاکم جلم بن شیبان ہے جس نے ملتان پر قبضہ کر کے فاطمی خلیفہ کا سکہ اور خطبہ جاری کر دیا۔ ملتان کے اس پرانے مندر کو جس کو محمد بن قاسم کے زمانہ سے اس وقت تک کسی مسلمان گورنر نے نہیں چھوا تھا، اس نے گرا کر جامع مسجد بنا ڈالا اور محمد بن قاسم کے زمانہ کی جامع مسجد جو موجود تھی، اس کو بند کرا دیا۔ اس نے اپنے مذہب کی تبلیغ کے ساتھ سلطنت کو بہت مضبوط بنایا۔ آس پاس کے ہمسایہ ہندو راجاؤں سے ربط و ضبط بڑھا کر ایک دوسرے کی امداد کرنے کا معاہدہ کر لیا۔ 985ء میں شیخ حمید تخت پر بیٹھا، پھر شیخ نصر متوفی (999ء)۔ اس کے بعد اس کا لڑکا ابوالفتوح داؤد تخت پر بیٹھا۔ اس نے لاہور کے راجہ جے پال کو محمود غزنوی کے مقابلے میں فوجی امداد دی تھی۔ اس جرم میں سلطان محمود غزنوی نے 1010 میں ملتان فتح کر کے داؤد کو غزنی لے گیا، جہاں کچھ دنوں کے بعد وہ مر گیا، اسماعیلی یہاں سے بھاگ کر غالباً منصورہ پہنچے اور اچانک منصورہ پر قابض ہو گئے۔ 1025ء میں محمود غزنوی نے ریاست منصورہ پر بھی قبضہ کر لیا اور اس وقت سے سندھ کا کل علاقہ غزنوی سلطنت کا حصہ بن گیا۔

4.5 سندھ میں عرب انتظامیہ (Arab Administration in Sindh)

سندھ میں عربوں کا نظم و نسق عسکری فتوحات کے بعد ایک مستحکم، روادارانہ اور عملیت پسندانہ ریاست کے قیام کی بہترین مثال تھا۔

712ء میں محمد بن قاسم کی فتح کے بعد، سندھ کو خلافت کے ایک صوبے کا درجہ دیا گیا، جس کا انتظام براہِ راست ایک مقرر کردہ گورنر (عامل یا والی) چلاتا تھا۔ عربوں نے اتنے وسیع علاقے کا انتظام سنبھالنے کے لیے اسے مختلف اضلاع یا صوبائی اکائیوں میں تقسیم کیا۔ ان اضلاع کی نگرانی تو عرب کمانڈروں کے پاس تھی، لیکن نچلی سطح پر یعنی قصبوں اور دیہاتوں کا انتظامی ڈھانچہ بالکل نہیں چھیڑا گیا۔ مقامی سرداروں، دیہی پنچایتوں کے سربراہوں اور زمینداروں (دہقانوں) کو ان کے پرانے عہدوں پر بحال رکھا گیا تاکہ روزمرہ کے انتظامی امور، مقامی رسم و رواج کے مطابق بغیر کسی رکاوٹ کے چلتے رہیں۔ عربوں کی سیاسی بصیرت کا سب سے بڑا مظہر ان کی مذہبی رواداری اور پرامن بقائے باہمی کی پالیسی تھی، جس کی بنیاد مشہور 'معاہدۂ برہمن آباد' پر رکھی گئی۔ چونکہ سندھ کی اکثریت ہندو اور بدھ مت کی پیروکار تھی، اس لیے انہیں اسلامی ریاست میں 'ذمی' (محفوظ شہری) کا باضابطہ درجہ دیا گیا۔ ان کی جان، مال اور مندروں کو مکمل ریاستی تحفظ فراہم کیا گیا اور زبردستی مذہب تبدیل کرانے کی قطعی ممانعت تھی۔ اس سے بھی بڑھ کر، عربوں نے مقامی برہمنوں کے اثر و رسوخ کو تسلیم کرتے ہوئے مالیات اور محاصل (ٹیکس) اکٹھا کرنے جیسی اہم ریاستی ذمہ داریاں انہی کے سپرد کیں، جس سے مقامی آبادی کا نئے غیر ملکی حکمرانوں پر اعتماد بحال ہوا اور بغاوت کے امکانات کم ہو گئے۔

ریاست کا معاشی اور محصولاتی (ریونیو) نظام اسلامی اصولوں اور مقامی روایات کے متوازن امتزاج پر مبنی تھا۔ مسلمانوں سے ان کی املاک پر 'زکوٰۃ' اور زرعی پیداوار پر 'عشر' (پیداوار کا دسواں حصہ) وصول کیا جاتا تھا۔ دوسری طرف، غیر مسلموں پر 'جزیہ' نافذ کیا گیا، جو کہ دراصل فوجی خدمت سے استثنیٰ اور ریاستی تحفظ کا ٹیکس تھا۔ اس کی شرح لوگوں کی مالی حیثیت کے مطابق تین درجات (امیر، متوسط، اور غریب) میں منقسم تھی، جب کہ عورتوں، بچوں، بوڑھوں، غریبوں اور معذوروں کو اس سے مکمل طور پر مستثنیٰ رکھا گیا تھا۔ زرعی زمینوں پر 'خراج' (زرعی محصول) عائد کیا گیا جس کی شرح آبپاشی کے ذرائع پر منحصر تھی۔ اگر آبپاشی قدرتی ذرائع (بارش یا ندی) سے ہوتی تو خراج پیداوار کے ایک چوتھائی سے پانچویں حصے تک ہوتا تھا، اور اگر محنت کر کے کنوؤں وغیرہ کے ذریعے آبپاشی ہوتی تو لگان کی شرح کم رکھی جاتی تھی۔ یہ سارا پیچیدہ مالیاتی نظام، مقامی ہندو افسران ہی چلاتے تھے، جس سے وصولی میں شفافیت رہی۔

نظامِ عدل کے میدان میں بھی عربوں نے ایک متوازی اور لچکدار طریقہ کار اپنایا۔ مسلمانوں کے عائلی، دیوانی اور فوجداری مقدمات کے فیصلوں کے لیے ہر اہم شہر میں قاضی مقرر کیے گئے جو اسلامی شریعت کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ تاہم، غیر مسلموں کو اپنے داخلی معاملات میں مکمل قانونی آزادی حاصل تھی۔ ان کے نجی، خاندانی اور دیوانی مقدمات ان کے مقامی پنڈتوں اور پنچایتوں کے ذریعے ان کے اپنے دھرم شاستر (مذہبی قوانین) کے تحت ہی نمٹائے جاتے تھے۔ البتہ سنگین نوعیت کے فوجداری مقدمات، ریاستی عدالتوں یا گورنروں کے سامنے پیش کیے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ، امن و امان کے قیام اور فوجی طاقت کو برقرار رکھنے کے لیے عربوں نے 'محفوظہ' اور 'منصورہ' جیسے نئے عسکری شہر آباد کیے۔ ان چھاؤنیوں میں عرب فوجی مقیم ہوئے، جنہوں نے رفتہ رفتہ مقامی خاندانوں میں شادیاں کیں، جس سے سندھ میں ایک نئی ثقافتی اور سماجی ہم آہنگی (Cultural Synthesis) نے جنم لیا۔ مجموعی طور پر، سندھ میں عربوں کا یہ نظم و نسق برصغیر میں آنے والی اگلی مسلم سلطنتوں کے لیے ایک انتہائی پائیدار اور مثالی ریاستی ماڈل ثابت ہوا۔

4.6 عرب فتوحات کے نتائج (Results of the Arab Conquests)

سندھ میں عربوں کی فتوحات (712ء) اگرچہ سیاسی لحاظ سے برصغیر کی تاریخ میں کوئی فوری اور وسیع انقلاب برپا نہ کر سکیں اور مشہور مورخ اسٹینلے لین پول نے اسے ''ایک بے نتیجہ فتح' قرار دیا تھا، کیونکہ عربوں کا اقتدار محض سندھ اور ملتان تک ہی محدود رہا اور وہ شمالی ہندوستان کے دیگر علاقوں تک پیش قدمی نہ کر سکے۔ لیکن تہذیبی، ثقافتی اور علمی اعتبار سے اس کے انتہائی گہرے اور دور رس نتائج مرتب ہوئے۔ سیاسی طور پر بھلے ہی یہ ایک محدود واقعہ تھا جس نے فوری طور پر کسی عظیم الشان مسلم سلطنت کی بنیاد نہیں رکھی، لیکن اس نے برصغیر کو پہلی بار ایک وسیع تر بین الاقوامی اسلامی دنیا کے ساتھ جوڑ دیا، جس نے صدیوں بعد آنے والے ترک حکمرانوں کے لیے ایک ابتدائی خاکہ ضرور فراہم کیا۔

اس فتح کا سب سے شاندار اور دیرپا نتیجہ۔ علمی اور ثقافتی تبادلے کی صورت میں سامنے آیا۔ سندھ کے راستے ہندوستانی علوم اور فلسفہ عرب دنیا اور پھر وہاں سے یورپ تک پہنچا۔ عباسی خلفاء کے دور میں برمکی وزیروں (جن کے آباؤاجداد کا تعلق برصغیر کی بودھ خانقاہوں سے تھا) کی سرپرستی میں سنسکرت کی بے شمار اہم کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوا۔ علمِ فلکیات پر برہم گپت کی کتاب 'برہم سدھانت' (جسے عربوں نے السند ھند کا نام دیا)، طب کے قدیم ہندوستانی نسخے، اور اخلاقیات پر مبنی مشہور کتاب 'پنچ تنتر' (جس کا ترجمہ کلیلہ ودمنہ کے نام سے ہوا) عربوں تک پہنچیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ عربوں نے اعشاری نظام (Decimal System) اور 'صفر' (Zero) کا تصور ہندوستانی ریاضی دانوں سے ہی سیکھا، جسے انہوں نے 'ہندسہ' (یعنی ہند سے آیا ہوا) کا نام دیا۔ اس طرح سندھ عربوں اور ہندوستانیوں کے درمیان ایک مضبوط علمی اور تہذیبی پل بن گیا۔

مذہبی اور سماجی سطح پر اس فتح کے اثرات نہایت پرامن اور تہذیب یافتہ تھے۔ محمد بن قاسم نے مقامی آبادی کے ساتھ جس حسنِ سلوک اور مذہبی رواداری کا مظاہرہ کیا، اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پرامن بقائے باہمی کی فضا قائم کی۔ مقامی لوگوں کی آبادکاری، مندروں کے تحفظ اور عرب سپاہیوں کی مقامی خاندانوں میں شادیوں کے نتیجے میں سندھ میں ایک نئی مخلوط سماجی و ثقافتی ہم آہنگی نے جنم لیا۔ اسی دور میں سندھ کے راستے صوفیائے کرام کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا، جن کے مساویانہ اور محبت بھرے طرزِ عمل نے مقامی آبادی کو بے حد متاثر کیا اور اسلام کی پرامن اشاعت کا سبب بنا۔

اقتصادی اور تجارتی لحاظ سے بھی سندھ، عرب فتوحات کے بعد ایک نئے روشن دور میں داخل ہوا۔ عرب چونکہ بہترین جہازران اور تاجر تھے، اس لیے انہوں نے سندھ کو عالمی بحری تجارت کے ایک وسیع نیٹ ورک سے منسلک کر دیا۔ دیبل اور دیگر ساحلی شہر بین الاقوامی تجارت کے اہم مراکز بن گئے، جہاں سے سندھ کا کپڑا، مسالے اور دیگر مصنوعات مشرقِ وسطیٰ اور افریقہ کی منڈیوں تک پہنچنے لگیں۔ غرضکہ، سندھ میں عرب فتوحات کو محض ایک فوجی یلغار تک محدود کرنا تاریخی ناانصافی ہو گی۔ اس واقعے نے دونوں عظیم تہذیبوں کو ایک دوسرے کے قریب لا کر انمٹ ثقافتی، علمی اور معاشی نقوش چھوڑے جن کے اثرات آج تک محسوس کیے جاتے ہیں۔

4.7 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ہندوستان اور عرب کے مابین اسلام کے ظہور سے قبل ہی گہرے تجارتی اور علمی روابط استوار تھے۔ سندھ کے ساحلی قزاقوں کی جانب سے عرب جہازوں کی لوٹ مار اور مقامی راجا کی ہٹ دھرمی کے نتیجے میں 711ء میں محمد بن قاسم نے دیبل پر حملہ کر کے سندھ کو فتح کیا۔ فتح کے بعد عربوں نے یہاں ایک انتہائی روادارانہ اور مثالی نظم و نسق قائم کیا، جس کے تحت مقامی ہندو اور بدھ آبادی کو 'ذمی' کا درجہ دے کر مکمل مذہبی و قانونی آزادی فراہم کی گئی اور پرانے عہدیداروں کو ان کے عہدوں پر بحال رکھا گیا۔ معاشی سطح پر ریاست کا نظام زکوٰۃ، عشر، خراج اور جزیہ پر استوار کیا گیا اور مقامی پنچایتوں کو بحال رکھا گیا۔ اگرچہ عربوں کی یہ فتح سیاسی لحاظ سے محض سندھ اور ملتان تک محدود رہی، لیکن اس نے برصغیر کو بین الاقوامی اسلامی دنیا سے جوڑ کر ایک عظیم تہذیبی و ثقافتی انقلاب برپا کیا۔ اسی فتح کی بدولت ہندوستانی علوم جیسے طب، فلکیات اور ریاضی (بشمول صفر اور اعشاری نظام) عرب دنیا اور پھر وہاں سے یورپ تک منتقل ہوئے، جس نے دونوں خطوں کے درمیان ایک مضبوط اور دیرپا علمی پل کا کردار ادا کیا۔

4.8 کلیدی الفاظ (Keywords)

دیبل : کراچی کے قریب سندھ کا مشہور قدیم بندرگاہ، جہاں محمد بن قاسم نے پہلا حملہ کیا تھا۔

العروس : عربوں کی ایک دیوہیکل منجنیق (پرانے زمانے کی توپ) جسے دیبل قلعے کو فتح کرنے کے لیے استعمال کیا گیا۔

ذمی : اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو دیا جانے والا محفوظ شہری کا درجہ، جن کی جان و مال کے تحفظ کی ذمہ داری ریاست پر ہوتی تھی۔

جزیہ اور عشر : جزیہ غیر مسلموں سے فوجی استثنیٰ اور تحفظ کے عوض لیا جانے والا ٹیکس تھا، جبکہ عشر مسلمانوں کی زرعی پیداوار کا دسواں حصہ تھا۔

ہباری خاندان : منصورہ کے عربوں کا ایک ممتاز خاندان جس نے طویل عرصے تک سندھ پر حکومت کی۔

السند ھند: مشہور ہندوستانی ماہرِ فلکیات برہم گپت کی کتاب 'برہم سدھانت' کا عربی ترجمہ اور نام۔

ہندسہ : ریاضی میں صفر اور اعشاری نظام، جسے عربوں نے ہندوستان سے سیکھنے کی وجہ سے ہندسہ (ہند سے آیا ہوا) کہا۔

4.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

4.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. محمد بن قاسم نے کس سال دیبل کے مقام پر حملہ کر کے اپنی فتوحات کا آغاز کیا؟

(a) 705ء (b) 711ء (c) 714ء (d) 725ء

2. عربوں نے دیبل کے قلعے کو فتح کرنے کے لیے کس نام کی دیو ہیکل منجنیق (پرانے زمانے کی توپ) کا استعمال کیا تھا؟

(a) القاہرہ (b) المنصور (c) العروس (d) السند ھند

3. اخلاقیات پر مبنی قدیم ہندوستانی کتاب 'پنچ تنتر' کا عربی میں کس نام سے ترجمہ کیا گیا؟

(a) السند ھند (b) کلیلہ ودمنہ (c) الف لیلہ (d) ہندسہ

4. عربوں نے ہندوستانی ریاضی دانوں سے صفر اور اعشاری نظام سیکھا، جسے انہوں نے کیا نام دیا؟

(a) ہندسہ (b) جبر (c) حساب (d) ارقام

5. 977ء میں کس اسماعیلی داعی نے فوجی مدد کے ساتھ حملہ کر کے بنو سامہ قریشی سے ملتان کی حکومت چھین لی تھی؟

(a) عبداللہ بن عمر (b) منصور بن جمہور (c) جلم بن شیبان (d) ہیثم

4.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. ہندوستان پر عربوں کے باقاعدہ حملے کے فوری اسباب کیا تھے؟
2. عرب انتظامیہ میں 'معاہدہِ برہمن آباد' کی کیا اہمیت تھی اور غیر مسلموں کو کیا حقوق دیے گئے؟
3. سندھ میں عربوں کے قائم کردہ مالیاتی اور محصولاتی نظام (زکوٰۃ، عشر، جزیہ، خراج) کی وضاحت کیجیے۔

4.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. اسلام کی آمد سے قبل اور عباسی دورِ خلافت تک عربوں اور ہندوستان کے درمیان قائم تجارتی، ثقافتی اور علمی تعلقات کا تفصیلی جائزہ پیش کیجیے۔
2. ''سندھ میں عربوں کی فتح سیاسی لحاظ سے ایک محدود واقعہ تھی، لیکن اس کے تہذیبی اور ثقافتی نتائج بے حد وسیع تھے۔'' اس بیان کی روشنی میں سندھ میں عرب فتوحات کے دوررس نتائج پر ایک جامع مضمون تحریر کیجیے۔

اکائی 5۔ غزنوی اور غوری خاندان

(Ghaznavids and Ghurids)

اکائی کے اجزا

5.0 تمہید

5.1 مقاصد

5.2 سیاسی پس منظر

5.3 غزنوی خاندان

5.3.1 الپ تگین

5.3.2 امیر ناصرالدین سبکتگین

5.4 سلطان محمود غزنوی

5.4.1 تخت نشینی

5.4.2 ہندوستانی مہمات

5.4.3 سومنات کا مندر

5.4.4 محمود کا کردار

5.4.5 غزنوی حکومت کا زوال

5.5 غور کا جغرافیہ

5.6 غور میں تبلیغ اسلام

5.7 شنسبانی خاندان

5.8 سلطان معزالدین سام

5.9 ترائن کی پہلی جنگ

5.10 معزالدین کی تیاریاں

5.11 ترائن کی دوسری جنگ

5.12 شمالی ہندوستان کی فتح
5.13 معزالدین کی آخری ہندوستانی مہم اور اس کی وفات
5.14 اکتسابی نتائج
5.15 کلیدی الفاظ
5.16 نمونہ امتحانی سوالات

5.0 تمہید (Introduction)

محمد بن قاسم کی 712 عیسوی میں فتحِ سندھ کے ساتھ ہی ہندوستان کا شمال مغربی علاقہ سیاسی طور پر عرب دنیا سے جڑ گیا تھا، لیکن اندرونِ ملک اس کے کوئی دیرپا اثرات مرتب نہیں ہوئے۔ عرب خلافت کی کمزوری کے ساتھ ہی اسلامی دنیا کے نقشے پر ترک حکومتیں حاوی ہو گئیں۔ان ترک حکومتوں میں غزنوی سلطنت کو بے حد اہم مقام حاصل ہے اور یہ اسلامی قانونی نقطہ نظر سے پہلی سلطنت تھی جو کئی معنوں میں خلافت سے مختلف تھی۔ محمود غزنوی اس سلطنت کا پہلا سلطان تھا، جس کے سر بخارا کے ماتحت غزنی کی ایک چھوٹی سی امارت کو ایک عظیم الشان سلطنت میں تبدیل کرنے کا سہرا ہے۔ ہندوستان پر اس کے حملوں اور پنجاب کے غزنوی سلطنت میں الحاق نے ہی بعد میں دہلی سلطنت کے قیام کی راہ ہموار کی۔ تاہم اس نے تمام تر وسائل کے باوجود ہندوستان میں باقاعدہ سلطنت کے قیام کی کوشش نہیں کی اور وہ تلون پذیر ایشیائی سیاست میں الجھا رہا۔ دوسری جانب ہندوستان میں باضابطہ ترک اسلامی اقتدار کی بنیاد رکھنے والا غور کا حکمران معزالدین ابن سام تھا، جسے دنیا شہاب الدین غوری کے نام سے جانتی ہے۔ اگرچہ معزالدین رتبے، علاقے اور فنِ سپہ گری میں محمود کا ہم پلہ نہ تھا، لیکن اس کی سب سے بڑی خوبی اس کی مستقل مزاجی تھی اور وہ شکست سے کبھی دل برداشتہ نہیں ہوتا تھا۔ اس مشترکہ اکائی میں ہم غزنوی اور غوری خاندانوں کے عروج و زوال پر روشنی ڈالتے ہوئے، غور کے محل وقوع اور شہاب الدین غوری کی فتوحات کے ساتھ ساتھ شمالی ہند میں دہلی سلطنت کے قیام کے ابتدائی حالات کا تفصیلی جائزہ لیں گے

5.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- خلافتِ عباسیہ کے زوال کے بعد ابھرنے والی ترک طاقتوں، بالخصوص غزنویوں اور غوریوں کے عروج و زوال کو سمجھ سکیں گے۔
- غزنوی سلطنت کی توسیع اور ہندوستان پر ان کے ابتدائی حملوں کے سیاسی و معاشی محرکات کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- سلطان محمود غزنوی کی عسکری حکمتِ عملیوں، خصوصاً سومنات کی مہم کے اثرات اور اس کے ذاتی کردار کی تنقید کر سکیں گے۔
- سلطان معزالدین کی ابتدائی ناکامیوں اور اس کے بعد اس کی آئندہ حکمت عملیوں کا جائزہ لے سکیں گے۔

- ترائن کی دونوں جنگوں کے اسباب اور ہندوستان کی تاریخ پر اس کے دوررس نتائج کا تقابلی مطالعہ کر سکیں۔
- شمالی ہند میں ترک اقتدار (دہلی سلطنت) کے باقاعدہ قیام اور اس میں ایبک اور خلجی جیسے مایہ ناز سالاروں کے کردار کو سمجھ سکیں گے۔

5.2 سیاسی پس منظر (Political Background)

بنوامیہ اور بنوعباس کی خلافت کے ابتدائی دور میں عربوں کو زبردست عروج حاصل ہوا تھا۔ لیکن ہارون رشید کے انتقال کے بعد عرب اقتدار میں زوال کے آثار دکھائی دینے لگے۔ مختلف صوبوں کے صوبہ داروں نے اطاعت کا جوا اتار پھینکا اور خود مختار امیر کا لقب اختیار کر لیا، جبکہ بغداد کی خلافت صرف بغداد کے صوبے اور اس کے ماتحت علاقوں تک محدود ہو کر رہ گئی اور خلیفہ کو صرف مذہبی معاملات میں بااختیار سمجھا جانے لگا۔ طاہری خاندان جنہوں نے سب سے پہلے آزادی حاصل کی وہ خراسان اور ماوراءالنہر کے عظیم صوبوں میں آباد ہو گئے۔ 872ء میں ان کی جگہ صفاریوں نے لے لی۔ صفاری خاندان کی بنیاد سیستان کے ایک لوہار یعقوب لیث نے رکھی تھی جسے اپنی عسکری مہمات کے باعث بہت زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ صفاری خاندان کو 903ء میں سامانی خاندان کے حقیقی بانی اسماعیل نے شکست دے کر انہیں اپنا ماتحت بنا لیا۔ اسماعیل ایک انصاف پسند اور رفاہی کاموں میں پیش پیش رہنے والا تھا۔ اس کی حکومت بخارا، ماوراءالنہر، خراسان اور ایران کے بڑے حصے پر تھی۔ سامانی خاندان نے 120 سال تک بڑے اطمینان کے ساتھ حکومت کی۔ پانچویں بادشاہ عبدالملک جس کا انتقال بخارا میں ہوا، نے اپنا وارث میں ایک کمسن شہزادے منصور کو بنایا۔

5.3 غزنوی خاندان (Gaznavid Dynasty)

5.3.1 الپ تگین (Alp Tigin)

سامانی خاندان کے آخری دور میں جب مرکزی حکومت کمزور پڑنے لگی، تو ترک غلاموں (ممالیک) نے، جو فوج اور انتظامیہ میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے، دربار کی آپسی کشمکش سے فائدہ اٹھا کر اپنی طاقت بڑھانا شروع کر دی۔ اقتدار کی اسی کشمکش اور سیاسی عدم استحکام کے دوران سامانی دربار کا ایک بااثر ترک سالار، الپتگین تاریخ کے منظر نامے پر ابھرا۔ مرحوم بادشاہ کا ایک ترک غلام الپتگین تھا جو خراسان کے وسیع و عریض صوبے پر حکومت کرتا تھا۔ اس نے نوجوان شہزادے کا چچا ہونے کا اعلان کر دیا لیکن مخالف دھڑے نے منصور کو تخت پر بٹھا دیا۔ نئے بادشاہ نے الپتگین سے ناراض ہو کر اسے بخارا حاضر ہونے کا حکم دیا۔ اپنی ہونے والی سزا کے ڈر سے وہ خراسان سے بھاگ کر غزنی چلا گیا۔ وہاں پر اپنے قدم جما کر اور شاہی فوجوں کو پسپا کرنے کے بعد اس نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ الپتگین نے اپنے جرنیل سبکتگین کے تحت اپنی فوجوں کو کئی مرتبہ کابل اور لمغان کے صوبوں کو زیر کرنے کے لیے بھیجا جہاں کے ہندو شاہی حکمران اکثر اس کے مخالفین کی مدد کرتے تھے اور انہیں پناہ دیتے تھے۔ سبکتگین نے ان صوبوں کو کافی تاخت و تاراج کیا اور واپسی پر بہت سے قیدیوں اور مال غنیمت کے ساتھ واپس آیا۔ اس علاقے کے ہندو شاہی حکمران جے پال نے جب یہ محسوس کیا کہ اس کے فوجی دستے شمالی حملہ آوروں کی فوجوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو اس نے بھاٹیہ کے راجا کے ساتھ اتحاد کیا لیکن پھر بھی وہ ترک حملہ آوروں کو روکنے میں ناکام رہا۔ الپتگین نے 15 سال تک بڑے سکون اور اطمینان

سے حکومت کی اور 976ء میں اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا ابو اسحاق اس کا جانشین مقرر ہوا لیکن وہ دو سال میں ہی انتقال کر گیا۔ لہذا عمائدین سلطنت نے متفقہ طور پر سبکتگین کو جو اصل میں اس کا غلام اور ایک کامیاب سالار تھا، تخت پر بٹھا دیا۔

5.3.2 امیر ناصرالدین سبکتگین (Amir Nasiruddin Sabuktigin)

منہاج السراج کے مطابق سبکتگین ترک نسل کا ایک غلام تھا۔ ایک تاجر نصر حاجی نے اسے خرید کر الپتگین کے پاس فروخت کر دیا۔ سبکتگین نے الپتگین کے دیگر غلاموں کے ہمراہ تعلیم حاصل کی اور ہتھیاروں کا استعمال سیکھا۔ تعلیم پوری ہونے کے بعد وہ بادشاہ کے ذاتی محافظ دستے میں شامل ہو گیا۔ نہایت طاقت ور اور پھرتیلا ہونے کے باعث جنگل میں وہ اس کے لیے شکار کیا کرتا تھا۔ اوائل عمر میں ہی اس میں مستقبل کی عظمت کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ اس کا سرپرست اس کی صلاحیتوں کو بہت سراہا تھا اور بہت سی عسکری مہمات کے سلسلے میں اس پر بہت زیادہ اعتماد کرتا تھا۔ جلد ہی ہیں وہ فوج میں اہم عہدوں پر فائز کر دیا گیا۔ آخر کار غزنی میں شاہی اقتدار حاصل کرنے کے بعد اس نے اپنے حمایتیوں کو خوب نوازا۔ سبکتگین نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد ناصر الدین کا لقب اختیار کیا مگر وہ خود کو امیر ہی کہلاتا رہا۔

سبگتین کی مہمات

قندھار کو مطیع کرنے اور اپنی سلطنت میں شامل کرنے کے بعد اس نے زابلستان کی راجدھانی بست کے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ وہاں اس کی ملاقات مشہور زمانہ ابوالفتح سے ہوئی جنہیں ان کے علم و فضل اور ذہانت کے باعث سبکتگین نے اپنا مصاحب خاص بنا لیا۔ اس کے بعد لاہور کے ہندو شاہی حکمرانوں سے مقابلہ کرنا پڑا جو سبکتگین کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو اپنے لیے خطرہ سمجھتے تھے اور اس کے مخالفین کی مدد کرتے تھے۔ اس وقت ہندو شاہی خاندان کی باگ ڈور ہسپال کے بیٹے جے پال کے ہاتھوں میں تھی۔ جس کی حکومت ایک طرف دریائے سندھ سے لمغان دوسری جانب کشمیر سے ملتان تک پھیلی ہوئی 977ء میں سبکتگین نے ہندو شاہی سرحدوں کے مضافات میں حملہ کیا اور متعدد فتوحات کے بعد بہت سے مال غنیمت کے ساتھ ساتھ غزنی واپس آیا۔

جے پال جو اس وقت بھٹنڈا کے قلعے میں رہائش پذیر تھا، اس نے محسوس کیا کہ ترکوں کے پے در پے حملوں نے ملک کے امن و امان کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ لہذا اس نے ایک بہت بڑی فوج تیار کی اور بے شمار ہاتھیوں کے ساتھ دریائے سندھ عبور کیا اور لمغان کی طرف پیش قدمی کی جہاں اس کی مڈبھیڑ سبکتگین سے ہوئی۔ اس جنگ میں سبکتگین کے لڑکے محمود نے جو ابھی نو عمر تھا، سپاہیانہ کارناموں کے جوہر دکھائے۔ رات کے وقت زبردست طوفان بادوباراں اولے پڑنے کی وجہ سے ہر طرف خوف و ہراس اور تباہی پھیل گئی لاہور کے راجا کے دستے جو اس سردی کے عادی نہیں تھے، بری طرح متاثر ہوئے اور ان کے بے شمار مویشی ہلاک ہو گئے۔ راجا نے جب اپنی فوج کو منتشر ہوتے دیکھا اس نے امن کی تجویز پیش کی۔ سبکتگین اس درخواست کو قبول کرنے پر رضامند ہو گیا مگر نوجوان محمود جو کہ پرجوش جنگجو تھا صلح کے حق میں نہیں تھا، اس پر راجا نے سبکتگین کے پاس کہلوایا کہ اگر اب آپ نے ہمیں جنگ پر مجبور کیا تو اب ہم اپنے بیوی بچوں کو مار کر تم سے لڑتے لڑتے مر جائیں گے یعنی راجپوتی رسم و رواج کے مطابق جوہر ادا کریں گے۔

سبکتگین جو راجا کو مایوسی کی حالت میں زیر نہیں کرنا چاہتا تھا، وہ شرائط ماننے پر تیار ہو گیا۔ راجا بھی امن کی قیمت کے طور پر 10 لاکھ درہم اور پچاس ہاتھی دینے پر رضامند ہو گیا۔ راجا نے پوری رقم کو اپنے پڑاؤ میں رہتے ہوئے ادا کرنے سے معذور بتا کر اپنے ساتھ چند بااعتماد افراد کو لیا تاکہ لاہور سے باقی ماندہ تمام وصول کی جا سکے، جبکہ یرغمال کے طور پر کچھ لوگوں کو سبکتگین کے پاس رہنے دیا۔ تاہم راجا نے اپنی راجدھانی میں اپنے آپ کو محفوظ پا کر اپنے برہمن مشیروں کی ہدایت پر عمل کیا اور معاہدے سے پھر گیا۔ اس نے مسلمان افسران کو قید میں ڈال دیا۔ سبکتگین جو اس وقت تک غزنی پہنچ چکا تھا، اس نے جب یہ سنا تو سخت غضبناک ہو گیا۔ اس نے اسی وقت ہندو راجا کی طرف سے کی گئی توہین کا بدلہ لینے کے لیے بہت بڑی فوج کے ہمراہ لمغان کی طرف پیش قدمی کر دی۔

جے پال نے آنے والے طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے خود کو تیار کر لیا تھا۔ اس نے اپنے حلیفوں اور ماتحت باجگذاروں کا ایک لشکر جرار تیار کر لیا تھا۔ بقول فرشتہ اس کی متحدہ فوج دس ہزار گھڑ سوار اور بے شمار پیادہ افواج پر مشتمل تھی۔ اس نے ترک حملہ آوروں کو پیچھے دھکیلنے کے لیے لمغان کی سرحدوں پر اپنے لشکر کو ترتیب دیا۔ سبکتگین نے قریبی پہاڑی پر قبضہ کرنے کے بعد ہندوستانی لشکر کا جائزہ لیا۔ جس کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ سمندر کی طرح لامتناہی تھا۔ اس نے اپنے سرداروں کو مستقبل کی شان و شوکت کے بارے میں حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اور ان سے شجاعت کا مظاہرہ کرنے کی درخواست کرتے ہوئے ہر ایک کو فرداً فرداً احکامات دیے اور تعداد میں کم اپنے سپاہیوں کو پانچ پانچ سو کے دستوں میں تقسیم کر دیا اور انہیں حکم دیا گیا کہ وہ مخالف لشکر کے کمزور مقامات پر پے در پے حملہ کریں۔ ہندوستانی سپاہی جو جم کر لڑنے کے عادی تھے اس طرح کے حملوں کے سامنے کمزور پڑنے لگے۔ وہ جب تک جنگ کے لیے تیار ہوتے تب تک دشمن ضرب لگاؤ اور بھاگو کے اصول کے تحت کافی نقصان کر کے جا چکا ہوتا تھا۔ اس طرح سے جے پال کے لشکر میں ابتری پھیل گئی۔ سبکتگین نے جب یہ دیکھا تو اس نے عام حملے کا حکم دے دیا۔ ہندوستانی سپاہی ہر مقام پر ہزیمت اٹھا کر بھاگ نکلے۔ ترک فوجی دستوں نے نیلاب کے کنارے تک ان کا تعاقب کیا۔ سبکتگین نے نے دریائے سندھ کے مغربی علاقوں سے بھاری تاوان وصول کیا اور لمغان اور پشاور کو اپنی سلطنت کی مشرقی سرحد بنانے کے بعد دس ہزار گھوڑ سواروں کے ہمراہ اپنے ایک افسر کو مفتوحہ علاقے کا نظم و نسق سونپا اور غزنی کی طرف لوٹ گیا۔ سبکتگین اپنی باقی ماندہ زندگی میں اپنی سلطنت کے شمال مغرب میں عسکری مہمات میں مصروف رہا۔ وہ اگست 997ء میں 56 سال کی عمر میں بیس سال حکومت کرنے کے بعد بلخ کے نزدیک نیمروز میں انتقال کر گیا۔ اس کی میت کو دفن کرنے کے لیے غزنی لے جایا گیا۔

سبکتگین کا کردار

سبکتگین ایک ایسا بادشاہ تھا جس میں غیر معمولی شجاعت اور ہوشمندی کے علاوہ مساوات و اعتدال پسندی بھی بدرجہ اتم موجود تھی۔ اس کا وزیر ابوالعباس فضل تھا جو حکومت کے معاملات کو بڑی ذہانت و قابلیت سے نپٹاتا تھا۔ ماثر الملک کے مصنف کے مطابق سبکتگین کے بیٹے محمود نے اپنے باغ میں ایک نہایت عالیشان گھر تعمیر کروایا اور ایک نہایت پر تکلف دعوت میں اپنے والد کو مدعو کیا۔ اس عمارت کی خوبصورتی ذوق اور کمال فن نے نوجوان شہزادے کو اس بات پر اکسایا کہ وہ اس کے بارے میں اپنے والد کی رائے حاصل کرے۔ لیکن سبکتگین نے نہایت مایوسی کی حالت میں اپنے بیٹے سے کہا کہ اس نے اس مکان کو محض ایک کھلونے کی مانند دیکھا ہے جسے اس کی رعایا میں سے

دولت کے ذریعے سے کوئی بھی تعمیر کر سکتا تھا۔اس نے کہا کہ ایک شہزادے کا کام یہ ہے کہ وہ شہرت کی ایسی دیرپا یادگار تعمیر کرے جو شان و شوکت کے ستونوں کی طرح ہمیشہ قائم رہیں۔اچھے کارناموں کی طرح جو پیروی کے قابل ہوں اور اولاد ان پر سبقت لے جانے میں دشواری محسوس کرے۔

5.4 سلطان محمود غزنوی (Sultan Mahmud Ghaznavi)

5.4.1 تخت نشینی (Accession to the Throne)

جب سبکتگین کا انتقال ہوا تو اس کا سب سے بڑا لڑکا محمود نیشاپور میں تھا۔اس کے دوسرے بیٹے اسماعیل نے آخری لمحات میں اپنے والد کے پاس ہوتے ہوئے اس سے اپنی جانشینی کے لیے رضامندی حاصل کرلی اور اپنے والد کے انتقال کے بعد نہایت سنجیدگی سے مسند حکومت پر بیٹھ گیا۔تاہم تجربہ کار ہونے کی وجہ سے محمود بھی تخت وتاج پر اپنا دعویٰ رکھتا تھا لہذا اس نے اپنے چھوٹے بھائی سے کہا اگر وہ باقی ماندہ حصے سے دستبردار ہو جائے تو وہ اسے بلخ اور خراسان پیش کردے گا اور اس کی خود مختار حیثیت بھی تسلیم کرلے گا۔ناعاقبت اندیش بھائی نے اس پر خلوص پیش کش کو ٹھکرادیا اور جنگ کی تیاریاں کرنے لگا۔محمود بھی پوری تیاری کے ساتھ میدان میں آیا۔اس کو اپنے چچا بوعز اور سب سے چھوٹے بھائی ناصر الدین یوسف کی حمایت حاصل تھی۔اسماعیل کے دستوں کے آگے ہاتھیوں کی قطار تھی جو اس کو اپنے باپ سے ورثے میں ملے تھے۔دونوں فوجوں میں غزنی کے قریب زبردست جنگ ہوئی۔ایک مایوس جدوجہد کے بعد اسماعیل نے بذات خود اپنی شکست کو تسلیم کرلیا اور اپنے بھائی محمود کو قلعہ اور خزانے کی چابیاں پیش کردیں جس نے اسے تاحیات نظر بند کردیا۔

محمود جب تخت پر بیٹھا تو اس کی عمر تیس سال تھی اور وہ اس وقت عنفوان شباب میں تھا۔فوجی مہمات میں اپنے والد کے ساتھ مستقل ساتھ دینے اور اس کی طرف سے خود مختار فوجی کمانیں سونپے جانے کے باعث اسے فن حرب وضرب میں زبردست تجربہ حاصل ہو گیا تھا۔جبکہ امن کے فنون کے معاملے میں اس کے اندر ایک عظیم شہزادے کی سبھی صلاحیتیں موجود تھی۔تخت پر بیٹھنے کے بعد اس نے سب سے پہلے بخارا میں سامانی حکمران کو اپنی اطاعت پیش کرنے کے لیے سفیر روانہ کیا لیکن اس کے تھوڑے عرصے بعد دشمنوں کے ہاتھوں سامانی خاندان کا خاتمہ ہو گیا، نتیجتا 999ء میں محمود نے اپنی خود مختاری کا اعلان کردیا اور سامانی خاندان کے دشمنوں سے جو بلخ اور خراسان پر قابض تھے، بدلہ لینے کی قسم کھائی۔چند روز کی جنگ کے بعد یہ تمام علاقے محمود کی حکومت میں شامل ہو چکے تھے۔ان مہمات کی وجہ سے اس کی شہرت بغداد کے دربار تک جا پہنچی۔عباسی خلیفہ القادر باللہ نے اس کے لیے ایک نہایت قیمتی خلعت روانہ کیا اور اسے امین الملت اور یمین الدولہ کا خطاب عطا کیا۔اس نے سلطان کا لقب اختیار کیا، ایسا کرنے والا وہ پہلا مسلم حکمران تھا۔اس سے پہلے کے تمام حکمران اپنے آپ کو امیر کہلاتے رہے۔محمود نے سامانی خاندان کے غاصب بخارا کے حکمران ایلق خان کی بیٹی سے شادی کرلی۔اپنے باپ کی طرح محمود کو بھی بہت جلد ہندوستان کی طرف توجہ دینا پڑی جہاں ہندو شاہی حکمران جے پال سبکتگین کے انتقال سے فائدہ اٹھا کر اپنے کھوئے علاقے واپس لے چکا تھا اور غزنی پر حملہ کرنے کے لیے تیاری کر رہا تھا۔

5.4.2 ہندوستانی مہمات (Indian Campaigns)

پہلا حملہ- اگست 1001ء میں دس ہزار منتخب گھڑ سوار فوج کے ساتھ اس نے غزنی سے پشاور کی طرف پیش قدمی کی۔ یہاں پر لاہور کا راجا جے پال 12 ہزار گھڑ سوار اور 30 ہزار پیدل فوج اور 300 ہاتھیوں کے ہمراہ اس کے مقابلے پر آیا۔ راجپوت فوجی بڑی بہادری سے لڑے لیکن آخر کار وہ محمود کے منظم گھڑ ڑ سوار دستوں کے سامنے پسپا ہو گئے اور انہیں شکست فاش کا سامنا کرنا پڑا۔ میدان جنگ میں ان کے پانچ ہزار سپاہی مارے گئے۔ جے پال اور اس کے 15 سر کردہ سرداروں کو محمود نے قیدی بنالیا۔ اس فتح سے محمود کو بہت زیادہ شہرت اور دولت حاصل ہوئی مال غنیمت میں ہیرے جواہرات سے مزین 16 ہار بھی اس کے قبضے میں آئے جن کو صرف جے پال زیب تن کرتا تھا۔ ان کی مالیت 82 ہزار پاؤنڈ تھی۔ اس فتح کے بعد محمود نے بھٹنڈا کی طرف پیش قدمی کی اور اس کے قلعے پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا۔ آئندہ موسم بہار میں اس نے جے پال کو اس شرط پر رہا کر دیا کہ وہ سالانہ خراج ادا کرے گا لیکن اس نے اس کی پنجاب کی طرف پیش قدمی کے دوران مخالفت کرنے والے والے افغان سرداروں کو تہہ تیغ کر دیا۔ ضعیف ہندو راجا جے پال نے محمود کی طرف سے ہونے والی شکست اور شکست کی وجہ سے ذلت محسوس کرتے ہوئے اور اپنے آپ کو حکومت کرنے کا نااہل سمجھتے ہوئے اپنے بیٹے انند پال کے حق میں دستبردار ہونے کا فیصلہ کر لیا اور اپنی تیار کردہ چتا پر اپنے دیوتاؤں کے لیے اپنی قربانی پیش کر دی۔

دوسرا حملہ- محمود نے 1004ء سیستان میں ایک فوجی مہم سے واپس آنے کے بعد یہ دیکھا کہ ہندوستان سے خراج مکمل طور پر ادا نہیں کیا گیا۔ لاہور کے راجا انند رڈالنے اپنا حصہ ادا کر دیا تھا لیکن بھاٹیہ کے ایک باجگزار راجا وجے رآئے نے اپنا حصہ روک لیا اور مسلمانوں سے نہایت تلخ رویہ اختیار کرنے کے علاوہ ان گورنروں سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا جنہیں محمود نے ہندوستان میں تعینات کیا تھا۔ محمود ملتان کے راستے سے راجا کے علاقے میں داخل ہوا اس نے دیکھا بھاٹیہ کو ایک نہایت بلند فصیل سے قلعہ بند کیا گیا ہے اور اس کے ارد گرد ایک گہری اور کشادہ خندق ہے۔ جنگ شروع ہوئی راجپوت فوجی نہایت بے باکی سے لڑے اور ترک حملہ آوروں کو کئی بار پیچھے دھکیل دیا۔ یہاں تک کہ محمود کے فوجی جنگ سے منہ موڑنے لگے۔ محمود نے جب یہ دیکھا تو بذات خود لشکر کے سامنے آیا اور پر جوش جملوں سے اپنے لشکر کی حوصلہ افزائی کی۔ اس کے بعد کی جنگ کافی خونریز تھی۔ دونوں لشکروں نے پیچھے نہ ہٹنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ بالآخر ترکوں کے منظم دستوں نے راجپوت فوج کے قدم اکھاڑ دیے اور اسے قلعے میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ اگلی صبح بھاٹیہ کے قلعے کو مکمل طور پر محصور کر لیا گیا کیا اور صرف چند دنوں میں چاروں طرف کی خندقوں کو بھر دیا گیا۔ وجے رائے نے جب یہ دیکھا کہ اپنی پوزیشن کو مستحکم رکھنا اب ناممکن ہو گیا ہے تو اس نے قلعہ خالی کر دیا اور اس کے دفاع کے لیے ایک مختصر سی چھاؤنی کو وہاں چھوڑنے کے بعد اس نے اپنے باقی ماندہ دستوں کے ہمراہ دریائے سندھ کے کناروں پر اُگے جنگل میں پناہ لے لی۔ محمود کی فوج کے ایک دستے نے جنگل میں اس کا تعاقب کیا۔ انہوں نے اس کے مورچے پر حملہ کیا اور اسے تنگ گھاٹیوں کی طرف بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بہترین دوست اس کا ساتھ چھوڑ گئے اور جب اسے قیدی بنایا جانے لگا تو اس نے اپنی تلوار سے اپنی زندگی ختم کر لی۔ اس کے پیروکار جنہوں نے اپنے آقا کی موت کا بدلہ لینے کی کوشش کی ان میں سے بے شمار کو تہہ تیغ کر دیا گیا۔ ایک حملے کے ذریعے بھاٹیہ پر قبضہ کر لیا گیا۔ 280 ہاتھی بہت سے غلام اور دیگر مال غنیمت بادشاہ کے ہاتھ لگا اور وہ ایک فاتح کی حیثیت سے غزنی کی

طرف لوٹا۔

تیسرا حملہ- ملتان کے پہلے مسلم حکمران شیخ حمید سعدی نے امیر سبکتگین کی اطاعت قبول کرلی تھی اور اسے خراج ادا کرتا تھا۔اس کے بعد ناصر کا بیٹا اور اس کا پوتا ابوالفتح داؤد غزنی کے سلطان کا مطیع و فرمانبردار رہا۔ لیکن 1005ء میں اس نے لاہور کے راجا انند پال سے ساز باز کر کے بغاوت اختیار کی اور سالانہ خراج ادا کرنے سے انکار کیا۔ محمود نے ملتان کے دوبارہ فتح کرنے کا منصوبہ بنایا۔ لہذا موسم بہار کے آغاز میں بہت بڑی فوج کے ہمراہ اس نے اس مقام کی طرف پیش قدمی کی۔ پشاور کی پہاڑیوں میں انند پال کی فوجوں نے اس کا مقابلہ کیا لیکن غزنی کی فوج نے انہیں زبردست شکست سے دوچار کیا اور دریائے چناب کے کنارے پر سودرا کے قصبہ تک ان کا تعاقب کیا۔انند پال اپنا دارالحکومت چھوڑ کر کشمیر کی طرف بھاگ گیا۔ محمود بھٹنڈا کے راستے ملتان کی طرف بڑھا اور سات روز تک اس کا مکمل محاصرہ کیا آخر کار داؤد کو گرفتار کر لیا گیا اور اسے اس وعدے پر معافی دے دی گئی کہ وہ بیس ہزار طلائی درہم سالانہ خراج کے طور پر ادا کرے گا۔ ہو سکتا ہے سلطان ہندوستان میں اپنا قیام طویل کر لیتا مگر اس کے سسر اور شاہ کاشغر ایلق خان کی طرف سے اس کے مغربی علاقوں پر حملے کے باعث اسے مجبوراً غزنی کی طرف لوٹنا پڑا۔اس نے ہندوستانی معاملات ایک ہندو شہزادے سیوک پال کے سپرد کیے جو پشاور کے حاکم ابو علی کے اثر رسوخ سے مسلمان ہو گیا تھا۔

چوتھا حملہ- نائب سیوک پال کی بغاوت نے محمود کو 06-1005ء میں دوبارہ ہندوستان کی سرزمین پر لا کھڑا کیا کیونکہ اس نے سلطان کے تمام افسروں کو ان کے محکموں سے نکال دیا تھا۔ محمود نے سب سے پہلے اپنے رسالے کے ایک حصے کو پیش قدمی کے لیے حکم دیا۔ ہراول دستوں نے راجپوت فوج کے سامنے غیر متوقع طور پر ظاہر ہو کر انہیں زبردست شکست سے دوچار کیا۔ سیوک پال کو قیدی بنا لیا گیا اور اسے چار لاکھ درہم جرمانے کے طور پر ادا کرنے پر مجبور کیا گیا اور باقی ماندہ ساری زندگی سرکاری قیدی کے طور پر رکھا گیا۔

پانچواں حملہ- ملتان کی بغاوت میں انند پال کی حمایت اور غدارانہ رویہ محمود کے سینے میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔ چنانچہ 1008ء کے موسم بہار کے شروع میں ایک فوج لے کر وہ ہندوستان کی طرف چلا۔ ترکوں کی طاقت سے گھبرا کر انند پال نے آس پاس کے تمام راجاؤں اور ماتحت جاگیرداروں سے مدد کی درخواست کی اور مشترکہ دشمن کے خلاف متحدہ محاذ بنانے کی پیشکش کی۔اس طرح اس نے کافی بڑی فوج تیار کر لی۔ یہاں تک کہ پنجاب کے کے شمال مغربی پہاڑی علاقے کے طاقتور قبیلے کھکھڑ کے بھی ہزاروں افراد اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ جنگ کی شروعات میں چھ ہزار مسلمان تیر اندازوں نے راجپوت لشکر پر تیر برسانا شروع کیے، جس پر جواب میں راجپوت فوج بھی نہایت بہادری کے ساتھ ترک لشکر سے بھڑ گئی۔ زبردست خوں ریزی شروع ہو گئی۔ نہایت ہی مختصر وقت میں پانچ ہزار ترک فوجی مارے گئے، تاہم دشمن کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے ترک فوج کے ایک منظم دستے نے ڈٹ کر ان کا مقابلہ کیا اور بے شمار کو قتل کر دیا۔ دریں اثناء ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جو راجپوت فوج کے لیے بہت نقصان دہ ثابت ہوا۔ وہ ہاتھی جس پر سوار ہو کر لاہور کا راجا ہندوستانی فوجوں کو احکامات دے رہا تھا، نفت کے گولوں کی آواز اور تیروں کی بارش سے بے قابو ہو کر بھاگ نکلا۔اس سے راجپوتوں کے لشکر میں زبردست خوف و ہراس اور ابتری پھیل گئی۔انہوں نے خیال کیا کہ شاید ان کا راجا بھاگ نکلا ہے لہذا وہ منتشر ہو کر پیچھے ہٹ گئے۔ ترکوں نے ان کی ابتری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے

عبداللہ طائی کی سرکردگی میں چھ ہزار عربی گھڑ سواروں اور ارسلان جاذب کی سربراہی میں دس ہزار ترک وافغان اور خلجیوں کے ہمراہ مورچوں کو پار کیااور دشمن کا تعاقب کرتے ہوئے بہت زیادہ کشت وخون کیا۔ ترکوں کے ہاتھ 30 ہاتھی اور بہت زیادہ مال غنیمت آیا۔اس فتح کے فورا بعد بعد شہر نگر کوٹ کی طرف چڑھائی کی گئی اور پہلی مرتبہ ان کے بتوں کو توڑااور ان کے مندروں کو زمین بوس کر دیا۔ شہر کو تاخت وتاراج کرنے کے بعد قلعے کا محاصرہ کیا گیا۔ یہ ایک ڈھلوانی پہاڑ کی چوٹی پر واقع تھا۔اس میں ایک انتہائی شاندار مندر تھا جس میں بہت سے راجاؤں کی بے شمار دولت جمع کی ہوئی تھی۔ قلعہ سر کرنے کے بعد مندر پر قبضہ کر لیا گیاوہاں کے پجاریوں کو تو معافی دے دی گئی مگر وہاں کے مال ودولت کو جمع کر کے غزنی لے جایا گیااور باقاعدہ نمائش کے ذریعے وہاں کے لوگوں کو دکھایا گیا۔ درحقیقت ان مندروں میں برسوں سے چڑھاوے میں آنے والی بے شمار دولت جمع تھی جو کسی بھی فاتح کو اس کی طرف متوجہ کرنے کے لیے کافی تھی۔

چھٹا حملہ- 1011ء میں محمود نے تھانیسر کو فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ ہندو اس کا اسی طرح احترام کرتے تھے جس طرح مسلمان مکہ مکرمہ کا کرتے ہیں۔ آنند پال نے محمود کو اس حملے سے باز رکھنے کی کوشش کی اور کافی رقم ادا کرنے کا بھی وعدہ کیا، لیکن محمود نے اس کی پیش کش کو ٹھکرا دیا۔اس نے شہر پر قبضہ کر لیا،اس کے شہریوں کو لوٹ لیاان کے بڑے بڑے عظیم الشان مندروں کو تباہ کر دیااور بتوں کو پاش پاش کر دیا۔ان بتوں میں سب سے اہم بت کو "جگسوم" کہا جاتا تھااور اس کے بارے میں ہندوؤں کا عقیدہ تھا کہ یہ روز تخلیق سے موجود ہے۔اسے بے شمار ٹکڑوں کی صورت میں غزنی مکہ مکرمہ اور بغداد روانہ کیا گیا کیاتا کہ گلیوں میں پاؤں تلے روندا جاسکے۔ تھانیسر کے مندروں سے محمود کو بے پایاں دولت حاصل ہوئی۔

ساتواں حملہ- 1013ء میں محمود نے ایک بہت بڑی فوج کے ہمراہ بلوات کی پہاڑیوں میں واقع نندونہ کے خلاف پیش قدمی کی اور بھرپور حملے کے بعد چھاؤنی کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔انند پال کے بیٹے اور جانشیں جے پال دوم نے جب یہ محسوس کیا کہ وہ سلطان کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں ہے تو اس نے اپنی فوج کے ہمراہ کشمیر کا رخ کیا۔ محمود نے پہاڑی علاقے میں ایک حاکم کو تعینات کیااور بغیر کوئی دقیقہ فروگزاشت کیے کشمیر کی طرف روانہ ہوا۔اس پر لاہور کے راجانے صوبے کو خیر باد کہااور پہاڑوں کی طرف بھاگ گیا۔ محمود نے کشمیر کی تمام عظیم الشان دولت کو لوٹ لیااور لوٹ مار کے نہایت بیش بہاسامان کے ساتھ اپنی راجدھانی کی طرف لوٹ گیا۔

آٹھواں حملہ- دوسال کے بعد سلطان نے 1015 میں چند باغی سرداروں کو سزا دینےاور چند قلعوں کو فتح کرنے کے لیے جن پر گزشتہ ماہ کے دوران حملہ نہیں کیا گیا تھا، دوبارہ کشمیر کا رخ کیا۔ان میں سب سے زیادہ اہم لوہ کوٹ کا قلعہ تھا جو اپنی بلندی اور مضبوطی کے لیے بہت مشہور تھا۔ گرمی کے موسم کے دوران اس مقام کو فتح کرنے کے لیے سلطان کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں۔ پھر جاڑے کی شروعات پر سلطان کو اس مہم کو چھوڑ کر مجبوراً غزنی واپس جانا پڑا۔

نواں حملہ-1017ء کے موسم بہار میں سلطان ایک لاکھ گھڑ سوار اور بیس ہزار پیادہ فوج کے ہمراہ قنوج کی طرح بڑھا۔ قنوج کا راجا بڑی شان و شوکت اور جاہ وجلال کا حامل تھا لیکن دفاع کے لیے پوری طرح تیار نہ ہونے کے باعث اس نے پرامن طور پر صلح کر لی۔اس کے بعد اس نے

میرٹھ کی طرف پیش قدمی کی۔وہاں کے راجاہری دت رائے نے بھی اطاعت قبول کرلی۔اس کے بعد وہ جمنا کے کنارے پر آباد مہاون کی طرف بڑھااور اسے تسخیر کر لیا۔راجا کیل چند نے مایوسی کی حالت میں پہلے بیوی بچوں کو قتل کیااس کے بعد اپنی تلوار کی نوک کواپنی جانب کرکے اپناخاتمہ بھی کرلیا۔اس کے بعد اس نے متھراکارخ کیاجو واسودیو کرشن کا شہر تھا۔ قلیل مزاحمت کاسامنا کرنے کے بعد اس میں لوٹ مار شروع کردی گئی۔ کئی مندروں کو توڑ دیا گیااور وہاں موجود زر و جواہرات کو لوٹ لیا گیا۔ محمود بیس دن تک قنوج میں ٹھہرا۔چند چھوٹے راجا کو مطیع کرنے کے بعد سلطان لوٹ مار کی دولت اور بے شمار قیدیوں کے سمیت غزنی کی طرف لوٹا۔ محمود ہندوستان میں اپنے قیام کے دوران ہندوستان کے فن تعمیر کی خوبصورتی سے بڑامتاثر ہوا۔اپنی راجدھانی پہنچنے کے بعد اس نے وہاں پتھر اور سنگ مرمر کی ایک شاندار مسجد تعمیر کرائی۔اس نے اسے قالین و جھاڑ فانوس اور سونے اور چاندی کے ساز وسامان سے مزین کیا۔وہ اسے آسمانی دلہن کہتا تھااس کے درباری عمرہ نے بھی اس کی تقلید کی۔وہ دارالحکومت کو ن جی محلات و سرکاری عمارات سے مزین کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ محمود نے سرکاری خزانے کی مدد سے شاہی مسجد کے قرب وجوار میں ایک عظیم الشان جامعہ نہایت عالم فاضل مصنفین کی کتب پر مبنی دارالمطالعہ اور قدرتی عجائبات اور فن کے نمونوں پر مشتمل عجائب گھر تعمیر کرایا۔ فن تعمیر کے ذوق وشوق میں اضافہ ہوااور ایک مختصر سے وقت میں محمود کادار لخلافہ خوبصورت مساجد، بارہ دریوں، فواروں، تالابوں، محرابی نالوں اور چوبچوں سے مزین ہو گیا۔ وضع قطع اور کاریگری کے لحاظ سے گزشتہ ادوار کی کوئی عمارت ان کی برابری نہیں کر سکتی تھی۔1019ء میں سلطان محمود نے بغداد کے خلیفہ القادر باللہ کے پاس اپنی فتوحات کی ایک سرگزشت روانہ کی۔اس نے اسے شہر کے مسلمانوں کے عظیم الشان اجتماع کے سامنے پڑھ کر سنایا۔اس طرح محمود کا مقصد اپنی شہرت کو دور دراز جاز علاقوں تک پہنچانا تھا۔

دسواں حملہ-1021ء میں راجپوت راجاؤں کی متحدہ فوج نے قنوج کے راجا کنور رائے پر حملہ کر دیا کیونکہ اس راجا نے محمود سے صلح کرلی تھی۔ محمود نے ہندوستان کی طرف پیش قدمی کی مگر اس سے قبل کے وہ قنوج پہنچتا اس پر کالنجر کے راجا نندا نے قبضہ کر لیا تھا۔اس نے کنور رائے اور اس کے متعدد سرداروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔اس کی موت کا بدلہ لینے کے لیے سلطان کالنجر کی طرف روانہ ہوااور رائے نندا کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔اس کے بعد اس نے لاہور کی اہمیت کے پیش نظر اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ محمود کے خلاف وفاق میں شامل ہونے کی وجہ سے آنند پال اپنے انجام سے باخبر تھا لہذا محمود کے آنے سے پہلے ہی وہ بھاگ نکلا۔ محمود نے لاہور کا انتظام اپنے پسندیدہ مشیر اور جنرل ملک ایاز کے سپرد کیا۔ملک ایاز نے لاہور کا قلعہ اور فصیل تعمیر کرائی اور شہر کو وسیع اور خوبصورت بنایا۔ محمود نے یہاں ایک ٹکسال بھی قائم کروائی لاہور کا نام بدل کر محمود پور رکھا۔

گیارواں حملہ- اس کے دو سال بعد 1023 میں محمود نے کالنجر کے راجا نندا کو مزہ چکھانے کے لیے دوبارہ ہندوستان کی طرف پیش کی، کیونکہ گزشتہ مہم کے دوران وہ سزا سے بچ گیا تھا۔وہ اس کے خلاف لاہور کے راستے سے بڑھااور گوالیار سے گزرنے کے بعد اس نے اس جگہ کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن راجا نے اطاعت کرلی اور اس طرح وہ محفوظ رہا۔ نندا رائے نے بروقت اطاعت اور قیمتی تحائف پیش کر کے اپنے آپ کو آفت سے بچالیا۔اسے قبول کر لیا گیااور اسے اس کے علاقوں پر بحال رکھا گیا۔

بارہواں حملہ- محمود کافی عرصے سے کاٹھیاواڑ کے ایک ساحلی شہر سومنات کے مشہور و معروف مندر کی دولت اور تقدس کے بارے میں سنتا چلا آرہا تھا۔ وہاں پر ہندوستان کے سبھی حصوں سے پجاری جمع ہوتے تھے۔

5.4.3 سومنات کا مندر (The Somnath Temple)

ہندوؤں کا عقیدہ تھا کہ سوم دیوتا جس کے نام پر یہ مندر مشہور تھا، اس کو تمام ارواح پر مکمل اختیار حاصل ہے۔ اس کے بارے میں اس عقیدے کا اظہار کیا جاتا تھا کہ وہ تمام تناسخوں کو باقاعدہ بناتا ہے اور علیحدہ روحوں کو سزا و جزا دینے کی طاقت بھی اسی کے پاس ہے۔ مندر بہت عالی شان تھا اور تمام پجاری اس کی بڑی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ یہاں پر سارے ملک سے چڑھاوے اور نذرانے پیش ہوتے تھے۔ سلطان محمود نے 1025ء کے ستمبر کے مہینے میں غزنی سے ہندوستان کی طرف کوچ کیا۔ اس کے ہمراہ فوج کی تعداد تقریباً چالیس ہزار گھڑ سوار تھی۔ ملتان کے صحرا کو عبور کرنے کے بعد مغربی راجستھان ہوتے ہوئے، راستے کی رکاوٹوں کو دور کر کے وہ نہایت تیزی کے ساتھ 1026ء کی جنوری میں سومنات پہنچا۔ مندر کے قلعہ کا راجپوتوں نے بڑی مضبوطی اور جوانمردی سے دفاع کیا اور تین دن ترک حملہ آوروں قلعے کے پاس تک پھٹکنے نہیں دیا۔ چوتھے روز محمود نے اپنی جنگی حکمت عملی میں تبدیلی کی اور چاروں طرف سے محاصرہ کرنے کے بجائے ایک مقام پر تیز ترین یلغار کی۔ یہ حملہ کچھ اس قدر تیز تھا دشمن کے سنبھلنے سے پہلے ہی اس کے پانچ ہزار فوجی مارے جا چکے تھے۔ باقی ماندہ فوج اپنی جان بچانے کے لیے کشتیوں پر سوار ہو گئی لیکن ترکوں نے ان کا تعاقب کیا اور بے شمار کشتیوں کو ڈبو دیا۔ سلطان مندر میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ اس کے بیٹے اور چند امراء اور سردار تھے۔ جیسے ہی وہ ایک عظیم الشان ایوان میں داخل ہوا، اس نے اپنے سامنے پتھر کا ایک نو فٹ بلند بت دیکھا۔ برہمنوں نے سلطان کے سامنے پیشکش رکھی کہ اگر وہ بتوں کو چھوڑ دے تو سب سے بڑی مقدار میں سونا دیں گے۔ یہاں تک کے محمود کے درباریوں نے بھی اسے اس سے باز رہنے کے لیے کہا۔ لیکن محمود نے ان کے خیالات کو یہ کہتے ہوئے رد کر دیا کہ وہ تاریخ میں بت فروش کے بجائے بت شکن کہلانا زیادہ پسند کرے گا۔ بت کے اندر سے بیش قیمتی ہیرے جواہرات برآمد ہوئے۔ بت کے ٹکڑوں کو لے جا کر غزنی کی جامع مسجد کے دروازے اور شاہی محل کے دروازوں پر پھینک دیا گیا۔ سومنات میں مختصر قیام کے بعد سلطان نے کچھ میں گنداوا اور مشہور شہر انہل واڑہ فتح کیا۔ اس کے بعد سندھ کے راستے غزنی کی طرف لوٹ گیا۔ سومنات کی مہم اور گجرات کے معرکے میں اڑھائی سال صرف ہوئے۔

تیرہواں حملہ- ہندوستان کے لیے محمود کی آخری مہم کا آغاز 1027ء میں ہوا۔ یہ مہم دریائے سندھ کے کناروں پر آباد بعض جاٹ قبائل کے خلاف تھی۔ انہوں نے گجرات سے واپسی پر مسلمانوں کی فوج سے چھیڑ چھاڑ کی تھی جس کا خمیازہ انہیں اس مہم کے دوران بھگتنا پڑا۔ اس کے بعد ہندوستان پر بڑے پیمانے پر مزید کسی حملے کا ارادہ نہیں کیا گیا۔ تھوڑے عرصے بعد محمود پتھری کے باعث بری طرح بیمار ہو گیا اور 29 اپریل 1030ء کو 63 سال کی عمر میں 33 سال حکومت کرنے کے بعد انتقال کر گیا۔ اسے غزنی کے قصر فیروزی میں دفن کیا گیا۔

5.4.4 محمود کا کردار (Character of Mahmud)

ذاتی طور پر وہ میانہ قد و قامت، خوب طاقتور اور متناسب الاعضاء اور اپنے ساتھیوں سے زیادہ سخت جان تھا۔اس کی فوج میں صرف چند لوگ ہی اس کے گرز کو چلا سکتے تھے یا اس کا نیزہ پھینک سکتے تھے۔اس کے چہرے پر چیچک کے گہرے نشانات تھے۔ محمود کی نجی زندگی کے بارے میں بہت کم پتہ چل سکا ہے۔اس کی چہیتی بیوی کا نام حرم نور تھا جس کے بہت زیادہ حسین و جمیل ہونے کے باعث مہر شغل (خوبصورتیوں کا سورج) بھی کہا جاتا تھا۔وہ محمود کے دیرینہ دشمن اور کاشغر کے ازبک بادشاہ، ایلق خان کی بیٹی تھی۔فرصت کے اوقات میں سلطان کٹر مذہبی ہونے کے باوجود انگور کی شراب سے بھی دل بہلا لیتا تھا۔وہ علم و ادب کا دلدادہ تھا۔ابوالفضل کے مطابق کوئی ایسا بادشاہ نہیں گزرا جس کے پاس اس کے دربار میں محمود کے مقابلے میں زیادہ علماء و فضلاء موجود ہوں، یا اتنی بہترین فوج کا انتظام ہو، یا اس جیسی شان و شوکت ہو۔اس کا انصاف بے لچک تھا جس میں وہ اپنے رشتے داروں اور دوسرے لوگوں میں کوئی امتیاز نہیں کرتا تھا۔وفات کے وقت اس نے ایک ایسی سلطنت اپنے پیچھے چھوڑی جو کسی بھی زندہ بادشاہ کی سمجھ سے بہت زیادہ بڑی تھی۔اس کی سلطنت کشمیر سے اصفہان اور بحیرہ خزر سے گنگا تک پھیلی ہوئی تھی۔وہ عالم اسلام کا پہلا سلطان تھا۔دنیا کے مشہور ترین فاتحین میں اس کا نام شامل ہے۔

5.4.5 غزنوی حکومت کا زوال (Decline of Ghaznavid Dynasty)

سلطان محمود غزنوی کی وفات کے بعد اس کی عظیم الشان سلطنت کو اس کے کمزور جانشین سنبھالنے میں ناکام رہے اور وہ تخت کی آپسی لڑائیوں میں بری طرح الجھ گئے۔اس داخلی انتشار اور نااہلی کا نتیجہ یہ نکلا کہ وسطی ایشیا کی پیچیدہ سیاست میں غزنویوں کی گرفت کمزور پڑ گئی اور سلجوقیوں نے پے در پے حملوں میں انہیں شکست دے کر ہندوستان کی طرف لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ان مسلسل ناکامیوں کے باعث غزنوی سلطنت سکڑ کر محض لاہور تک محدود ہو کر رہ گئی۔سلطنت کے اس زوال کے دوران ان کی غور کے حکمرانوں سے دشمنی بھی ان کے لیے انتہائی تباہ کن ثابت ہوئی، جس کے نتیجے میں وہ افغانستان اور غزنی کے آبائی علاقے بھی ہار بیٹھے۔غزنویوں کی اسی پسپائی اور سیاسی کمزوری نے غور کے شنسبانی خاندان کو ابھرنے اور بالآخر غزنویوں کی جگہ ایک نئی طاقتور ترک سلطنت قائم کرنے کا سنہری موقع فراہم کیا۔

5.5 غور کا جغرافیہ (Geography of Ghur)

غور موجودہ افغانستان کے مغربی مرکزی حصے میں واقع ہے، اور یہ ہری رود، فرح رود، رود غور اور کش رود کی وادیوں اور پہاڑی سلسلے پر مشتمل ہے۔طبقات ناصری کے مصنف مورخ منہاج سراج جوزجانی غور کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے قلم طراز ہیں۔

> غور کے ملک کو پانچ پہاڑی سلسلے منقسم کرتے ہیں اور غور کے باشندوں کے خیال میں یہ پہاڑیاں دنیا میں بلند ترین ہیں۔پہلا پہاڑ مرغ میندش میں ہے، جس کے نچلے حصے میں میں شہنشاہ کا دارالحکومت سلطنت اور قلعہ واقع تھا۔دوسرا پہاڑ جس کو سرخ غار کہا جاتا ہے، یہ بھی میندش علاقے میں تجز کے نزدیک ہے۔تیسرا پہاڑ اشک جو کہ ضلع تمران میں واقع ہے، غور کے دیگر حصوں سے بلند اور رقبے میں بڑا ہے۔تمران کا ضلع اس کے دونوں جانب اور اس کی گود میں واقع ہے۔چوتھا ورنی کا بلند اور بڑا پہاڑی سلسلہ جو داور

والشت کے اضلاع سے ہو کر گزرتا ہے اور جس پر کجوران کا شہر واقع ہے۔ بعض بیان کے مطابق روئن جو سارے غور میں اپنی دشوار گزار بلندی کے لیے مشہور ہے، پانچواں پہاڑی سلسلہ ہے لیکن بعض دوسرے بیانات کے مطابق پانچواں درہ خیبر کا پہاڑی سلسلہ ہے، جس کی لمبائی، چوڑائی اور بلندی انسان کی سمجھ سے باہر ہے۔

ان پہاڑی سلسلوں جن کی بلندی دس ہزار فٹ تک ہے اور جو مشرق کی جانب کوہ ہندوکش تک آتے آتے اور بلند ہو جاتے ہیں، کی وجہ سے غور میں داخلہ دشوار گزار تھا اور انہوں نے غور کو بیرونی دنیا کے تمام ثقافتی اور تجارتی تعلقات سے منقطع کر دیا تھا۔ آس پاس کے علاقوں سے ثقافتی علیحدگی کی حد کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ سلطان مسعود غزنوی نے جب 1020 عیسوی میں غور پر حملہ کیا تو اسے ایک مقامی مترجم بحال کرنا پڑا تھا۔ کیونکہ علاقائی لسانی اختلاف کی وجہ سے وہاں کے لوگوں کی بولی ناقابل فہم تھی۔ اس کے علاوہ جغرافیائی حالات نے بھی غور میں سیاسی اقتدار کو مختلف حصوں میں منقسم کر رکھا تھا اور ہر قلعہ کا مالک اپنے تابع علاقوں پر بلاشرکت غیرے حکمران تھا۔ قطب الدین محمد (م1146) کے زمانے میں غور کے ایک حصے ہری رود پر واقع ورشادا کی چھوٹی مملکت نے فیروز کوہ کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ اس کے قبل کوئی ایسا مرکزی مقام نہ تھا جہاں سے کوئی ایک حکمراں سارے علاقے کی نگرانی کر سکتا تھا۔

غور عام طور پر ایک زراعتی علاقہ تھا۔ آج کل اس کی وادیاں درختوں سے بھری ہیں۔ پتے ہر سال گر جاتے ہیں اور ان میں شہتوت، اخروٹ، خوبانی کے درخت اور انگور کی بیلیں لگی ہیں۔ یہ دسویں صدی میں بھی اسی قدر زرخیز تھا کہ اصطخری نے اس کی زرخیزی، اس کی نہروں، اس کے سبزہ زاروں اور اس کی کاشت کی تعریف کی ہے۔ یہاں کوئی قابل ذکر شہر نہ تھے بلکہ صرف زراعتی نوآبادیاں اور قلعہ جات اور مینارے (قصر، قلعہ، حصار، کوشک) تھے جو کہ ملک کے زمینی منظر کی سب سے نمایاں خصوصیت تھے۔ حدود العالم کے مصنف کے مطابق بدمزاج، سرکش اور جاہل قسم کے لوگ ان قلعوں میں اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکتے تھے۔ عمدہ گھوڑے پالنے کے لیے بھی یہاں کے لوگ مشہور تھے۔ اس کے علاوہ ہرات اور سیستان کے بازاروں کے لیے غلام مہیا کرانے کی وجہ سے بھی غور کی شہرت تھی۔

اس علاقے کے پہاڑوں میں مختلف قسم کی دھات پائی جاتی تھیں اور یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غور میں لوہا کافی مقدار میں پایا جاتا تھا۔ کیونکہ غور کے باشندے اسلحہ اور جنگی سامان بنانے کے لیے مشہور تھے اور غلاموں کو آس پاس کے ممالک میں برآمد کرتے تھے۔ حدود العالم کا نامعلوم مصنف لکھتا ہے کہ اس صوبے سے غلام، زرہ، جوشن اور عمدہ اسلحہ منگوائے جاتے تھے۔ اس کے بقول طغان، غور اور کابل سے لے کر قرلوق تک کا سارا علاقہ دھات کی کاریگری کے لیے مشہور تھا۔ شاید اسی وجہ سے غور کے قلعہ کو پل آہنگران بھی کہا جاتا تھا۔ جب 1020 میں مسعود نے غور پر حملہ کیا تھا تو وہاں کے حکمران ابوالحسن خلف نے اس کو تلواریں اور ڈھالیں پیش کی تھیں اور جب جرداس کا قلعہ فتح کیا گیا تھا تو خراج کے طور پر اسلحہ وصول کیا گیا تھا۔ غور کے اسلحہ کی وقعت کا اعتراف مسعود نے بھی کیا تھا اور اس نے غوری افسران کو محاصروں کے ماہرین کے طور پر بحال کیا۔ جب غور کے عزیزالدین (1100-1140) نے سلجوقی سلطان سنجر کو سالانہ خراج بھیجا تو اس میں خصوصی طور پر زرہ بکتر، آہنی خود اور دوسرے جنگی سامان شامل تھے۔ ساتھ ہی غور میں پالے گئے خونخوار کتے بھی۔ لہذا غور، جس نے مسلم ثقافتی اثرات حال ہی میں قبول کیے تھے، کے پاس عہد وسطیٰ کے دو اہم ترین جنگی سامان موجود تھے یعنی لوہا اور گھوڑے۔

5.6 غور میں تبلیغ اسلام (The Spread of Islam in Ghur)

قبل اس کہ معزالدین کے بر سر اقتدار آنے تک کی غور کی تاریخ کا ذکر آگے بڑھایا جائے ایک ضروری معاملے پر غور کرنا ہے اس وقت غور کی مذہبی صورتحال کیا تھی اور کن ذرائع سے یہ دائرہ اسلام میں داخل ہوا۔ غور کے ماقبل اسلام مذہبی حالات کے متعلق ہمیں بہت کم معلومات ہیں اور غوریوں کے اسلام قبول کرنے کے متعلق کوئی ہمعصر تحریر دستیاب نہیں ہے۔ چونکہ طخارستان، بامیان اور کابل بدھ مذہب کے سرگرم مراکز تھے۔ اس لیے یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ غور کے لوگ بھی شاید ایک قسم کے مہایان بدھ مذہب کے پیروکار رہے ہونگے اس سلسلے میں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رکھنی ہوگی کہ غور کے جنوبی علاقے مثلاً زمندوار، غزنی اور قصدار ہندوستان سے ملحق تھے اور دسویں صدی تک ثقافتی اعتبار سے اور اکثر سیاسی اعتبار سے بھی اس کا ایک حصہ تھے۔ کابل غزنی اور بست ہندوستان اور مشرقی اسلامی ممالک کے درمیان تجارتی سلسلے کی اہم کڑیاں تھیں اور اکثر جغرافیہ دان ان کو سوداگروں کی آماجگاہ اور ہندوستان کی منڈی کہتے تھے۔ غزنوی دور کی شروعات میں پہلے دو شہروں میں ہندوستانی تاجروں کی مستقل آبادی تھی۔ اس لیے یہ بعید از قیاس نہیں کہ غور علاقہ زیادہ تر بدھ مذہب کے ماننے والوں سے آباد ہوگا۔ غور میں اسلامی سیاسی اور ثقافتی اثرات کی ابتدا سلطان محمود غزنوی (998-1030ء) کے زمانے میں ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے نے اپنی 1011 کی مہم کے بعد معلمین کی تقرری کی تاکہ وہ غور کے لوگوں کو اسلامی ہدایات کی تعلیم دے سکیں۔

کرامیہ فرقہ محمد بن کرام سے منسوب ہے جو سجستان کا رہنے والا تھا۔ جس کو اپنی مذہبی تبلیغ کے شروعاتی دور میں بہت ظلم برداشت کرنا پڑا تھا۔ لیکن بعد میں اس فرقہ کے لوگ غور، گرجستان، بامیان اور متصل علاقوں میں پھیل گئے۔ بغدادی لکھتا ہے کہ نیشاپور کے مضافات کے ستم زدہ لوگ خصوصی طور پر اس فرقہ کی جانب متوجہ ہوئے۔ ان کے مذہبی عقائد کے متعلق بغدادی لکھتا ہے کہ ابن کرام نے اپنے پیروں کو تاکید کی کہ وہ اپنے معبود کی جسمانیت یا مادیت پر عقیدہ رکھیں۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ ایک جسم مادی ہے جس کے حدود متعین ہیں اور جس کی زیریں حد اس کے تخت سے متصل ہے۔ اس طرح کرامی لوگ اللہ اور اس کے تخت کو اس طرح تصور کرتے تھے جیسے گوتم بدھ کنول پر بیٹھتے تھے۔ آہستہ آہستہ کرامی فرقہ کو اسلام اور بدھ مذہب کے بیچ ایک درمیانی مقام حاصل ہوگیا، اور وہ غور کی مذہبی زندگی میں ایک اہم عنصر بن گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس فرقے کے پیروں نے شنسبانی حکمرانوں کو بھی اپنے زمرے میں شامل کرلیا تھا۔

جب سلطان علاؤالدین جہاں سوز نے اسماعیلی ملحدین کے مرکز الموت کے داعیوں کو اپنی مملکت کے سارے طول و عرض میں مذہبی تبلیغ کی اجازت دی، تو غور جہاں عمومی طور پر کرامیوں کا اثر تھا، کی مذہبی زندگی میں ایک گہرا بحران کھڑا ہوگیا۔ بقول منہاج الموت کے ملحدین نے غور کے لوگوں کو اپنے عقیدے میں شامل کرلینے اور ماتحت بنالینے کی ٹھان رکھی تھی۔ علاؤالدین کا رویہ شاید سیاسی اسباب سے متاثر تھا۔ اسماعیلیوں کو بلا کر شاید وہ کرامیوں کے مذہبی اثرات کو کم کرنا چاہتا تھا کیوں کہ کرامی باطنیوں کے مخالف تھے اس لیے دونوں کے درمیان ایک شدید تصادم شروع ہوگیا۔ سلطان علاؤالدین جہاں سوز کے بیٹے سلطان سیف الدین محمد نے اپنے باپ کی پالیسی کو بدل دیا اور اپنی مملکت میں تمام ملحدین کے قتل کا حکم صادر کردیا۔

بقول منہاج، غیاث الدین اور معزالدین دونوں بھائی پہلے کرامی تھے۔ بعد میں وہ علی الترتیب شافعی اور حنفی عقائد اور مذہب کے پیروکار ہو گئے۔ جن حالات میں ان کی تبلیغ ہوئی اور ان کا جو رد عمل ہوا اس کو منہاج اور ابن دسیر نے بیان کیا ہے۔ منہاج لکھتا ہے کہ جب معزالدین تخت نشیں ہوا تو اس نے دیکھا کہ اس علاقے کے رہنے والے زیادہ تر لوگ امام ابو حنیفہ کے پیرو تھے اس لیے اس نے بھی حنفی عقائد قبول کر کے ان کی مطابقت حاصل کر لی۔ اس طرح یہ معلوم ہوتا ہے کہ سیدھے سادے حالات کے تحت کی سیدھا سادہ فیصلہ ہوا۔ لیکن جیسا کہ پروفیسر حبیب نے سوال کیا ہے اگر واقعی ایسا تھا تو غور کے زیادہ تر شہری ابھی بدھ مذہب کے ماننے والے تھے، پھر تو اسے بدھ مذہب قبول کرنا چاہیے تھا۔ ابن اثیر نے قدرے مختلف بیان پیش کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اہل خراسان جو کرامیوں کے مخالف تھے، کے دباؤ کی وجہ سے ان دونوں بھائیوں نے کرامی عقائد کو چھوڑ دیا۔ غیاث الدین کا شافعی عقیدہ قبول کرنا گہری غور و فکر کا نتیجہ تھا جو عطا اور شیخ وجیہ الدین مرورودی کی کوششوں کی وجہ سے ہوا۔ حنفی علماء کو اس تبدیلی عقائد سے ناراضگی ہوئی اور ان کے رہنما امام صدر الدین علی ہیضم نیشاپوری جو افشین کے ایک کالج کے پروفیسر تھے، نے سلطان کی ایک ہجو لکھی اور وہ ہجو کچھ اس طرح تھی۔

''خراسان میں بہت سارے شافعی تاجر ہیں، اعلیحضرت انہیں اکثر شہزادوں کے محلوں کے آگے منتظر پائیں گے۔ لیکن آپ نہایت تکلیف کے ساتھ ڈھونڈنے پر بھی شافعی مذہب کا پیروکار بادشاہ نہیں پائیں گے۔ اگر آپ کو اپنا آبائی عقیدہ بدلنا ہی تھا تو آپ دیگر بادشاہوں کی طرح حنفی ہو سکتے تھے۔ بخدا ابو حنیفہ اور امام شافعی دونوں آپ سے قیامت کے روز سوال کریں گے۔''

5.7 شنسبانی خاندان (The Shansabani Dynasty)

سلطان معزالدین سام جو شہاب الدین غوری کے لقب سے مشہور ہوا، غور کے شنسبانی خاندان کا ایک فرد تھا۔ اس خاندان کی ابتدائی تاریخ اسرار اور افسانوی واقعات سے ڈھکی ہوئی ہے۔ حقائق کو افسانوں سے علیحدہ کرنا مشکل ہے اور اس موضوع پر ہماری معلومات کا انحصار تمام تر منہاج سراج پر ہے، اور وہ خود اپنی تصنیف طبقات ناصری میں اس بات پر اظہار افسوس کرتا ہے کہ کتاب لکھتے وقت وہ ان حوالہ جات اور ماخذ پھر سے نہ دیکھ سکا جو غور میں اس کے پاس تھے۔ جب وہ منگولوں سے اپنی جان بچانے کے لیے بھاگا تو وہ سب ماخذات وہیں رہ گئے اور اس کو اپنی یاداشت سے ہی کام لینا پڑا۔ لیکن پھر بھی تاریخ ناصری اور تاریخ ہیصم نبی بھی اس کی دسترس میں تھیں اور وہ ان کو شنسبانی خاندان کے ابتدائی حالات مرتب کرنے میں کام میں لایا۔ جیسا کہ مشرق کے بعض اور ایسے حکمران خاندان جن کے ابتدائی حالات نامعلوم یا گمنام تھے، کے ساتھ ہوا۔ بالکل اسی طرح معزالدین کے خاندان کے لیے بھی ایک روایتی سورما ضحاک مہیا کیا گیا جو اس کا مورث اعلی تسلیم کیا گیا۔

ایرانی علاقوں کی روایات میں میں ضحاک ایک مکروہ شخصیت تھی، مگر غزنی اور زابلستان کے علاقے میں اسے مقبولیت حاصل تھی۔ اس لیے غور کے ماہرین انساب نے اس کو معزالدین کے خاندان کے لیے چنا۔ زرتشتوں نے ضحاک کو جو اولاً ایک اسیریائی دیوتا تھا، کو مسکن شیاطین میں پھینک ڈالا۔ فردوسی جسے ایک ایسے نمونے کی نمائندگی کی تلاش تھی جس سے اسے شدید نفرت تھی مگر جس کو وہ نظرانداز نہیں کر سکتا تھا، نے ضحاک کو ایک مشرقی عرب کی صورت میں دوبارہ پیش کر کے زندہ جاوید بنا دیا۔ روایت یہ تھی کہ جب فریدوں نے ضحاک کی ہزار

سالہ مملکت کا تختہ الٹ دیا تب اس کے اخلاف غور میں آباد ہو گئے۔

شنسب جس نے اپنا نام خاندان کو دیا، بقول منہاج سراج حضرت علی کے ہاتھوں مشرف بااسلام ہوا تھا جنہوں نے اس کو ایک علم اور ایک عہد نامہ عطا کیا تھا۔ یہ قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا۔ اگرچہ تیسرے خلیفہ حضرت عثمان کے زمانے سے مسلمانوں نے غور پر چھٹ پٹ حملے شروع کر دیے تھے، تاہم یہ علاقہ باضابطہ مسلم حکومت کے تحت نہیں آیا اور طبری اور ابن اثیر نے نے جن مہمات کا ذکر کیا ہے وہ محض چھوٹی موٹی جھڑپیں تھیں۔ بوسورتھ (Bosworth) کے مطابق غور کی اہمیت محض غلاموں کی منڈی کی حیثیت سے تھی اور ان کا حصول وقتاً فوقتاً حملوں کے ذریعے ممکن تھا۔ اس علاقے پر واقعی عملداری اور اس کا الحاق بعد کا واقعہ ہے۔ حدود العالم (982-3) کا مصنف جو فریغونی خاندان کی ملازمت میں تھا اور ملحقہ صوبے گورزگان میں رہتا تھا، اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ اس کے آقاؤں کو غور پر اقتدار اعلیٰ حاصل تھا اور یہ کہ غوری لوگ جو اس سے پہلے کافر تھے اس کے زمانے میں زیادہ تر مسلمان ہو چکے تھے۔ مینورسکی کے خیال میں یہ بیان مبالغہ آمیز ہے۔ درحقیقت حدود العالم کے اس بیان سے اگر کوئی نتیجہ نکالا جائے تو اس علاقے میں محمود اور مسعود کی جنگیں بے مقصد نظر آئیں گی۔ اصطخری قطعی طور پر غور کو دارالکفر لکھتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کے تذکرے میں اس علاقے کے شامل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کچھ مسلمان تھے اور چونکہ یہ اسلامی حدود میں سب سے بڑا کافر علاقہ تھا۔ لیکن منہاج لکھتا ہے کہ شنسب خاندان کے ہر حکمران کو تخت نشینی سے پہلے حضرت علی کے عہد نامے کی تائید کرنی پڑتی تھی۔ غوریوں کو آل علی سے اس قدر عقیدت تھی کہ انہوں نے خلافت بنوامیہ کو تسلیم نہ کیا۔

طبری اور ابن اثیر کی تحریروں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ 667 اور 725-6 میں میں غور کے خلاف جنگیں لڑی گئیں۔ دوسری جنگ کی قیادت ابو منظر اسعد کر رہے تھے۔ اس موقع پر غوریوں نے اپنے مال و اسباب دشوار گزار غاروں میں چھپا دیے۔ اسعد اس صورتحال سے پریشان نہ ہوئے۔ اس نے اپنے آدمیوں کو توابیت کے ذریعہ زنجیروں کے سہارے نیچے اتارا اور ان مال اور اسباب پر قبضہ کیا۔ اس پورے عہد میں بنی امیہ کے چھٹ پٹ حملے غور پر ہوتے رہے لیکن جغرافیائی دشواریوں کی وجہ سے مستقل طور پر سیاسی یا ثقافتی قبضہ قائم رکھنا ناممکن تھا۔ چونکہ پہاڑی راستے جن کو پار کرنا گرمی کے موسم میں بھی دشوار تھا سردیوں میں بالکل بند ہو جاتے تھے۔ منہاج لکھتا ہے کہ جب ابو مسلم خراسانی نے بنی امیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو شنسبانی خاندان کے ایک فرد امیر فولاد نے اس کی مدد کے لیے کوچ کیا۔ خلیفہ ہارون رشید کی حکومت کے دوران کچھ غوری قبائل نے اپنے اختلافات کے سلسلے میں خلیفہ سے ثالث بننے کی گزارش کی تھی۔ لیکن منہاج کا یہ بیان بھی قیاس پر مبنی لگتا ہے۔ منہاج مزید لکھتا ہے کہ یعقوب ابن لیث کے زمانے میں غوری سرداروں کی مسلم اور غیر مسلم پارٹیاں ایک دوسرے کی دشمن تھیں۔ لیکن غور کے مذہبی حالات کے متعلق اصطخری کے قطعی بیان کی روشنی میں یہ بات بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ گردیزی اور بیہقی لکھتے ہیں کہ 979-80 کے لگ بھگ سامانی حکمران امیر نوح بن منصور نے ابو جعفر زبیری کو غور کی فتح کے لیے بھیجا۔ لیکن صرف قلعہ فتح کرنے کے بعد اسے واپس ہونا پڑا۔ بعد میں جب سبکتگین، سامانیوں کی جانب سے غزنی اور زابلستان کا گورنر تھا تو اس نے غور پر کئی حملے کیے۔ عنصری کے ایک قصیدے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمود جو اس وقت کم سن تھا، نے بھی ایک مہم میں حصہ لیا تھا۔ سبکتگین نے ایک شنسبانی شہزادہ محمد بن سوری سے خراج وصول کیا تھا۔

محمد بن سوری نے سبکتگین کے انتقال کے بعد خراج روک کر اور کاروانوں کی آمدورفت میں دخل اندازی کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔اس وجہ سے سلطان محمود غزنوی کو طیش آیا اور اس نے 1011 میں ہرات کے گورنر التونتاش اور طوس کے گورنر ارسلان جاذب کو ہراول دستہ بنا کر بھیجا اور خود جغرافیائی مشکلات سے ڈرے بغیر غور کی جانب کوچ کیا۔ محمد بن سوری نے دشوار گزار پہاڑوں میں خود کو قلمبند کر لیا اور محمود کو ایک چال چلنی پڑی،اس نے پسپائی کا ڈھونگ رچایا۔اس وجہ سے پہاڑی لوگ پسپا شدہ فوج کو لوٹنے کے لالچ میں نیچے اتر آئے۔ تب محمود نے محمد بن سوری کو شکست فاش دی اور اس کو اور اس کے بیٹے شیش کو گرفتار کر لیا۔1020ء میں محمود نے غور کے جنوب مغربی علاقے خوابین کی جانب کوچ کیا اور چند قلعوں کو فتح کیا۔چند سال بعد مسعود کو غور کے شمال مغربی حصے طاب کی طرف بھیجا گیا۔اس کی مدد ابوالحسن اور شیروان کے سرداروں نے کی جو علی الترتیب غور کے جنوب مغربی اور شمال مشرقی علاقوں کے منتظم تھے۔ مسعود نے غور کے بہت سے قلعوں کو فتح کیا اور ماسوائے اندرونی دشوار گزار علاقوں کے پورے غور کو غزنوی دائرہ اقتدار میں لے آیا۔ابوالفضل بیہقی لکھتا ہے کہ کوئی بھی غور میں اتنی دور تک داخل نہ ہو سکا تھا اور اتنے کارنامے انجام نہ دے سکا تھا جتنا کہ مسعود نے انجام دیے۔اپنی رضا یا مجبوری سے غور کے امیر اپنی اطاعت پیش کرنے اس کے پاس آئے۔وہ اس کی کامیابی سے خوفزدہ اور دم بخود تھے۔روایات یا تصنیفات کسی میں بھی یہ ذکر نہیں کہ غور کے لوگ کسی اور بادشاہ کے اتنے اطاعت گزار تھے جتنا کے مسعود کے تھے۔جب کہ محمد بن سوری سلطان محمود کے خلاف بغاوت کر رہا تھا اس کا بڑا لڑکا ابو علی سلطان کو اپنی وفاداری اور خیر خواہی کا یقین دلا رہا تھا۔اس غداری نے خاندان کا چراغ گل نہ ہونے دیا۔ محمود نے ابو علی کو اس کے باپ کے تخت پر بٹھا دیا۔ابو علی سلطان محمود کی حکومت کے زمانے تک بر سر اقتدار رہا۔ منہاج لکھتا ہے کہ اس نے غور میں کئی ایک اسلامی اداروں کو قائم کیا۔اس نے ملک میں جامع مسجد اور مدرسے بنوائے اور ان کی دیکھ بھال کے لیے اوقاف قائم کیے۔وہ علماء اور مذہبی پیشواؤں کی بڑی عزت کرتا تھا۔صوفیوں اور تارک الدنیا بزرگان کی خدمت کو اپنا فرض جانتا تھا۔ابو علی نے اپنے چھوٹے بھائی شیش کو غور آنے اور اپنے ساتھ رہنے کی اجازت دی۔ لیکن شیش کے بیٹے عباس نے اچانک بغاوت کی اور اپنے چچا کو قید میں ڈال دیا۔

عباس نے غور کے حصاروں کے استحکام، قلعہ بندی اور ان میں فوج تعینات کرنے کے لیے کافی کوشش کی۔ لیکن وہ بہت مطلق العنان اور ظالم تھا اور غور کے امیر اس کے بے رحم رویوں سے اس قدر بد ظن تھے کہ انہوں نے سلطان مسعود کے بیٹے سلطان رضی الدین ابراہیم کو اس ظالم سے نجات دلانے کے لیے دعوت دی۔ابراہیم نے عباس کو گرفتار کر لیا اور غزنی لے گیا۔ لیکن اس نے خاندان کو ختم نہیں کیا بلکہ سلطان محمود کے نمونے پر عمل کرتے ہوئے عباس کے بیٹے محمد کو تخت پر بٹھا دیا۔ محمد نے اپنے غزنوی حکمراں کے ساتھ بہت اچھے تعلقات قائم رکھے۔ عباس کے بیٹے محمد کے بعد غور کی سیاسی تاریخ میں کئی اہم حکمران گزرے جنہوں نے رفتہ رفتہ غوریوں کی علاقائی حیثیت کو ایک بڑی سلطنت میں تبدیل کیا۔ان میں عزیزالدین (1100-1140ء) کا نام نمایاں ہے جس نے سلجوقی سلطان سنجر کی بالادستی قبول کرتے ہوئے اسے سالانہ خراج بھیجا اور غوریوں کی فوجی طاقت کو منظم کیا۔اس کے بعد قطب الدین محمد (متوفی 1146ء) کے دور میں ہری رود پر واقع ورشادا کی اس مملکت نے فیروز کوہ کو اپنا باقاعدہ دارالسلطنت بنایا، جس سے غوریوں کو ایک مضبوط سیاسی مرکز مل گیا۔ بعد ازاں، سلطان علاؤالدین جہاں سوز بر سر اقتدار آیا، جس کے بعد اس کا بیٹا سلطان سیف الدین محمد تخت نشین ہوا۔ سیف الدین محمد کے بعد غوری

سلطنت کی باگ ڈور غیاث الدین اور اس کے بھائی معزالدین کے ہاتھ میں آئی۔ ان دونوں بھائیوں کی مشترکہ کاوشوں نے فیروز کوہ کی اس ریاست کو ایک عظیم الشان سلطنت میں ڈھال دیا، جس کے بعد معزالدین نے غزنی پر قبضہ کر کے اپنی توجہ ہندوستان کی فتوحات پر مرکوز کر دی

5.8 سلطان معزالدین سام (Sultan Mu'izzuddin Sam)

سلطان معزالدین محمد بن سام، جسے تاریخ میں شہاب الدین غوری کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، غور کے شنسبانی خاندان کا ایک مایہ ناز حکمران تھا۔ غور کے دشوار گزار جغرافیائی حالات، جہاں بہترین جنگی گھوڑے اور اسلحہ سازی کے لیے اعلیٰ قسم کا لوہا وافر مقدار میں دستیاب تھا، نے غوریوں کو ایک ناقابل تسخیر عسکری طاقت بننے میں بھرپور مدد دی۔ ابتدائی مذہبی کشمکش اور سیاسی رسہ کشی سے نکل کر جب غوری اقتدار مستحکم ہوا، تو معزالدین نے اپنی توجہ مشرق کی جانب مرکوز کی۔ سلطان محمود غزنوی کے برعکس، جس کی ہندوستانی مہمات کا بڑا مقصد مال غنیمت کا حصول تھا، معزالدین غوری کا نقطہ نظر واضح طور پر مختلف تھا۔ وہ محض ایک لوٹ مار کرنے والا حملہ آور نہیں تھا، بلکہ اس کا بنیادی سیاسی ہدف ہندوستان میں ایک مستقل اور مستحکم ترک اسلامی سلطنت کا قیام تھا۔ اسی وسیع تر نقطہ نظر اور بلند ہمت مقاصد کی تکمیل کے لیے اس نے ہندوستان کی جانب اپنی فوجی پیش قدمی کا باقاعدہ آغاز کیا، جس کے مختلف مراحل ذیل میں بیان کیے گئے ہیں۔

ملتان

سلطان معزالدین کی ہندوستان کی جانب پہلی فوجی پیش قدمی 1175ء میں ہوئی جب اس نے ملتان کے قرامطیوں پر حملہ کیا۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل سلطان محمود غزنوی نے قرامطی حکمراں پر کاری ضرب لگائی اور ان کو ملتان سے بے دخل کر دیا تھا مگر اس کی موت کے بعد انہوں نے پھر اقتدار حاصل کر لیا۔ معزالدین نے دوبارہ ان کی طاقت کو اکھاڑ پھینکا۔ یہ معلوم نہیں کہ معزالدین نے ملتان کے لیے کس طرح کا انتظامی ڈھانچہ تیار کیا لیکن اس علاقے میں قرامتی اقتدار پھر کبھی قائم نہ ہو سکا۔ بہر حال اس کی وجہ سے کرامتیوں کے دل میں سخت نفرت پیدا ہوئی اور چونکہ ان کی خفیہ تنظیم بڑی موثر تھی اس لیے بالآخر انہوں نے معزالدین کو قتل کر ڈالا۔

اچھہ

ملتان پر اپنا قبضہ جمانے کے بعد مرض الدین نے اچھہ کی جانب توجہ کی ہو گی۔ منہاج نے اچھ کی مہم کا علیحدہ تذکرہ نہیں کیا ہے۔ لیکن جب وہ بعد میں سلطان کے انہلواڑہ کی مہم کا ذکر کرتا ہے تو وہ اچھہ کا ایک غور مملکت کی حیثیت سے ذکر کرتا ہے۔ فرشتہ کے مطابق اچھہ پر 1176ء میں قبضہ ہوا۔ سلطان نے اچھہ کو علی کرمانی کے حوالے کیا۔ طبقات ناصری سے ظاہر ہوتا ہے کہ اندخود کی جنگ کے وقت ملک ناصر الدین ایتم اچھہ کا گورنر تھا۔ بعد میں معزالدین نے اس کو قباچہ کے حوالے کیا۔

نہروالا (انہلواڑہ)

1178-79ء میں اچھ اور ملتان سے گزرتے ہوئے معزدین نے نہروالہ کی طرف کوچ کیا۔ کتبوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی

راجپوتانہ میں ترکوں کا دباؤ پچھلے دس سالوں سے محسوس کیا جارہا تھا۔ بہرام کے مقرر کردہ پنجاب کے گورنر باہلیم نے ناگور فتح کر لیا تھا۔ لیکن اس فتح کی نہایت ایسی تھی کہ شیخ رضی الدین حسن صغانی جب اس علاقے کا دورہ کر رہے تھے تو انہیں اپنی پوشاک بدلنی پڑی تھی۔ تاکہ ان کا مسلمان ہونا ظاہر نہ ہو جائے۔ اس طرح یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان سپاہیوں کو گنگا کے دوآب کے مقابلے میں مغربی راجپوتانا سے زیادہ واقفیت تھی۔ معین الدین نے محمود کے کارنامے کو دہرانے کی کوشش کی اور جنوبی ہندوستان اور اس کے مندروں کی دولت تک راجپوتانہ اور گجرات ہو کر پہنچنے کی کوشش کی۔ ابو پہاڑ پہنچ کر محض دین کی فوج تھک کر پریشان ہو گئی ہو گی۔ کسی ہندوستانی حکمران سے اس کے مقابلے کا یہ پہلا موقع تھا۔ نہروالہ کے حکمران آپ کے پاس ایک طاقتور فوج اور ہاتھیوں کی ایک بڑی تعداد تھی ابو پہاڑ کے نزدیک ایک گاؤں کیادرا میں جنگ ہوئی۔ والدین کی فوج کو شکست فاش ہوئی اور وہ کسی طرح اپنی شکست خوردہ فوج کے ساتھ گجرات سے بھاگ نکلا۔

پشاور

نہروالا کی شکست معزالدین کے لیے فوجی حکمت عملی میں ایک سبق تھی۔ اگر وہ محمود کی برابری کی کوشش کر رہا تھا تو وہ غلط فہمی میں مبتلا تھا۔ ذرائع سربراہی اور تبدیل شدہ حالات نے بالکل نقشہ پلٹ دیا تھا۔ اپنے تجربات کی روشنی میں اس نے اپنی جنگی کارروائیوں کا پورا نقشہ بدل دیا۔ 1179-80ء میں میں اس نے پشاور جو غزنویوں کی ہندوستانی مملکت میں شامل تھا پر حملہ کیا اور اس پر قبضہ کر لیا۔

لاہور

پشاور ترائن کی جانب پہلا قدم تھا اور اس کے دو سالوں کے اندر اس نے لاہور کی جانب کوچ کیا۔ غزنوی خاندان کی حکومت جواب سمٹ کر صرف لاہور اور اس کے گردونواح تک رہ گئی تھی۔ اس کے آخری حکمران خسرو ملک یہ مدافعت کی طاقت نہ دیکھ کر معزالدین سے گفت وشنید کرنے کا فیصلہ کیا۔ اپنی نیک نیتی اور معزالدین کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم رکھنے کے ثبوت کے طور پر اس نے اپنے لڑکے کو مع ایک ہاتھی کے معزالدین کے پاس بھیجا۔ لیکن یہ وقتی مصالحت ہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ ملک کے اندر اپنے اقتدار کی توسیع کے لیے معزالدین کو لاہور پر قبضہ کرنا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ محمود کے خاندان اور شنسبانوں کے درمیان جو تعلقات رہے تھے اس کے پیش نظر سر یہ مصالحت زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ 1182ء میں معزالدین نے دیبل (موجودہ کراچی) کی جانب کوچ کیا اور سمندر تک کا سارا علاقہ قبضہ کر لیا۔ مگر حکمران نے اس کی ماتحتی قبول کر لی اور اگلے تین سال تک سکون رہا۔ 1184-85ء میں معزالدین کی فوجوں نے لاہور کی جانب حرکت کی اور پورے علاقے کو تاراج کیا۔ خسرو ملک کو شہر پناہ کے اندر محصور ہونا پڑا۔ واپسی سے قبل سیالکوٹ کے قلعے کی تعمیر کا حکم دیا اور حسین بن خرمیل کو وہاں کا حاکم مقرر کیا۔ سلطان کے تبدیل شدہ جنگی نقشے میں سیالکوٹ کی بڑی اہمیت تھی اور ملک کے اندر مزید فوجی کارروائیوں کے لیے معزالدین اس کو اور مستحکم بنانا چاہتا تھا۔ لیکن خسرو ملک ملک اپنے دارالحکومت کے اس قدر نزدیک غوری طاقت کے استحکام کو اپنی مملکت کے لیے خطرہ سمجھتا تھا۔ اس نے تمام دستیاب ذرائع کو اکٹھا کر کے اور کھوکھر قبیلے کی مدد سے سیالکوٹ کے قلعہ کا محاصرہ کیا۔ لیکن یہ محاصرہ اس کے لیے دشوار ثابت ہوا اور اس کو شرمندہ ہو کر لاہور واپس ہونا پڑا۔ اس طرح بغیر کوئی فائدہ حاصل کیے اس نے معزالدین کی مخالفت مول لی۔

1186ء میں معزالدین، غزنوی طاقت کے آخری آثار کو مٹانے کا ارادہ کر کے لاہور پہنچ گیا۔اپنی کمزور حیثیت کا معائنہ کرنے کے بعد معزالدین سے گفتگو کرنے کے لیے وہ قلعے سے باہر نکل آیا۔اس کے سرکشانہ سرگرمیوں کو پیش نظر رکھ کر معزالدین نے اس کو گرفتار کر لیااور گرجستان کے ایک قلعہ میں بھیج دیا جہاں 1192ء اس کی موت ہو گئی۔اس کی موت کے ساتھ ہی غزنوی خاندان کا نام و نشان مٹ گیا۔اس طرح لاہور غوریوں کے قبضے میں آگیا۔اب دیبل سے سیالکوٹ تک اور پشاور سے لاہور تک ہر طرف معزالدین کی فوجی چھاونیاں پھیلی ہوئی تھیں۔اس کی فتح کا ایک اہم پہلو جو اکثر نظرانداز کر دیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ راجپوت حکومتوں پر حملہ شروع کرنے سے پہلے اس نے سندھ اور پنجاب میں اپنی طاقت کو مضبوط کیا۔یہ سارا علاقہ ایک ہی تھا۔یہ بات اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ علی کرماخ جو ملتان کا والی اور سپہ سالار تھا، وہ لاہور میں تعینات ہوا۔پھلے ہی اس علاقے کا فوجی وانتظامی حاکم اعلی علی کرماخ تھا لیکن عدلیہ کا انتظام مولانا سراج الدین کو دیا گیا جو طبقات ناصری کے مصنف منہاج کے والد تھے۔ان کے تحت کچھ اہلکار بھی بحال کیے گئے۔

تبرہند (بھٹنڈہ)

معزالدین کا اگلا ہدف تبرہند (بھٹنڈہ) کا قلعہ تھا۔اس پر قبضہ کر لیا گیااور اس کو ملک ضیاءالدین توکلی کے زیر انتظام کر دیا گیا،اور بارہ ہزار سواروں کی ایک فوج قلعہ کی حفاظت کے لیے متعین کی گئی، جو کہ ساری فوج میں سے بہترین دستوں پر مشتمل تھی۔اس کے ذمے قلعہ کو آٹھ مہینوں تک سمبھالے رکھنے کی ذمہ داری تھی۔ معزالدین کا ایک ارادہ تھا کہ اس عرصے کے بعد وہ ہندوستان آئے گا تاکہ تبرہند میں اپنی طاقت کو اور مستحکم کرے اور مزید علاقوں کو فتح کرے۔رآئے پتھورا (پرتھوی راج سوم) نے معزالدین کو استحکام کا موقع دینے کے خطرے کو محسوس کیا۔اس کے سیاسی شعور نے اس کو فوری اقدامات اختیار کرنے پر مجبور کیااور غوریوں کو ان کی فوجی اہمیت کے مقام سے ہٹانے کے ارادے سے وہ تبرہند کی جانب روانہ ہوا۔ معزالدین رائے پتھورا کا مقابلہ کرنے کے لیے واپس لوٹا۔ حالانکہ شاید اس نے اس جنگ کا اندازہ نہیں کیا تھااور وہ اس وقت کسی راجپوت حکمراں کے خلاف بڑی جنگ کے لیے تیار نہیں تھا۔مزید برآں رائے پتھورا بھی میدان جنگ میں نہیں آیا تھا۔فرشتہ کے بقول ''کولاہ کے رائے کے ساتھ ہندوستان کے تمام رانا شامل تھے۔اس کی فوج میں دو ہزار گھوڑے اور 33 ہزار ہاتھی شامل تھے۔'' حالانکہ یہ اعداد ناقابل یقین ہیں۔

5.9 ترائن کی پہلی جنگ (First Battle of Tarain, 1191)

یہ جنگ ترائن میں ہوئی تھی۔فرشتہ کے مطابق، معزالدین کی فوج کے داہنے اور بائیں دستے منتشر ہو گئے تھے اور مرکز میں بھی بہت زیادہ آدمی باقی نہیں تھے۔اس مقام پر سلطان کے ایک افسر نے عرض کیا کہ داہنے اور بائیں جانب کے امراء جن کی پرورش آپ کے شاہی خاندان میں ہوئی منتشر اور فرار ہو چکے ہیں۔افغان اور خلجی امراء جو ہراول دستہ تھے اور برابر اپنی مردانگی اور شجاعت کی ڈینگ مارتے تھے، ان کا میدان میں کچھ اتا پتا نہیں ہے۔اس صورتحال میں سب سے مفید قدم یہ ہو گا کہ آپ فورا لاہور کی جانب باگ موڑ دیں۔ سلطان یہ مشورہ سن کر ناخوش ہوا۔اس نے اپنی تلوار کھینچی اور مرکزی دستہ لے کر دشمن پر حملہ کر دیا۔دوست اور دشمن سبھی نے اس کی ہمت اور چابکدستی کی تعریف

کی۔ کھانڈے راؤ کی نظر سلطان پر پڑی تو اس نے اپنے بلند ہاتھی کو سلطان کی جانب بڑھایا۔ سلطان بھی ہاتھ میں نیزہ لے کر کھانڈے راؤ کی طرف بڑھااور اس کے منہ پر ایسا سخت وار کیا کہ اس کے بہت سے دانت اس کے منہ میں گر گئے۔ لیکن پھر بھی رائے نے بڑی ہمت اور اطمینان سے کام لیااور سلطان کے بازو پر ایسا وار کیا کہ وہ اپنے گھوڑے پر لڑکھڑا گیا۔اس موقع پر ایک خلجی پیدل سپاہی جس نے سلطان کی خطرناک صورتحال دیکھ لی تھی،اس کے گھوڑے پر سوار ہو گیااور سلطان کے پیچھے بیٹھ کر گھوڑے کو ایڑ لگادی۔اس طرح وہ سلطان کو بھاگتے ہوئے غوری امیروں کے پاس لے گیاجو تقریباً بیس کروہ آگے جا چکے تھے۔ منہاج کے مطابق کئی امراءاور غوری نوجوان اور دیگر معزز اشخاص نے سلطان کو اس خلجی سپاہی کے ساتھ دیکھااور اس کے گرد جمع ہو گئے۔انہوں نے اپنے نیزے توڑ کر ایک پالکی(Stretcher)بنایااور اس کو اپنی جائے قیام تک لے گئے۔ معزالدین کو شکست دینے کے بعد رائے پتھورا کی فوج تبر ہند کی جانب بڑھی۔ ملک ضیاءالدین نے اس قلعہ کی 13 مہینوں تک محافظت کی مگر بعد میں ہتھیار ڈالنے پڑے۔اس درمیان معزالدین نے رائے پتھورا سے ایک اور مقابلے کی تیاریاں کی۔

5.10 معزالدین کی تیاریاں (Preparations of Mu'izzuddin)

معزالدین کی انتقامی تیاریوں کے متعلق منہاج نے اختصار سے کام لیا ہے۔ لیکن فرشتہ ایسے ماخذ کی بناپر جواب موجود نہیں یا زبانی روایات کی بناپر کچھ تفصیلات مہیا کرتا ہے۔ لیکن یہ تفصیلات معزالدین کے مزاج، کردار اور بعد کے کارناموں کے بالکل مطابق ہیں۔اپنے بھائی سے ملنے غور جانے سے پہلے اس نے اپنے غوری، خلجی اور خراسانی امیروں کو سخت سزائیں دیں۔اس نے افغانوں کو کچھ نہیں کہا۔ شاید اس لیے کہ جن علاقوں میں یہ قبیلہ آباد تھے وہ معزالدین نے حال ہی میں فتح کیے تھے،اور دانشمندی کا تقاضا یہ تھا کہ ان کی غلطی کو نظر انداز کر دیا جائے۔ غوری خلجی اور خراسانی امیروں کی گردنوں میں غلوں کے تھیلے ڈال کر ان کو شہر میں گھمایا گیا۔اگر ان میں سے کوئی وہ غلہ کھانے سے انکار کرتا تو اس کا سر قلم کر دیا جاتا۔جب معزالدین دارالسلطنت فیروز کوہ پہنچا تو وہ سخت غمگیں اور شرم سار تھا۔اس نے اپنے اوپر آرام حرام قرار دے دیااور شب و روز جنگ کی تیاریوں میں مصروف رہنے لگا۔ایک سال کی تیاری کے بعد معزالدین نے ہندوستان کی راہ اختیار کی۔ جب وہ پشاور پہنچا تو ایک پرانے وفادار افسر نے ہمت کر کے اس کی منزل مقصود کے بارے میں پوچھا۔ سلطان نے اپنا ارادہ بتادیااور یہ کہا کہ اس نے غوری، خلجی اور خراسانی امراء کو اپنے سامنے حاضر ہونے کی اجازت نہیں دی ہے اور ان کی مدد کے بغیر اللہ پر بھروسہ کر کے ہندوستان جارہا ہے۔اس افسر نے عتاب زدہ امراء کی طرف سے معافی کی درخواست کی جسے سلطان نے قبول کر لیا۔ ملتان پہنچ کر اس نے ان امراء کو انعام دیا جو اس کی غیر حاضری میں ثابت قدم رہے تھے۔ عصامی کا کہنا ہے کہ سندھ کے نزدیک 40 بہادر اور جنگجو ترک سوار فوج میں شامل ہوئے۔

تاج المآثر کے مطابق معزالدین نے قوام الملک رکن الدین حمزہ کو لاہور سے رائے پتھورا کے پاس روانہ کیااور اطاعت قبول کرنے کا پیغام دیا۔رائے سخت جواب دیااور ہندوستان کی تمام راجاؤں سے مدد طلب کی۔ فرشتہ کے مطابق رائے کی فوج میں تین لاکھ راجپوت اور افغان تھے لیکن یہ تعداد مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے اور قابل قبول نہیں۔ منہاج کو معین الدین اوشی نامی ایک بھروسہ مند آدمی نے بتایا تھا کہ اس وقت معزالدین کی فوج میں غور کے چار جانباز فوجی کمانڈر تھے جو کہ تجربہ کار اور ہوشیار تھے۔ان میں سے ہر ایک کے تحت ایک بڑی فوج تھی۔ان کے علاوہ تاج الدین یلدوز، ناصر الدین قباچہ اور قطب الدین ایبک تھے۔ سلطان غور سے 1191ء میں روانہ ہوا۔1191-92ء

میں ترائن پہنچا۔اس نے اسی جگہ اپنا خیمہ نصب کیا جہاں ایک سال قبل اس کو شکست ہوئی تھی۔فرشتہ کے مطابق رائے پتھورا کے ساتھ جنگ 150 ٹھاکر یارانا تھے جو یہ سوچ کر نکلے تھے کہ یا تو دشمنوں کو کچل دیں گے یا خود اپنی جانیں گنوا دیں گے۔

5.11 ترائن کی دوسری جنگ (Second Battle of Tarain, 1192)

اس مرتبہ معزالدین نے بہت سوچ سمجھ کر جنگ کا نقشہ تیار کیا تھا۔اس نے کل بھی دستے کو جس میں اسباب، علم، جھنڈے اور ہاتھی شامل تھے، کئی میل پیچھے چھوڑ دیا تاکہ دشمن کو اس کی صحیح طاقت کا اندازہ نہ ہو سکے۔یہ دستہ ایک طرح کا محفوظہ (Reserve Force) تھا اور یہ اس وقت میدان جنگ میں لایا جانا تھا جبکہ بقیہ فوج راجپوتوں سے نبرد آزما ہو چکی ہو۔اس دستے کو پیچھے چھوڑ کر معزالدین کی بقیہ فوج آگے روانہ ہو گئی۔فوج کے اس حصے کو جو ہلکے اسلحوں سے لیس گھوڑ سواروں پر مشتمل تھا، چار دستوں میں تقسیم کر دیا گیا تاکہ یہ ہندوستانی فوج پر چاروں طرف سے حملہ کر سکے۔اپنی فوج کو یوں منقسم کر کے نواز دین نے دس ہزار گھوڑ سوار تیر اندازوں کو یہ حکم دیا کہ وہ دشمن کی فوجوں کو داہنے بائیں آگے اور پیچھے کی جانب سے الجھائے رکھے۔دشمن کے ہاتھیوں اور گھوڑوں سے برابر کا فاصلہ رکھ کر ان پر تیر برساتے رہو۔اس کا مقصد یہ تھا کہ دشمن کی فوج کو اس طرح حیران و پریشان رکھا جائے کہ اس کی فوج کی پوری تعداد میدان جنگ میں موجود رہے۔

اگلے روز میدان کارزار گرم ہوا۔عصامی کے مطابق راجپوت فوجوں کے ہراول کا سالار گووند رائے تھا۔وہ پتھورا کی فوج کے ہراول دستے میں لڑ رہا تھا۔قلب میں رائے پتھورا موجود تھا۔جب کہ اس کی فوج کی بایاں حصہ اس کے وزیر بھولا کی سرکردگی میں لڑ رہا تھا۔دایاں حصہ کی قیادت بدمسار اول کے ہاتھ میں تھی۔دوسری طرف معزالدین کی فوج کے قلب کی کمان معزالدین کے اپنے ہاتھ میں تھی۔ہراول دستے کا سالار خربک تھا۔داہنا دستہ سالار آلہا کے تحت اور بائیں دستہ کی سربراہی سالار کمیل کر رہا تھا۔قطب الدین کے ذمہ فوج کی عام نگرانی تھی، اور وہ معزالدین کے نزدیک تھا۔بقول عصامی سلطان کی فوج ایک لاکھ تیس ہزار سواروں پر مشتمل تھی اور اس کا ہر سپاہی آہنی زرہ اور ہتھیاروں سے لیس تھا۔گووند رائے ہاتھیوں کے دستے کے ساتھ آگے بڑھ کر خربک پر حملہ آور ہوا۔خربک نے اپنی حفاظت کے لیے منہ پر ڈھال رکھ لی اور اپنے تیر اندازوں کو فیل بانوں پر نشانہ محصول ے کو کہا۔جیسے ہی تین چار فیل بان زخمی ہوئے ہاتھیوں کی صفیں بکھر گئیں اور ہاتھی میدان سے بھاگنے لگے۔جب ہاتھی پیچھے ہٹ گئے تو خربک نے ان پر اپنا دباؤ بڑھا دیا۔جب سلطان نے دشمن کی صفوں کو درہم برہم دیکھا تو اپنے داہنے اور بائیں جانب سے حملہ کروا دیا اور خود قلب کے ساتھ حملہ آور ہوا۔راجپوتوں کی صفیں ٹوٹ گئیں اور وہ بھاگنے لگے۔

معزالدین کی ترکیب کامیاب ہوئی اور رائے پتھورا کو سخت شکست کا سامنا کرنا پڑا۔وہ اپنے ہاتھی سے اتر گیا اور ایک گھوڑے پر سوار ہو کر فرار ہو ہی رہا تھا کہ سرسوتی کے نزدیک گرفتار کر لیا گیا۔منہاج کے مطابق اس کو اسی وقت قتل کر دیا گیا۔لیکن حسن نظامی کے مطابق اس کو اجمیر لے جایا گیا اور کچھ دنوں تک بحال رکھا گیا۔بعد میں غداری کا الزام عائد ہونے پر وہ قتل کر دیا گیا۔سکوں اور سنسکرت تذکروں کی شہادت سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ اس کو کچھ عرصے تک حکومت کرنے کا موقع دیا گیا۔رائے پتھورا کے کچھ سکوں کے اوپر کی جانب "سری محمد سام" کندہ ہے۔اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے معزالدین کی ماتحتی قبول کر لی تھی۔رائے پتھورا کے قتل کے بعد بھی اجمیر کی

حکومت کو اپنے اختیار میں نہیں لیا گیا اور اس کے بیٹے کو کچھ عرصے تک ماتحت حکمراں کی حیثیت سے کام کرنے دیا گیا۔ دہلی کا گووندرائے میدان جنگ میں مارا گیا۔ لیکن جو پالیسی اجمیر کے متعلق اختیار کی گئی تھی وہی دہلی کے متعلق بھی اپنائی گئی۔ گووندرائے کے جانشین نے معزالدین کی ماتحتی قبول کی۔ حسن نظامی لکھتا ہے کہ اس علاقے کے رائے اور مقدموں نے اطاعت اختیار کی اور جب انہوں نے مال گزاری اور مراسم خدمتی ادا کرنے کا وعدہ کیا تو انہیں ان کی زمینوں میں برقرار رکھا گیا لیکن اندرپرستھ میں ایک لشکر گاہ قائم کر دی گئی۔

5.12 شمالی ہندوستان کی فتح (Conquest of Northern India)

ترائن کی دوسری جنگ میں معزالدین کی شاندار کامیابی اور رائے پتھورا (پرتھوی راج) کی شکست راجپوتوں کے لیے ایک بہت بڑا سانحہ تھا۔ اس فیصلہ کن جنگ نے شمالی ہندوستان میں راجپوتوں کی سیاسی عظمت کو بالعموم اور چوہانوں کے اقتدار کو بالخصوص شدید دھچکا پہنچایا۔ معزالدین کا ہدف چونکہ محض لوٹ مار نہیں تھا، اس لیے اس نے ترائن کے بعد ان وسیع مفتوحہ علاقوں پر ایک مستحکم انتظامی ڈھانچہ اور ترک حکومت قائم کرنے کا فیصلہ کیا، جس کی تکمیل کا بیڑا اس نے اپنے قابل اعتماد نائبین کو سونپا۔ ترائن میں اپنی کامیابی کے فوراً بعد معزالدین نے شوالک کا پورا علاقہ جس میں ہانسی اور سرسوتی شامل تھے غوری سلطنت میں شامل کر لیا جبکہ کہرام کو ایبک کے حوالے کر کے خود واپس غور چلا گیا۔ اس دوران قطب الدین ایبک نے اجمیر اور اس کے اطراف میں اٹھنے والی راجپوت بغاوتوں کی روک تھام کی اور ترک اقتدار کو مضبوطی سے قائم کیا۔ اس نے ہری رائے اور جھٹ راؤ کی بغاوتوں کو بھی دبا دیا۔ اس دوران اسے ایک بار غور بھی جانا پڑا۔ واپس ہونے کے بعد 1194ء ایبک نے جمنا پار کر کے کول (موجودہ علی گڑھ) فتح کیا۔

چنداور کی جنگ

ایبک ابھی کول کی فتح سے فارغ ہی ہوا تھا، کہ معزالدین اس ارادے سے ہندوستان آپہنچا کہ گہڑوال اقتدار کا خاتمہ کیا جائے۔ اس نے دہلی میں فوجیوں کی بھرتی کی اور پھر پچاس ہزار فوج کے ساتھ قنوج اور بنارس کی جانب کوچ کیا۔ ایبک اور سپہ سالار عزالدین حسین بن خرمیل کے ذمہ ہراول دستے کی قیادت سونپی گئی۔ یہ جنگ چنداور کے پاس 1194 میں لڑی گئی۔ سخت مقابلہ ہوا بلآخر معزالدین کو شاندار کامیابی حاصل ہوئی اور جو بھی فوری فوائد رہے ہوں مگر منہاج سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ظاہر کرتا ہے کہ تین سو سے کچھ زائد ہاتھی معزالدین کے قبضے میں آئے۔ درحقیقت یہ فتح اور زیادہ اہمیت کی حامل تھی۔ اگرچہ پوری گڑھوال سلطنت پر قبضہ نہ ہو سکا لیکن اس فتح کے بعد بنارس اور ہانسی جیسے مقامات پر فوجی چھاؤنیاں قائم کرنا ممکن ہو سکا۔ اب بھی کئی گڑھوال علاقے اپنی آزادی قائم کیے ہوئے تھے۔ مثلاً قنوج پر 99-1198ء تک قبضہ نہ ہو سکا اور اس وقت بھی مکمل طور پر قبضہ نہ جم سکا۔ کیونکہ ہم بعد میں التمش کو قنوج پر حملہ کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ سلطان کے غور واپس ہونے کے بعد ایبک کو کول کے استحکام پر دوبارہ توجہ دینی پڑی۔

بیانہ اور گوالیار کی فتح

96-1195ء میں معزالدین پھر ہندوستان آیا۔ اس مرتبہ اس نے بیانہ پر حملہ کیا، جو بھٹی راجپوت حکمراں کمار پال کے قبضہ میں

تھا۔اس لیے آپ نے دارالسلطنت بیانہ میں جنگ سے بچنے کے لیے ٹھنکر میں جا کر قلعہ بندی کی۔ لیکن تھوڑی سی مزاحمت کے بعد اسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہونا پڑا۔ بیانہ اور ٹھنکر پر قبضہ کر لیا گیا اور اسے بہاوالدین طغرل کے حوالے کر دیا گیا۔اس کے بعد معزالدین نے گوالیار کی جانب کوچ کیا۔ لیکن پرتیہار خاندان کے حکمران سللچھن پال نے بنا لڑے ہی سلطان کی ماتحتی قبول کر لی۔اس دوران ایبک اجمیر کی بغاوت کو کچلنے کے بعد نہروالہ یا انہلواڑہ کی طرف روانہ ہوا اور آبو کے اسی چالوکیہ حکمران جس نے کچھ سال قبل معزالدین کو شکست دی تھی، ایبک نے شکست فاش دے کر انہلواڑہ سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن یہاں مستقل ترک اقتدار قائم کرنے کی کوشش نہیں کی گئی کیوں کہ راجپوتانہ بھی ابھی ترک اقتدار سے باہر تھا بلکہ مفتوحہ علاقے کو پرانے حکمران خاندان کے حوالے کر دیا گیا۔

بختیار خلجی کے کارنامے

اس دوران ایک ترک مہم جو بختیار خلجی نے شاہی افواج سے الگ بہار اور بنگال فتح کر لیا۔اس علاقے کی حکمرانی کی سند اسے ایبک سے حاصل ہو گئی جو کہ ہندوستان میں سلطان کا نائب سلطنت تھا۔ لیکن تبت اور آسام کی مہم میں اسے سخت نقصان اٹھانا پڑا۔اس کے صدمے میں وہ بیمار پڑ گیا۔اسی بیماری کی حالت میں موقع پا کر ایک دوسرے امیر علی مردان نے اس کا کام تمام کر دیا اور خود بنگال اور بہار پر قابض ہو گیا۔

5.13 معزالدین کی آخری ہندوستانی مہم اور اس کی وفات

(Last Indian Campaign and Death of Mu'izzuddin)

ہندوستان میں قطب الدین ایبک اور بختیار خلجی کی مسلسل فتوحات اور ترک سلطنت کی توسیع کے باوجود، سلطان معزالدین کی اپنی زیادہ تر توجہ وسطی ایشیا اور خراسان کی سرحدوں پر مرکوز رہی۔ وہاں اسے خوارزم شاہی سلطنت جیسے انتہائی طاقتور دشمن کا سامنا تھا۔ ہندوستان میں فتوحات کے پرچم لہرانے والا یہ سلطان جب اندخود کے میدان میں خوارزم شاہ سے نبرد آزما ہوا تو اسے حالات کی سختی کا سامنا کرنا پڑا، اور یہی وسطی ایشیائی سیاسی الجھنیں بالآخر اس کی آخری ہندوستانی مہم اور اس کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔

اندخود میں خوارزم شاہ کے ہاتھوں معزالدین کی شکست کی خبر پھیلتے ہی ساری مملکت میں شر پسند عناصر زور پکڑنے لگے۔ یہاں تک کہ سلطان کی موت کی جھوٹی افواہ پھیلائی گئی۔ حسن نظامی کے مطابق اس کے ایک افسر ایبک بیک نے اندخود کے میدان اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور ملتان پہنچ گیا۔ جہاں اس نے گورنر کا قتل کر کے اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی۔ منہاج، حسین خرمیل کے دھوکے سے بھاگنے کا ذکر کرتا ہے۔ تاریخ گزیدہ کے مطابق معزالدین کے ایک افسر الادگز نے اس موقع پر غور پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن کسی دوسری تحریر میں اس بیان کی تائید نہیں ملتی۔ گناہوں کا اثر ہندوستان میں بھی ہوا۔ کھوکھروں نے جو غزنی-لاہور شاہراہ کے علاقے میں رہتے تھے، پورے علاقے میں ہنگامہ برپا کر دیا۔ان کی حرکتوں کی وجہ سے غزنی اور لاہور کے درمیان مراسلات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔اس خطرے کی اہمیت کا اندازہ کرتے ہوئے معز الدین خود ہندوستان روانہ ہوا تاکہ کھوکھروں سے نپٹ سکے۔ کھوکھر بہادری کے ساتھ لڑے لیکن ان کو ہرا دیا گیا اور پسپا ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ معزالدین نے لاہور کے معاملات طے کیے اور ایبک کو دہلی جانے کی اجازت دے کر غور کو روانہ ہوا۔ سفر کے دوران معزالدین دریائے

سندھ پر واقع ایک مقام دریا ک پر ٹھہرا اور دریا کے کنارے ایک ٹھنڈے سبزہ زار میں خیمہ زن ہوا۔ جب وہ مغرب کی نماز ادا کر رہا تھا تو چند قاتل اس کے خیمے میں چپکے سے داخل ہو گئے اور 3 شعبان 602ھ/1206ء کو سلطان کو قتل کر دیا۔ اس طرح فاتح فوج کا ایک جلوس جنازے میں بدل دیا۔

5.14 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سامانی خاندان کے زوال کے بعد غزنویوں نے وسطی ایشیا اور شمالی ہند کی سیاست میں ایک نیا باب رقم کیا۔ سلطان محمود ایک بے مثل عسکری رہنما تھا جس نے پے در پے 17 حملوں کے ذریعے ہندو شاہیوں اور راجپوتوں کی طاقت کو توڑا، لیکن اس کی ترجیحات وسطی ایشیا کے مقبوضات تک محدود رہیں اور اس نے ہندوستان میں مستقل حکومت بنانے سے گریز کیا۔ بعد ازاں اس کے جانشینوں کی نااہلی کی بدولت غزنوی سلطنت سمٹ کر صرف لاہور تک محدود ہو گئی۔ غزنویوں کی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر غور کے شنسبانی خاندان نے اقتدار حاصل کیا۔ غور کا الگ تھلگ جغرافیہ، لوہے کی کثرت سے بننے والے اعلیٰ درجے کے ہتھیار اور بہترین گھوڑوں نے غوریوں کو ایک ناقابل تسخیر عسکری طاقت میں تبدیل کر دیا۔ سلطان معزالدین کا نقطہ نظر محمود غزنوی سے یکسر مختلف تھا؛ اس کا مقصد محض مال و دولت کا حصول نہیں بلکہ ہندوستان میں ایک مستقل اور مستحکم ترک سلطنت کا قیام تھا۔ اس نے لاہور پر قبضہ کر کے غزنوی خاندان کے آخری نشانات مٹا دیے۔ معزالدین کی سب سے بڑی خوبی اس کی مستقل مزاجی اور حالات سے سیکھنے کی صلاحیت تھی۔ انہلواڑہ اور ترائن کی پہلی جنگ میں راجپوتوں سے عبرتناک شکست کھانے کے باوجود وہ مایوس نہیں ہوا، بلکہ اس نے ایک سال تک سخت فوجی تیاریاں کیں اور ترائن کی دوسری جنگ میں بہترین جنگی چالوں (مرکزی دستے کو محفوظ رکھنے اور تیر اندازوں کے ذریعے ہراساں کرنے) کے ذریعے راجپوتوں کو فیصلہ کن شکست دی۔ معزالدین کی فتح کے بعد، اس کے نائبین قطب الدین ایبک اور بختیار خلجی نے چنداور، بیانہ، گوالیار، بہار اور بنگال تک کامیاب فوجی مہمات کیں۔ ان مہمات نے شمالی ہندوستان میں چوہان اور گہڑوال جیسی بڑی دیسی طاقتوں کا مکمل خاتمہ کر کے اس دہلی سلطنت کی مضبوط بنیاد رکھی جس نے آئندہ کئی صدیوں تک ہندوستان کی تاریخ اور ثقافت پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

5.15 کلیدی الفاظ (Keywords)

غزنی	:	افغانستان کا ایک شہر
قندھار	:	افغانستان کا ایک شہر جو راجدھانی کابل سے کچھ دور واقع ہے۔
فیروز کوہ	:	غور کا مرکزی مقام اور غوریوں کا پایہ تخت
اصطخری	:	دسویں صدی کا ایک سیاح
زابلستان	:	جنوبی بلوچستان
ہندو شاہی	:	دسویں صدی میں پنجاب، کابل اور قندھار کے علاقوں پر حکومت کرنے والا ایک خاندان

مورث اعلیٰ : خاندان کا بانی

5.16 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

5.16.1 معروضی سوالات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. محمد بن قاسم نے فتحِ سندھ کس سال حاصل کی، جس کے نتیجے میں شمال مغربی علاقہ عرب دنیا سے جڑ گیا؟

(a)710ء (b)712ء (c)1001ء (d)1192ء

2. محمود غزنوی کو 'سلطان'، 'امین الملت' اور 'یمین الدولہ' کے خطابات کس عباسی خلیفہ نے عطا کیے؟

(a)القادر باللہ (b)ہارون رشید (c)المعتصم (d)منصور

3. شنسبانی خاندان کے عروج اور باضابطہ اسلام کی اشاعت سے قبل غور کی مذہبی زندگی میں کس فرقے کا گہرا اثر تھا؟

(a)اسماعیلی (b)کرامیہ (c)شافعی (d)حنبلی

4. سلطان معزالدین غوری کو ہندوستان میں پہلی بڑی شکست کا سامنا کس مقام پر کرنا پڑا، جس کے بعد اس نے اپنا جنگی نقشہ تبدیل کیا؟

(a)ترائن (b)پشاور (c)نہروالا (کیادرا) (d)ملتان

5. ترک اقتدار کی توسیع کے دوران قطب الدین ایبک کی سرکردگی میں چنداور کی جنگ (1194ء) کس طاقت کے خلاف لڑی گئی؟

(a)چوہان (b)گہڑوال (c)بھٹی راجپوت (d)کھوکھر

5.16.2 مختصر سوالات کے حامل جوابات (Short Answer Type Questions)

1. سومنات مہم کا مختصر تجزیہ کیجیے۔
2. ترائن کی پہلی جنگ کے بارے میں مختصر نوٹ لکھیے۔
3. چنداور کی جنگ کا مختصر جائزہ لیجیے۔

5.16.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. سلطان محمود کی ہندوستانی مہمات پر ایک تفصیلی مضمون تحریر کیجیے۔
2. ترائن کی جنگ سے پہلے تک معزالدین کی ہندوستانی مہمات پر ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیجیے۔

اکائی 6۔ سماج، ثقافت اور معیشت

(Society, Culture, and Economy)

اکائی کے اجزا

6.0		تمہید
6.1		مقاصد
6.2		سماج
	6.2.1	عوام کا طرز زندگی
	6.2.2	ذات پات کا نظام
	6.2.3	عورتوں کی حیثیت
	6.2.4	لباس، کھانا، زیورات
	6.2.5	تعلیم، سائنس اور علم
6.3		ادب اور فنونِ لطیفہ
	6.3.1	سنسکرت ادب
	6.3.2	عربی فارسی ادب
	6.3.3	علاقائی زبانیں
	6.3.4	فنون لطیفہ
6.4		اکتسابی نتائج
6.5		کلیدی الفاظ
6.6		نمونہ امتحانی سوالات

6.0 تمہید (Introduction)

اگرچہ ہم نے ابھی تک ہندوستان میں 1000 سے 1200 تک کی سیاسی نشو و نما کا مطالعہ نہیں کیا ہے، تو بھی، اقتصادی سماجی اور مذہبی زندگی کے مطالعے کے لیے 800 سے 1200 تک کے عہد کو ایک مانا جاسکتا ہے۔ سیاسی زندگی کے مقابلے میں اقتصادی اور سماجی زندگی نیز تصورات اور اعتقادات میں کافی سست رفتاری سے تبدیلی آئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سی ابتدائی خصوصیات جو کہ نویں صدی سے پہلے موجود تھیں وہ اس عہد میں بھی برقرار رہیں۔ لیکن متعدد نئے عوامل کے شامل ہو جانے کی وجہ سے اس عہد کی اپنی الگ خصوصیات پیدا ہو گئیں۔ یہ ایک عام بات ہے کہ ہر تاریخی دور میں نئے عوامل کے ساتھ ساتھ پرانے عوامل بھی موجود رہتے ہیں۔ البتہ تبدیلی کی رفتار اور سمت ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔

6.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- آٹھویں سے بارہویں صدی تک کے عہد کے سماج سے واقف ہو سکیں گے۔
- اس عہد میں عوام کی حالت اور ذات پات کے نظام کے بارے میں سمجھ سکیں گے۔
- اس عہد میں عورتوں کی حالت اور طرز رہائش پر روشنی ڈال سکیں گے۔
- اس عہد میں تعلیم سائنس اور علوم کی ترقی کا جائزہ لے سکیں گے۔
- اس عہد کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے بارے میں جان سکیں گے۔

6.2 سماج (Society)

اس عہد میں ہندوستانی سماج میں کئی اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان میں سے ایک تبدیلی ان لوگوں کے ایک طبقے کی بڑھتی ہوئی طاقت تھی، جنہیں اس عہد کے مصنفین نے سامنت، رنک، روت (راجپوت) جیسے ناموں سے ذکر کیا ہے۔ ان کی ابتداء مختلف طریقوں سے ہوئی تھی، ان میں سے کچھ تو ایسے سرکاری افسر تھے جنہیں نقد تنخواہ کی بجائے گاؤں دیے جاتے تھے جن سے وہ محصول حاصل کیا کرتے تھے۔ دوسرے مفتوح راجا اور ان کے حامی تھے جنہیں محدود علاقوں سے مالیانہ حاصل کرنے کی اجازت تھی۔ کچھ دوسرے لوگ موروثی مقامی سردار یا جاں باز فوجی تھے جنہوں نے کچھ مسلم حامیوں کی مدد سے اپنے اختیارات کے علاقے قائم کر لیے تھے۔ ان کے علاوہ کچھ دوسرے لوگ بھی تھے جو قبیلوں یا خاندانوں کے سردار تھے۔ ان لوگوں کی حقیقی پوزیشن ایک دوسرے سے کافی مختلف تھی۔ ان میں سے کچھ تو محض گاؤں کے مکھیا تھے جن میں سے کچھ کا تو دائرہ اختیار کئی گاؤں پر مشتمل علاقوں تک پھیلا ہوا ہوتا تھا جبکہ ان میں سے کچھ کا تو پورے علاقے پر ہی تسلط ہوتا تھا۔ یہ ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہتے تھے اور اپنے اختیار اور مراعات کے حلقے کو وسیع کرنے کی کوشش میں رہتے تھے۔

حکمراں کی طرف سے اپنے افسروں اور حامیوں کو آمدنی کی وصولی (بھوگ یا جاگیر) کا جو کام سونپا جاتا تھا وہ نظریاتی اعتبار سے عارضی ہوتا تھا جسے حکمراں اپنی مرضی سے واپس بھی لے سکتا تھا لیکن ایسا بہت کم ہوتا تھا اور اس کی نوبت عام طور پر کھلی بغاوت یا غداری کے بعد ہی آتی تھی۔ موجودہ خیال یہ ہے کہ کسی شکست خوردہ حکمراں کو بھی اس کی زمینوں سے بے دخل کرنا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ نتیجے کے طور پر اس عہد کی سلطنتوں میں وہ بڑے علاقے بھی شامل ہوتے تھے جو کہ شکست خوردہ اور ماتحت حکمرانوں کے زیر تسلط ہوتے تھے جو کہ اپنی آزادی پر زور دینے کی مسلسل کوشش کرتے تھے۔ پھر یہ کہ ان حکمرانوں کے علاقوں میں بھی جو افسران تھے وہ اپنے عہدے اور کام کو موروثی جاگیر سمجھتے تھے۔ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ، مختلف سرکاری محکمے بھی موروثی سمجھے جانے لگے تھے۔ پچھلے ایک باب میں ایک مثال ہمارے سامنے یہ آ چکی ہے کہ بنگال میں مہامنتری کا عہدہ ایک ہی خاندان میں چار پشتوں تک رہا تھا۔ اسی طرح کچھ عہدوں پر چند خاندانوں کی اجارہ داری بھی جانے لگی تھی۔ موروثی سرداروں نے رفتہ رفتہ متعدد سرکاری کاموں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ انہوں نے محض سرکاری محصول طے کرنے اور وصول کرنے کا ہی کام نہیں کیا بلکہ انتظامی امور کو بھی اپنے ہاتھوں میں لے لیا جن میں سزا دینے اور جرمانہ محصول ے جیسے اختیارات بھی شامل تھے اور جو پہلے مخصوص شاہی اختیارات کی حیثیت رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی زمینوں کو راجا کی پیشگی مرضی کے بغیر ہی اپنے پیروکاروں اور حامیوں کو دے دینے کا حق بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا جس کے نتیجے میں ان لوگوں کی تعداد بڑھتی گئی تھی جو اس طرح کی زمینوں پر کوئی محنت کیے بغیر ہی ان سے اپنا گزارا کرتے تھے۔ اس طرح کے سماج کو ایک جاگیردارانہ معاشرہ کہا جاسکتا ہے۔ جاگیردارانہ سماج کی عام خصوصیت یہ ہے کہ سماج میں ان لوگوں کو ہی زیادہ طاقت ور حیثیت حاصل ہوتی ہے جو زمین سے کسی محنت کے بغیر روزی حاصل کرتے ہیں۔

ہندوستان میں اس طرح کے ایک سماج کی نشو و نما کے دوررس اثرات مرتب ہوئے اس سے راجا کی حیثیت کمزور ہو گئی اور باج گزار سرداروں پر اس کا انحصار اور بڑھ گیا۔ ان میں سے بیشتر باج گزار سرداروں کے پاس اپنی فوج بھی ہوتی تھی جسے راجا کی حکم عدولی کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا تھا۔ ہندوستانی ریاستوں کی اندرونی کمزوری بعد میں ترکوں کے ساتھ مقابلہ آرائی کے وقت کافی سنگین ثابت ہوئی۔ چھوٹی ریاستوں نے تجارت کی حوصلہ شکنی کی اور ایک ایسی معیشت کو بڑھاوا دیا جس میں گاؤں یا گاؤوں کے گروپوں میں زیادہ سے زیادہ خود کفیل بننے کا رجحان پیدا ہوتا گیا۔ باج گزار سرداروں کے غلبے کے نتیجے میں گاؤں کی اپنی حکومت کے نظام کو بھی جھٹکا لگا اور وہ کمزور پڑتا گیا لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ جاگیردارانہ نظام میں صرف برائیاں ہی تھیں۔ بد نظمی اور تشدد کے زمانے میں مقابلتاً زیادہ مضبوط باج گزار سردار کسانوں اور دوسرے لوگوں کو جان و مال کا تحفظ فراہم کرتے تھے جن کے بغیر روزمرہ کی زندگی گزارنا ناممکن تھا۔ کچھ باج گزار سرداروں نے زراعت کی توسیع اور ترقی میں بھی کافی دلچسپی لی۔

6.2.1 عوام کا طرز زندگی (People's Lifestyle)

اس عہد میں کپڑے، سونے چاندی کے حکام اور دھات سازی جیسی ہندوستانی دست کاریوں کے اعلیٰ معیار میں کوئی زوال نہیں آیا۔ ہندوستانی زراعت بھی ترقی پذیر حالت میں رہی تھی۔ ہمیں بہت سے عرب سیاحوں سے زمین کی زرخیزی اور ہندوستانی کسانوں کی مہارت کی شہادتیں ملتی ہیں۔

اس عہد کی تمام ادبی تخلیقات سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ وزراء، حکام اور زمین دار سردار بہت شان و شوکت اور ٹھاٹ باٹ کی زندگی گزارتے تھے۔ یہ اپنے راجا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے عالیشان مکانوں میں رہتے تھے۔ جو تین سے پانچ منزل تک اونچے ہوتے تھے۔ یہ لوگ اپنے جسموں کی آرائش کے لیے بیش قیمت غیر ملکی لباس پہنتے تھے یا جن میں اونی اور چینی ریشمی کپڑے، بیش قیمت ہیرے جواہرات نیز سونے چاندی کے زیورات بھی ہوتے تھے۔ ان کے محلوں میں بڑی تعداد میں عورتیں ہوتی تھیں اور ان کی دیکھ بھال کے لیے گھریلو نوکر بھی ہوتے تھے جب بھی وہ باہر نکلتے تھے تو ان کے ساتھ بڑی تعداد میں گھریلو خدمت گار بھی ہوتے تھے۔ یہ مہاسامنت ادھی پتی جیسے اونچے خطابات بھی اپنے لیے خود ہی اختیار کر لیا کرتے تھے۔ اور ایسے بے امتیازی نشان کی شکل میں جھنڈے، آراستہ و پیراستہ چھتریاں مکھیوں کو اڑانے کے لیے یاک (تبتی بیل) کی دم کی بنی ہوئی پنکھی استعمال کرتے تھے۔ اس عہد کی ایک تصنیف سے ایک شاہی افسر کے چھوٹے لڑکے کی زرق برق پوشاک اور جسمانی آرائش کے سامان کا جو ذکر ملتا ہے اس سے اس عہد کے مٹھی بھر باج گزار سرداروں اور شاہی (سرکاری) افسروں کے رہن سہن کی بخوبی نمائندگی ہوتی ہے۔ اس کو خاص قسم کی انگوٹھیاں، کنڈل (بندے) اور گلے میں ایک پتلا سنہرا ہار ہوئے دکھایا گیا ہے۔ زعفران کے لیپ کی وجہ سے اس کا جسم پیلے رنگ کا ہو گیا ہے۔ اس کے جوتے کامدار ہیں۔ اس کے کپڑے زعفران سے رنگے پیلے ہیں۔ جن میں سنہری کناری ہے۔ جب کبھی وہ عوام میں آتا ہے تو اس کے ساتھ بہت سارے خدمت گار ہوتے ہیں۔ جن میں ایک شخص پاندان کے ساتھ ہوتا تھا اور پانچ یا چھ مسلح سپاہی بھی ہوتے تھے۔

بڑے سوداگر بھی شاہی ٹھاٹ باٹ رکھتے تھے۔ اور بعض اوقات تو ان کا رہن سہن بالکل شاہی انداز اختیار کر لیتا تھا۔ چالوکیہ عہد حکومت کے ایک کروڑپتی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے مکان کے اوپر بجنے والی گھنٹیوں کے ساتھ بڑے جھنڈے لہراتے رہتے تھے اور اس کے اصل مکان کے قریب پہونچنے کے لیے بلور کی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ مکان کے اندر ایک مندر بھی تھا جس کا فرش اور دیواریں بلور کی تھیں۔ جن پر مذہبی تصویریں اور بلور کی ایک مورتی بنی ہوئی تھی۔ وشو پال اور تیج پال جو کہ گجرات میں وزیر تھے، اپنے زمانے کے متمول ترین سوداگر مشہور تھے۔

مذکورہ بالا بیان کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط ہوگا کہ ہر طرف خوش حالی ہی تھی۔ اگرچہ غذائی اشیا سستی تھیں، لیکن شہروں میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہوتے تھے جنہیں پیٹ بھر کھانا بھی نصیب نہیں ہوتا تھا۔ راج ترنگنی (شہر میں لکھی گئی بارہویں صدی کی تصنیف کے مصنف نے انہی لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ایک طرف تو درباری بھنا ہوا گوشت کھاتے اور خوشبودار ٹھنڈی شراب پیتے تھے تو دوسری طرف تمام لوگوں کو چاول اور املی ساگ (کڑوے ذائقے کی جنگلی سبزی) پر ہی صبر کرنا پڑتا تھا۔ اس زمانے کے نادار مردوں اور عورتوں کی بدقسمتی کی متعدد کہانیاں ملتی ہیں۔ ان میں کچھ لوگ ڈکیتی اور لوٹ مار کر کے زندگی بسر کرتے تھے۔ جہاں تک گاؤوں کا تعلق ہے جہاں آبادی کا بڑا حصہ رہتا تھا، تو ہمیں کسانوں کے بارے میں، اس عہد کی ادبی تخلیقات، زمین کے ہبہ ناموں اور کتبوں سے معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ دھرم شاستر کے شارحین کا کہنا ہے کہ کسانوں سے حسب سابق پیداوار کا چھٹا حصہ محصول کے طور پر لیا جاتا ہے۔ زمین کے ہبہ ناموں سے ہمیں چراگاہ محصول، تالاب محصول جیسے کئی اضافی یا ذیلی محصولوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ کسانوں کو زمین کے محصول کے ساتھ ساتھ

ان محصولوں کی بھی ادائیگی کرنی ہوتی تھی۔ کچھ ہبہ ناموں سے زمین کے مالک کو یہ حق حاصل ہو جاتا تھا کہ وہ اس زمین پر متعین یا غیر متعین، مناسب یا نامناسب محصول کسانوں پر لگا سکتا تھا۔ کسانوں کو بیگار یا جبریہ مزدوری کرنی پڑتی تھی۔ وسطی ہندوستان اور اڑیسہ جیسی بعض جگہوں پر عہد وسطیٰ کے یورپ کے زرعی غلاموں کی طرح گاؤں کی زمینوں کے ساتھ ساتھ، ان زمینوں پر بسے ہوئے کاریگر، دست کار، چرواہے اور کسان بھی دے دیے جاتے تھے۔ ادبی تخلیقات سے ہمیں ایسے باج گزار سرداروں کے بارے میں پتہ چلتا ہے جو محصول وصول کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ ایک راجپوت سردار چڑیوں، مردہ پرندوں، خنزیر کی لید اور مردوں کے کفن سے بھی آمدنی کرتا تھا۔ ایک دوسری تخلیق سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ایک باج گزار سردار کی زیادتیوں سے ایک گاؤں انسانوں سے بالکل خالی ہو گیا تھا۔ بار بار پڑنے والے قحط اور جنگیں بھی اس صورت حال کا یقیناً ایک سبب رہی ہوں گی۔ جنگوں میں پانی کے وسائل کو تباہ کر دینا، گاؤوں کو جلا دینا، مویشیوں اور بازاروں کے غلے کے ذخیروں پر زبردستی قبضہ کر لینا اور شہروں کو تباہ و برباد کر دینا اس حد تک عام بات تھی کہ اس عہد کے مصنفین نے بھی ان کاموں کو درست ہی بتایا ہے۔ اس طرح جاگیر دارانہ نظام کی ترقی سے عام لوگوں کے مصائب میں اور اضافہ ہو گیا۔

6.2.2 ذات پات کا نظام (Caste System)

ذات پات کا نظام، جو کہ کافی پہلے قائم ہو چکا تھا سماجی ڈھانچے کی سب سے اہم بنیاد بن گیا۔ اس عہد کی سمرتیوں کے لکھنے والوں نے برہمنوں کے خصوصی حقوق کو کافی بڑھا چڑھا کر بتایا اور شودروں (نچلی ذاتوں) کو سماجی اور مذہبی اعتبار سے نااہل قرار دینے کے سلسلے میں اپنے پیشرو مصنفین کو بھی پیچھے چھوڑ گئے۔ اس عہد کے سمرتی کے ایک مصنف، پراشر کے مطابق شودروں کا تیار کیا ہوا کھانا کھانا، ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اور ان سے کچھ سیکھنا ایسے کام ہیں جو خاندانی شخص کو بھی پنچ بنا دیتے ہیں۔ ہمیں اس سوال پر بھی ایک بحث و مباحثے کا پتہ چلتا ہے کہ کسی شودر کا سایہ بھی نجس ہے یا نہیں۔ اس بارے میں یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے کہ سمرتی کے ان مصنفین کے یہ خیالات روزمرہ کی زندگی پر کس حد تک اثر انداز تھے؟ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس عہد میں پس ماندہ اور نچلے طبقوں کے لوگوں کی حالت اور بھی خستہ ہو گئی تھی۔ مختلف ذاتوں کے درمیان شادی کو برا سمجھا جاتا تھا۔ اگر کوئی اونچی ذات کا مرد کسی نچلی ذات کی عورت سے شادی کر لیتا تھا تو اس کی اولاد کی ذات، ماں کی ذات کے اعتبار سے طے پاتی تھی لیکن اگر عورت اونچی ذات کی ہوتی تھی اور مرد نچلی ذات کا، تو ایسی صورت میں اولاد کی ذات، باپ کی ذات کے اعتبار سے طے ہوتی تھی۔ اس عہد کے مصنفین نے اس عہد کی کئی ذاتوں کا ذکر کیا ہے جن میں کمہار، جولاہا، سونار، گویا، موسیقار، نائی (حجام)، ری بانٹنے والے، چمڑے کا کام کرنے والے، مچھیارا، شکاری وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے کچھ تو مزدوروں کی تنظیمیں تھیں، جن میں اس عہد میں ذات (جاتی) کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ اہم بات یہ ہے کہ اس عہد کی سمرتی کے لکھنے والوں نے دست کاریوں کو ادنی پیشہ قرار دیا تھا۔ اس طرح بیشتر مزدور پیشہ لوگوں اور بھیل قبائل جیسے لوگوں کو اچھوت اور نچلی ذات کا مانا جانے لگا تھا۔

اس عہد میں راجپوتوں کے عروج کا بھی پتہ چلتا ہے۔ راجپوتوں کی اصل کے بارے میں عالموں میں کافی اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ کئی راجپوت خود کو مہابھارت کے عہد کے سوریہ ونشی اور چندر ونشی چھتریوں کی اولاد مانتے ہیں جبکہ کچھ دوسرے راجپوت اپنی اصل کا سرچشمہ اس یگیہ کی قربانی کی آگ کو مانتے ہیں جو کہ رشی وششٹ نے آبو پہاڑ پر کیا تھا لیکن ہم راجپوتوں کی اصل کے سلسلے میں ان روایتوں پر ہی منحصر

نہیں رہ سکتے کیونکہ ان میں سے بعض روایتوں کا ذکر جیسے ماؤنٹ آبو کا یگیہ پرتی ہار، پرمار، چوہان اور سولنکی جیسی کچھ راجپوت ذاتیں معرض وجود میں آئیں۔ پہلی بار بعد کی شعری روایتوں میں ہی آیا ہے۔ ہم ان روایتوں سے صرف یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ مختلف راجپوت خاندانوں کی اصل کا سرچشمہ بھی مختلف ہے۔ کچھ ہندوستانی اور غیر ملکی عالموں کا یہ خیال ہے کہ ان میں سے کچھ راجپوتوں کے آباواجداد سیتھین اور ہن تھے، جو کہ ہرش کے بعد ہندوستان میں آکر بس گئے تھے، جبکہ دوسرے راجپوت خاندان، ہندوستان کے ہی قبائل سے نکلے ہیں۔ چھتریوں کے علاوہ برہمنوں اور ویشیہ خاندان کے لوگوں نے مختلف زمانوں میں ملک پر حکومت کی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ مختلف ذاتوں کے حکمرانوں کو راج پتر یا راجپوت کہا جانے لگا تھا اور انہیں چھتری کا درجہ دے دیا گیا۔

قابل غور بات یہ ہے کہ ذات کی درجہ بندی اتنی شدید نہیں تھی جیسی کہ بعض اوقات سمجھی جاتی ہے۔ لوگ انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر اونچی ذات میں شامل ہو سکتے تھے اور نچلی ذات میں گر بھی سکتے تھے۔ بعض اوقات نئی ذاتوں کو ورن کے درجے میں رکھنا مشکل بھی ہو جاتا تھا۔ اس کی ایک مثال کائستھ ذات ہے جس کا ذکر خاص طور پر اس زمانے سے شروع ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں مختلف ذاتوں کے لوگ، جن میں برہمن اور شودر بھی تھے جو سرکاری کام میں شامل تھے۔ کائستھ کے نام سے پکارے گئے اور امتداد زمانہ کے ساتھ ان لوگوں نے ایک الگ ذات کی حیثیت حاصل کر لی۔ اس عہد میں ہندو دھرم تیزی سے پھیل رہا تھا۔ اس نے نہ صرف یہ کہ بڑی تعداد میں بدھسٹوں اور جینیوں کو اپنے میں جذب کر لیا بلکہ مختلف دیسی قبیلوں اور غیر ملکی لوگوں کو بھی ہندو بنالیا۔ ان نئے طبقوں نے نئی ذاتوں اوذیلی ذاتوں کو نیا روپ دیا اور عام طور پر اپنی رسموں، شادی بیاہ کے طریقوں بلکہ اپنے قبائلی دیوی دیوتاؤں کی پرستش کو بھی جاری رکھا۔ اس طرح سماج اور مذہب دونوں ہی زیادہ سے زیادہ پیچیدہ ہوتے چلے گئے۔

6.2.3 عورتوں کی حیثیت (Position of Women)

حسب سابق اس عہد میں بھی عورتیں ذہنی اعتبار سے کم تر ہی سمجھی جاتی تھیں۔ اپنے شوہر کے علم کو آنکھ بند کر کے بجالانا ان کا فرض تھا۔ ایک مصنف نے اس عہد میں اپنے شوہر کے تئیں بیوی کے فرائض پر اس طرح روشنی ڈالی ہے کہ اسے اپنے شوہر کے پیروں کی مالش اور وہ تمام کام کرنے چاہئیں جو کہ نوکروں کے لیے مناسب ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ شرط بھی لگاتا ہے کہ شوہر کو راستی کے راستے پر چلنا چاہئے اور اپنی بیوی کے تئیں نفرت یا حسد نہیں رکھنا چاہئے۔ متسیہ پران میں بدچلن بیوی کے شوہر کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ اس کے سر اور چھاتی کو چھوڑ کر، کوڑے یا بانس کی چھڑی سے اس کی پٹائی کر سکتا ہے۔ اس عہد میں بھی عورتوں کو دید پڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کے علاوہ لڑکیوں کی شادی کی عمر بھی کم کر دی گئی جس کے نتیجے میں ان کی اعلیٰ تعلیم کے مواقع بھی ختم کر دیے گئے۔ اس عہد کی فرہنگوں میں معلماؤں کا ذکر نہ ملنا اس بات کی علامت ہے کہ عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ تاہم اس عہد میں تحریر کیے گئے کچھ ڈراموں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شاہی محل کی عورتیں اور رانی کی باندیاں بھی سنسکرت اور پراکرت زبانوں اعلیٰ معیار کی شاعری کر سکتی تھیں۔ فنون لطیفہ، خاص طور پر مصوری اور موسیقی میں شہزادیوں کی مہارت کا ذکر مختلف قصوں اور کہانیوں میں ملتا ہے۔ اعلیٰ عہدیداروں کی لڑکیاں، طوائفیں اور داشتائیں بھی مختلف فنون لطیفہ کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری پر بھی پورا پورا عبور رکھتی تھیں۔

شادی کے سلسلے میں سمرتی لکھنے والوں کا یہ کہنا تھا کہ لڑکیوں کی شادی چھ اور آٹھ سال کی عمر کے درمیان یا آٹھ سال کی عمر کے بعد اور بالغ ہونے سے پہلے پہلے کر دینی چاہئے۔ دوسری یا دوبارہ شادی کی اجازت بعض مخصوص حالت میں تھی یعنی اس صورت میں جبکہ شوہر نے بیوی سے کنارہ کشی کر لی ہو (یعنی اس کا کوئی پتہ نہ ہو یا شوہر فوت ہو گیا ہو یا اس نے سنیاس لے لیا ہو، نامرد ہو یا اسے ذات سے باہر کر دیا گیا ہو۔

عام طور پر عورتیں ناقابل اعتبار بھی جاتی تھیں۔ انہیں بالکل الگ رکھا جاتا تھا اور وہ ہر حال میں کسی نہ کسی مرد یعنی باپ، بھائی، شوہر یا بیٹے کے تابع ہوتی تھیں۔ تاہم گھر میں ان کا پورا احترام تھا۔ اگر کوئی شوہر قصور وار بیوی کو بھی چھوڑ دیتا تھا تو بھی اسے اپنی بیوی کا خرچ دینا پڑتا تھا۔ زمین کی ملکیت کے حق کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ جائیداد سے متعلق عورتوں کے حقوق میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ ایک کنبے کی جائیداد کو محفوظ رکھنے کی غرض سے عورتوں کو اپنے شوہر، باپ یا بیٹے کی جائیداد میں وراثت کا حق دیا گیا۔ اگر کسی شوہر کی موت نرینہ اولاد پیدا کیے بغیر ہی ہو جاتی تھی تو بعض حالات کے استثناء کے ساتھ اس کی بیوی کو شوہر کی ساری جائیداد کا حق ملکیت مل جاتا تھا۔ اسی طرح بیوہ کی جائیداد پر اس کی لڑکیوں کا حق ہوتا تھا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ جاگیر دارانہ نظام کی ترقی سے نجی جائیداد کے تصور کو استحکام ملا۔

جہاں کچھ مصنفین نے ستی کے رواج کو لازمی قرار دیا تھا وہیں کچھ دوسرے مصنفین نے اس کی مذمت بھی کی۔ ایک عرب سیاح اور تاجر، سلیمان کے بیان کے مطابق راجا کی بیویاں کبھی کبھی اپنے شوہر کی چتا پر جل مرتی تھیں، لیکن اس کا دارومدار ان کی اپنی مرضی پر ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باج گزار سرداروں کے ذریعے بڑی تعداد میں بیویاں رکھنے کے رواج کو بڑھاوا، نیز اس کے نتیجے میں جائیداد کی تقسیم کے سلسلے میں نزاع پیدا ہونے کی وجہ سے بھی ستی کا رواج پھیلا۔

6.2.4 لباس، کھانا اور زیورات (Garments, Food Habits and Ornaments)

اس عہد میں عورتوں اور مردوں کی پوشاک میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور دھوتی اور ساڑی کو مردوں اور عورتوں کی عام پوشاک کی حیثیت حاصل رہی۔ اس کے علاوہ شمالی ہندوستان میں مرد مرزائی (صدری) اور عورتیں چولیاں بھی پہنتی تھیں۔ مورتیوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شمالی ہندوستان میں اونچے طبقے کے لوگ لمبے کوٹ، پاجامے اور جوتے پہنتے تھے۔ راج ترنگنی کے مطابق رابہ ہرش نے کشمیر میں ایک راجا کے شایان شان ایک پوشاک کا چلن شروع کیا تھا۔ اس شاہی لباس میں ایک لمبا کوٹ بھی تھا کیونکہ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ایک سابق وزیر اعلیٰ کو اس وجہ سے شاہی عتاب کا نشانہ بننا پڑا تھا کہ اس نے ایک چھوٹا کوٹ پہنا تھا۔ سردی کے موسم میں اونی کمبل استعمال کیے جاتے تھے۔ عام طور پر سوتی کپڑے کا استعمال سب سے زیادہ ہوتا تھا۔ اونچے طبقے کے لوگ ریشمی اور ململ کے کپڑے پہنتے تھے۔ عرب سیاحوں سے اس بات کی توثیق ہوتی ہے کہ مرد اور عورت زیورات کے شوقین تھے۔ مرد اور عورت دونوں ہی سونے کے بازو بند اور بالیاں پہنتے تھے جو بعض اوقات بیش قیمت پتھروں کے بھی بنے ہوتے تھے۔ ایک چینی مصنف، چاؤ جو کوا کا کہنا ہے کہ گجرات میں مرد، عورت دونوں ہی دوہرے دوہرے کن پھول پہنتے تھے اور ان کے کپڑے چست ہوتے تھے۔ سروں پر پگڑیاں ہوتی تھیں اور پیروں میں لال رنگ کے جوتے ہوتے تھے۔ ایک دوسرے مشہور سیاح مارکو پولو کا کہنا ہے کہ مالابار میں مرد اور عورت دونوں ہی صرف ایک لنگوٹی پہنتے تھے اور اس سلسلے میں راجا کا

بھی استثناء نہیں تھا اور درزی نام کی کوئی چیز ہیں تھی۔ کیلون میں بھی لنگوٹی ہی مردوں اور اورتوں کی پوشاک تھی۔ اگرچہ جنوبی ہند کے حکمرانوں کی پوشاک میں کپڑے بہت کم ہوتے تھے لیکن وہ زیورات کے بہت شوقین تھے۔ چاؤ جو کوا کے بیان کے مطابق مالا بار کا راجا بھی اپنی رعیت کی طرح سوتی لنگوٹی پہنتا تھا اور ننگے پیر رہتا تھا، لیکن جلوس کی شکل میں ہاتھی پر سوار ہو کر باہر جاتے وقت وہ اپنے سر پر ہیرے اور جواہرات جڑا تاج (مکٹ) اور سونے کے بنے بازو بند اور پازیب پہنتا تھا۔ مارکو پولو بتاتا ہے کہ راجا سونے، ہیرے اور جواہرات کی شکل میں جو کچھ بھی پہنتا تھا اس کی مالیت ایک شہر کے فدیہ سے بھی زیادہ ہوتی تھی۔

جہاں تک کھانے یا غذا کا تعلق ہے تو بہت سے علاقوں اور آبادی کے بڑے حصے میں سبزی خوری (Vegetarianism) کا رواج تھا۔ اس عہد کے سمرتیوں کے مصنفین نے ان مواقع کا تفصیل سے ذکر کیا ہے جب گوشت کھانا جائز ہوتا تھا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مور، گھوڑا، جنگلی گدھے، جنگلی مرغ اور جنگلی خنزیر کا گوشت کھانا جائز مانا جاتا تھا۔

ہندوستانیوں میں نشہ آور اشیاء کے استعمال کا رواج نہ ہونے کو عرب مصنفین نے کافی سراہا ہے۔ بہر حال یہ ان کی زندگی کو مثالی انداز سے پیش کرنے کی کوشش بھی معلوم ہوتی ہے۔ اس عہد کی ادبی تخلیقات میں شراب خوری کے متعدد حوالے ملتے ہیں۔ شراب تقریبات کے موقعوں خاص طور پر شادی بیاہ، دعوتوں اور سیر و تفریح وغیرہ میں پی جاتی تھی۔ یہ تقریبات عوام کے کچھ طبقات میں کافی مقبول تھیں۔ راجا کے سفر کے دوران اس کے قافلے میں شامل عورتیں بھی شراب نوشی کا پورا پورا مزہ لیتی تھیں۔ جہاں چند سمرتی لکھنے والوں نے تین اونچی ذاتوں کے لیے شراب نوشی پر پابندی لگائی وہیں کچھ دوسری سمرتیوں میں صرف برہمنوں کے لیے شراب نوشی ممنوع قرار دی گئی اور چھتریوں اور ویشیوں کو چند استثناء کے ساتھ شراب پینے کی اجازت دی گئی۔

اس عہد کے ادب سے پتہ چلتا ہے کہ شہروں کے لوگ کھیل کود اور تفریح بازی کے رسیا تھے۔ میلوں اور جشنوں کے علاوہ باغیچوں کی سیر، تیراکی اور مل بیٹھن کا کافی رواج تھا۔ بھیڑوں، مرغوں وغیرہ جیسے جانوروں کی لڑائی اور کشتیوں کے مقابلے وغیرہ عوام میں بہت مقبول تھے۔ سماج کے اونچے طبقے کے لوگ چوسر اور شکار کھیلنے کے شوقین تھے۔ چوگان شاہی تفریح کا وسیلہ تھا۔

6.2.5 تعلیم، سائنس اور علم

وہ تعلیمی نظام جو کہ سابقہ عہد میں بتدریج ترقی کرتا رہا تھا۔ زیادہ تبدیلی کے بغیر اس عہد میں بھی جاری رہا۔ اس زمانے میں اجتماعی تعلیم کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ لوگ بس وہی سیکھتے تھے جو وہ اپنی گزراوقات کے لیے لازمی سمجھتے تھے۔ لکھنا پڑھنا، کچھ ہی لوگوں، خاص طور پر برہمنوں کا سُستھوں اور اونچے طبقوں کے لوگوں تک ہی محدود تھا۔ کبھی کبھی اعلیٰ تعلیم کا بندوبست مندروں کے ذریعے بھی ہوتا تھا۔ عام طور پر طالب علم کو معلم کے گھر جا کر یا اس کے ساتھ رہ کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنی ہوتی تھی۔ ایسی صورت میں وہ اپنے معلم کو فیس ادا کرتا تھا یا تعلیم کی تکمیل پر نذرانہ (دکھشنا) دیتا۔ طالب علموں کو، خاص طور پر ایسے طالب علموں کو، جو کہ فیس نہیں دے سکتے تھے اپنے معلم کی خدمت کرنی پڑتی تھی۔ زبان کی قواعد (صرف و نحو) منطق، فلسفہ اور ویدوں کی مختلف شاخوں کی تدریس تعلیم کا اہم موضوع تھا۔

کسی دست کاری یا پیشے کی تعلیم دینے کی ذمہ داری تنظیموں پر یا انفرادی طور پر کنبوں پر ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر ہمارے پاس ایسے بیانات موجود ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ ایک سوداگر اپنے بیٹے کو کس محتاط طریقہ سے اپنے پیشے کی تعلیم دیا کرتا تھا۔

زیادہ رسمی قسم کی تعلیم جس میں غیر مذہبی مضامین پر زیادہ زور ہوتا تھا، بعض بودھ وہاروں میں بھی جاری رہی۔ ان میں بہار میں واقع نالندہ یونیورسٹی سب سے زیادہ مشہور تھی۔ اس طرح کے دوسرے بڑے تعلیمی مرکزوں میں وکرم شیلا اور اُدنڈپورہ تھے جو بہار ہی میں تھے۔ ان تعلیمی اداروں میں جن دور دراز مقامات سے طالب علم حصول علم کے لیے آتے تھے ان میں تبت بھی شامل تھا۔ بیشتر تعلیم مفت ہی دی جاتی تھی۔ ان اخراجات کو پورا کرنے کے لیے اس وقت کے حکمران کافی فراخ دلی سے رقم اور زمین کا عطیہ دیا کرتے تھے۔ نالندہ کو دو سو گاؤں عطیے میں ملے ہوئے تھے۔

کشمیر تعلیم کا دوسرا اہم مرکز تھا۔ اس وقت کشمیر میں متعدد شیو پرست فرقے اور تعلیم وتدریس کے مرکز تھے۔ جنوبی ہندوستان میں مدورائی اور سرنگیری جیسے کئی مقامات پر کئی اہم مٹھ قائم کیے گئے۔ تعلیم کے مختلف مرکزوں میں مذہب اور فلسفے جیسے موضوعات پر بحث و مباحے کی حوصلہ افزائی کی گئی ملک کے مختلف مقامات پر کئی تعلیمی مرکزوں اور مٹھوں کے توسط سے ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک افکار وخیالات تیزی اور آزادی سے پھیلے۔ فلسفے کی تعلیم اس وقت تک مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی جب تک کہ فلسفی نے ملک کے مختلف تعلیمی مرکزوں کا سفر کر کے وہاں کے فلسفیوں سے تبادلہ خیال نہ کر لیا ہو۔ ملک بھر میں افکار وخیالات کے پھیلاؤ اور لین دین کے لیے جو طریق کا اختیار کیا گیا وہ ملک کی ثقافتی اور تہذیبی ایکتا کو برقرار رکھنے اور مستحکم بنانے میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔

اس عہد میں ملک میں سائنس کی نشو ونما اور ترقی کی رفتار دھیمی پڑ گئی یہاں تک کہ کچھ وقت گزرنے کے بعد ملک سائنس کے میدان میں اپنی قائدانہ حیثیت سے ہی محروم ہو گیا۔ اس طرح علم جراحت (سرجری) میں زوال کی وجہ یہ تھی کہ لاشوں کی چیر پھاڑ کے لیے صرف نچلی ذاتوں کے لوگ ہی اہل سمجھے جاتے تھے۔ درحقیقت علم جراحت تو نائیوں کا ہی پیشہ بن کر رہ گیا۔ اس طرح علم نجوم نے دھیرے دھیرے علم فلکیات کی جگہ لے لی۔ بہرحال ریاضیات کے میدان میں کسی قدر ترقی ہوئی۔

بھاسکر دوم کی کتاب لیلاوتی کو جو کہ اس عہد میں لکھی گئی تھی کافی عرصے تک ایک اعلیٰ معیاری درسی کتاب کی حیثیت حاصل رہی۔ کچھ معدنیات، خاص طور پر پارے کے استعمال کی شکل میں علم ادویہ نے بھی کسی قدر ترقی کی۔ نباتاتی علوم، نیز جانوروں (ہاتھیوں، گھوڑوں وغیرہ) کے علاج کے موضوعات پر بھی کئی کتابیں لکھی گئیں لیکن اچھے گھوڑوں کی نسل بڑھانے کا کوئی طریقہ دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی گئی جس کی وجہ سے ہندوستان کا سارا دارومدار ایران، عرب اور وسطی ایشیا سے گھوڑوں کی سپلائی پر ہی رہا۔ ان علاقوں پر مسلم حکمرانوں کا تسلط قائم ہو جانے کے بعد ہندوستانی راجاؤں کو اچھی نسل کے گھوڑوں کی حصولیابی میں کافی دشواریاں آتی تھیں۔

اس عہد میں ہندوستانی سائنس میں انحطاط اور جمود کے کئی اسباب تھے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ سائنس کی ترقی پورے سماج کی ترقی سے جڑی ہوتی ہے۔ اس عہد میں معاشرہ اپنے رویے کے لحاظ سے سخت (جامد) اور تنگ نظر ہوتا جا رہا تھا۔ مذہبی قدامت پرستی کی وجہ سے شہری

زندگی اور رسل ورسائل کے ذرائع میں بھی زوال آتا جارہا تھا۔

اس زوال کا دوسرا اہم سبب یہ تھا کہ ہندوستانیوں نے باہری دنیا میں ہونے والی سائنسی ترقی کی دھارا سے خود کو الگ رکھا۔ اس کی ایک جھلک ہمیں وسطی ایشیا کے ایک مشہور سائنس داں اور عالم البیرونی کی تصنیفات سے بھی ملتی ہے جو گیارہویں صدی کے اوائل میں دس سال تک ہند میں مقیم رہا تھا۔ اگرچہ البیرونی ہندوستانی علم اور سائنس کا زبردست معترف تھا لیکن اس نے ملک کے عالموں یعنی برہمنوں کی تنگ نظری کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ ''یہ لوگ (برہمن) مغرور، خود پسند، خود بین اور ضدی ہوتے ہیں۔'' اور اپنے علم میں دوسروں کو شریک کرنے کے معاملے میں کنجوسی سے کام لیتے ہیں اور اس بات کا پورا خیال رکھتے ہیں کہ کسی دوسری ذات کے کسی شخص خاص طور پر کسی دوسرے ملک کے شخص کو ان کا علم حاصل نہ ہونے پائے۔ ان لوگوں کا اعتقاد یہ ہے کہ ان کے علاوہ کائنات کے کسی بھی ذی روح کو سائنس کا علم نہیں ہے۔

6.3 ادب اور فنونِ لطیفہ (Literature and Fine Arts)

6.3.1 سنسکرت ادب (Sanskrit Literature)

زیر نظر عرصے کے دوران سنسکرت ہی اعلیٰ خیالات کے اظہار اور ادبِ عالیہ کی تخلیق کا وسیلہ رہی تھی۔ فی الحقیقت ادب کی مختلف شاخوں میں سنسکرت ادب کی تخلیق کا کام زبردست مقدار میں اور شاید اس سے پہلے دور سے زیادہ ہی عمل میں آیا۔ عظیم شنکراچاریہ کے بعد 'ادویتا' فلسفے کے میدان میں رامانج، مادھو، ولبھ وغیرہ نے جو تحریری کام کیے وہ متواتر سنسکرت میں ہی ہوئے۔ ان لوگوں کے خیالات جس تیز رفتار سے ملک کے مختلف حصوں میں پھیلے اور ان پر بحثیں ہوئیں اس سے اس بات کا بخوبی اظہار ہو جاتا ہے کہ سنسکرت اس دور میں کتنا اہم کردار ادا کر رہی تھی۔ ملک کے مختلف حصوں میں، جن میں مسلم اقتدار والے علاقے بھی شامل تھے، کچھ مخصوص قسم کے اسکولوں اور علمی اداروں کا ایک جال سا پھیلا ہوا تھا۔ ان اداروں کے کام میں کسی قسم کی مداخلت یا رکاوٹ پیدا نہیں کی جاتی تھی اور یہ متواتر پھلتے پھولتے رہے۔ ان میں سے بہت سے اداروں نے کاغذ کے آنے سے بھی فائدہ اٹھانا شروع کیا اور اسے قدیم تحریروں کو دوبارہ لکھ کر مختلف جگہوں تک پہنچانے میں استعمال کیا۔ اس طرح رامائن اور مہابھارت کے کچھ قدیم ترین نسخے، جو آج موجود ہیں، وہ گیارہویں، بارہویں اور اس کے بعد کے عرصے سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔

فلسفے کے علاوہ کاویہ (Poetry)، ناٹیہ شاستر (Drama)، اپنیاس (Fiction)، چکتسا شاستر (Medicine)، جیوتش ودیا (Astronomy) سنگیت (Music) وغیرہ میں بھی تحریری کام جاری رہا۔ دھرم شاستر (ہندو قوانین) پر بہت سی تفسیریں اور تلخیصیں (ڈائجسٹ) بارہویں سے سولہویں صدی کے درمیان تیار کی گئیں۔ وجنانیشور کی عظیم 'متاکشر' جو ہندو قوانین کے دو بنیادی مکاتیب فکر میں سے ایک کی تشکیل کرتی ہے، اس کی تیاری کو بھی بارہویں صدی سے پہلے نہیں مانا جاسکتا۔ دھرم شاستروں کا ایک اور مشہور و معروف مفسر بہار کا 'چندیشور' تھا جو چودہویں صدی کا تھا۔ زیادہ تر تحریری کاموں کی تخلیق ہندو حکمرانوں کے تحت جنوبی ہندوستان، اس کے بعد

بنگال، پھر متھیلااور مغربی ہندوستان میں ہوئی۔ سنسکرت کی نشو و نمامیں جینیوں کا حصہ رہا۔ان میں سب سے مشہور نام ہیم چندر سواری کا آتا ہے۔ یہ بات خاصی جیب لگتی ہے کہ انہوں نے عام طور پر ملک میں مسلمانوں کی موجودگی کو نظر انداز کیا ہے۔اسلامی ادب یا فارسی ادب کو سنسکرت میں ترجمہ کرنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی گئی۔ شاید ایک واحد استثناء جامی کی تحریر کردہ یوسف وزلیخا کی کہانی کے ترجمے کی تھی۔اسے ہندوؤں کی طرز فکر کی تنگ نظری یا گھرے پن کی ایک اور مثال سمجھا جاسکتا ہے جس کا ذکر البیرونی پہلے ہی کر چکا تھا۔اس دور کی موجود حقیقتوں کو نظر انداز کرنا یا ان سے منہ موڑ لینا شاید اس حقیقت کے لیے ذمے دار مانا جائے گا کہ اس دور کے ادب میں زیادہ تر مواد دوہرایا گیا ہے اور اس میں تازگی بصیرت، تخلیقی جدت کی کمی ہے۔

6.3.2 عربی فارسی ادب (Arabic and Persian Literature)

حالانکہ مسلمانوں کا تخلیق کردہ ادب زیادہ تر عربی میں تھا جو ان کے پیغمبر کی زبان تھی اور ادب اور فلسفے کی زبان کی حیثیت میں اسپین سے بغداد تک استعمال ہوتی تھی مگر جب ترک ہندوستان آئے تو ان پر فارسی کا بڑا گہرا اثر تھا کیونکہ دسویں صدی کے بعد سے یہی زبان وسط ایشیا اور ایران میں ادب اور حکومت کے انتظامیہ کی زبان ہو گئی تھی۔ ہندوستان میں عربی کا استعمال عام طور پر علماء اور فلاسفہ کے ایک محدود حلقے میں باقی رہا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اسلامی قوانین کی تلخیصیں اور ترجمے فارسی میں بھی تیار ہوتے رہے جنہیں خود ہندوستان کے علماء نے ہی تیار کیا تھا۔ان میں سب سے مشہور فقہ فیروز شاہی، ہے جسے فیروز تغلق کے عہد میں تیار کیا گیا تھا۔ بہر حال، عربی تلخیصیں تیار کرنے کا کام بھی جاری رہا، چنانچہ ان میں سب سے مشہور فتاوائے عالمگیری ہے جو اورنگ زیب کے دور میں فقیہوں کے ایک حلقے کے تیار کیے ہوئے اسلامی قوانین کا مجموعہ ہے۔

دسویں صدی میں ترکوں کی آمد سے ملک میں ایک نئی زبان 'فارسی' بھی پہنچی۔اسی زمانے میں ایران اور وسطِ ایشیا میں بھی فارسی میں ایک نئی زندگی اور توانائی آئی اور فارسی زبان کے کچھ عظیم ترین شعراء فردوسی اور سعدی اور عشقِ حقیقی اور صوفیانہ شاعری کے عظیم شعراء، ثنائی، عراقی، جامی، حافظ وغیرہ ہوئے اور دسویں سے چودھویں صدی کے درمیان ان کا زبردست کلام منظر عام پر آیا۔ ترکوں نے بالکل ابتدائے ہی ادب اور انتظامیہ کے لیے فارسی زبان کو اپنالیا تھا۔اس طرح اس زبان کی نشو و نما کے لیے ہندوستان میں سب سے پہلا مرکز لاہور بنا حالانکہ اس ابتدائی دور کے فارسی لکھنے والوں میں سے بہت کم لوگوں کا کام اب باقی ہے لیکن ان میں سے کچھ لکھنے والوں جیسے مسعود سعد سلمان کی تحریروں میں لاہور سے ایک گہرے لگاؤ اور محبت کا احساس ہوتا ہے۔ بہر حال اس دور کے سب سے قابل ذکر لکھنے والے امیر خسرو تھے۔1252 میں پٹیالی (مغربی اتر پردیش میں بدایوں کے پاس ایک مقام) میں پیدا ہوئے اور انہیں اپنے ہندوستانی ہونے پر بڑا ناز تھا۔وہ کہتے ہیں، ''میں نے ہندوستان کی تعریف و توصیف دو وجہوں سے کی ہے، چونکہ ہندوستان میری جائے پیدائش اور میرا ملک ہے، اور اپنے ملک سے محبت ایک اہم فریضہ ہے۔۔۔ ہندوستان جنت جیسا ہے۔اس کی آب و ہوا خراسان سے بہتر ہے۔۔۔ یہ پورے سال ہرا بھرا اور ہمیشہ پھولوں سے بھرا رہتا ہے۔ یہاں کے برہمن اتنے ہی لائق و فاضل ہیں جیسے ارسطو، اور یہاں بہت سے علموں کے بہت بڑے بڑے عالم موجود ہیں''

ہندوستان سے خسرو کی اس والہانہ محبت سے اظہار ہوتا ہے کہ ترک خود کو اب ایک غیر ملکی حکمراں طبقے کی شکل میں دیکھنے کے لیے تیار نہیں تھے اور اب ان کے اور ہندوستانیوں کے درمیان ایک طرح کی ثقافتی مصالحت اور قربت کے لیے میدان ہموار ہو گیا تھا۔ خسرو نے بہت بڑا شاعرانہ ذخیرہ تیار کیا جس میں تاریخی رومانی کہانیاں بھی شامل تھیں۔ انہوں نے شاعری کی ہر صنف میں لکھا اور فارسی کا ایک نیا طرز ایجاد کیا جسے سبقِ ہندی، یا ہندوستانی طرز کے نام سے جانا جاتا ہے۔

خسرو نے ہندوستان کی زبانوں کی تعریف کی ہے جس میں ہندی (جسے انہوں نے 'ہندوی' لکھا ہے) بھی شامل تھی۔ اُن کے کچھ متفرق ہندی اشعار بھی اُن کی تحریروں میں نظر آجاتے ہیں، لیکن خالق باری، جس کی تالیف کو اُن سے منسوب کیا جاتا ہے، اس کے متعلق اغلب خیال یہی ہے کہ وہ کسی بعد کے اِسی نام کے شاعر کی تیار کی ہوئی ہے۔ وہ ایک باکمال موسیقار بھی تھے اور مشہور صوفی نظام الدین اولیا کی 'سماع' کی محفلوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جس دن خسرو نے اپنے پیر نظام الدین کے انتقال (1325) کی خبر سنی، اُسی دن ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ انہیں بھی نظام الدین اولیا کے مقبرے کے احاطے میں ہی دفن کیا گیا۔

شاعری کے علاوہ اس دور میں فارسی میں تاریخ نویسی کی بھی ایک مضبوط روایت اُبھری۔ اس دور کے سب سے مشہور تاریخ نویس منہاج سراج، ضیاء الدین برنی، عفیف اور عصامی تھے۔ فارسی زبان کے توسط سے ہی ہندوستان کے وسط ایشیا اور ایران سے گہرے ثقافتی تعلقات قائم ہوئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ فارسی صرف انتظامیہ اور سیاسی امور کی زبان ہی نہیں رہی، بلکہ سماج کے اعلیٰ طبقے اور اُن سے ملحق اور منحصر حلقے کی زبان بھی ہو گئی۔ یہ صورتِ حال شمالی ہندوستان سے شروع ہوئی اور بعد میں دہلی سلطنت کی جنوب میں توسیع اور ملک کے مختلف حصوں میں مسلم ریاستوں یا بادشاہتوں کے قائم ہونے سے لگ بھگ پورے ملک میں پھیل گئی۔

ملک میں سنسکرت اور فارسی نے خاص طور پر سیاست، مذہب اور فلسفے کے میدانوں میں خاص طور پر رشتے یا واسطے کی زبان کا کام انجام دیا اور ادبی تخلیقات کی بھی یہی زبانیں رہیں۔ شروع شروع میں ان دونوں زبانوں میں بہت کم لین دین تھا۔ ضیاء نقشبندی (فوت 1350) نے سب سے پہلے سنسکرت سے فارسی میں وہ کہانیاں ترجمہ کیں جو ایک طوطے نے اس عورت کو سنائی تھیں جس کا شوہر سفر پر گیا ہوا تھا۔ 'طوطی نامہ' کتاب جو محمد بن تغلق کے زمانے میں تیار ہوئی تھی بے حد مقبول ہوئی اور فارسی سے ترکی اور بعد میں بہت سی یوروپی زبانوں میں ترجمہ ہوئی۔ اس نے ہندوستان کی قدیم جنسی کتاب کوک شاستر کا بھی فارسی میں ترجمہ کیا۔ بعد میں فیروز شاہ کے زمانے میں علم طب یا اویہ، اور موسیقی کی کتابیں بھی سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کی گئیں۔ کشمیر کے سلطان زین العابدین نے مشہور و معروف تاریخ کی کتاب 'راج ترنگنی' اور 'مہابھارت' کا فارسی میں ترجمہ کروایا۔ اسی کی فرمائش پر علم طب اور موسیقی کی کتابیں بھی سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ ہوئیں۔

6.3.3 علاقائی زبانیں (Regional Languages)

اس زمانے میں بہت سی علاقائی زبانوں میں بھی اعلیٰ درجے کا ادب تخلیق ہوا۔ کچھ علاقائی زبانوں ہندی بنگالی، مراٹھی وغیرہ کی ابتدا

بھی آٹھویں صدی میں ہی تلاش کی گئی ہے۔ کچھ دوسری زبانیں جیسے تامل بہت پرانی زبانیں ہیں۔ بودھ، جینیوں اور ناتھ پنتھی 'سادھوؤں' نے کچھ ''ملی جلی یا بگڑی ہوئی زبانوں''(اپ بھرنش)اور علاقائی زبانوں کو سنسکرت کے استعمال پر ترجیح دی۔ چودھویں صدی کے شروع میں امیر خسرو نے علاقائی زبانوں کی موجودگی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے: ''اس زمانے میں ملک کے ہر صوبے میں اس کی ایک مخصوص زبان ہے، جو کسی دوسرے سے مستعار نہیں لی گئی ہے۔ سندھی، لاہوری، کشمیری کباری (جموں کے علاقے کی ڈوگری)، دُھر سمندری (کرناٹک کی کنڑ)، تیلنگی (تلگو)، گوجر (گجراتی)، معبری (تامل)، گوری (شمالی بنگال) بنگالی، اودھ اور دہلی اور اس کے آس پاس بولی جانے والی (ہندوی)''انہوں نے آگے بیان کیا'' یہ زبانیں زمانہ قدیم سے ہی زندگی کے عام کاروبار میں ہر طرح استعمال ہوتی رہی ہیں۔''

کچھ جدید علاقائی زبانیں، جیسے آسامی، اُڑیا، ملیالم وغیرہ کا ذکر نہیں ملتا۔ بہر حال خسرو نے اس اہم صورت حال، یعنی جدید علاقائی ہندوستانی زبانوں کی نشو نما کی طرف صحیح نشاندہی کی ہے۔ ان میں سے بہت سی زبانوں کا پختگی کی سطح تک پہنچ جانا اور ان کا ادبی تخلیقات میں استعمال ہونا عہد وسطی کی بڑی ممتاز اور قابل ذکر خصوصیت مانی جائے گی۔ اس کی وجوہات متعدد اور مختلف تھیں۔ ممکن ہے برہمنوں کی بالادستی اور حیثیت میں کمی آنے سے سنسکرت کی حیثیت میں بھی کسی قدر کمی آئی ہو۔ بھکتی سنتوں کی طرف سے علاقائی اور عام زبان کا استعمال بھی ان زبانوں کی ترقی کی ایک یقینی وجہ تھی۔ فی الحقیقت، ملک کے بہت سے علاقوں میں سنتوں سادھوؤں نے ہی ان زبانوں کو ادب کے سانچے میں ڈھالنا شروع کیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ترکوں کی آمد سے پہلے بہت سی علاقائی حکومتوں میں سنسکرت کے ساتھ تامل، کنڑ، مراٹھی وغیرہ بھی استعمال ہوتی تھیں۔ ترک حکومت کے دوران بھی یہ طریقہ جاری رہا ہوگا کیوں کہ ہمیں دہلی سلطنت میں ہندی جاننے والے محاسبیوں (اکاؤنٹنٹس) کے تقرر کا ذکر ملتا ہے۔ بعد میں جب دہلی سلطنت منتشر ہوگئی، تب بھی انتظامی امور میں بہت سی علاقائی حکومتوں میں فارسی کے ساتھ علاقائی زبانوں کا استعمال جاری رہا۔ چنانچہ جنوبی ہندوستان میں وجے نگر کے حکمرانوں کی سرپرستی میں تلگو ادب کی نشو و نما ہوئی۔ مراٹھی بہمنی سلطنت کی انتظامیہ کی زبانوں میں سے ایک تھی اور اس کے بعد بیجاپور کے دربار میں بھی یہ صورت برقرار رہی۔ وقت کے ساتھ ساتھ جب یہ زبانیں ترقی کر کے ایک خاص درجے پر پہنچ گئیں تو کچھ مسلم حکمرانوں نے ان کے ادبی استعمال کے سلسلے میں بھی سرپرستی کی۔ مثال کے طور پر بنگال کے حکمراں نصرت شاہ نے رامائین اور مہابھارت کا بنگالی میں ترجمہ کروایا۔ اسی کی سرپرستی میں مالادھر باسو نے 'بھگوت' کا ترجمہ کیا۔ بنگالی شعراء کو اس کی جو سرپرستی ملی اس کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔

صوفیوں کی موسیقی کی محفلوں میں بھکتی سنتوں کی ہندی نظموں اور گیتوں کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ مشرقی اتر پردیش میں 'چنداین' کے مصنف ملاداؤد، ملک محمد جائسی وغیرہ نے ہندی میں ہی لکھا اور صوفیانہ تصورات اور خیالات کو اس انداز میں بیان کیا کہ انہیں عام آدمی سمجھ سکے۔ انہوں نے شاعری کی کچھ صنفوں جیسے مثنوی کو بھی عام کیا۔

6.3.4 فنون لطیفہ (Fine Arts)

ایک دوسرے کو سمجھنے، قربت اور میل جول کے رجحانات صرف مذہبی اعتقادات اور رسوم، طرزِ تعمیر اور ادب میں ہی نظر نہیں

آتے بلکہ یہ فنون لطیفہ، خاص طور پر موسیقی کے میدان میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ ترک جس وقت ہندوستان آئے تھے تو انہیں موسیقی کی بھرپور روایت عربوں سے ورثے میں مل چکی تھی جس کی ایران اور وسط ایشیا میں مزید نشو و نما ہوئی تھی۔ وہ اپنے ساتھ کچھ نئے ساز بھی لائے تھے، جیسے رباب اور سارنگی اور کچھ نئے طرز اور اصول بھی اُن کے پاس تھے۔ بغداد کے خلفاء کے دربار میں ہندوستانی موسیقی اور موسیقاروں نے شاید وہاں موسیقی کی نشو و نما پر بھی اثر ڈالا تھا۔ بہر حال، ان دونوں کے درمیان باقاعدہ تعلق سلطنت دور میں ہی عمل میں آیا۔ امیر خسرو کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔ خسرو جنہیں 'نایک' یعنی موسیقی کے اصول اور ریاض دونوں کے استاد کا خطاب دیا گیا تھا، انہوں نے بہت سے فارس۔ عرب راگ شروع کیے۔ جیسے ایمن، گورا (غارا) سنم وغیرہ۔ قوالی کی ابتدا بھی انہیں سے منسوب کی جاتی ہے۔ ستار کی ایجاد کا سہرا بھی انہیں کے سر رکھا جاتا ہے لیکن اس کا کوئی ثبوت ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ طبلے کو بھی اُن سے منسوب کیا جاتا ہے مگر اس کی نشو و نما غالباً سترھویں صدی کے آخری حصے میں یا اٹھارویں صدی کے شروع میں ہوئی تھی۔

موسیقی میں قربت اور تکمیل کا عمل فیروز کے عہد میں جاری رہا۔ اس کے عہد میں ہندوستانی کلاسیکی تحریہ 'راگ درپن' کا ترجمہ فارسی میں ہوا۔ موسیقی کی محفلیں صوفیوں کی خانقاہوں اور بسیروں سے باہر نکل کر امراء کے محلوں تک پہنچ گئیں۔ جونپور کا حکمراں سلطان حسین شرقی موسیقی کا بڑا مربی اور سرپرست تھا۔ اس دور کے سب سے بڑے موسیقار کے بعد صوفی پیر بودھن کو ہی اگلے نمبر پر مانا جاتا ہے۔ ایک اور علاقہ جہاں موسیقی کی زبردست آبیاری اور نشو و نما ہوئی وہ گوالیار کی ریاست تھی۔ گوالیار کا راجا مان سنگھ موسیقی کا زبردست دلدادہ تھا۔ 'مان کوٹوہال' نام کی کتاب، جس میں مسلمانوں کی اختراع کی ہوئی تمام طرزوں کو جمع کیا گیا ہے، وہ اسی کی سرپرستی اور نگرانی میں تیار کی گئی تھی۔ یہ نہیں معلوم کہ شمال ہندوستان کی موسیقی کی طرز جنوبی ہندوستان کی طرز سے کب الگ ہوئی۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ طرز میں یہ فرق زیادہ تر شمالی ہندوستان میں فارس۔ عرب راگوں اور تالوں کی وجہ سے ہی پیدا ہوا۔

سلطنت کشمیر میں ایک بالکل الگ یا ممتاز طرز ابھرا جس پر ایرانی موسیقی کا زیادہ اثر تھا۔ جون پور کو فتح کرنے کے بعد سکندر لودی نے وہاں کی پرانی روایت، موسیقی کی سرپرستی کو بڑے شاہانہ انداز میں برقرار رکھا۔ بعد میں اسے افغان حکمرانوں نے بھی اپنایا اور اس روایت کو اور آگے بڑھایا۔ چنانچہ شیر شاہ کا جانشین عدالی خود موسیقی کا بڑا استاد تھا۔ بہر حال موسیقی کا نقطہ عروج مغل دور میں پہنچا۔

6.4 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

آٹھویں سے بارہویں صدی کا عہد ہندوستانی تاریخ میں ایک عبوری دور کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس عہد میں جس طرح سیاسی اور انتظامی میدان میں بہت سی تبدیلیاں واقع ہوئیں ویسے ہی سماج اور اور ثقافت بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ سماج میں سامنت وادی نظام یا بالفاظ دیگر جاگیر داری نظام کو عروج حاصل ہوا۔ حالانکہ یہ یورپی جاگیر داری کی طرح نہیں تھا اور نہ ہی یہاں میسر نظام اور وسائل پر جاگیر دار کا کنٹرول تھا۔ زرعی جاگیر داری (Serfdom) کی جگہ یہاں وشٹھی یا بیگار کا نظام تھا، البتہ کسان کو اس کے ہل بیل اور زمین سے محروم نہیں رکھا جاتا تھا۔

سماج میں کئی طبقات تھے جن میں سب سے اوپر راجا یا اس کے سامنت ہوا کرتے تھے۔ برہمنوں کو نظریاتی طور پر سب سے اونچا سمجھا جاتا تھا اور انہیں پہلے سے زیادہ مراعات بھی حاصل تھیں، پھر بھی وہ اپنی حفاظت کے لیے چھتریوں کے محتاج تھے، جیسا کہ اگنی کل نظریے سے معلوم ہوتا ہے جہاں برہمن وششٹھ یگیہ کی آگ سے چوہان، پرمار، چندیل اور چالوکیہ کو باہر نکالتے ہیں۔ سماج میں حاشیے پر نچلے طبقے، شودر، اچھوت اور انتیج یا ذات باہر لوگ تھے، جن کے کندھوں پر تمام اعلیٰ طبقات کی خدمت اور چاکری کرنا تھا۔ البیرونی نے چنڈالوں اور انتیج لوگوں کی بدتر حالت کا بذات خود مشاہدہ کیا ہے۔ پاکی اور ناپاکی کا تصور اس عہد تک آتے آتے اتنا سخت اور بے لچک ہو گیا تھا کہ برہمن کے کنویں سے نچلی ذات والا اگر پانی پی لیتا تو اسے سزائے موت دی جاتی تھی۔

برہمنی نظام اس عہد میں بدھ مذہب اور جین مذہب پر مکمل غالب آچکا تھا اور اس کے بہت سے عناصر جیسے مورتی کی عبادت، مندر اور مجسموں کی تیاری وغیرہ بدھ مذہب سے لیے ہوئے تھے۔ پال حکمرانوں کی سرپرستی سے بدھ مذہب شمال مشرقی ہند میں زندہ تو تھا مگر وہ اب اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ برہمن یا ہندو مذہب کی شکتی کی عبادت اور بدھ مذہب کا تانترمسلک ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو چکا تھا۔

سماج میں عورتوں کی حیثیت اور ان کے حقوق میں گراوٹ آئی تھی اور کئی سمرتی کے مفسرین نے بدچلن عورت کو کوڑے مارنے کی سزا سنائی تھی اور اس کا حق مرد کو دیا تھا۔ جائیداد اور ملکیت کے طور پر عورتوں کو بھی دان کیا جانے لگا جسے کنیادان کہا جاتا تھا۔ عورتوں کو اغوا کر کے شادی کر لینے کی مثالیں اب عام ہو چکی تھیں جو پہلے کبھی کبھی نظر آتی تھیں۔ دشمن کو ہرا کر اس کی عورتوں پر قبضہ کر لینا مردانگی اور ہمت کا کام سمجھا جانے لگا۔ عورتوں کو گھونگھٹ ڈالنے اور پردہ کرنے پر زور دیا گیا۔ شوہر کے مرنے پر اس کی چتا میں جل جانا (ستی)، دشمن سے بچنے کے لیے خود کو جلا لینا (جوہر) بھی اب عام ہو چکا تھا۔ بیواؤں کی شادی پر سختی سے روک لگائی گئی۔ مجموعی طور پر عورتوں کی حالت پہلے سے بدتر ہو چکی تھی۔ البتہ اعلیٰ طبقے کی عورتوں کو کچھ حقوق حاصل تھے جیسے کی عطیہ دینا، مندر بنوانا اور تجارت میں حصہ لینا، لیکن یہ سب عام عورتوں کی حالت سے بہت دور کی بات تھی۔

اس عہد کے لوگوں کے لباس، رہن سہن اور زیورات میں تبدیلی آئی۔ اب یہ ہر شخص کی حیثیت پر منحصر تھا اور ہر ایک اپنے کو دوسرے سے بہتر دکھانے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ سامنتوں کی آپسی لڑائی اور رقابت اس حد تک پہنچی ہوئی تھی کہ جو گھوڑا دوسرے کے پاس ہے وہ میرے پاس کیوں نہیں ہے، اس پر بھی لڑ پڑتے تھے۔ نئے نظام میں پہلے کی سادگی کے بجائے سجنے دھجنے پر زیادہ زور دیا جانے لگا جس کا خمیازہ عام کسانوں اور مزدوروں کو جھیلنا پڑتا تھا۔

تعلیم کے میدان میں کافی ترقی دیکھنے کو ملی، حالانکہ برہمنوں کا زاویہ نظر البیرونی کے مطابق تنگ ہو گیا تھا اور وہ اپنے علم کو دوسرے لوگوں سے چھپانے پر زور دیتے تھے۔ اس سب کے باوجود متھرا، کشمیر اور بنارس تعلیم کے بڑے مراکز تھے اور یہاں علم وادب سے متعلق بہت سی تخلیقات وجود میں آئیں۔ سنسکرت، عربی اور فارسی میں بہت سی تصنیفات لکھی گئیں اور کچھ پرانی کتابوں کے ترجمے بھی کیے گئے۔ اس کے علاوہ فنون لطیفہ، تعمیرات اور موسیقی کے میدان میں ترقی دیکھنے کو ملتی ہے۔ بہت سے مندر اس عہد میں بنائے گئے جو پہلے کے مندروں

سے شان و شوکت میں عظیم تھے اور ساتھ ہی راجا اپنے نام سے بہت مندر بنوانے لگے اور اسی کے حساب سے ان کی سرپرستی کرتے تھے۔

6.5 کلیدی الفاظ (Keywords)

رانک، راوت	راجپوتوں کے لیے فارسی مورخین کے ذریعے استعمال کیے جانے والے الفاظ
مکٹ	شاہی تاج، تمغہ
لیلاوتی	بھاسکر دوم کی ایک اہم درسی تصنیف جو 1150 میں لکھی گئی۔
ہندوی	ہندوستانی زبان

6.6 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

6.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. ''مہاسامنت ادھی پتی (Mahāsāmantādhipati) ''جیسے اعلیٰ خطابات عموماً کون اختیار کرتے تھے؟

(a) اعلیٰ حکام، وزراء اور جاگیر دار (b) صرف برہمن (c) صرف کسان (d) صرف سپاہی

2. عہد وسطیٰ میں ''کنڈل (Kundal) '' سے کیا مراد تھی؟

(a) گلے کا ہار (b) کانوں کا زیور (c) ہاتھ کا کڑا (d) پاؤں کا زیور

3. وشو پال اور تیج پال کس علاقے کے مشہور سوداگر تھے؟

(a) بنگال (b) گجرات (c) پنجاب (d) مالوا

4. سمرتیوں میں لڑکی کی شادی کے لیے کم از کم کتنی عمر کا ذکر ملتا ہے؟**

(a) 8 سال (b) 10 سال (c) 12 سال (d) 16 سال

5. عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں تعلیم کے اہم مراکز میں سے دو کون سے تھے؟

(a) نالندہ اور ولبھی (b) اجنتا اور ایلورا (c) دہلی اور اجمیر (d) کانچی پورم اور مدورائی

6.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. آٹھویں سے بارہویں صدی کے دوران ذات پات کے نظام پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
2. آٹھویں سے بارہویں صدی کے دوران عورتوں کی حالت کا مختصر جائزہ لیجیے۔
3. اس عہد میں لباس کھانا اور زیورات پر ایک نوٹ لکھیے۔
4. اس عہد میں سنسکرت ادب کی ترقی کا مختصر تجزیہ کیجیے۔

5. اس عہد میں موسیقی کی نشوونما پر روشنی ڈالیے۔

6.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. آٹھویں سے بارہویں صدی کے دوران ہندوستان میں عربی فارسی ادب کے ارتقا پر ایک مضمون لکھیے۔
2. آٹھویں سے بارہویں صدی کے دوران تعلیم اور سائنس کی ترقی پر ایک تفصیلی مضمون تحریر کیجیے۔
3. آٹھویں سے بارہویں صدی کے دوران عوام کی حالت کا تفصیلی تجزیہ کیجیے۔

اکائی 7۔تاریخ نویسی کے مآخذ: ہند فارسی روزنامچے؛اور ملفوظات

(Sources of History Writing: Indo-Persian Chronicles; and Sufi Literature)

اکائی کے اجزا

7.0 تمہید

7.1 مقاصد

7.2 ہند-فارسی تواریخ: پس منظر، نوعیت اور خصوصیات

7.3 منتخب ہند-فارسی تواریخ: تعارف و تنقیدی مطالعہ

7.3.1 طبقات ناصری مصنف منہاج السراج

7.3.2 تاریخ فیروز شاہی مصنف برنی

7.3.3 تاریخ فیروز شاہی مصنف عفیف

7.3.4 امیر خسرو

7.3.5 دیگر تاریخی ماخذ

7.4 صوفی ملفوظات اور ادبی سرمایہ: ایک تمہیدی جائزہ

7.4.1 اہم صوفی تصانیف

7.4.2 فوائد الفوٴاد

7.4.3 سیر الاولیاء

7.4.4 اخبار الاخیار

7.4.5 مکتوبات

7.5 اکتسابی نتائج

7.6 کلیدی الفاظ

7.7 نمونہ امتحانی سوالات

7.0 تمہید (Introduction)

دہلی سلطنت کے تاریخ کو سمجھنے کے لیے مختلف قسم کے ماخذ کا سہارا لیا جاتا ہے، جن میں سب سے اہم ہند-فارسی تواریخ (Indo-Persian chronicles) اور صوفی ادب (Sufi literature) ہیں۔ یہ دونوں نہ صرف سیاسی واقعات کا ریکارڈ پیش کرتے ہیں بلکہ اس دور کے سماجی، مذہبی اور ثقافتی پہلوؤں کو بھی روشن کرتے ہیں۔ ہند-فارسی تواریخ دراصل دربار سے وابستہ مؤرخین کے لکھے ہوئے تاریخی بیانات ہوتے تھے، جن میں سلاطین کی فتوحات، حکومت کے انتظامی نظام اور سیاسی رویوں کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ ضیاء الدین برنی، منہاج السراج اور امیر خسرو جیسے مؤرخین نے اپنی تصانیف کے ذریعے دہلی سلطنت کے سیاسی ڈھانچے کو سمجھنے کے لیے بنیادی معلومات فراہم کیں۔ اس کے برعکس، صوفی ادب ایک مختلف پہلو کو سامنے لاتا ہے۔ صوفی ملفوظات، مکتوبات اور تذکرہ لٹریچر اس دور کے روحانی رجحانات، عوامی زندگی اور حکمرانوں کے ساتھ صوفیہ کے تعلقات کو واضح کرتے ہیں۔ جیسے کہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات اور ان کے شاگرد امیر حسن سجزی کی ''فوائد الفؤاد'' جیسی تصانیف سے ہمیں نہ صرف صوفی تعلیمات کا پتہ چلتا ہے بلکہ عام لوگوں کے مسائل، سماجی تناظر اور سلطنت کے دور کی روحانی فضا بھی سمجھ آتی ہے۔

یہ دونوں قسم کے مصادر اپنی فطرت میں مختلف ہونے کے باوجود ایک دوسرے کو مکمل کرتے ہیں۔ جہاں ہند-فارسی تواریخ زیادہ تر حکمرانوں کے نقطۂ نظر کو پیش کرتی ہیں، وہیں صوفی ادب عوام اور روحانی زندگی کی جھلک دیتا ہے۔ اس طرح، دہلی سلطنت کے تاریخ کو سمجھنے کے لیے ان دونوں مصادر کا مطالعہ ضروری ہے، کیونکہ یہ ہمیں ایک مکمل اور متوازن تصویر فراہم کرتے ہیں۔ اس باب میں انہی دونوں اہم مصادر کا تفصیلی جائزہ لیا جائے گا، جن کے ذریعے دہلی سلطنت کے سیاسی، سماجی اور روحانی پہلوؤں کو بہتر طور پر سمجھنے کی کوشش کی جائے گی۔ مزید یہ کہ ان مصادر کی نوعیت، اہمیت اور حدود پر بھی روشنی ڈالی جائے گی تاکہ تاریخ نویسی کے عمل کو زیادہ گہرائی کے ساتھ سمجھا جاسکے۔

7.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- ہند-فارسی تواریخ کا تعارف اور ان کی تاریخی اہمیت کو واضح کرنا۔
- دہلی سلطنت کے سیاسی اور انتظامی ڈھانچے کو تواریخ کی روشنی میں سمجھنا۔
- صوفی ادب (ملفوظات، مکتوبات، تذکرہ) کی نوعیت اور اس کی تاریخی قدر کو بیان کرنا۔
- صوفی ادب کے ذریعے سماجی، مذہبی اور روحانی زندگی کے پہلوؤں کا تجزیہ کرنا۔
- دونوں مصادر (تواریخ اور صوفی ادب) کا تقابلی مطالعہ کرکے ایک متوازن تاریخی تصویر پیش کرنا۔
- ضیاء الدین برنی کی تصانیف کے ذریعے درباری تاریخ نویسی کے انداز اور اس کے رجحانات کو سمجھنا۔
- امیر خسرو کی تحریروں کے ذریعے ادبی و تاریخی بیانیے کے امتزاج کا جائزہ لینا۔

7.2 ہند-فارسی تواریخ: پس منظر، نوعیت اور خصوصیات

ہند-فارسی تواریخ کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ برصغیر میں تاریخ نویسی کی ابتدائی روایت اور فارسی زبان کے فروغ کے پس منظر پر بھی مختصر روشنی ڈالی جائے۔ دہلی سلطنت سے قبل ہندوستان میں تاریخ نویسی کی روایت زیادہ تر مذہبی اور روایتی نوعیت کی تھی۔ سنسکرت متون، رزمیہ ادب، راجاؤں کی نسب نامے (وَنسھاولی) اور کتبے (inscriptions) اس روایت کی اہم مثالیں ہیں۔ ان کا بنیادی مقصد اکثر مذہبی تعلیمات کی ترویج یا حکمرانوں کی مدح سرائی ہوتا تھا، نہ کہ واقعات کو زمانی ترتیب (chronology) کے ساتھ معروضی انداز میں قلمبند کرنا۔ اس لیے انہیں جدید مفہوم میں باقاعدہ تاریخ نویسی کے بجائے روایتی بیانیہ کہا جاسکتا ہے۔

فارسی زبان کا فروغ برصغیر میں ترک اور افغان حکمرانوں کی آمد کے ساتھ ہوا، جو اپنے ساتھ وسطی ایشیا اور ایران کی ادبی و انتظامی روایات بھی لائے۔ دہلی سلطنت کے قیام کے بعد فارسی کو دربار، انتظامیہ اور علمی اظہار کی زبان کے طور پر اختیار کیا گیا۔ اس تبدیلی نے تاریخ نویسی کے ایک نئے رجحان کو جنم دیا، جس میں واقعات کو نسبتاً منظم، سیاسی تناظر کے ساتھ اور تحریری شکل میں محفوظ کیا جانے لگا۔ اسی پس منظر میں ہند-فارسی تواریخ نے جنم لیا، جو دہلی سلطنت کے دور کی تاریخ کا بنیادی ماخذ بن گئیں۔

ہند-فارسی تواریخ دراصل وہ تاریخی متون ہیں جو فارسی زبان میں لکھے گئے اور جن کا تعلق براہِ راست سلاطین کے دربار سے تھا۔ یہ تواریخ زیادہ تر ان مؤرخین نے تحریر کیں جو یا تو دربار سے وابستہ تھے یا حکمرانوں کی سرپرستی میں کام کر رہے تھے۔ اس لیے ان میں حکمرانوں کے نقطۂ نظر، ان کی سیاسی حکمتِ عملی اور ان کے اقتدار کو جائز ثابت کرنے کی کوشش نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ یوں یہ محض واقعات کا بیان نہیں بلکہ ایک طرح کا سیاسی و ادبی بیانیہ بھی ہیں۔

ان تواریخ کی پہلی نمایاں خصوصیت درباری نقطۂ نظر ہے۔ چونکہ مؤرخین کا تعلق دربار سے تھا، اس لیے ان کی توجہ زیادہ تر سلاطین، امرا اور اعلیٰ طبقے تک محدود رہتی ہے، جبکہ عام لوگوں کی زندگی پر کم روشنی ڈالی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ضیاء الدین برنی کی تصانیف میں سیاسی نظریات اور حکمرانی کے اصولوں کی تفصیل ملتی ہے، لیکن ان کا زاویۂ نظر اشرافیہ تک محدود دکھائی دیتا ہے۔

دوسری اہم خصوصیت ان کا سیاسی واقعات پر ارتکاز ہے۔ یہ تواریخ بنیادی طور پر فتوحات، جنگوں، بغاوتوں اور حکومتی تبدیلیوں کو بیان کرتی ہیں۔ اکثر متون زمانی ترتیب کے ساتھ لکھے گئے ہیں، جس سے دہلی سلطنت کے سیاسی ارتقاء کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ امیر خسرو کی تحریریں اس کی نمایاں مثال ہیں، جہاں ادبی انداز کے ساتھ ساتھ سیاسی واقعات بھی بیان کیے گئے ہیں۔

تیسری اہم خصوصیت سرپرستی کا نظام (Patronage System) ہے۔ اس دور میں مؤرخین اور ادباء اکثر سلاطین کی مالی اور سماجی سرپرستی پر منحصر ہوتے تھے، جس کا اثر ان کی تحریروں پر بھی پڑتا تھا۔ اکثر مؤرخین اپنے سرپرست حکمرانوں کی تعریف کرتے اور ان کی کامیابیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے تھے، جبکہ کمزوریوں کو نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ اس لیے ان تواریخ کا مطالعہ کرتے وقت ان کے تعصبات اور حدود کو مدنظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔

فطری طور پر ہم جیسے لوگوں کے لیے، جو عہدِ وسطیٰ کی تاریخ کے مطالعے میں دلچسپی رکھتے ہیں، اس تحریری تاریخ کی دستیابی بہت مددگار ثابت ہوتی ہے۔ لیکن اس قسم کے مواد کی موجودگی سے کچھ سنگین مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں۔ تیار شدہ تاریخوں کی موجودگی کے اپنے کچھ نقصانات بھی ہوتے ہیں۔ ایسی تاریخوں میں "اصلیت" اور "ہم عصریت" کی جھلک اکثر اہلِ علم کے تنقیدی شعور کو ماند کر دیتی ہے۔ موجودہ تاریخوں کا محض مفہوم کے ساتھ ترجمہ کر دینا ایک فطری کشش رکھتا ہے اور اس سے بچنا مشکل ہوتا ہے، اور اکثر ایسا ہوا بھی ہے۔ ہم عصر یا قریب العہد تاریخی بیانات ایک طرح کا غیر مرئی جال ہوتے ہیں۔ عہدِ وسطیٰ کے مؤرخین کے اپنے تعصبات کو صحیح طور پر سمجھا نہیں جاتا، بلکہ انہیں جانے یا انجانے میں جدید تحریروں میں بھی جوں کا توں اپنا لیا جاتا ہے۔ نتیجتاً یہ رجحان اس دور کے بارے میں مختلف غلط تصورات کو جنم دیتا ہے۔

تحریری بیانات کی دستیابی بظاہر فائدہ مند ہے، لیکن اگر ان کی اصل نوعیت کو واضح طور پر نہ سمجھا جائے تو یہ الٹا نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ مصادر کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ جدید تصانیف کے لیے گویا پہلے سے طے شدہ تعبیر پیش کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ جو شخص صدیوں پہلے لکھ رہا تھا، وہ واقعات اور حالات کے بارے میں دراصل اپنی ذاتی رائے کا اظہار کر رہا تھا۔ کون سی بات اہم ہے اور کون سی نہیں، کن حقائق کو بیان کرنا ہے اور کن کو چھوڑ دینا ہے—ان سب کے بارے میں اس کے تاریخی فیصلے مکمل طور پر ذاتی نوعیت کے تھے۔

جب تک ہم سنجیدگی سے یہ نہ سمجھ لیں کہ مؤرخ کے ذہنی ڈھانچے میں کیا عوامل کارفرما تھے، اس وقت تک ہم کسی تاریخی تصنیف کی حدود اور اس کی اہمیت کو نہیں پہچان سکتے۔ اس سے پہلے کہ ہم کسی مؤرخ کی تحریروں سے کسی بھی طرح فائدہ اٹھائیں، یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم اس کے نقطۂ نظر کو اچھی طرح سمجھ لیں، یعنی یہ جانیں کہ وہ کیوں اور کس کے لیے لکھ رہا تھا۔ ہمیں یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ اس مؤرخ کا تصورِ تاریخ کیا تھا، وہ اپنے کام کے ذریعے کیا حاصل کرنا چاہتا تھا، وہ کن قوتوں کو تاریخی واقعات کا محرک سمجھتا تھا، اس کے سماجی اور سیاسی خیالات کیا تھے، اس نے اپنی معلومات کن ذرائع سے حاصل کیں اور وہ ذرائع کس حد تک قابلِ اعتماد تھے، وغیرہ وغیرہ۔

مؤرخ کے ذاتی رجحانات، پسند و ناپسند، تعصبات اور اس کے طبقاتی مفادات بھی اس کی تحریروں کو متاثر کرتے ہیں، اور ہمیں ان سب کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ جب تک ان تمام پہلوؤں کی مستند معلومات حاصل نہ ہو، ہم ان تصانیف کے حقیقی محاسن و معائب کو نہیں سمجھ سکتے جن پر ہم بہت زیادہ انحصار کرتے ہیں۔

اس کے باوجود، ہند-فارسی تواریخ دہلی سلطنت کے سیاسی، انتظامی اور درباری نظام کو سمجھنے کے لیے نہایت اہم ماخذ ہیں۔ یہ نہ صرف اس دور کے واقعات کو محفوظ کرتی ہیں بلکہ اس زمانے کے حکمرانوں کے نظریات اور اقتدار کے تصور کو بھی واضح کرتی ہیں۔ تاہم، ایک سنجیدہ مورخ کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان مصادر کا تنقیدی جائزہ لے اور دیگر ذرائع کے ساتھ ملا کر ان کی تعبیر کرے، تاکہ ایک متوازن اور جامع تاریخی تصویر سامنے آ سکے۔

7.3 منتخب ہند-فارسی تواریخ: تعارف و تنقیدی مطالعہ

7.3.1 طبقات ناصری مصنف منہاج السراج

سلطنتِ دہلی کی تاریخ نویسی کی روایت میں منہاج السراج جوزجانی کی تصنیف طبقاتِ ناصری کو نہایت اہم مقام حاصل ہے۔ یہ ہندوستان میں ترکوں کی ابتدائی فتوحات کا تقریباً واحد مفصل ماخذ ہے۔ اگرچہ بعض دیگر کتب، مثلاً فخرِ مدبر اور جاج المعاثر میں بھی اس موضوع کا ذکر ملتا ہے، لیکن وہ محدود دائرے تک ہی رہتی ہیں۔ منہاج کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے پہلی مرتبہ سلطنتِ دہلی کی تاریخ کو منظم اور زمانی ترتیب کے ساتھ پیش کیا۔ بعد ازاں ضیاء الدین برنی نے اسی سلسلے کو وہاں سے آگے بڑھایا جہاں منہاج نے اسے ختم کیا تھا اور شمسِ سراج عفیف نے اسے فیروز شاہ تغلق کے عہد تک پہنچایا۔

منہاج السراج اقتدار کے مرکز کے نہایت قریب تھے اور طویل عرصے تک دربار سے وابستہ رہے۔ وہ ایک جید عالم تھے جنہیں تعلیم، عدلیہ اور انتظامی شعبوں میں مختلف ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ ان کے بلند مناصب کی وجہ سے ان کی تصنیف کو خاص اہمیت حاصل ہو جاتی ہے، کیونکہ اس میں ایک ایسے فرد کی فکر جھلکتی ہے جو خود حکومتی نظام کا فعال حصہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تاریخ نویسی پر اقتدار کے مفادات کا واضح اثر دکھائی دیتا ہے۔

ان کی ولادت غالباً 1193ء میں ایک معزز اور تعلیم یافتہ خاندان میں ہوئی۔ منگول حملوں کے باعث وسطی ایشیا میں پیدا ہونے والی بے چینی کے نتیجے میں وہ ہندوستان آئے، جو اس وقت نسبتاً محفوظ اور مسلم اقتدار کے تحت تھا۔ 1227ء میں وہ اُچ پہنچے اور ناصر الدین قباچہ کے زیرِ سایہ خدمات انجام دیں۔ بعد ازاں وہ شمس الدین التتمش سے وابستہ ہو گئے اور دہلی میں اہم مناصب پر فائز ہوئے۔ وہ گوالیار کے قاضی، دہلی کے مدرسہ ناصریہ کے صدر مدرس (رضیہ کے دور حکومت میں) اور بعد میں ریاست کے اعلیٰ قاضی (بہرام شاہ کے دور حکومت میں) مقرر ہوئے۔ علاء الدین مسعود شاہ کے دورِ حکومت میں ان پر شاہی عنایت باقی نہ رہی، جس کے باعث انہوں نے کچھ عرصہ لکھنوتی اور جاج نگر میں گزارا۔ ناصر الدین محمود اور بعد ازاں بلبن کے زمانے میں انہیں دوبارہ عروج حاصل ہوا اور وہ صدرِ جہاں جیسے اعلیٰ منصب تک پہنچے۔

طبقاتِ ناصری ان کی سب سے اہم اور وقیع تصنیف ہے جو ناصر الدین محمود کو وقف کی گئی ہے، جس میں انہوں نے حضرت آدم سے لے کر ناصر الدین محمود کے عہد تک کی تاریخ بیان کی ہے۔ یہ کتاب 23 ابواب پر مشتمل ہے اور مختلف سلطنتوں و خاندانوں کا جداگانہ جائزہ پیش کرتی ہے۔ اگرچہ ابتدائی اسلامی تاریخ کا بیان نسبتاً مختصر ہے، لیکن عہدِ التتمش سے تفصیل میں نمایاں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس میں معاصر امرا اور اعلیٰ حکام کی سوانح بھی شامل ہیں۔ منہاج کی تاریخ نویسی کے پسِ منظر میں مختلف محرکات کارفرما تھے۔ اگرچہ انہیں حکمرانوں کی جانب سے انعامات بھی ملے، لیکن ان کا مقصد محض مالی فائدہ نہ تھا۔ وہ تاریخ کو اسلام اور ریاست کے ساتھ وفاداری اور وابستگی پیدا کرنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ منگول یلغار کے دور میں اسلامی عظمت کو اجاگر کرنا ان کے پیشِ نظر تھا۔ مزید برآں، اس زمانے میں تاریخ تعلیم کا ایک لازمی جز تھی، اس لیے ایک تعلیم یافتہ عالم کی حیثیت سے ان کا اس میدان میں کام کرنا فطری امر تھا۔ سیاسی طور پر منہاج ترک اقتدار کے جواز کو مستحکم کرنے کے

خواہاں تھے۔ان کے نزدیک اقتدار کا استحکام سب سے زیادہ اہم تھا، خواہ حکمران کوئی بھی ہو۔اسی بناپر وہ مختلف سلاطین کی تعریف و توصیف کرتے ہیں، چاہے انہوں نے اقتدار پُر تشدد طریقوں سے حاصل کیا ہو۔ان کی تصنیف زیادہ تر سیاسی واقعات کی سادہ اور براہِ راست روداد پیش کرتی ہے، جس میں سماجی پہلو نسبتاً کمزور ہیں۔ان کی تحریر میں مذہبی اصطلاحات کا کثرت سے استعمال ملتا ہے۔وہ جنگوں کو اسلامی افواج اور باطل قوتوں کے مابین کشمکش کے طور پر پیش کرتے ہیں، جس سے ان کی فکری وابستگی ظاہر ہوتی ہے۔تاہم یہ محض مذہبی تعصب نہیں بلکہ اس عہد کی فکری روایت کا عکس ہے۔ہندوؤں کے بارے میں ان کا رویہ بھی زیادہ تر سیاسی حالات سے متاثر نظر آتا ہے۔

منہاج نے اپنی تصنیف میں سابقہ مآخذ سے بھی استفادہ کیا، لیکن اپنے عہد کے واقعات کے لیے انہوں نے ذاتی مشاہدات اور معتبر روایات پر انحصار کیا۔ مختلف بیانات میں اختلاف کی صورت میں وہ اپنے انتخاب کی وجہ بھی بیان کرتے ہیں۔اگرچہ ان کی تصنیف پر یہ تنقید کی جاتی ہے کہ اس میں عوامی زندگی کا فقدان ہے اور یہ صرف اشرافیہ تک محدود ہے، تاہم اس کے باوجود یہ اس دور کی سیاسی تاریخ کا بنیادی ماخذ ہے۔در حقیقت ان کی حدود ان کے عہد کے سماجی و سیاسی حالات سے جڑی ہوئی تھیں۔ایک ایسے غیر مستحکم دور میں، جہاں اہلِ علم اپنی بقا کو ریاست سے وابستہ سمجھتے تھے، منہاج کی تاریخ نویسی اسی حقیقت کی عکاس ہے۔اس طرح طبقاتِ ناصری نہ صرف سلطنتِ دہلی کے ابتدائی دور کا ایک اہم تاریخی ماخذ ہے بلکہ یہ عہد وسطیٰ کی اسلامی تاریخ نویسی کے رجحانات اور اس کی حدود کو بھی بخوبی واضح کرتی ہے۔

7.3.2 تاریخ فیروز شاہی مصنف برنی

سلطنتِ دہلی کی تاریخ نویسی میں ضیاءالدین برنی کو ایک اہم مگر کسی حد تک متنازع مؤرخ کی حیثیت حاصل ہے۔ان کی دو بنیادی کتابیں تاریخِ فیروز شاہی اور فتاویٰ جہانداری نہ صرف اس دور کی تاریخ سمجھنے کے لیے ضروری ہیں بلکہ ان سے کئی علمی بحثیں بھی جنم لیتی ہیں۔ برنی صرف واقعات بیان نہیں کرتے بلکہ اپنے سماجی اور سیاسی خیالات بھی شامل کرتے ہیں، اسی لیے ان کی تحریریں خاصی موضوعی (subjective) نظر آتی ہیں۔

برنی کی پیدائش 1284 یا 1285ء میں ایک معزز سادات خاندان میں ہوئی، جو درباری اشرافیہ سے گہرا تعلق رکھتا تھا۔ان کے خاندان کے افراد اعلیٰ سرکاری مناصب پر فائز رہے تھے، جس کا اثر ان کی ابتدائی زندگی اور ذہنی تربیت پر واضح طور پر نظر آتا ہے۔ان کے چچا علاء الملک، علاءالدین خلجی کے معتمد مشیر اور دہلی کے کوتوال تھے، جس کی وجہ سے برنی کو کم عمری ہی سے دربار، سیاست اور اقتدار کے قریب رہنے کا موقع ملا۔انہوں نے اعلیٰ درجے کی تعلیم حاصل کی اور خود اپنے بیان کے مطابق تقریباً چھیالیس ممتاز علما سے علم حاصل کیا۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے نہایت تعلیم یافتہ اور ذہین افراد میں شمار ہوتے تھے۔ان کی تعلیم نے ان کے مذہبی اور سیاسی خیالات کی بنیاد رکھی، جس میں علما کے مخصوص طبقے کی سوچ نمایاں تھی۔ عملی زندگی میں برنی کا سب سے اہم تعلق محمد بن تغلق کے دربار سے رہا، جہاں وہ "ندیم" (قریبی مصاحب اور مشیر) کے طور پر تقریباً سترہ سال تک وابستہ رہے۔ اس طویل عرصے میں انہیں سلطنت کے انتظامی امور، درباری سیاست اور حکمرانوں کے فیصلوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، جس کا اثر ان کی تاریخ نویسی میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔وہ نہ صرف دربار کے حالات سے واقف تھے بلکہ کئی امرا اور بااثر شخصیات سے بھی ان کے قریبی تعلقات تھے۔تاہم، ان کی زندگی کا یہ استحکام زیادہ دیر

برقرار نہ رہ سکا۔ فیروز شاہ تغلق کے اقتدار میں آنے کے بعد برنی کو دربار سے دور کر دیا گیا۔ بعض روایات کے مطابق وہ سیاسی سازشوں یا اختلافات کا شکار ہوئے اور انہیں قید بھی برداشت کرنی پڑی۔ امکان ہے کہ وہ ان امرا کے گروہ سے وابستہ تھے جو فیروز شاہ کے بجائے کسی اور شہزادے کو تخت پر دیکھنا چاہتے تھے۔ زندگی کے آخری حصے میں برنی کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ نہ صرف مالی طور پر کمزور ہو گئے بلکہ سماجی طور پر بھی انہیں نظر انداز کر دیا گیا۔ انہوں نے خود اپنی تحریروں میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ کس طرح وہ بڑھاپے میں تنہائی، غربت اور بے قدری کا شکار تھے، اور کوئی انہیں پناہ یا مناسب عزت دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ بعض مؤرخین کے مطابق ممکن ہے کہ ان کی جائیداد بھی ضبط کر لی گئی ہو، جس کی وجہ سے ان کی حالت مزید خراب ہو گئی۔

یہی وہ دور تھا جب برنی نے اپنی اہم تصانیف تحریر کیں۔ ایک طرف ان کی ذاتی محرومیاں اور ناکامیاں تھیں اور دوسری طرف ان کی علمی و فکری صلاحیتیں ان دونوں کے امتزاج نے ان کی تاریخ نویسی کو ایک خاص رنگ دیا۔ ان کی تحریروں میں جو تلخی، نصیحت اور اشرافیہ کے حق میں جھکاؤ نظر آتا ہے، وہ بڑی حد تک ان کے ذاتی تجربات اور حالات کا نتیجہ تھا۔ برنی کے نزدیک تاریخ کا مقصد صرف ماضی کو بیان کرنا نہیں بلکہ لوگوں کو سبق دینا بھی ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ تاریخ کے ذریعے حکمران صحیح فیصلے سیکھ سکتے ہیں اور انسان اپنے اعمال کے نتائج سے آگاہ ہو سکتا ہے۔ تاہم وہ صاف کہتے ہیں کہ ان کی کتابیں عام لوگوں کے لیے نہیں بلکہ امرا اور اشرافیہ کے لیے ہیں، کیونکہ انہی کو وہ ریاست چلانے کے قابل سمجھتے تھے۔

تاریخِ فیروز شاہی میں برنی نے صرف ہندوستان کی سیاسی تاریخ پر توجہ دی اور مختلف سلاطین کے ادوار کو الگ الگ بیان کیا۔ ان کا انداز محض واقعات گنانے کا نہیں بلکہ ان کے اسباب اور نتائج کو سمجھانے کا ہے۔ اسی تناظر میں وہ غیاث الدین بلبن کی بادشاہت کے نظریے (kingship) کو خاص اہمیت دیتے ہیں اور یہ واضح کرتے ہیں کہ کس طرح بلبن نے سخت نظم و ضبط، رعب و دبدبہ اور مرکزیت کے ذریعے سلطنت کو مستحکم کیا۔ اسی طرح وہ علاء الدین خلجی کے دور کی پالیسیوں—خاص طور پر بازار کی نگرانی (market policy)، محاصل/ریونیو نظام اور فوجی اصلاحات—کا کافی تفصیل سے ذکر کرتے ہیں اور انہیں سلطنت کے استحکام کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں۔ تاہم یہاں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ برنی کا بیان ہر جگہ یکساں نہیں ہے۔ مثال کے طور پر علاء الدین خلجی کی دکن پالیسی (Deccan policy) کو وہ زیادہ اہمیت نہیں دیتے یا اس پر تفصیل سے گفتگو نہیں کرتے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ہمیں امیر خسرو کی تحریروں سے مدد لینی پڑتی ہے، جو اس پہلو پر زیادہ روشنی ڈالتی ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ برنی کا انتخابی انداز (selective approach) ان کی تاریخ نویسی کی ایک اہم خصوصیت ہے۔

فتاویٰ جہانداری میں برنی نے ایک مثالی اسلامی ریاست کا تصور پیش کیا، جس میں بادشاہ کو اسلام کی حفاظت، شریعت کے نفاذ اور سماج کو ایک سخت درجہ بندی (hierarchy) میں قائم رکھنے کا پابند بتایا گیا ہے۔ برنی ایک سخت طبقاتی نظام کے حامی تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ نچلے طبقے کے لوگ اعلیٰ عہدوں تک پہنچیں۔ انہوں نے محمد بن تغلق پر اسی بنیاد پر تنقید کی کہ اس نے کم حیثیت کے لوگوں اور نو مسلم افراد کو بڑے عہدے دے دیے۔ وہ فلسفیوں اور دانشوروں کو بھی حکومت کے لیے نقصان دہ سمجھتے تھے۔ دراصل ان کے خیالات اس اشرافیہ کے

خوف کی عکاسی کرتے ہیں جسے بدلتے ہوئے حالات میں اپنی حیثیت کھونے کا اندیشہ تھا۔

اب اگر ہم برنی کے ہندوؤں کے بارے میں رویے کو دیکھیں تو یہ ان کی فکر کا نہایت اہم اور پیچیدہ پہلو ہے۔ برنی نے ہندوؤں کے خلاف سخت زبان استعمال کی ہے، لیکن اسے صرف مذہبی تعصب کہنا درست نہیں ہوگا۔ اس کے پیچھے سیاسی، سماجی اور معاشی عوامل کارفرما تھے۔ سیاسی طور پر محمد بن تغلق کے دور میں ہونے والی بغاوتوں نے برنی کو یہ احساس دلایا کہ ہندو سلطنت کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں، اس لیے وہ اکثر انہیں باغی کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ دوسری طرف، ان کی ذاتی غربت اور اس کے مقابلے میں بعض ہندو طبقات کی خوشحالی نے ان کے اندر تلخی پیدا کی۔ اسی وجہ سے وہ امیر ہندوؤں پر زیادہ تنقید کرتے ہیں، جبکہ غریب ہندوؤں کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ برنی "ہندو" کی اصطلاح کو عمومی انداز میں استعمال کرتے ہیں اور مختلف طبقات میں فرق نہیں کرتے۔ اسی وجہ سے بعد کے بعض مورخین نے ان کے بیانات کو غلط انداز میں استعمال کیا اور یہ تاثر دیا کہ عہد وسطیٰ کا دور صرف مذہبی ظلم کی تاریخ ہے، حالانکہ حقیقت اس سے کہیں زیادہ مختلف ہے۔

برنی کے ذرائع مکمل طور پر واضح نہیں ہیں۔ وہ زیادہ تر ذاتی مشاہدات اور سنی سنائی باتوں پر انحصار کرتے ہیں اور اپنے ذرائع کا ذکر کم کرتے ہیں۔ وہ تاریخ کو ایک نصیحتی ذریعہ سمجھتے ہیں، اس لیے ان کی تحریر میں وعظ کا انداز نمایاں ہے۔ وہ مکالموں کے ذریعے اپنے خیالات پیش کرتے ہیں، لیکن یہ مکالمے دراصل ان کے اپنے نظریات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ اکثر واقعات کو خدا کی مرضی سے جوڑتے ہیں، لیکن وہ سیاسی اور عملی وجوہات کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔ وہ یہ مانتے ہیں کہ کسی حکمران کی کامیابی اس کی پالیسیوں پر منحصر ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ مختلف سلاطین کے اقدامات کا تجزیہ کرتے ہیں اور ان کے نتائج کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ان کی تاریخ میں کچھ کمزوریاں بھی ہیں، جیسے تاریخوں کی غلطی، واقعات کا انتخابی بیان اور بعض جگہوں پر یک طرفہ نقطۂ نظر۔ لیکن اس کے باوجود ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے، کیونکہ وہ صرف واقعات نہیں بلکہ ان کے پسِ پردہ عوامل کو بھی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ برنی کی تحریروں کو تنقیدی نظر سے پڑھنا ضروری ہے، لیکن وہ سلطنتِ دہلی کے سیاسی، سماجی اور فکری تاریخ کو سمجھنے کے لیے ایک نہایت اہم ذریعہ ہیں۔ ان کے ذریعے ہمیں نہ صرف اس دور کے حالات بلکہ اس زمانے کے اہلِ علم کی ذہنیت اور سوچ کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

7.3.3 تاریخ فیروز شاہی مصنف عفیف

سلطنتِ دہلی کی تاریخ نویسی کی روایت میں شمسِ سراج عفیف ایک اہم مگر نسبتاً مختلف نوعیت کے مؤرخ کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب تاریخِ فیروز شاہی، ضیاءالدین برنی کے تقریباً پچاس برس بعد لکھی اور یہ دعویٰ کیا کہ ان کی تصنیف ضیاءالدین برنی (اور اس سے پہلے منہاج السراج جوزجانی) کے کام کی تکمیل ہے۔ تاہم ان کی تاریخ کا انداز اور پس منظر ان دونوں سے مختلف ہے۔ منہاج نے سلطنت کے قیام، برنی نے اس کے استحکام اور ابتدائی زوال کو بیان کیا، جبکہ عفیف نے اس کے آخری دور اور کمزوریوں کی تصویر پیش کی—

جس کے فوراً بعد تیمور کے حملے نے سلطنت کو شدید نقصان پہنچایا۔

عفیف ایک متوسط درجے کے سرکاری ملازم خاندان سے تعلق رکھتے تھے، جن کے تغلق خاندان سے پرانے تعلقات تھے۔ وہ خود بھی غالباً دیوانِ وزارت میں کسی معمولی عہدے پر فائز تھے۔ ان کی پیدائش تقریباً 1356–57ء میں ہوئی۔ ان کی زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات دستیاب نہیں، تاہم انہوں نے خود کو صوفیانہ رجحانات کا حامل بتایا ہے، جس کا اثر ان کی سوچ اور تحریر میں نمایاں ہے۔ عفیف کی تمام تصانیف مکمل طور پر محفوظ نہیں رہیں، لیکن تاریخِ فیروز شاہی کا کچھ حصہ دستیاب ہے، جو تقریباً 90 ابواب پر مشتمل ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ ان 101 ابواب کو مکمل کرنا چاہتے تھے جن کا ارادہ برنی نے کیا تھا۔ عفیف نے فیروز شاہ تغلق کے عہد کو اپنی تاریخ کا مرکز بنایا اور اسے امن و خوشحالی کا دور قرار دیا۔

عفیف کے لکھنے کا مقصد براہِ راست درباری سرپرستی حاصل کرنا نہیں تھا، کیونکہ جب انہوں نے لکھنا شروع کیا تو فیروز شاہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ دراصل وہ اس ماضی کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتے تھے جو تیمور کے حملے کے نتیجے میں تباہ ہو گیا تھا۔ انہوں نے فیروز شاہ کے دور کو ایک مثالی اور پُرامن زمانے کے طور پر پیش کیا اور اس کے مثبت پہلوؤں پر زیادہ زور دیا، جبکہ منفی پہلوؤں کو کم اہمیت دی یا مثبت انداز میں بیان کیا۔ یہ جان بوجھ کر تاریخ کو مسخ کرنا نہیں تھا بلکہ ان کے اپنے زاویۂ نظر کا نتیجہ تھا۔ مثال کے طور پر فیروز شاہ کی فوجی کمزوری کو وہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ وہ جنگ کے بجائے امن کو ترجیح دیتا تھا۔ اسی طرح اس کی فیاضی اور بعض اوقات بدعنوانی کو وہ رعایا کی بھلائی کے جذبے سے جوڑتے ہیں۔ چونکہ عفیف نے تیمور کے حملے کی تباہی خود دیکھی تھی، اس لیے انہیں فیروز شاہ کا دور اس کے مقابلے میں زیادہ بہتر محسوس ہوتا تھا۔

عفیف کی تاریخ نویسی میں برنی جیسی فکری پیچیدگی یا سیاسی نظریہ سازی نہیں ملتی۔ ان کی زبان سادہ اور انداز بیانیہ (narrative) ہے، جو عوامی ادب کے قریب ہے۔ وہ کوئی سیاسی مفکر نہیں تھے بلکہ ایک ایسے ماضی کی تصویر پیش کرنا چاہتے تھے جو سکون اور خوشحالی سے بھرپور تھا۔ غیر مسلموں کے بارے میں عفیف کا رویہ بھی منہاج اور برنی سے مختلف ہے۔ اگرچہ وہ بعض مواقع پر فیروز شاہ کی سخت پالیسیوں کی تعریف کرتے ہیں، لیکن مجموعی طور پر وہ ہندوؤں کو بڑا خطرہ نہیں سمجھتے۔ وہ اس بات کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ تیمور کے حملے میں ہندو اور مسلمان دونوں کو نقصان پہنچا۔ ان کے نزدیک اصل تباہی کا سبب تیمور تھا، نہ کہ ہندو۔ اسی طرح وہ اس بات پر اعتراض نہیں کرتے کہ درباری تہواروں میں ہندو شریک ہوتے تھے یا مسلمانوں کے معاشرتی رویوں میں ہندو رسم و رواج شامل ہو گئے تھے۔

عفیف کے نزدیک تاریخ میں واقعات کا سبب بنیادی طور پر خدا کی مرضی ہوتا ہے۔ وہ فیروز شاہ کی کامیابی کو بھی اللہ کی عنایت قرار دیتے ہیں۔ ان کی توجہ اس بات پر نہیں کہ حالات کیوں بدلے، بلکہ اس پر ہے کہ ماضی ان کے حال سے بہتر تھا۔ عفیف کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ صرف سیاسی واقعات تک محدود نہیں رہتے بلکہ سماجی اور معاشی زندگی کی تفصیلات بھی بیان کرتے ہیں۔ وہ نہروں کی تعمیر، باغات، ٹکسال، فوجی نظام، بازار، قیمتوں، تقریبات اور انتظامی ڈھانچے کا تفصیل سے ذکر کرتے ہیں۔ اس طرح وہ ہمیں اس دور کی عام زندگی کی جھلک

بھی فراہم کرتے ہیں، جو منہاج اور برنی کے یہاں کم ملتی ہے۔ اگرچہ عفیف کا انداز سادہ ہے اور وہ گہرے تجزیے سے گریز کرتے ہیں، لیکن ان کی تحریروں سے ہمیں سلطنت کے زوال کے آثار واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ ان کے بیان کردہ حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاست کے سیاسی اور انتظامی ڈھانچے میں کمزوریاں پیدا ہو چکی تھیں۔ اسی وجہ سے ان کی تصنیف سلطنتِ دہلی کے آخری دور کو سمجھنے کے لیے نہایت اہم ذریعہ سمجھی جاتی ہے۔

7.3.4 امیر خسرو

امیر خسرو برصغیر کے عہدِ وسطیٰ کے سب سے نمایاں ادبی اور ثقافتی شخصیتوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا اصل نام ابوالحسن تھا، جبکہ "خسرو" ان کا تخلص تھا۔ درباری خدمات کی وجہ سے انہیں "امیر" کا خطاب ملا، جس کے بعد وہ "امیر خسرو" کے نام سے معروف ہو گئے۔ ان کی پیدائش 1253ء میں موجودہ اتر پردیش کے ضلع ایٹہ کے قصبہ پٹیالی میں ہوئی۔ ان کے آباؤ اجداد کا تعلق وسطی ایشیا سے تھا، جو منگول حملوں کے نتیجے میں ہندوستان ہجرت کر آئے تھے۔ امیر خسرو خود کو "ہندوستانی ترک" کہتے تھے، جو ان کی دوہری ثقافتی شناخت کی عکاسی کرتا ہے۔ ان کے والد امیر سیف الدین محمود سلطنتِ دہلی کے دربار سے وابستہ تھے اور فوجی خدمات انجام دیتے تھے، جس کی وجہ سے خسرو کو کم عمری ہی سے درباری ماحول میسر آیا۔

امیر خسرو نے بچپن ہی سے غیر معمولی ادبی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ ان کے والد نے ان کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی اور ان کی خواہش تھی کہ وہ ایک بڑے عالم اور ادیب بنیں۔ خسرو نے کم عمری میں ہی فارسی شاعری میں مہارت حاصل کر لی اور جلد ہی وہ اپنے عہد کے ممتاز شعرا میں شمار ہونے لگے۔ انہیں "طوطیٔ ہند" (ہندوستان کا طوطا) کا لقب بھی دیا گیا، جو ان کی ادبی عظمت کی دلیل ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں دہلی سلطنت کے کئی سلاطین کے ادوار دیکھے، جن میں غیاث الدین بلبن، جلال الدین خلجی، علاءالدین خلجی، قطب الدین مبارک شاہ اور غیاث الدین تغلق شامل ہیں۔ وہ نہ صرف درباری شاعر تھے بلکہ کئی مواقع پر فوجی مہمات میں بھی شریک رہے، جس کی وجہ سے انہیں سیاسی اور عسکری حالات کا براہِ راست مشاہدہ حاصل ہوا۔

اگرچہ امیر خسرو بنیادی طور پر ایک شاعر اور ادیب تھے، تاہم ان کی تصانیف میں تاریخی مواد بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ انہوں نے اپنی مختلف مثنویوں میں اس دور کے اہم واقعات، سلاطین کی فتوحات اور درباری زندگی کا ذکر کیا ہے۔ ان کی تحریریں محض ادبی نہیں بلکہ اس عہد کے سماجی، ثقافتی اور سیاسی حالات کو سمجھنے کے لیے بھی نہایت قیمتی ماخذ ہیں۔ امیر خسرو کا ایک اور اہم پہلو ان کا صوفیانہ تعلق ہے۔ وہ نظام الدین اولیاء کے مرید تھے اور ان سے گہری روحانی وابستگی رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری اور موسیقی کے ذریعے ہندوستان میں صوفی ثقافت کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کا انتقال 1325ء میں دہلی میں ہوا، اور وہ اپنے مرشد نظام الدین اولیاء کے مزار کے قریب مدفون ہیں۔ اس طرح امیر خسرو نہ صرف ایک عظیم شاعر تھے بلکہ ایک ایسے ثقافتی پُل بھی تھے جنہوں نے ہندوستانی اور ایرانی روایات کو یکجا کر کے ایک منفرد ادبی اور تہذیبی روایت کو جنم دیا۔

امیر خسرو کی ادبی تخلیقات دہلی سلطنت کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی حالات کو سمجھنے کے لیے نہایت اہم ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ان کی مختلف مثنویاں اپنے عہد کے اہم واقعات، درباری زندگی اور فتوحات کی جھلک پیش کرتی ہیں۔ ان کی پہلی اہم مثنوی قران السعدین (1289ء)ہے، جو سلطان کیقباد کے حکم پر لکھی گئی تھی۔اس میں کیقباد اور اس کے والد بغرا خان جو بنگال کا گورنر تھا، کے درمیان ہونے والی ملاقات کو نہایت دلکش انداز میں "دو سورجوں کے ملاپ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ محض ایک تاریخی واقعہ نہیں بلکہ اس میں دہلی شہر، درباری آداب، امرا کی زندگی، موسیقی، تقاریب، ضیافتوں اور تحائف کے تبادلے کا بھی مفصل بیان ملتا ہے، جس سے اس دور کی ثقافتی فضا واضح ہوتی ہے۔ اسی طرح درباری سیاست اور ملک نظام الدین کے کردار کا ذکر بھی اس کی اہمیت میں اضافہ کرتا ہے۔اس کے بعد مفتاح الفتوح (1291ء) میں جلال الدین خلجی کی ابتدائی فتوحات کا بیان ملتا ہے۔اس مثنوی میں روایت کے مطابق ابتدا حمد و نعت سے کی گئی ہے اور پھر سلطان کی مدح کے بعد مختلف فوجی مہمات کا ذکر کیا گیا ہے، جن میں ملک چھجو کی بغاوت کا خاتمہ، منگولوں کے خلاف جنگ اور دیگر علاقائی مہمات شامل ہیں۔ان واقعات کی تفصیل اسے خلجی دور کے ابتدائی سیاسی حالات کے لیے ایک قابلِ اعتماد ذریعہ بناتی ہے۔

عاشقہ (1316ء)، جسے دیول رانی اور خضر خان کی محبت کی داستان کے طور پر جانا جاتا ہے، بظاہر ایک عشقیہ مثنوی ہے، لیکن اس میں علاءالدین خلجی کے دور کے اہم سیاسی اور فوجی واقعات بھی شامل ہیں۔اس میں گجرات اور مالوہ کی فتوحات، منگول حملوں کا مقابلہ، درباری سازشیں اور سلطان کے آخری ایام کی تفصیل ملتی ہے۔اس کے ساتھ ہی خسرو نے اخلاقی نصیحتوں کے ذریعے حکمران کو بعض اہم امور، جیسے شراب نوشی اور ظلم کے نقصانات، کی طرف بھی متوجہ کیا ہے۔خاص طور پر ملک کافور کے کردار اور جانشینی کے تنازعات کا بیان اسے تاریخی لحاظ سے مزید اہم بنا دیتا ہے۔

اسی طرح نہ سپہر (تقریباً 1318ء) ایک ایسی مثنوی ہے جو مبارک شاہ خلجی کے عہد کا بیان کرتے ہوئے ہندوستان کی جغرافیائی، ثقافتی اور سماجی تصویر پیش کرتی ہے۔اس میں ملک کی آب و ہوا، زبانوں، نباتات، حیوانات اور عوامی زندگی کا نہایت تفصیلی ذکر ہے۔ خسرو نے ہندوستان کو جنت سے تشبیہ دی ہے اور مختلف علاقوں کی زبانوں کی کثرت کو نمایاں کیا ہے، جس سے اس دور کے سماجی تنوع کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ محض ایک تاریخی متن نہیں بلکہ ثقافتی تاریخ کا ایک اہم ماخذ بھی ہے۔ تغلق نامہ (1321ء) میں خسرو خان کے زوال اور غیاث الدین تغلق کے اقتدار میں آنے کا بیان ہے۔اس میں مبارک شاہ کے آخری ایام، درباری سازشوں اور تغلق خاندان کے قیام کے حالات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، جو 14ویں صدی کے ابتدائی سیاسی حالات کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

اسی سلسلے کی ایک اور اہم تصنیف خزائن الفتوح (تاریخِ علائی) ہے، جو تقریباً 1311-12 میں لکھی گئی اور جس میں علاءالدین خلجی کے عہد کی فتوحات اور اصلاحات کا تفصیلی ذکر ہے۔اس میں گجرات، چتوڑ، مالوہ اور دکن کی مہمات، خصوصاً ملک کافور کی کارروائیوں کا بیان ملتا ہے۔ ساتھ ہی سلطان کی معاشی اور انتظامی اصلاحات جیسے بازار کا نظام، قیمتوں کا تعین اور بدعنوانی کے خاتمے کی کوششیں—— بھی اس میں شامل ہیں۔اگرچہ اس میں مدح کا عنصر نمایاں ہے اور تنقیدی پہلو کم ہے، تاہم یہ ایک نہایت اہم معاصر ماخذ ہے۔

ان تمام تصانیف کی روشنی میں یہ واضح ہوتا ہے کہ امیر خسرو اگرچہ پیشہ ور مؤرخ نہیں تھے، لیکن ان کی تحریریں دہلی سلطنت کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی حالات کو سمجھنے میں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بہت سے واقعات کے خود عینی شاہد تھے اور بعض فوجی مہمات میں شریک بھی رہے۔ اس طرح ان کی تصانیف 13 ویں صدی کے اواخر اور 14 ویں صدی کے اوائل کے حالات کا ایک زندہ اور معتبر عکس پیش کرتی ہیں، اور دیگر تاریخی ماخذوں کی کمی کو بڑی حد تک پورا کرتی ہیں۔

7.3.5 دیگر تاریخی ماخذ

سلطنتِ دہلی کی تاریخ کو سمجھنے کے لیے صرف بڑے مؤرخین، جیسے ضیاءالدین برنی، منہاج السراج جوزجانی اور شمسِ سراج عفیف ہی اہم نہیں ہیں، بلکہ کچھ دیگر کتب اور مصنفین بھی ہیں جو ان کے بیانات کی تکمیل کرتے ہیں اور ہمیں اس دور کی زیادہ جامع تصویر فراہم کرتے ہیں۔ ان میں سب سے پہلے نام ابن بطوطہ کا آتا ہے، جو مراکش سے سفر کرتے ہوئے مصر، عرب، ایران اور وسطی ایشیا کے مختلف علاقوں سے گزرتے ہوئے 1333ء میں محمد بن تغلق کے عہد میں دہلی پہنچے۔ یہاں انہیں قاضی مقرر کیا گیا اور وہ تقریباً آٹھ سال تک اس منصب پر فائز رہے۔ بعد میں شاہی ناراضی کے باعث وہ دوبارہ سفر پر نکل گئے۔ ان کی مشہور تصنیف 'الرحلہ' اس دور کی سیاسی سرگرمیوں اور سماجی حالات کے بارے میں اہم معلومات فراہم کرتی ہے۔ اگرچہ ان کی تحریر میں محمد بن تغلق کے خلاف ذاتی ناراضی کا عنصر موجود ہے اور بعض مقامات پر معلومات سطحی محسوس ہوتی ہیں، اس کے باوجود اسے ایک قیمتی ماخذ سمجھا جاتا ہے۔

اسی طرح خواجہ عبدالملک عصامی بھی محمد بن تغلق کے عہد کے ایک اہم مگر سخت ناقد مؤرخ تھے۔ ان کی کتاب فتوح السلاطین منظوم (poetic) انداز میں لکھی گئی اور بہمنی سلطنت کے بانی علاءالدین بہمن شاہ کے دربار میں تصنیف کی گئی۔ چونکہ بہمن شاہ نے خود محمد بن تغلق کے خلاف بغاوت کی تھی، اس لیے عصامی کا بیان بھی شدید طور پر جانبدار ہے۔ سلطان محمد بن تغلق کے دور میں اسے اپنے دادا عزالدین عصامی کے ساتھ مجبوراً دہلی سے دیوگیری ہجرت کرنی پڑی۔ عصامی نے اس کتاب کی تصنیف 750 ہجری میں شروع کی اور صرف 5 ماہ اور 9 دن کی قلیل مدت میں تقریباً 751 ہجری کو مکمل کی۔ انہوں نے اس نظم میں دنیا کی مشہور کتاب شاہنامہ کے مصنف فردوسی اور نظامی گنجوی جیسے شاعروں کی نقل کی اور سلطان محمود غزنوی سے لے کر اپنے ہم عصر سلطان علاؤالدین بہمن شاہ (1347-58) تک کی تاریخ لکھی۔ وہ اپنی زندگی کے 24 سال دولت آباد میں رہے۔۔ دولت آباد کے قاضی برہان الدین ان کے علم و عرفان سے بہت متاثر ہوئے اور انہیں سلطان علاؤالدین کے دربار میں لے گئے۔ سلطان علاؤالدین بہمن شاہ کی سرپرستی میں عصامی نے اپنی مشہور تاریخی مثنوی تحریر کی۔ وہ لکھتے ہیں کہ 'میں نے جو کچھ لوگوں سے سنا اور کتابوں میں پایا، اس کتاب میں لکھا۔ میں نے قدیم کہانیوں کی حقیقت کو جاننے کے لیے بہت محنت کی۔ ہندوستان کے شہنشاہوں کے حالات عقلمند دوستوں سے حاصل کی۔ ہر ایک کے بارے میں تاریخ کا مطالعہ کیا۔' عصامی کی مثنوی سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی بہت سی تحریریں جو عصامی کو دستیاب تھیں اب ناقابل رسائی ہیں، اس لیے عصامی کا کام بہت اہمیت کا حامل ہے۔ جب ہم محمد بن تغلق (1325-51) سے متعلق تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ ذہن میں رہے کہ عصامی محمد بن تغلق سے بہت بدزن تھے ظاہر ہے دہلی سے دولت آباد ہجرت کے دوران عصامی کے دادا کا انتقال ہو گیا تھا۔ عصامی کی یہ مثنوی تاریخ نگاروں کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔

آخر میں یحییٰ بن احمد سرہندی کا ذکر ضروری ہے، جن کی کتاب تاریخِ مبارک شاہی فیروز شاہ تغلق کے بعد کے دور (1388–1434ء) کی واحد اہم معاصر تاریخ ہے۔ انہوں نے ابتدائی حصے میں منہاج اور برنی پر انحصار کیا، جبکہ بعد کے واقعات کے لیے عینی شاہدین اور ذاتی مشاہدے کو بنیاد بنایا۔ ان کی توجہ زیادہ تر سیاسی اور فوجی تاریخ پر ہے، اور وہ واقعات کو ترتیب وار بیان کرتے ہیں۔ بعد کے مؤرخین، جیسے فرشتہ اور بدایونی، نے بھی ان کی تحریروں سے استفادہ کیا۔ اس طرح یہ تمام مصنفین مل کر سلطنتِ دہلی کے دور کی ایک زیادہ مکمل اور متوازن تصویر پیش کرتے ہیں، جہاں ہر ایک کی تحریر اپنی حدود کے باوجود دوسرے کی کمی کو کسی حد تک پورا کرتی ہے۔

7.4 صوفی ملفوظات اور ادبی سرمایہ: ایک تمہیدی جائزہ

سلطنتِ دہلی کے دور کے مطالعے میں جہاں فارسی تاریخی تواریخ—جیسے طبقاتِ ناصری اور تاریخِ فیروز شاہی—سیاسی اور انتظامی ڈھانچے کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں، وہیں صوفی ادب ہمیں اس عہد کی سماجی، ثقافتی اور مذہبی زندگی کی ایک زیادہ گہری اور اندرونی تصویر فراہم کرتا ہے۔ صوفی ادب کو مجموعی طور پر چند اہم اصناف میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، جن میں ملفوظات، مکتوبات اور تذکرے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ملفوظات دراصل صوفی بزرگوں کے اقوال، مجالس اور روزمرہ تعلیمات کا مجموعہ ہوتے ہیں، جنہیں ان کے مریدوں نے قلمبند کیا۔ مکتوبات میں صوفیاء کے وہ خطوط شامل ہوتے ہیں جو انہوں نے اپنے مریدوں یا معاصرین کو لکھے، جن سے ان کے فکری اور روحانی نظریات کا اندازہ ہوتا ہے۔ تذکرے صوفیاء کی سوانح حیات پر مشتمل ہوتے ہیں، جن میں ان کی زندگی، تعلیمات اور کرامات کا بیان کیا جاتا ہے۔ یہ تینوں اصناف مل کر اس دور کے روحانی، سماجی اور فکری ماحول کو سمجھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

تاہم صوفی ادب کے استعمال میں ایک تنقیدی نقطۂ نظر اختیار کرنا نہایت ضروری ہے۔ چونکہ یہ متون زیادہ تر صوفیاء کے مریدوں نے مرتب کیے ہوتے ہیں، اس لیے ان میں عقیدت، مبالغہ اور بعض اوقات کرامات کے ایسے بیانات شامل ہوتے ہیں جنہیں براہِ راست تاریخی حقیقت نہیں مانا جاسکتا۔ اسی طرح ملفوظات میں بیان کردہ واقعات اکثر کسی خاص اخلاقی یا روحانی سبق دینے کے لیے منتخب کیے جاتے ہیں، نہ کہ مکمل تاریخی حقیقت پیش کرنے کے لیے۔ اس کے باوجود، اگر ان متون کو تنقیدی انداز میں پڑھا جائے اور دیگر تاریخی ذرائع کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے، تو یہ ہمیں اس دور کے معاشرتی تعلقات، مذہبی رجحانات، عوامی ذہنیت اور صوفیاء کے اثرات کے بارے میں نہایت قیمتی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ اس طرح صوفی ادب کو تاریخ نویسی میں ایک معاون اور تکمیلی ماخذ کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔

7.4.1 اہم صوفی تصانیف

ہندوستان میں صوفی ادب کی اولین اور نہایت اہم تصنیف کشف المحجوب ہے، جسے علی ہجویری نے 11ویں صدی کے اواخر میں تحریر کیا۔ یہ کتاب تصوف کے بنیادی اصولوں، اصطلاحات اور عملی پہلوؤں کو منظم اور واضح انداز میں پیش کرتی ہے، اسی لیے اسے برصغیر میں تصوف کی پہلی مستند اور جامع کتاب سمجھا جاتا ہے۔ اس تصنیف کی تالیف جزوی طور پر مصنف کے ایک ہم شہری کے سوالات کے جواب میں ہوئی، جنہوں نے تصوف کی حقیقت اور اس کے مختلف مقامات کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ ہجویری کا بنیادی مقصد تصوف کی ایک مستند

تعبیر پیش کرنا تھا، کیونکہ ان کے نزدیک ان کے دور میں، خصوصاً پنجاب میں، تصوف کی اصل روح کمزور پڑتی جارہی تھی اور لوگ ظاہری رسوم ورواج میں الجھ کر اس کے حقیقی مقاصد سے دور ہورہے تھے۔

کشف المحجوب تقریباً پچیس ابواب پر مشتمل ہے، جن میں تصوف کے اصول، طریقے اور مختلف روحانی مراحل کو سادہ اور مؤثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہجویری نے قدیم اور معاصر صوفیوں کے حالاتِ زندگی اور اقوال بھی نقل کیے ہیں، جن کے ذریعے وہ تصوف کی عملی صورت کو واضح کرتے ہیں۔ خاص طور پر انہوں نے مختلف صوفی مکاتبِ فکر کا ذکر کیا اور ان کے درمیان پائے جانے والے اختلافات کی وضاحت کی۔ ہجویری کے نزدیک تصوف کا بنیادی اصول یہ ہے کہ محض ظاہری عبادات کافی نہیں، بلکہ انسان کو نفس اور دنیاوی خواہشات سے بلند ہونا ضروری ہے۔ اسی تناظر میں انہوں نے "سُکر" (وجد) اور "صَحو" (اعتدال) کی بحث میں اعتدال کو ترجیح دی اور بےاعتدالی کے رجحانات کو رد کیا۔

ان کی فکر کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ وہ شریعت کو طریقت پر مقدم رکھتے ہیں۔ ان کے مطابق شریعت اور طریقت ایک دوسرے کے لازم وملزوم ہیں؛ شریعت کے بغیر تصوف محض ایک کھوکھلا دعویٰ رہ جاتا ہے۔ اسی بنیاد پر انہوں نے ان گروہوں کی سخت تنقید کی جو شریعت سے انحراف کرتے تھے۔ اگرچہ تصوف کو شریعت کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش ان سے پہلے بھی موجود تھی، لیکن کشف المحجوب پہلی ایسی تصنیف ہے جس میں اس تصور کو باقاعدہ اور منظم انداز میں پیش کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب نے بعد کے صوفی مفکرین اور سلاسل پر گہرا اثر ڈالا۔ شیخ نظام الدین اولیاء کا یہ قول "جو شخص راہِ تصوف میں کسی کامل رہنما کو نہ پائے، اسے کشف المحجوب کا مطالعہ کرنا چاہیے" اس کتاب کی اہمیت پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس طرح کشف المحجوب نہ صرف ایک روحانی نص ہے بلکہ یہ ہمیں ابتدائی عہد وسطیٰ کے دور میں تصوف کے فکری اور سماجی پس منظر کو سمجھنے میں بھی اہم رہنمائی فراہم کرتی ہے۔

7.4.2 فوائدالفؤاد

فوائدالفؤاد برصغیر کے صوفی ادب کی ایک نہایت اہم تصنیف ہے، جس میں خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات (اقوال ومجالس) کو یکجا کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو ان کے مرید امیر حسن سجزی نے چودھویں صدی کے اوائل میں مرتب کیا۔ یہ تصنیف نہ صرف سلسلۂ چشتیہ کی تعلیمات کو سمجھنے کے لیے بنیادی ماخذ ہے بلکہ اسے ہندوستان کی پہلی باقاعدہ ملفوظات کی کتاب بھی سمجھا جاتا ہے۔ اس کتاب میں نظام الدین اولیاء کی مختلف محفلوں میں کہی گئی باتوں کو ترتیب دے کر پیش کیا گیا ہے۔ ان ملفوظات میں خاص طور پر محبتِ الٰہی، انسان دوستی، رواداری، عاجزی اور خدمتِ خلق جیسے بنیادی صوفی اصولوں پر زور دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں اس دور کے سماجی مسائل، مذہبی رویّوں اور اخلاقی اقدار کا بھی ذکر ملتا ہے، جس سے ہمیں دہلی سلطنت کے معاشرتی اور ثقافتی حالات کی ایک زندہ جھلک حاصل ہوتی ہے۔

فوائدالفؤاد کی زبان نہایت سادہ، دلنشین اور اثر انگیز ہے، جو اسے عام قارئین کے لیے بھی قابلِ فہم بناتی ہے۔ اس میں مختلف واقعات، حکایات اور مثالوں کے ذریعے روحانی تعلیمات کو واضح کیا گیا ہے۔ یہ کتاب صرف مذہبی تعلیمات تک محدود نہیں بلکہ اس میں صوفی

بزرگ اور عوام کے باہمی تعلقات، روزمرہ زندگی اور روحانی ماحول کی بھی عکاسی ملتی ہے۔ تاریخی اعتبار سے بھی یہ تصنیف بہت اہم ہے، کیونکہ یہ درباری تاریخوں کے برعکس عام لوگوں کی زندگی اور ان کے مسائل کو بھی نمایاں کرتی ہے۔ اگرچہ یہ ایک مرید کی اپنے مرشد کے لیے عقیدت کا اظہار بھی ہے، اس لیے بعض مقامات پر مبالغہ اور جذباتیت پائی جاتی ہے، لیکن تنقیدی نظر سے مطالعہ کرنے پر یہ دہلی سلطنت کے سماجی اور مذہبی پس منظر کو سمجھنے کے لیے نہایت مفید ثابت ہوتی ہے۔

7.4.3 سیر الاولیاء

سیر الاولیاء برصغیر کے صوفی ادب کی ایک اہم تذکرہ نگاری پر مبنی تصنیف ہے، جسے سید محمد بن مبارک کرمانی "امیر خورد" نے مرتب کیا۔ یہ کتاب بنیادی طور پر سلسلۂ چشتیہ کے بزرگوں کی سوانح حیات اور ان کی روحانی تعلیمات پر مشتمل ہے اور اسے دہلی سلطنت کے دور میں صوفی روایت کو سمجھنے کے لیے ایک معتبر ماخذ مانا جاتا ہے۔ تاریخی شواہد سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب محمد بن تغلق کے عہد میں چشتی صوفیوں کو دہلی سے باہر منتقل کیا گیا تو اس تصنیف کے مؤلف بھی ان میں شامل تھے، جس سے ان کے ذاتی تجربات اور حالاتِ زمانہ کی جھلک بھی اس کتاب میں نظر آتی ہے۔ مشہور مورخ محمد حبیب کے مطابق مؤلف کے نام کے ساتھ "امیر" کا اضافہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انہوں نے اپنے خاندانی رجحانات کے برخلاف کسی حد تک درباری خدمات اختیار کیں۔

اس تصنیف میں مختلف صوفی بزرگوں خصوصاً خواجہ معین الدین چشتی، قطب الدین بختیار کاکی، بابا فرید الدین گنج شکر اور نظام الدین اولیاء کی زندگی، روحانی خدمات اور تعلیمات کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے ذریعے چشتی سلسلے کی ارتقائی تاریخ اور اس کے اصولوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ کتاب تقریباً دس ابواب پر مشتمل ہے، جن میں صوفیوں کی سوانح کے ساتھ ساتھ ان کے اقوال، مجالس اور عملی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس میں صوفیوں کے اخلاق، ان کے عوام کے ساتھ تعلقات اور ان کے سماجی کردار کی جھلک بھی ملتی ہے، جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ صوفیاء نے کس طرح معاشرے میں ہم آہنگی اور روحانیت کو فروغ دیا۔ اسی طرح بعد کے صوفی تذکروں—جیسے لطائف اشرفی، سیر العارفین اور اخبار الاخیار میں اس کتاب سے بھرپور استفادہ کیا گیا، جو اس کی اہمیت اور اثرات کو ظاہر کرتا ہے۔

تاہم، چونکہ یہ کتاب ایک صوفی مصنف کی طرف سے عقیدت کے جذبے کے تحت لکھی گئی ہے، اس لیے اس میں بعض مقامات پر مبالغہ اور کرامات کا بیان بھی ملتا ہے، جسے براہِ راست تاریخی حقیقت نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس کے باوجود، اگر اسے تنقیدی انداز میں پڑھا جائے، تو یہ دہلی سلطنت کے صوفیانہ ماحول، مذہبی رجحانات اور سماجی حالات کو سمجھنے کے لیے نہایت اہم ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔ اس طرح سیر الاولیاء نہ صرف صوفیاء کی زندگیوں کا بیان ہے بلکہ اس دور کے روحانی اور سماجی ڈھانچے کی ایک جامع تصویر بھی پیش کرتی ہے۔

7.4.4 اخبار الاخیار

صوفی ادب کی ایک اہم صنف تذکرے ہیں، جن میں صوفی بزرگوں کی سوانح حیات، روحانی خدمات اور تعلیمات کو قلمبند کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں اخبار الاخیار کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، جسے شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے تصنیف کیا۔ یہ کتاب برصغیر کے صوفیاء کی

سوانح کا ایک وقیع مجموعہ ہے، جس میں دو سو سے زائد صوفی بزرگوں کے حالاتِ زندگی بیان کیے گئے ہیں۔ شیخ عبدالحق ایک جید محدث اور دینی گھرانے سے تعلق رکھنے والے عالم تھے، اس لیے انہیں معاصر صوفیاء کے ملفوظات اور روایات پر مکمل دسترس حاصل تھی۔ بحیثیت محدث انہوں نے مذہبی روایات اور بیانات کو تنقیدی نظر سے پرکھا، جس کے باعث ان کی تصنیف میں ایک خاص درجہ کی علمی سنجیدگی اور استناد پیدا ہو گیا۔ یہ کتاب بنیادی طور پر تذکرۃ الاولیاء سے متاثر ہے، جسے شیخ فریدالدین عطار نے تحریر کیا تھا، تاہم عبدالحق دہلوی نے اسے برصغیر کے تناظر میں ایک منظم اور نئے انداز میں پیش کیا۔ انہوں نے اس کتاب کو طبقاتی (Tabaqat) اسلوب میں تین حصوں میں تقسیم کیا:

- خواجہ معین الدین چشتی اور ان کے خلفاء،
- شیخ فریدالدین گنج شکر اور ان کے مریدین،
- شیخ نصیرالدین محمود چراغ دہلوی اور ان کے متوسلین۔

اس منظم درجہ بندی نے نہ صرف صوفیاء کی سوانح کو واضح ترتیب میں پیش کیا بلکہ زمانی ابہام (chronological confusion) سے بھی بڑی حد تک بچا لیا۔ ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے دیگر تذکروں کے برعکس کرامات اور ماورائی واقعات کے مبالغہ آمیز بیانات سے حتی الامکان گریز کیا، جس سے اس تصنیف کی تاریخی اہمیت اور معروضیت میں اضافہ ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب آج بھی ابتدائی ہندوستانی صوفیاء کی زندگیوں کے بارے میں معلومات کا ایک بنیادی اور مستند ذریعہ سمجھی جاتی ہے، خصوصاً ان صوفیاء کے لیے جن کے حالات دیگر ذرائع میں محفوظ نہیں۔ اس کے علاوہ اس میں اودھ کے علاقے کے صوفیاء کا بھی تفصیلی ذکر ملتا ہے، جو اسے علاقائی تاریخ کے لیے بھی اہم بناتا ہے۔ بعد ازاں اس اہم تصنیف کا اردو ترجمہ مولانا سبحان محمود اور مولانا محمد فاضل نے 2004ء میں کیا، جس سے اس کے مطالعے کو مزید سہولت حاصل ہوئی۔ اس طرح اخبار الاخیار نہ صرف صوفی تذکرہ نگاری کی ایک اعلیٰ مثال ہے بلکہ یہ دہلی سلطنت اور اس کے بعد کے ادوار کے مذہبی و سماجی حالات کو سمجھنے کے لیے ایک نہایت اہم اور قابلِ اعتماد ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

7.4.5 مکتوبات

صوفی ادب کی ایک اہم صنف مکتوبات ہے، جو صوفیاء کے خطوط پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان خطوط میں صوفی بزرگ اپنے مریدوں، خلفاء اور معاصرین کو روحانی رہنمائی، اخلاقی نصیحتیں اور عملی ہدایات فراہم کرتے تھے۔ اس اعتبار سے مکتوبات نہ صرف صوفی تعلیمات کو سمجھنے کا ذریعہ ہیں بلکہ یہ اس دور کے فکری، مذہبی اور سماجی حالات کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔ برصغیر میں مکتوبات کی روایت کو خاص طور پر شیخ احمد سرہندی کے مجموعۂ خطوط مکتوباتِ امام ربانی کے ذریعے غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی، جس میں انہوں نے اپنے زمانے کے مذہبی، سیاسی اور سماجی مسائل پر تفصیلی اظہارِ خیال کیا ہے۔ اسی طرح دیگر صوفیاء کے مکتوبات میں بھی ہمیں ان کے نظریات، تصوف کی عملی صورت اور شریعت و طریقت کے باہمی تعلق پر گہری بصیرت حاصل ہوتی ہے۔

اسی سلسلے میں مکتوباتِ قدوسی ایک نہایت اہم مجموعہ ہے، جس میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے 193 خطوط شامل ہیں۔ اس مجموعے

کوان کے مرید شیخ بدھن جونپوری نے مرتب کیا۔ یہ خطوط صوفی تعلیمات، عملی تصوف، شریعت کی پابندی اور خاص طور پر وحدت الوجود کے تصور سے ان کی وابستگی کو واضح کرتے ہیں، نیز ان میں معاصر سیاسی حالات کی جھلک بھی ملتی ہے۔ اگرچہ مؤرخ سید اطہر عباس رضوی نے ان خطوط کی تعداد 189 بتائی ہے، تاہم مولانا کیپٹن وحید بخش کے مرتب کردہ اردو ترجمے میں 193 خطوط شامل ہیں، جو 2010ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ اس طرح یہ مجموعہ نہ صرف صوفی فکر بلکہ اس دور کے سیاسی و سماجی حالات کو سمجھنے کے لیے بھی ایک اہم ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔

7.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

خلاصۂ بحث کے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ دہلی سلطنت کی تاریخ کو سمجھنے کے لیے ہند-فارسی تواریخ اور صوفی ادب دونوں نہایت اہم اور تکمیلی ماخذ ہیں۔ ہند-فارسی تواریخ، جیسا کہ منہاج السراج، ضیاءالدین برنی اور امیر خسرو کی تصانیف سے ظاہر ہوتا ہے، ہمیں اس دور کے سیاسی ڈھانچے، انتظامی نظام اور حکمرانوں کی پالیسیوں کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کرتی ہیں۔ تاہم، چونکہ یہ زیادہ تر درباری سرپرستی میں لکھی گئیں، اس لیے ان میں اشرافیہ کا نقطۂ نظر غالب ہے اور عوامی زندگی کے پہلو نسبتاً کم نمایاں ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس، صوفی ادب جس میں ملفوظات، مکتوبات اور تذکرے شامل ہیں اس دور کے سماجی، مذہبی اور روحانی ماحول کی ایک گہری اور زیادہ جامع تصویر پیش کرتا ہے۔ فوائد الفؤاد، سیر الاولیاء، اخبار الاخیار اور مکتوبات جیسے مصادر ہمیں نہ صرف صوفی تعلیمات بلکہ عوامی زندگی، اخلاقی اقدار اور صوفیہ و حکمرانوں کے تعلقات کو بھی سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ اگرچہ ان متون میں عقیدت اور بعض اوقات مبالغہ کا عنصر پایا جاتا ہے، لیکن تنقیدی مطالعے کے ذریعے یہ نہایت قیمتی تاریخی مواد فراہم کرتے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ ان دونوں قسم کے مصادر کو الگ الگ نہیں بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر پڑھنا ضروری ہے۔ جہاں ہند-فارسی تواریخ اقتدار اور سیاست کی نمائندگی کرتی ہیں، وہیں صوفی ادب معاشرت اور روحانیت کی عکاسی کرتا ہے۔ اس طرح دونوں کو یکجا کر کے ہی دہلی سلطنت کی ایک متوازن، جامع اور حقیقت کے قریب تصویر سامنے آسکتی ہے۔ لہٰذا ایک سنجیدہ مورخ کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان مصادر کا تنقیدی جائزہ لے، ان کے تعصبات کو سمجھے اور مختلف ذرائع کو باہم ملا کر ایک مربوط تاریخی تعبیر پیش کرے۔

7.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

ملفوظات: صوفی بزرگوں کے اقوال، مجالس اور تعلیمات کا مجموعہ جو مریدوں نے قلمبند کیا ہو۔

نصیحتی تاریخ: ایسی تاریخ جس کا مقصد صرف واقعات بیان کرنا نہیں بلکہ سبق دینا بھی ہو۔

کرامات: صوفی بزرگوں سے منسوب غیر معمولی یا ماورائی واقعات۔

اشرافیہ: معاشرے کا اعلیٰ اور بااثر طبقہ، جیسے سلاطین، امرا اور درباری افراد

درباری نقطۂ نظر: تاریخ کو اس زاویے سے بیان کرنا جو حکمرانوں اور دربار کے مفادات کی عکاسی کرے۔

7.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

7.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. صوفی ملفوظات سے کیا مراد ہے؟

صوفیوں کے خطوط صوفیوں کے اقوال اور مجالس کا مجموعہ تاریخی جنگوں کا بیان شاہی فرامین

2. امیر خسرو کو کس لقب سے جانا جاتا ہے؟

امام الہند طوطیٔ ہند سلطان الشعراء حکیم الہند

3. ضیاءالدین برنی کے مطابق تاریخ کا مقصد کیا تھا؟

صرف تفریح تجارت کو فروغ نصیحت اور رہنمائی سائنسی تحقیق

4. طبقاتِ ناصری کے مصنف کون ہیں؟

ضیاءالدین برنی امیر خسرو منہاج السراج جوزجانی شمسِ سراج عفیف

5. ابن بطوطہ کی تصنیف الرحلہ کس زبان میں تحریر کی گئی تھی۔

عربی فارسی ہندوستانی مصری

7.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. صوفی ملفوظات سے ہمیں کس قسم کی معلومات حاصل ہوتی ہیں؟ روشنی ڈالیں۔
2. ضیاءالدین برنی کے نزدیک تاریخ کا مقصد کیا تھا؟ وضاحت کریں۔
3. ہند-فارسی تواریخ کی بنیادی خصوصیات کیا ہیں؟ ایک نوٹ لکھیں۔

7.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. امیر خسرو کی تصانیف کی روشنی میں دہلی سلطنت کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی حالات کا جائزہ لیں۔
2. ضیاءالدین برنی کی تصانیف تاریخِ فیروز شاہی اور فتاویٰ جہانداری کی روشنی میں ان کے سیاسی اور سماجی نظریات کی وضاحت کریں۔

اکائی 8۔ مملوک خاندان

(The Mamluks)

اکائی کے اجزا

8.0 تمہید

8.1 مقاصد

8.2 دلّی سلطنت کا قیام/ مملوک خاندان

8.3 قطب الدین ایبک

8.4 آرام شاہ

8.5 سلطان شمس الدین التتمش

8.6 رکن الدین فیروز شاہ

8.7 رضیہ سلطان

8.8 معزالدین بہرام شاہ

8.9 علاءالدین مسعود شاہ

8.10 ناصرالدین محمود

8.11 غیاث الدین بلبن

8.12 کیقباد

8.13 اکتسابی نتائج

8.14 کلیدی الفاظ

8.15 نمونہ امتحانی سوالات

8.15.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

8.15.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

8.15.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

8.0 تمہید (Introduction)

آٹھویں صدی سے گیارہویں صدی عیسوی کے دوران شمالی اور جنوبی ہندوستان میں کئی اہم اور طاقتور ریاستیں قائم ہوئیں جن میں پال، پرتی ہار اور راشٹر کوٹ کافی اہمیت کی حامل ہیں۔ یہ تمام ریاستیں اپنی سرحدوں کی توسیع کی خاطر ایک دوسرے سے برسرِپیکار رہا کرتی تھیں۔ مرکزی نظام کے فقدان کے باعث ان میں آپسی اتحاد نہیں تھا جو انہیں کسی بیرونی حملہ سے محفوظ رکھنے میں معاون ثابت ہوتا۔ شمالی اور جنوبی ہندوستان کی تمام چھوٹی اور بڑی ریاستوں کے آپسی اختلافات سے فائدہ اٹھا کر ترکوں نے ان پر کئی کامیاب حملے کیے اور بالآخر گیارہویں صدی کی آخری دہائی آتے آتے ان باہری ترک حملہ آوروں نے یہاں کے راجاؤں اور مہاراجاؤں کو اس حد تک کمزور کر دیا کہ وہ یہاں پر اپنا اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ بارہویں صدی کے اختتام تک انہوں نے ہندوستان میں ایک ایسی مضبوط ریاست کی بنیاد ڈالی جس نے آنے والی کئی صدیوں تک ہندوستان کی تاریخ پر نہایت مضبوط مستحکم اور دیرپا نقوش مرتب کیے۔

1192ء میں ترائن کی دوسری جنگ میں فتح کے بعد محمد غور کے دو انتہائی معتبر اور قابل سپہ سالاروں قطب الدین ایبک اور بختیار خلجی نے شمالی ہندوستان کے کئی اہم علاقے فتح کر لیے۔ 1197ء میں بہار، 1199ء میں بنگال 1202ء میں بندیل کھنڈ بھی فتح ہو گیا۔ 1206ء میں محمد غوری کی وفات کے بعد اس کا آزاد کردہ غلام قطب الدین ایبک اس کے نمائندہ (وائسرائے) کی حیثیت سے دہلی کے تخت پر متمکن ہوا۔ اس کی سلطنت شمال میں دلی سے لے کر جنوب میں کالنجر تک اور مشرق میں لکھنوتی (بنگال) سے لے کر مغرب میں لاہور تک کافی وسیع و عریض علاقوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ قطب الدین ایبک ایک آزاد کردہ غلام تھا لیکن لیاقت، شجاعت اور بہادری میں بے مثال تھا۔ اس کی قیادت میں ہی خاندان غلاماں یا مملوک سلاطین کو دہلی کے تخت پر بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا۔ اس اکائی میں ہندوستان میں ترک سلطنت کے قیام میں مملوک سلاطین جنہیں کچھ دانشور غلام خاندان کے نام سے موسوم کرتے ہیں کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ ان کی سلطنت کے استحکام، انتظام و انصرام کے ساتھ اس عہد کی تہذیبی اور ثقافتی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مملوک سلاطین کی فتوحات، فوجی مہمات اور عسکری کارناموں کے ساتھ ان کی وضع کی گئی پالیسیوں کی وضاحت کی گئی ہے۔

8.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- دہلی سلطنت کے قیام سے پہلے شمالی ہند کے حالات سے واقف ہو سکیں گے۔
- مملوک سلاطین اور ان کے کارناموں کو بیان کر سکیں گے۔
- قطب الدین ایبک کے کارناموں کو بیان کر سکیں گے۔
- مملوک سلطنت کے قیام میں التتمش کے کردار کا جائزہ لے سکیں گے۔
- رضیہ سلطان کے حالاتِ زندگی اور کارناموں سے واقف ہو سکیں گے۔

- سلطان غیاث الدین بلبن کے کارناموں کو جان سکیں گے۔
- مملوک سلاطین کی تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں پر گفتگو کر سکیں گے۔
- مملوک سلطنت کے زوال کی وجوہات کو بیان کر سکیں گے۔

8.2 دلّی سلطنت کا قیام / مملوک خاندان

بارہویں صدی عیسوی ہندوستان کی تاریخ میں انتہائی اہمیت کی حامل رہی ہے۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستان کی اکثر ریاستیں آپس میں ایک دوسرے سے برسرِپیکار تھیں جس کا فائدہ اٹھا کر ترک فاتحین نے شمالی ہندوستان میں ایک ایسی مضبوط اور وسیع حکومت قائم کی جو تاریخ میں دلی سلطنت کے نام سے موسوم کی گئی۔ دلی سلطنت کے ابتدائی حکمراں آزاد کردہ غلام طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس طبقے نے 1206 سے 1290ء تک دلّی کی سلطنت پر اپنی گرفت مضبوط رکھی اور کامیابی کے ساتھ حکومت کی۔ تاریخی کتابوں اور دستاویزوں میں اس دور حکومت کو ان کے خاندانی اور سماجی پس منظر کی بنیاد پر معزّی، قطبی، شمسی اور بلبنی وغیرہ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں انہیں مملوک ترک، البری ترک وغیرہ بھی کہا جاتا ہے۔ ان سلاطین کو مذکورہ ناموں سے پکارنا درست ہے یا نہیں اس پر مورخین کی رائیں جداگانہ ہیں۔ کچھ مورخین کا کہنا ہے کہ انہیں البری کہنا ٹھیک نہیں ہے کیونکہ صرف التتمش کے بارے میں یہ کہنا درست ہے کہ وہ البری قبیلے سے تعلق رکھتا تھا، جب کہ قطب الدین ایبک اور غیاث الدین بلبن کا تعلق البری قبیلے سے نہیں تھا۔ اس لیے جدید مورخین دلّی سلطنت کے ان ابتدائی حکمرانوں کو ابتدائی ترک یا مملوک سلاطین کے نام سے پکارتے ہیں۔ اکثر دانشوروں کا خیال ہے کہ انہیں ''مملوک'' کہنا زیادہ قرینِ قیاس ہے اور یہی بہتر بھی معلوم ہوتا ہے۔

معزالدین محمد غوری کے آزاد کردہ تربیت یافتہ غلاموں میں سب سے لائق، وفادار اور قابل اعتماد سالار قطب الدین ایبک تھا۔ اسے ہی دلّی سلطنت کا اولین بانی اور مملوک سلاطین کا بنیاد گزار تصور کیا جاتا ہے۔ ان مملوک حکمرانوں نے تقریباً ایک صدی تک شمالی ہندوستان پر اپنا اقتدار قائم رکھا اور یہاں کی سیاسی، سماجی، معاشی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی پر اپنی حکمرانی کے دیرپا اثرات مرتب کیے جس کے اثرات آنے والی دو صدیوں تک نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ مملوک سلاطین میں یوں تو کئی حکمراں پیدا ہوئے لیکن سلطنت کے استحکام، وسعت اور اپنی بہترین قائدانہ صلاحیتوں کی وجہ سے قطب الدین ایبک، التتمش، رضیہ سلطان اور غیاث الدین بلبن کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ مملوک سلطنت کا پہلا قابل ذکر حکمران جو دلی کے تخت پر بیٹھا وہ قطب الدین ایبک تھا۔

8.3 قطب الدین ایبک (1206-1210)

قطب الدین ایبک ترکستان کا باشندہ تھا اور ترکوں کے ایک اہم قبیلے ایبک سے تعلق رکھتا تھا۔ بچپن میں اسے نیشاپور کے بازار میں غلام کی حیثیت سے فروخت کیا گیا۔ قاضی فخرالدین عبدالعزیز کوفی نے اسے خریدا اور اس کے ساتھ انتہائی نرمی اور شفقت کا برتاؤ کیا۔ اس کے لیے اپنے بچوں کی طرح ہی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جس میں تیراندازی اور شہسواری بھی شامل تھی۔ اس کی ہنرمندی کو دیکھ کر اسے عمدہ

تعلیم و تربیت دلائی۔ مختلف علوم و فنون کے علاوہ تیر اندازی اور گھوڑ سواری کے گر بھی سکھائے۔اس نے قرآن کی تلاوت سیکھی اور ''قرآن خواں''، مشہور ہوا۔ کچھ دنوں بعد قاضی یا اس کے لڑکوں نے اسے کچھ تاجروں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ تاجر اسے غزنی کے غلام بازار لے گئے۔ اس کی صلاحیتوں کو پہچان کر معزالدین محمد غوری نے اسے خرید لیا۔اسے جلد ہی قطب الدین ایبک کی قابلیت اور فنی صلاحیتوں کا اندازہ ہوا۔ محمد غوری نے اسے ''امیر آخور'' کے عہدے پر فائز کیا بعد میں وہ امیر خرد (شاہی اصطبلوں کا افسر) بنایا گیا جو اس دور میں ایک اہم عہدہ ہوا کرتا تھا۔ اس نے کئی اہم معرکوں میں سلطان کا بھرپور ساتھ دیا۔

1192 میں ترائن کی جنگ میں ایبک نے انتہائی اہم اور ممتاز کردار ادا کیا اور ہندوستان میں ترک سلطنت کے قیام، توسیع اور استحکام میں بہت اہم اور نمایاں رول ادا کیا۔اس کے بعد اسے کہرام اور سامانہ کا انتظام و انصرام سونپا گیا۔ یہیں سے ہندوستان میں اس کی اصل سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔ محمد حبیب اور خلیق احمد نظامی نے ہندوستان میں اس کی زندگی کو اجمالی طور پر تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔اول 1192ء سے 1206ء تک وہ معزالدین کی جانب سے شمالی ہندوستان کے بعض علاقوں کا انچارج آفیسر رہا۔ 1206ء سے 1208ء تک وہ غیر رسمی طور پر مکمل اختیار کے ساتھ معزالدین کی ان ہندوستانی املاک کا محافظ سپہ سالار تھا جو دہلی اور لاہور کے درمیان تھیں۔ سوم 1208ء سے 1210ء تک وہ ایک آزاد ہندوستانی ریاست کا ایک خود مختار حکمراں رہا۔

قطب الدین ایبک ایک بہترین فوجی قائد اور عمدہ عسکری لیڈر تھا۔ شمالی ہند کی فتوحات میں غوری کے عزمِ مصمم اور ایبک کی وفادارانہ جاں نثاری کا اہم کردار رہا ہے۔ معزالدین احکام مرتب کرتا اور ایبک اسے زمین پر نافذ کرتا تھا۔اس نے غوری کے نمائندے کی شکل میں شمالی ہندوستان کے مفتوحہ علاقوں کا انتظام سنبھالا۔ راجپوت ریاستوں سے کامیاب لڑائیاں لڑیں۔ گڑھوالیوں کو ہرایا، گجرات، بیانہ، گوالیار کی جنگوں میں اہم کردار ادا کیا اور 1205 میں کھوکھروں کے خلاف محمد غوری کے ہمراہ رہا۔ کہا جاتا ہے کہ کھوکھروں کو کچلنے کے بعد محمد غوری نے قطب الدین ایبک کو ہندوستانی ریاستوں میں اپنا ''ولی عہد'' مقرر کیا۔ لیکن یہ بات قرینِ قیاس نہیں ہے۔ پروفیسر محمد حبیب اور پروفیسر خلیق احمد نظامی کے مطابق غوری نے کسی کو بھی اپنا نمائندہ یا جانشین مقرر نہیں کیا تھا۔

1206ء میں معزالدین محمد غوری کی وفات کے بعد قطب الدین ایبک 25 جون 1206ء میں لاہور میں اس کا جانشین بنا۔اس نے لاہور میں چار سال تک قیام کیا۔ ابتدا میں اس نے اپنا راجدھانی لاہور کو بنائے رکھا تاکہ سرحدی علاقوں کے انتظام و انصرام پر مکمل نظر رکھے اور کسی کو ہندوستان پر حملہ کی جرأت نہ ہو سکے۔ اس دوران اس نے اپنے مقبوضات میں بہترین نظم و نسق قائم کیا۔اپنی سلطنت میں امن و امان بحال کیا ڈاکہ زنی اور لوٹ مار کا خاتمہ کیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد اس نے اپنی حکومت کا راجدھانی دہلی کو بنایا۔ قطب الدین ایبک جس وقت سلطان بنا ہندوستان کے کئی اہم علاقے اس کی ماتحتی میں شامل تھے۔ سب سے پہلے اس نے ان علاقوں کی حفاظت کا بندوبست کیا ان کو محفوظ اور منظم کیا۔ تاج الدین یلدوز اور ناصر الدین قباچہ دونوں ایبک کے راستہ میں مشکلات پیدا کر رہے تھے۔اس لیے اس نے تاج الدین یلدوز اور ناصر الدین قباچہ سے جنگ کی۔ یلدوز کو ہرا کر 1208ء میں غزنی پر قبضہ کر لیا۔ ناصر الدین قباچہ کے ساتھ اس نے دوستانہ رویہ اپنایا اور اس

نے قباچہ کے ساتھ اپنی بیٹی کا نکاح کر دیا۔ چنانچہ قباچہ نے ایبک کی ماتحتی قبول کرلی۔ اس طرح قطب الدین ایبک نے اپنی پوزیشن مزید بہتر، مضبوط اور مستحکم کرلی۔ قطب الدین ایبک نے 1194ء میں گجرات کا راجدھانی پٹن فتح کرلیا۔ 1195ء میں چندراوتی، آبو اور ناگور کے راجاؤں کی مشترکہ افواج نے مل کر اجمیر کو اس سے چھین لینا چاہا لیکن ایبک نے ان کو شکست دے کر اجمیر پر اپنی گرفت مضبوط رکھی۔ گجرات جو کچھ دنوں کے لیے اس کے اقتدار سے نکل گیا تھا اسے اس نے 1196ء میں دوبارہ فتح کرلیا اور وہاں اپنا ایک نائب مقرر کر کے دہلی واپس آگیا۔ اس کے دہلی واپس آنے کے کچھ ہی دنوں بعد گجرات کے راجا نے اپنی ریاست کو دوبارہ چھین لیا۔ ایک ترک مہم جو محمد بختیار خلجی نے ایک افسانوی انداز میں حملہ کر کے 1199ء میں بہار اور بنگال کو فتح کرلیا جسے اس نے بعد میں دلّی سلطنت میں شامل کر دیا۔

قطب الدین ایبک ایک بہترین فوجی قائد اور زیرک منتظم تو تھا ہی ساتھ ہی وہ اپنی دلی کیفیتوں اور دماغی صلاحیتوں کے لیے بھی ممتاز تھا۔ اکثر مورخین اس کی وفاداری، دلیری، بہادری عدل وانصاف کی تعریف کرتے ہیں۔ فخرِ مدبر کہتا ہے کہ اگرچہ اس کی فوج ترکوں، غوریوں، خراسانیوں، سلجوقیوں اور ہندوستانیوں جیسی مختلف اقوام پر مشتمل تھی لیکن کسی سپاہی کو یہ ہمت نہیں ہوتی تھی کہ وہ کھانے کا ایک لقمہ یا گھاس کا ایک ٹکڑا، باڑے سے کوئی بکری یا چڑیا زبردستی لے لے یا کسی دیہاتی کے گھر زبردستی قیام کرے۔ ایبک نہایت سخی اور بہادر تھا۔ اس کی سخاوت کی وجہ سے اس کو ''لکھ بخش'' (لاکھوں کی بخشش دینے والا) بھی کہتے ہیں۔ اس کی فیاضی کے قصے دکن کے دور دراز علاقوں تک پھیل گئے تھے۔ پروفیسر محمد حبیب اور خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ ''اگرچہ ہندوستان میں اس کی پوری زندگی مسلسل عسکری سرگرمیوں میں گزری تاہم عوام کے دماغ پر اس نے جو تاثر چھوڑا وہ تباہی اور بربادی کا نہیں تھا بلکہ انصاف اور وسعتِ قلبی کا تھا۔'' ابوالفضل اس کے کارناموں کا ذکر اچھے الفاظ میں کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ''اس نے عمدہ اور عظیم کارنامے انجام دیے ہیں۔ ڈاکٹر اے۔ بی۔ ایم حبیب اللہ کہتے ہیں کہ ''اس نے ایرانیوں کے لطف وکرم میں ترکوں کی بہادری کی آمیزش کر دی تھی جس نے آگے چل کر ہندوستانی مشترکہ تہذیب وثقافت کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔'' قطب الدین ایبک نے دہلی میں ایک عظیم الشان مسجد ''قبتہ الاسلام'' یا ''قوت الاسلام'' کے نام سے بنوائی۔ اسی مسجد سے متصل جنوبی علاقے میں ایک شاندار مینار کی تعمیر کا آغاز کیا جسے قطب مینار کے نام سے شہرت حاصل ہوئی۔ اس نے اجمیر میں ''ڈھائی دن کا جھونپڑا'' نامی مسجد بھی بنوئی۔ ایبک کی عمارتی سرگرمیوں کی جھلک آج بھی مہرولی اور اس کے آس پاس دیکھی جاسکتی ہے۔ اس کی ابتدائی تعمیرات میں ہند اسلامی طرزِ تعمیر کی آمیزش نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ 1210ء میں لاہور میں چوگان (پولو) کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر اس کی وفات ہوگئی۔ اس کی وفات کے بعد آرام شاہ کو مملوک سلطنت کا حکمراں بنایا گیا۔

8.4 آرام شاہ (1210ء)

قطب الدین ایبک اپنی ناگہانی وفات کے باعث اپنا کوئی جانشین مقرر نہیں کر سکا۔ چنانچہ اس کی اچانک وفات سے اس نوزائیدہ ترک ریاست کے لیے جب حالات انتہائی نازک ہوئے تو کچھ ترک امراء اور سرداروں نے 1210ء میں آرام شاہ کو لاہور میں ایبک کا جانشین بنا دیا۔ کچھ لوگ اس کو قطب الدین کا بیٹا کہتے ہیں لیکن یہ درست نہیں ہے۔ جوینی کا کہنا ہے کہ ایبک کا کوئی بیٹا نہیں تھا اور منہاج السراج نے بھی

صرف اس کی تین بیٹیوں کا ہی حوالہ دیا ہے۔ بہر حال آرام شاہ کوئی نامی گرامی شخصیت کا حامل نہیں تھا اس کے باوجود اسے سلطان اس وجہ سے بنایا گیا کیوں کہ اکثر باصلاحیت ترک حکمراں شمالی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اپنے فرائض انجام دے رہے تھے اور وہ لاہور میں موجود نہیں تھے۔ جب انہیں آرام شاہ کی تخت نشینی کی اطلاع ملی تو بہت سے ترک سرداروں نے اس کی مخالفت کی اور کئی مقامات پر بغاوتیں ہوئیں۔ قباچہ نے سندھ میں بغاوت کی اوراچ اور ملتان پر چڑھائی کر دی۔ اس نے بھکر اور سہون پر قبضہ بھی کر لیا۔ بختیار خلجی نے بنگال میں خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ آرام شاہ ایک کمزور حکمراں ثابت ہوا اور اس کی تخت نشینی کو ترک امیروں کی مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ ان ہنگامی حالات پر قابو نہ پا سکا۔ دلی میں موجود ترک امراء اور سرداروں نے بدایوں کے گورنر التتمش کو دلّی آنے کی دعوت دی۔ التتمش دلی آیا اور آرام شاہ کو تھوڑے سے مقابلے کے بعد شکست دینے میں کامیاب رہا۔ التتمش نے آرام شاہ کو گرفتار کر کے قتل کر ڈالا۔ اس طرح آرام شاہ کی آٹھ مہینے کے مختصر دورِ حکمرانی کا خاتمہ ہوا اور ایبک کے داماد التتمش نے اس کے جانشین کی حیثیت سے زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔

8.5 سلطان شمس الدین التتمش (1210ء سے 1236ء)

سلطان شمس الدین التتمش ایک البری ترک تھا۔ اس کے والد ایلم خاں البری قبیلے کے سردار تھے۔ التتمش کے ابتدائی حالات اچھے نہیں تھے۔ اس کے بھائیوں نے اسے ایک غلام کی حیثیت سے بخارا کے بازار میں بیچ دیا تھا۔ بخارا سے وہ غزنی اور پھر بغداد لایا گیا۔ بعد میں دلّی میں قطب الدین ایبک نے اسے غلام کی حیثیت سے خرید لیا۔ ایبک کی طرح التتمش نے بھی اپنی زندگی کا آغاز ایک غلام کی حیثیت سے کیا تھا۔ وہ بے پناہ صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اپنی ایمان داری، محنت، سچی لگن اور جانفشانی کے باعث ترقی کی منزلیں طے کرتا گیا۔ اسے ''سر جان دار'' مقرر کیا گیا۔ اس کی انتظامی صلاحیت سے متاثر ہو کر ایبک نے اسے ''امیر شکار'' کا عہدہ پر فائز کیا۔ 1200ء میں اسے گوالیار کا امیر بنایا گیا۔ اس نے گوالیار، برن اور بدایوں کے اقطاع دار کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ سلطان قطب الدین ایبک اس کی صلاحیتوں سے کافی متاثر تھا۔ اس نے اپنی ایک لڑکی کی شادی بھی التتمش سے کر دی تھی۔ 1210ء میں سلطان بننے کے بعد التتمش کے سامنے کئی اہم مشکلیں در پیش تھیں۔ اس کے سامنے بہت سے مسائل منہ کھولے کھڑے تھے۔ اس کے تین اہم حریف اور مخالف موجود تھے :

1. غزنی میں تاج الدین یلدوز
2. سندھ میں ناصر الدین قباچہ
3. بنگال میں علی مردان

ان کے علاوہ شکست خوردہ راجپوت حکمراں بھی دلّی سلطنت پر قابض ہونے کے لیے مسلسل جدوجہد کر رہے تھے اور سلاطین دہلی کے لیے بدستور ایک اہم مسئلہ بنے ہوئے تھے۔ دلّی سلطنت کو منگولوں کے حملے کا بھی خطرہ برابر لاحق تھا۔ معزی اور قطبی ترک امیروں کا ایک طبقہ بھی التتمش کا مخالف تھا۔ سلطنت کے اندرونی حالات بھی اطمینان بخش نہیں تھے۔ ان تمام مسائل کے باوجود التتمش نے انتہائی عزم، حوصلہ، جوانمردی اور بہادری سے ان مشکلات کا سامنا کیا اور اپنے تمام مخالفین پر قابو پانے میں کامیاب ہوا۔ اسی لیے اکثر مورخین ہندوستان میں ترک سلطنت کا حقیقی بانی التتمش کو ہی قرار دیتے ہیں۔ شمالی ہندوستان میں ترکوں کی فتوحات کو وسیع اور مستحکم کرنے کا سہرا التتمش کے سر

ہی باندھا جاتا ہے۔اس کی تخت نشینی کے وقت علی مردان خان نے بنگال اور بہار کا حکمران بننے کا اعلان کر دیا۔ ناصر الدین قباچہ نے ملتان کا خود مختار حکمران ہونے کا اعلان کیا اور لاہور اور پنجاب کے کچھ علاقوں پر قبضہ کر لیا۔

سلطان شمس الدین التتمش نے 1210ء سے 1236ء تک دلّی کے تخت پر اپنی گرفت مضبوط رکھی اور کامیابی کے ساتھ حکومت کی۔ 1217ء میں ناصر الدین قباچہ نے پنجاب پر قبضہ کرنے کا ارادہ کیا مگر ناکام رہا۔ 1218ء میں غزنی کے امیر تاج الدین یلدوز نے پنجاب پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ التتمش نے پنجاب پہونچ کر یلدوز کو شکست دی اور اسے گرفتار کر لیا۔ 1210ء سے 1220ء کے دوران وہ اپنے دو اہم مخالفین تاج الدین یلدوز اور ناصر الدین قباچہ کی طاقت کو ختم کر کے اپنی پوزیشن کو مضبوط کرنے میں کامیاب رہا۔

سلطان شمس الدین التتمش نے منگولوں کے حملوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ 1221ء سے 1227ء کے بیچ التتمش نے منگولوں کے حملہ سے سلطنت کو محفوظ رکھنے کی کامیاب کوشش کی۔ 1221ء میں چنگیز خاں، خوارزم کے شہزادے جلال الدین منگ برنی کا پیچھا کرتے ہوئے دریائے سندھ تک آیا۔ چونکہ التتمش نے مفرور شہزادے کو پناہ دینے سے انکار کر دیا اس لیے دہلی کی سلطنت منگولوں کے حملے سے محفوظ رہی اور چنگیز خان ملتان سے واپس چلا گیا۔ جب منگولوں کے حملوں کا خطرہ ٹل گیا تو 1225ء میں التتمش نے بنگال کے باغیوں کی سرکوبی کی طرف توجہ دی اور ان کو شکست دی۔

سلطان شمس الدین التتمش نے 1228ء سے 1236ء تک اپنی ریاست کو مضبوط کرنے کے ساتھ انتظامی ڈھانچہ کی اصلاح کی طرف بھی اپنا دھیان مرکوز کیا۔ اس کا حریف ناصر الدین قباچہ رفتہ رفتہ سندھ میں اپنی پوزیشن مستحکم کر رہا تھا۔ چنانچہ التتمش نے 1228ء میں سندھ پر دوبارہ چڑھائی کی اور ناصر الدین قباچہ کو میدانِ جنگ میں شکست دی۔ قباچہ نے اپنی جان بچانے کے لیے دریا میں چھلانگ لگائی اور دریا میں ڈوب کر جان دے دی۔ التتمش نے سندھ پر قبضہ کر لیا۔ پھر رنتھمبور کا قلعہ فتح کیا۔ 1231ء میں گوالیار بھی فتح کر لیا اور 1232ء میں مالوہ کا پورا علاقہ اس کے زیر نگین ہوا۔ 18 فروری 1229ء میں عباسی خلیفہ نے التتمش کو خود مختار اور قانونی سلطان تسلیم کر لیا اور اسے ناصر امیر المومنین کا خطاب عطا کیا۔ اس طرح وہ ہندوستان کا پہلا خود مختار سلطان بن گیا۔ مسلمانوں کی نظر میں اسے ایک آزاد حکمران کی حیثیت حاصل ہوئی۔ خلیفہ کے پروانۂ مسند نشینی سے اسے حکمرانی کا قانونی جواز حاصل ہو گیا۔ اگرچہ یہ محض ایک رسم تھی پھر بھی التتمش نے اس کے حصول کے بعد اپنی حکمرانی کے جواز کا ایک پر وقار جشن منایا۔ اس نے ترک امیروں کا ایک گروہ ''ترکانِ چہلگانی'' کے نام سے تشکیل دیا۔ سلطنت کے زیادہ تر اہم عہدے انہیں ''ترکان چہلگانی'' کو سونپے گئے۔ التتمش نے اس وقت رائج سکوں میں کئی اہم اصلاحات کیں ۔ پرانے سکوں کی جگہ عربی ٹنکہ چلایا۔ ٹنکہ سونے اور چاندی کا بنتا تھا۔ اپنے عہد میں جاری کیے گئے ٹنکوں پر ٹکسال کا نام کندہ کرانے کی روایت بھی التتمش نے ہی شروع کی تھی۔ اس کے علاوہ اس عہد میں پیتل کے جیتل بھی جاری کیے گئے۔ 1236ء میں التتمش کی وفات ہوئی۔

پشاور سے وندھیاچل تک اور ساحل سندھ سے برہم پتر تک سارا شمالی ہندوستان اس کی حکومت میں تھا۔ اس نے قطب الدین ایبک کے ادھورے کاموں کو پورا کیا اور دلّی سلطنت کو ایک خود مختار ریاست کی شکل دی۔ محمد حبیب و خلیق احمد نظامی کے لفظوں میں ''ایبک نے

سلطنت (دہلی) کا محض ایک خاکہ اپنے ذہن میں قائم کیا تھا۔ التتمش نے اس خاکے کو انفرادیت، بلند درجہ اور قوت ارادی عطا کی اور اس کے لیے ایک نظام حکومت اور حکمراں طبقہ تیار کیا۔'' التتمش کی وفات کے فوراً بعد امراء خاص طور پر صوبائی افسروں نے رکن الدین فیروز کو تخت پر بٹھادیا۔

8.6 رکن الدین فیروز شاہ (1236ء)

سلطان شمس الدین التتمش اپنے جانشین کے بارے میں بہت زیادہ فکر مند تھا۔ وہ اپنے تمام لڑکوں میں سے کسی کو بھی جانشینی کا اہل نہیں سمجھتا تھا۔ بالآخر انتہائی غور و خوض کے بعد اس نے اپنی بیٹی رضیہ کو اپنا جانشین بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس بابت اس نے علماء اور امراء دونوں کو راضی کر لیا اور رضیہ کو اپنا ولی عہد نامزد کیا لیکن علماء اور امراء کو اس کی ولی عہدی قبول نہیں تھی چنانچہ اس کی وفات کے دوسرے ہی دن کچھ ترک امیروں اور سرداروں نے بڑی جلد بازی میں رکن الدین فیروز شاہ کو تخت نشین کر دیا۔ منہاج السراج کے مطابق رکن الدین فیروز شاہ میں تین ممتاز خوبیاں تھیں۔ ''خوبصورت قد و قامت، نرم دلی اور بے انتہا سخاوت کا خوگر تھا'' لیکن اس دور میں صرف یہ خوبیاں ایک کامیاب حکمران کے لیے کافی نہیں ہوتی تھیں۔ رکن الدین فیروز شاہ سلطنت پر کنٹرول نہ رکھ سکا۔ اقتدار اس کی ماں ''شاہ ترکان'' کے ہاتھ میں چلا گیا۔ رکن الدین نے انتظام حکومت سے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ اس نے ملکی خزانے کو بڑی بے دردی سے لٹایا اور عیاشی میں مشغول ہو گیا۔ چونکہ شاہ ترکان ایک خود سر خاتون تھی، اس نے مطلق العنانیت کے ساتھ حکومت کرنے کی کوشش کی اور حکمراں خاندان کے لوگوں کو بے عزت کرنا شروع کیا۔ التتمش کے چھوٹے لڑکے قطب الدین کو اندھا کروا کر اسے قتل کروا دیا۔ رفتہ رفتہ عوام پر بھی ظلم و ستم ہونے لگا جس کی وجہ سے سلطنت کے مختلف حصوں میں بغاوتیں پنپنے لگیں۔ ان شورشوں سے نپٹنے کے لیے رکن الدین فیروز دہلی سے روانہ ہوا۔ ملکوں اور امیروں کی بغاوت دن بدن بڑھتی گئی۔ سلطنت میں بغاوت اور لاقانونیت کے واقعات سے رضیہ نے فائدہ اٹھایا۔ اس نے سرخ جامہ زیب تن کیا اور اپنے باپ کے نام پر دہلی کے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ اسے ''شاہ ترکان'' کے ظلم اور سازشوں سے نجات دلائیں۔ بھیڑ نے محل پر حملہ کر دیا۔ شاہ ترکان کو قید کر لیا گیا اور رضیہ کو سلطان بنانے کا اعلان کیا۔ رکن الدین فیروز شاہ باغیوں سے خوف کھا کر دہلی واپس آگیا۔ پہلے اسے قید میں ڈالا گیا اور کچھ ہی دنوں کے بعد قتل کر دیا گیا۔ اس طرح 1236ء میں سلطان التتمش کی بیٹی رضیہ دہلی کے تخت کی حکمران بن گئی۔ رضیہ ہندوستان کی پہلی مسلم خاتون تھی جو سلطان بنی۔

8.7 رضیہ سلطان (1236-1240ء)

رضیہ سلطان دہلی سلطنت کی پہلی خاتون سلطان تھی۔ منہاج السراج کے مطابق اس نے تین سال چھ مہینے اور چھ دن حکومت کی تھی۔ اگرچہ دہلی کی عوام اور کچھ ترکی امیروں کی مدد و حمایت سے رضیہ سلطان بن گئی لیکن بحیثیت سلطان اس کی پوزیشن مستحکم نہیں تھی۔ اس کے سامنے بہت سی مشکلات تھیں۔ اس کا بھائی بہرام شاہ سلطان بننا چاہتا تھا۔ وزیر ناظم الملک جنیدی کے علاوہ ملتان، ہانسی، لاہور اور بدایوں جیسے صوبوں کے صوبیدار اور سردار جن میں ملک جانی، ملک کوچی، ملک ایاز اور ملک سالاری وغیرہ اہم تھے، رضیہ کو تخت سے ہٹانے کی

سازشیں کررہے تھے۔ کئی راجپوت ریاستوں نے بھی علم بغاوت بلند کررکھا تھا۔ غرض پوری ریاست انتشار و بدنظمی کا شکار تھی۔ رضیہ سلطان نے سب سے پہلے باغیوں کو اپنی حکمت عملی اور دوراندیشی سے زیر کرنے کی کوشش کی۔ سالاری اور ایاز کو جو اس کے شدید مخالف تھے اپنا ہمنوا بنالیا۔ ملک کوچی اور اس کے بھائی کو مروادیا۔ ملک جانی کو بھی تہہ تیغ کروادیا گیا۔ وزیر ناظم الملک جنیدی سرمور کی پہاڑیوں میں بھاگ کر روپوش ہوگیا۔ دوسرے سرداروں نے بھی انتقامی کارروائی سے ڈر کر رضیہ کو سلطان تسلیم کرلیا۔

راجپوت راجاؤں کی طرف سے بھی اسے کئی اہم مسائل اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ مسلسل اس کے لیے درد سر اور چیلنج بنے ہوئے تھے اور ہمیشہ بغاوت پر آمادہ رہتے تھے۔ نہایت عزم و حوصلے، سیاسی سوجھ بوجھ اور دانشمندی سے رضیہ نے راجپوتوں کا مقابلہ کیا اور ان پر کنٹرول قائم کرنے میں بھی کامیاب ہوئی۔ رضیہ نے ملک قطب حسن غوری کو رنتھمبور کے رائے کے خلاف کاروائی کے لیے بھیجا۔ اس نے رنتھمبور پر حملہ کرکے قلعہ پر قبضہ کرلیا۔ اسی طرح گوالیار پر بھی قبضہ کرکے سلطانی عظمت و وقار میں اضافہ کیا۔ انتظامی ڈھانچے کو بھی مضبوط کیا۔ تمام ملکوں اور امیروں نے بھی اس کے اقتدار کو قبول کرلیا تھا۔ دہلی سلطنت پر اپنا پورا تسلط قائم کرنے کے بعد رضیہ نے انتظامی امور کی جانب اپنی توجہ مرکوز کی۔

منہاج السراج کے مطابق ''سلطنت میں امن و سکون قائم ہوا اور اس کا قوت اور دبدبہ دور تک قائم ہوگیا۔ لکھنوتی سے دیبل تک کے تمام امیروں نے اس کی اطاعت قبول کرلی تھی۔'' انتظامی امور کی دیکھ ریکھ اور انتظامیہ سے براہِ راست رابطہ کرنے کے لیے اس نے اپنا نسوانی اور زنانہ لباس پہننا ترک کردیا۔ وہ مردانہ لباس میں ملبوس ہوکر قباو کلاہ پہن کر عوام کے سامنے بلا جھجک آنے جانے لگی۔ اس کے ساتھ ساتھ کھلے چہرے کے ساتھ دربار میں آنا، ہاتھی کی سواری کرنا، شکار کھیلنا شروع کردیا۔ دہلی سلطنت کے دیگر حکمرانوں کی طرح سلطنت کے تمام امور کی دیکھ ریکھ اپنی رہنمائی میں انجام دینا شروع کیا۔

ترک امیروں کو جن میں اکثر چہلگانی امراء تھے ایک عورت کی حکومت پسند نہ آئی۔ جلد ہی دہلی اور صوبوں کے امراء کے ایک مخصوص حلقے میں سازش کے تحت اس کی مخالفت شروع کی گئی۔ محمد حبیب اور خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ ''رضیہ نے محسوس کیا کہ ترک امراء کی حبِ جاہ، نظم و ضبط کے قیام میں ایک زبردست رکاوٹ ہے۔ لہٰذا اس نے ترکوں کی کاٹ کے لیے ان کے مدِ مقابل غیر ترک امراء کا ایک طبقہ تیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس پالیسی کے بعد جو مسلسل ردِ عمل ہوا اس نے رضیہ کو کچل ڈالا۔'' ستیش چندر لکھتے ہیں کہ ''اپنے وفادار امراء کی ایک جماعت تشکیل دینے اور اعلیٰ عہدوں پر غیر ترکوں کو فائز کرنے کی اس کی کوشش کو ترک سردار برداشت نہیں کرسکے'' ترک امیروں نے اس پر عصمت فروشی اور حبشی امیر یاقوت سے بے جا دوستی کا الزام لگایا اور رائے عامہ کو اس سے متنفر کرنے کی بھرپور کوشش کی جس کے نتیجے میں لاہور اور سرہند میں بغاوتیں ہوئیں۔ لاہور کے صوبے دار کبیر خان ایاز اور تبرہند (بھٹنڈا) میں امیر التونیہ نے بغاوتیں کیں۔ رضیہ نے لاہور جاکر کبیر خان ایاز کی بغاوت کو فرو کرکے اسے اپنا مطیع بنایا اور ملتان کا اقطاع دار مقرر کیا۔ ابھی وہ دہلی پہونچی ہی تھی کہ تبرہند کے گورنر التونیہ نے بھی بغاوت کردی۔ رضیہ سلطان نے تبرہند کی طرف کوچ کیا اور ملک التونیہ سے جنگ کی مگر اس جنگ میں اسے شکست ہوئی۔ اس

کے بھروسے مند سپہ سالار امیر جمال الدین یاقوت کو قتل کر دیا گیا اور رضیہ سلطان کو قید کر لیا گیا۔ عین ممکن تھا کہ اسے قتل کر دیا جاتا لیکن التونیہ نے رضیہ کے سامنے یہ پیش کش رکھی کہ اگر وہ اس سے شادی کر لے تو وہ اس کی جان بخش سکتا ہے اور دہلی کا تخت واپس دلانے میں اس کی مدد کر سکتا ہے۔ رضیہ کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ کسی مضبوط سہارے کے بغیر اس کی رہائی اور حکومت ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے بھٹنڈا کے صوبے دار التونیہ کی بات مان لی اور اس کے ساتھ شادی کر لی۔ شادی کے بعد رضیہ اور التونیہ نے اپنی منتشر فوجی قوت کو اکٹھا کرنا شروع کیا۔ ادھر دہلی میں چونکہ ترک امراء پہلے ہی رضیہ سے چھٹکارہ حاصل کرنے کا منصوبہ بنا چکے تھے۔ لہٰذا اس کے تبرہند کی طرف کوچ کرتے ہی بغاوت شروع ہو گئی۔ ترک سازشی امیروں نے 1240ء میں التتمش کے بیٹے معزالدین بہرام شاہ کو دلّی کا نیا سلطان بنا دیا۔

رضیہ کے دہلی کی طرف کوچ کی خبر سن کر بہرام شاہ ستمبر یا اکتوبر 1240ء میں ایک فوج لے کر رضیہ سے مقابلے کے لیے دہلی سے روانہ ہوا۔ اس جنگ میں رضیہ اور التونیہ کو شکست ہوئی۔ دونوں نے جان بچا کر کیتھل (موجودہ کرنال) میں پناہ لی جہاں ڈاکوؤں کے ہاتھوں دونوں میاں بیوی مارے گئے۔ سلطان بہرام شاہ کے سپاہی جوان کی تلاش میں تھے ان کو پہچان کر دہلی لے آئے اور انہیں سپردِ خاک کیا۔ سر سید احمد خاں نے اپنی کتاب ''آثار الصنادید'' میں لکھا ہے کہ ''شہرِ شاہجہان آباد میں محلہ بلبلی خانہ میں ترکمان دروازے کے پاس ایک ٹوٹی سی چار دیواری اور چھوٹی سی قبر رضیہ سلطان بنت شمس الدین التمش کی ہے۔'' یہاں دو قبریں ہیں جن کو رجی سجی کی درگاہ کہا جاتا ہے۔ یہ قبریں رضیہ اور اس کی بہن شاذیہ کی بتائی جاتی ہیں۔ منہاج سراج کے مطابق ''رضیہ کے اندر وہ تمام قابل تعریف خوبیاں موجود تھیں جن کا بادشاہوں کے اندر پایا جانا ضروری ہے، لیکن اس کا عورت ہونا ہی اس کی سب سے بڑی کمی تھی۔ یہ دشواری اس کے دل و دماغ کی پوری صلاحیتوں کے آزادانہ عمل کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی تھی۔'' بہر حال یہ چیز اس کے زوال کا باعث نہ تھی۔

8.8 معزالدین بہرام شاہ (1240-1242ء)

جس وقت رضیہ تبرہند میں قید کی گئی تھی امرائے چہلگانی نے معزالدین بہرام شاہ کو اپریل 1240ء میں دہلی کے تخت پر بیٹھایا۔ بہرام شاہ کے بارے میں منہاج نے لکھا ہے کہ اس میں کچھ ذاتی اوصاف تھے۔ وہ شرمیلا اور سادگی پسند تھا اس میں سلطانی شان و شوکت کی خواہش نہیں تھی۔ کئی ذاتی خوبیوں کے باوجود وہ صرف نام کا سلطان تھا۔ اصل طاقت ''ترکان چہلگانی'' کے ہاتھوں میں تھی جنہیں چالیس امیروں کا گروہ کہا جاتا ہے۔ حکومت پر اپنی گرفت مضبوط بنانے کے لیے ترکی امیروں نے نائب مملکت کا عہدہ قائم کیا اور ملک اختیار الدین ایتگین کو اس عہدے کے لیے منتخب کیا گیا۔ ایتگین نے انتظام حکومت کی ساری باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ اس کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر بہرام شاہ نے جولائی 1240ء میں قصرِ سفید میں ایک مذہبی مجلس کے دوران اس کو قتل کروا دیا۔ اس کے بعد بدرالدین سنقر رومی کو امیر حاجب بنایا۔ اس نے معزالدین بہرام شاہ کے قتل کی سازش رچی۔ اس سازش کا راز فاش ہو گیا اور بالآخر بدرالدین سنقر رومی کو بہرام شاہ نے قتل کروا دیا۔ جو امراء اس سازش میں شامل تھے انہیں بھی سخت سزائیں دی گئیں۔ کچھ کو ان کے عہدوں سے معزول کر دیا گیا اور کچھ قتل کروا دیے گئے جب کہ کچھ دوسرے چھپ گئے۔ سازشیوں کے خلاف سخت کاروائی سے دیگر ترک امراء خوف زدہ ہو گئے۔ اس

میں وزیر مظہر الدین پیش پیش رہا۔ اس نے دھوکے سے سلطان سے ایک ایسا فرمان حاصل کر لیا جس میں لکھا تھا کہ سارے ترک امیروں کو قتل کر دیا جائے۔ وزیر نے یہ خط ترک امیروں کو دکھلا دیا جس کی وجہ سے ترک امیروں نے بہرام کے خلاف بغاوت کر دی۔ 10 مئی 1242ء کو ترک امراء نے شہر پر قبضہ کر لیا اور 13 مئی 1242ء کو بہرام شاہ کو مار ڈالا گیا۔ اس نے کل دو برس اور ڈیڑھ مہینہ حکومت کی۔

8.9 علاءالدین مسعود شاہ (1242-1246ء)

علاءالدین مسعود شاہ ایک کمزور، نااہل اور نام کا سلطان تھا۔ اس کے عہد میں ملک قطب الدین حسن نائب سلطنت اور ملک ابو بکر وزیر سلطنت بن گیا۔ بلبن کو ہانسی جیسا اہم اقطاع ہاتھ آیا۔ آہستہ آہستہ بلبن نے اپنی حیثیت میں اضافہ کیا۔ علاءالدین مسعود شاہ کے عہد میں جب 1245ء میں منگولوں نے اُچ پر قبضہ کیا تو بلبن نے ہی منگولوں کو مار بھگایا اور اچ پر دوبارہ قبضہ حاصل کیا۔ اس سے بلبن کے عزت و وقار میں اضافہ ہوا لیکن سلطان مسعود شاہ کی ناکامی اور نااہلی کی وجہ سے امیروں کی نگاہ میں اس کی قدر و منزلت گر گئی۔ لہٰذا تمام ملکوں اور امیروں نے اتفاق رائے سے سلطان ناصر الدین محمود شاہ کو خفیہ خطوط لکھ کر دہلی آنے کی درخواست کی اور بلبن کی سازش سے 10 جون 1246 کو چار سال ایک ماہ اور ایک دن کی حکومت کے بعد علاءالدین مسعود شاہ کو جیل میں ڈال دیا گیا جہاں اس کی وفات ہو گئی اور اسی دن ناصر الدین محمود کو اس کے جانشین کے طور پر تخت سلطنت پر فائز کر دیا گیا۔

8.10 ناصر الدین محمود (1246-1266ء)

سلطان ناصر الدین محمود 1246ء کو تخت پر بیٹھا۔ یہ التتمش کا پوتا تھا۔ اور اس کے بیٹے ناصر الدین کا فرزند تھا۔ نہایت متقی، پرہیز گار اور سیدھی طبیعت کا مالک تھا۔ اس نے پورا اقتدار ''ترکان چہلگانی'' کے سربراہ غیاث الدین بلبن کے ہاتھوں میں سونپ دیا۔ اس طرح ترک امیروں اور سلطان کے مابین چلی آرہی اقتدار کی کشمکش ختم ہو گئی۔ ناصر الدین محمود کے عہد میں سلطنت کا پورا اقتدار بلبن کے ہاتھوں میں مرکوز تھا۔ بلبن کی حمایت سے اس نے اندرونی اور خارجی حالات پر کنٹرول حاصل کر لیا۔ اگرچہ بلبن بہت مضبوط تھا پھر بھی سلطان کا وقار مجروح نہیں ہوا۔ بلبن ایک خادم کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ 1249ء کو اس نے بلبن کو ''الغ خاں'' کا خطاب دیا اور نائب مملکت کے عہدے پر فائز کیا۔ بلبن کی اس حیثیت کی وجہ سے شمسی خاندان کی سلطنت مضبوط ہو گئی اور باغی ترکوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ سلطان ناصر الدین محمود کے عہد میں منگولوں کو دو بار شکست ہوئی۔ منگولوں نے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے لیے اپنا سفیر ایوان سلطنت بھیجا۔ اسے مرعوب کرنے کے لیے ایک شاندار دربار میں اسے باریاب کیا گیا۔ ناصر الدین محمود امراء کے لیے ایک مناسب آلۂ کار تھا اس لیے کہ اس کو سیاست و حکومت سے بہت کم دلچسپی تھی۔ اس نے اپنا زیادہ تر وقت عبادت میں صرف کیا۔ 1266ء میں ناصر الدین محمود کی وفات ہو گئی۔ اس کی وفات کی وجوہات کو لے کر مورخین کے مابین اختلافات ہیں۔

8.11 غیاث الدین بلبن (1266-1287)

بلبن کا تعلق البری ترک خاندان سے تھا۔ بچپن ہی میں بلبن کو غلام کی حیثیت سے بغداد میں بیچ دیا گیا۔ 1232 میں وہ دہلی لایا گیا۔ یہاں التتمش نے اسے خرید لیا رفتہ رفتہ وہ ''ترکان چہلگانی'' میں شامل ہو گیا۔ رضیہ سلطان کے عہد میں بلبن ''امیر شکار'' کے عہدہ پر فائز تھا۔ بہرام شاہ کے عہد میں ''امیر آخور'' کا عہدہ حاصل کیا۔ وہ ریواڑی اور ہانسی کا ''اقطاع دار'' بھی رہا۔ علاءالدین مسعود شاہ کے عہد میں اسے ''امیر حاجب'' کا عہدہ سونپا گیا۔ اسی عہد میں اس نے منگولوں کو شکست دے کر اچھ پر قبضہ کر لیا جس کی وجہ سے بلبن کی طاقت اور وقار میں اضافہ ہوا۔ بلبن نے مسعود شاہ کو تخت سے ہٹا کر سلطان ناصر الدین محمود کو گدی پر بیٹھنے میں کافی مدد کی تھی۔ چنانچہ ناصر الدین نے اسے نائب مملکت کے عہدے پر فائز کر دیا۔

بلبن بحیثیت نائب مملکت (1246-1266)

سلطان ناصر الدین محمود کے عہد میں بلبن کو نائب مملکت بنایا گیا اور الغ خاں کا خطاب دیا گیا۔ اپنی طاقت کو مزید مستحکم کرنے کے لیے بلبن نے اپنی لڑکی کی شادی سلطان سے کر دی۔ سلطان نے بھی اپنی ایک پوتی کی شادی بلبن کے بیٹے بغرا خاں کے ساتھ کر دی۔ رفتہ رفتہ بلبن نے قوت و اقتدار کے ساتھ فوج اور انتظامیہ پر مکمل اختیار حاصل کر لیا۔ اس کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر امراء حسد کرنے لگے، ان میں قتلغ خاں، کچلو خاں اور عماد الدین ریحان پیش پیش تھے۔ ان لوگوں نے سلطان پر دباؤ بنا کر بلبن کو نائب مملکت کے عہدے سے ہٹوا دیا۔ بلبن کو دلی چھوڑ کر ہانسی اور ناگور جانا پڑا۔ بلبن کے دلی سے جاتے ہی انتظامی امور میں گڑبڑی پیدا ہو گئی۔ سلطان کے لیے حکومت کرنا مشکل ہو گیا۔ مجبور ہو کر سلطان ناصر الدین نے 1254ء میں بلبن کو دوبارہ اپنا نائب مقرر کر دیا۔ اس عہدے پر بلبن سلطان کی وفات تک کام کرتا رہا۔ بحیثیت نائب مملکت بلبن نے سلطنت کو منظم رکھا۔ انتظامی امور کو سنبھالا اور شاہی خاندان کے زوال کو روکے رکھا۔

بلبن بحیثیت حکمراں (1266-1287)

یوں تو غیاث الدین 1266ء میں تخت سلطنت پر بیٹھا، لیکن 1246ء سے اس کی موت 1287ء تک کا عہد بلبنی عہد کہا جا سکتا ہے، اس لیے کہ اس زمانے میں اسی کی طاقت کا غلبہ رہا جس وقت بلبن سلطان بنا اس وقت دلّی سلطنت انتشار کا شکار تھی۔ برنی کے مطابق دلّی کے آس پاس میواتیوں کا ظلم و جبر بڑھا ہوا تھا۔ سلطان بلبن نے دلی کے اطراف کے جنگلوں کو کٹوایا اور میواتیوں کے ظلم کو ختم کیا۔ اس نے متعدد میواتیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ گوپال گیر میں اس نے ایک قلعہ بنوایا اور وہاں پولیس چوکیاں بنوا کر انہیں افغانوں کے حوالے کیا۔ اس نے اودھ خاص طور سے کٹیہر (روہیل کھنڈ) کے باغیوں کو تہہ تیغ کیا۔ اس نے کمپل، پٹیالی، بھوجپور اور جلالی میں ڈاکوؤں کے جو بڑے اڈّے تھے، ختم کرا کے مضبوط قلعے اور وسیع مسجدیں تعمیر کرائیں۔ ترکان چہلگانی کے اثر کو ختم کیا اور اندرونی بغاوت پر بھی قابو پایا۔ خصوصاً بنگال میں 1279ء میں طغرل خاں نے جو بغاوت کی تھی اس کو کچل دیا اور اپنے لڑکے بغرا خاں کو وہاں کا حاکم بنایا۔ منگولوں کے حملوں سے دلّی سلطنت کو محفوظ رکھا۔ بلبن کے عہد میں منگول پنجاب سے آگے نہیں بڑھ پائے۔

بلبن کا نظریہ بادشاہت

سلطان غیاث الدین بلبن دلّی کا پہلا حکمراں تھا جس نے حکمرانی کا ایک نیا نظریہ پیش کیا جس سے مورخین بلبن کا ''نظریۂ بادشاہت'' کہتے ہیں۔اس کا کہنا تھا کہ بادشاہت یا حکمرانی ایک ایسا منصب ہے جو خدا کی جانب سے کسی اہل فرد کو تفویض کیا جاتا ہے۔اس کا نظریہ بادشاہت،ایران کے ساسانی بادشاہوں کے نظریے سے ملتا جلتا تھا۔اس کے نظریہ حکمرانی کے بنیادی عناصر مندرجہ ذیل تھے:

- سلطانی زمین پر خدا کی نیابت ہے۔سلطان روئے زمین پر خدا کا سایہ ہے (السلطان ظل اللہ فی الارض)اور اس کا دل خدائی ہدایات اور نور کا مخزن ہوتا ہے۔سلطان کو اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں ہمیشہ خدا کی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔سلطان کے اختیارات کا سرچشمہ صرف خدا کی ذات ہے۔لہٰذا وہ صرف خدا کے سامنے جوابدہ ہے،عوام کے سامنے نہیں۔
- سلطانی کے لیے ظاہری وقار اور عظمت ضروری ہے۔وہ اپنے پورے دور حکومت میں عام افراد سے بہت دور رہا۔عام لوگوں سے گفتگو کرنا اس کے نظریہ سلطانی کے منافی تھا۔اپنے پورے عہد حکومت میں اس نے عام لوگوں سے گفتگو نہیں کی تھی۔
- وہ درباری آداب اور مجلس کے رکھ رکھاؤ پر بہت زور دیتا تھا اور دربار میں اونچی آواز میں گفتگو کو ناقابل معافی جرم تصور کرتا تھا۔اس کو کبھی بھی شاہی لباس کے بغیر نہیں دیکھا گیا۔
- برنی کے بقول بلبن نسلی برتری کا بھی قائل تھا۔وہ اشراف (اعلیٰ نسل والے)اور اذلاف (نچلی ذات والے) کے درمیان امتیازی سلوک اپناتا تھا۔ادنی نسل کے لوگوں کو اعلیٰ عہدوں پر نہیں رکھتا تھا۔وہ کہا کرتا تھا کہ ''اتفاقاً جب میں ادنی نسل کے کسی فرد کو دیکھ لیتا ہوں تو میرے جسم کی تمام رگیں اور نسیں غصہ سے پھڑکنے لگتی ہیں اور میرا ہاتھ میری تلوار کو پہنچ جاتا ہے۔''
- غیاث الدین بلبن حسب ونسب پر بڑا زور دیتا تھا۔اس نے اپنا سلسلہ نسب ایرانی بادشاہ افراسیاب سے جوڑا تھا اور بڑے فخر کے ساتھ اس کا ذکر دربار میں کرتا تھا۔ایرانی درباری رسوم ورواج پر اس نے بہت زور دیا۔اس نے سجدہ اور پائے بوس کی رسم جاری کی۔اس نے اپنے پوتوں کے نام جو تخت نشینی کے بعد پیدا ہوئے تھے،ایرانی طرز پر کیقباد اور کیخسرو رکھے تھے۔

بلبن نے اپنے مذکورہ نظریہ حکمرانی کی بنیاد پر سلطان کے کھوئے ہوئے عزت ووقار کو بحال کیا۔اس کا نظریۂ حکمرانی طاقت وقوت، عظمت ووقار اور عدل وانصاف پر مبنی تھا۔

سلطان غیاث الدین بلبن ایک مطلق العنان حکمران تھا،اس نے اپنی ''مطلق العنانیت'' کو اعتدال پر لانے کے لیے انصاف پر زور دینے کی کوشش کی۔انصاف کے معاملے میں وہ اس قدر سخت تھا کہ وہ اپنے بھائی، بچے، دوست احباب اور ملازم کے ساتھ بھی کوئی رعایت نہیں کرتا تھا۔اس نے اپنی سلطنت کے تمام علاقوں میں جاسوس مقرر کیے تاکہ ریاست میں رونما ہونے والے حالات اور اس میں پیش آنے والے واقعات اور افسروں کے کاموں سے باخبر رہ سکے۔بلبن نے مرکزی فوج کی تشکیل اور توسیع پر کافی توجہ دی۔بہادر اور تجربہ کار ملکوں اور سرداروں کا تقرر سلطانی افواج میں کیا۔انہیں اقطاع تفویض کیے۔فوجوں کو کبھی بیکار نہیں رہنے دیا۔شکار کے بہانے انہیں چاق وچوبند رکھتا تھا۔

بلبن نے بالائی گنگا کے میدانی علاقوں میں سختی کے ساتھ نظم ونسق قائم کیااور وہ عناصر جو لا قانونیت کے ذمہ دار تھے انہیں سختی سے کچل دیا۔ بلبن نے سلطان بننے کے بعد کچھ امراء کے اقطاع ختم کر دیے۔ بلبن کی توجہ کا مرکز ایک منظم فوج رہی، اس نے اپنے بیٹے بغرا خان کو ہدایت کی کہ فوج کے علاوہ آدھی آمدنی کو بچا کر رکھنا چاہئے تاکہ وقت ضرورت کام آسکے۔ غیاث الدین بلبن مملوک خاندان کا آخری بااثر سلطان تھا۔ جس نے نہایت منظم اور بااثر طریقے سے حکومت کی اور بالآخر 1287 میں اس کی وفات ہوگئی۔ اس کی وفات کے ساتھ ہی مملوک خاندان کا زوال تیزی سے شروع ہو گیا۔ اس کا جانشین کیقباد اس لائق نہیں تھا کہ وہ زوال پذیر سلطنت میں جان ڈال سکے۔

8.12 کیقباد(1287-1290)

سلطان معزالدین کیقباد 1287ء میں تخت پر بیٹھا۔ اس وقت اس کی عمر سترہ یا اٹھارہ سال تھی۔ وہ ایک خوبصورت، شائستہ، حلیم اور بردبار نوجوان تھا۔ اس کی پرورش اس کے دادا (بلبن) کی سخت نگرانی میں ہوئی تھی۔ اس کے اتالیقوں نے اسے کبھی بھی شراب وشباب کی رنگ رلیاں منانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اسے عمدہ تعلیم و تربیت کے ساتھ تمام فنِ حرب وضرب سکھائے گئے تھے۔ وہ فنِ خطاطی، ادب، تیغ زنی، تیر اندازی، اور نیزہ بازی وغیر میں ماہر تھا۔ تختِ سلطانی پر بیٹھتے ہی اس کی زندگی کی جیسے کایا ہی پلٹ گئی۔ اس نے اپنے آپ کو عیاشیوں میں لگادیا اور شراب وکباب کی رنگ رلیوں میں مست رہنے لگا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی عیاشیوں کی خاطر کیلوکھڑی میں عظیم الشان محل بھی تعمیر کرایا تھا۔ اس کے دادا سلطان غیاث الدین بلبن کا دربار جو اپنے سخت نظم وضبط کا نمونہ اور سنجیدہ ماحول کے لیے مشہور تھا اب مسخروں، عیاشوں، رقاصاؤں اور سازندوں کا اڈہ بن گیا تھا۔

کیقباد نے حکومت کے تمام کام نظام الدین کے سپرد کر دیے۔ ضیاءالدین برنی نے لکھا ہے کہ ''اگر ملک نظام الدین اور ملک قوام الدین نہ ہوتے تو ریاست ایک ہفتے سے زیادہ نہ چلتی'' اس نے ان تمام ترک افسران کو قتل کرنا شروع کر دیا جو اس کے رویے کے مخالف بنے۔ اس دوران نظام الدین کو بھی قتل کر دیا گیا اور انتظامیہ بالکل ٹھپ ہوگئی۔ جلال الدین خلجی جو مختلف جنگی مہموں کا سربراہ تھا، اسے سلطنت کی مدد کے لیے بلایا گیا۔ اس نے صلاحیت اور تجربے سے فائدہ اٹھایا اور جلد ہی کیقباد سے نجات حاصل کرلی اور ایک نئے حکمران خاندان کی بنیاد ڈالی۔

8.13 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی میں آپ نے یہ پڑھا کہ 1206 سے 1290 عیسوی تک ہندوستان میں دہلی سلطنت پر جس خاندان کے افراد نے حکومت کی انہیں مورخین نے ''خاندانِ غلاماں'' یا ''مملوک سلاطین'' کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس خاندان کا بانی شہاب الدین غوری کا سب سے بھروسے مند اور چہیتا غلام قطب الدین ایبک تھا۔ ایبک معزالدین کی فوج کا سالار اور ہندوستان میں غوری مفتوحہ علاقوں کا منتظم تھا۔ اس نے کئی اہم معرکوں میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ 1206ء میں شہاب الدین غوری کے انتقال کے بعد اس نے ہندوستانی مفتوحہ علاقوں میں اپنی حکومت کا اعلان کیا۔ پہلے اس نے لاہور کو اپنا دارالحکومت بنایا اور پھر اپنی راجدھانی دہلی منتقل کر دی۔ 1210ء میں چوگان کھیلتے ہوئے قطب

الدین کا انتقال ہو گیا۔اس کی وفات کے بعد دہلی کے امراء نے انتہائی جلد بازی میں آرام شاہ کو تخت پر بٹھادیا۔آرام شاہ ایک نااہل حکمراں تھا جس کے عہد میں کئی علاقوں میں بغاوتیں ہوئیں۔ بالآخر قطب الدین ایبک کا داماد شمس الدین التتمش جو ایک ترک غلام تھا دہلی کے تخت پر بیٹھا۔ تخت نشین ہوتے ہی اس نے تمام باغیوں کی سرکوبی کی اور پنجاب، بنگال اور سندھ کے باغیوں کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنایا۔اس کے بعد اس نے رنتھمبور، اجین، گوالیار، بندیل کھنڈ اور مالوہ کے علاقے فتح کیے۔ اس نے دہلی سلطنت کو وسیع مضبوط اور مستحکم کیا۔ اسی وجہ سے اسے دہلی سلطنت کا اصل بانی کہا جاتا ہے۔اس نے قطب الدین ایبک کے کئی منصوبوں کو پورا کیا۔ قطب مینار کی تعمیر کی تکمیل، قوت الاسلام مسجد کی توسیع، حوضِ شمسی کی تعمیر کے ساتھ دہلی کو ایک مرکز کے طور پر فروغ دیا۔ سلطان التتمش پڑھے لکھے افراد کا قدر دان اور صوفی سنتوں کا عقیدت مند تھا۔التتمش نے اپنی بیٹی رضیہ کو جو اپنے تمام بھائیوں سے زیادہ قابل تھی اپنا جانشین نامزد کیا تھا لیکن دہلی کے علماء اور امراء کسی خاتون کی حکمرانی کے قائل نہیں تھے۔ چنانچہ التتمش کی وفات کے فوراً بعد امراء نے اس کے بیٹے رکن الدین فیروز کو تخت پر بٹھادیا۔ فیروز کی نااہلی کی وجہ سے رضیہ تخت حاصل کرنے میں کامیاب رہی اور تقریباً چار سال کامیابی سے حکومت کی۔ رضیہ کی ترک امراء کی طاقت توڑنے کی کوشش اس کے خاتمے کا سبب بنی۔ رضیہ کے بعد معزالدین بہرام شاہ، علاؤالدین مسعود شاہ اور ناصر الدین محمود یکے بعد دیگرے سلطان بنے لیکن اصل سیاسی طاقت، ترکان چہلگانی کے ہاتھوں میں رہی۔ مملوک خاندان کا آخری طاقتور حکمراں غیاث الدین بلبن تھا جو پہلے ناصر الدین محمود کا نائب تھا۔ بعد میں ناصر الدین کے مرنے کے بعد اس نے حکومت سنبھالی۔ بلبن کے عہد میں بغاوتوں کو سختی سے کچل دیا گیا اور سلطنت کا وقار بحال ہوا۔ بلبن کے بعد اس کے پوتے کیقباد کے عہد میں اس کی عیاشیوں کی وجہ سے مملوک خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔

8.14 کلیدی الفاظ (Keywords)

لکھ بخش	:	سخی، داتا، لاکھوں روپیے بخش دینے والا
چوگان	:	چوگان: اسے پولو کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، جس میں گھڑ سواروں کی دو ٹیمیں حصہ لیتی ہیں۔
قوۃ الاسلام	:	مہرولی (دہلی) میں اس مسجد کا نام جس میں قطب مینار واقع ہے۔
امیر آخور	:	شاہی اصطبل کا سردار
سرجاندار	:	شاہی حفاظتی دستے کا سالار اعلیٰ
امیر شکار	:	شکار پر جانے والی فوج اور عملے کا سربراہ
اقطاع	:	زمین کا وہ ٹکڑا جو کسی عہدیدار کو اس کی خدمات کے عوض دیا جاتا تھا اور یہ قابل منتقلی ہوتا تھا۔
امرائے چہلگانی	:	لفظی طور پر چالیس امیروں کا گروہ، ترک امراء کی وہ جماعت جو التتمش نے تیار کی تھی۔
سجدہ	:	بادشاہ یا سلطان کو عزت اور تعظیم کے لیے سر جھکانا۔
پابوس	:	بادشاہ یا سلطان کو عزت اور تعظیم کے لیے اس کے قدم چومنا۔

8.15 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

8.15.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. قطب الدین ایبک کہاں کا رہنے والا تھا؟

(a) خراسان (b) ترکستان (c) غزنی (d) سمرقند

2. قطب الدین ایبک کو ''امیرِ آخور (Amir-i-Akhur) '' کے عہدے پر کس نے فائز کیا تھا؟

(a) محمد غوری (b) التتمش (c) تاج الدین یلدوز (d) ناصر الدین قباچہ

3. ''اڑھائی دن کا جھونپڑا'' نامی مسجد کہاں واقع ہے؟

(a) دہلی (b) اجمیر (c) لاہور (d) ملتان

4. سلطان شمس الدین التتمش کے ترک امیروں کے گروہ کو کیا کہا جاتا تھا؟

(a) چہل گانی (b) اخوان الصفا (c) اہلِ صفہ (d) دیوانِ خاص

5. دہلی سلطنت کی پہلی مسلم خاتون سلطان کون تھی؟

(a) رضیہ سلطان (b) نور جہاں (c) مہر النساء (d) گل بدن بیگم

8.15.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. رضیہ سلطان کو اپنی تخت نشینی کے لیے کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا؟ بیان کیجیے۔
2. قطب الدین ایبک کے حالاتِ زندگی پر ایک مختصر نوٹ تحریر کیجیے۔
3. دوآب میں امن وامان قائم کرنے کے لیے غیاث الدین بلبن نے کیا اقدامات کیے تھے؟

8.15.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. دہلی سلطنت کے استحکام اور توسیع میں شمس الدین التتمش نے کیا کردار ادا کیا تھا؟ بیان کیجیے۔
2. مملوک سلاطین کی تعمیری اور تہذیبی سرگرمیوں کا جائزہ پیش کریں۔
3. سلطان غیاث الدین بلبن کے نظریہ حکمرانی (بادشاہت) پر روشنی ڈالیے۔

Answer Key:
1. (b) | 2. (a) | 3. (b) | 4. (a) | 5. (a)

اکائی 9۔ خلجی خاندان

(The Khaljis)

اکائی کے اجزا

9.0 تمہید

9.1 مقاصد

9.2 جلال الدین فیروز خلجی

9.2.1 خلجی حکومت کا قیام

9.2.2 جلال الدین فیروز خلجی کی فوجی مہمات اور کارنامے

9.2.3 ملک چھجو کی بغاوت کا خاتمہ

9.2.4 منگول حملے کا انسداد

9.2.5 رنتھمبور کے خلاف کاروائی

9.3 علاءالدین خلجی

9.4 توسیعِ سلطنت

9.4.1 شمالی ہند کا استحکام

9.4.2 جنوبی ہند کی جانب پیش قدمی

9.5 نظم و نسق

9.6 علاءالدین خلجی کی معاشی اصلاحات

9.6.1 مالگزاری نظام کی تشکیل

9.6.2 علاءالدین کی مارکیٹ کنٹرول پالیسی

9.6.3 مارکیٹ کنٹرول پالیسی کے مقاصد

9.7 سلطان قطب الدین مبارک خلجی

9.8 اکتسابی نتائج
9.9 کلیدی الفاظ
9.10 نمونہ امتحانی سوالات

9.0 تمہید (Introduction)

1286ء میں سلطان غیاث الدین بلبن کی وفات کے بعد کچھ عرصہ تک دہلی سلطنت انتشار کا شکار رہی۔ درباری سازشوں کی وجہ سے غیاث الدین بلبن کا بیٹا بغرا خان اور اس کے کم عمر اور ناتجربہ کار پوتے کیقباد، کیخسرو اور کیومرس اقتدار کو زیادہ دنوں تک سنبھال نہیں سکے اور بالآخر دہلی سلطنت کی باگ ڈور ایک ایسے خاندان کے ہاتھوں میں آئی جو تاریخ میں خلجی خاندان کے نام سے مشہور ہے۔ خلجی خاندان کے کئی افراد مملوک عہد میں نمایاں خدمات انجام دے چکے تھے۔ اس کے باوجود کافی عرصہ سے وہ مرکزی حکومت سے باہر رہے۔ مملوک خاندان کے کمزور ہوتے ہی انہیں اقتدار پر قابض ہونے کا موقعہ ملا۔ اس خاندان نے 1290ء سے 1320ء تک حکومت کی۔ خلجی حکمران غالباً ترکی نژاد تھے لیکن کردار کے اعتبار سے افغانی بن چکے تھے۔ بعض مؤرخین انہیں ترکی قرار دیتے ہیں لیکن اس عہد کے ایک ہمعصر مستند مورخ ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ خلجی سلاطین ترک حکمرانوں سے مختلف تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ کیقباد کی وفات کے ساتھ ہندوستان میں ترکوں کی حکمرانی اپنے اختتام کو پہنچ گئی تھی۔

9.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- خلجی سلطنت کے آغاز وارتقا کے بارے میں جان سکیں گے۔
- جلال الدین خلجی کے کارناموں کا جائزہ لے سکیں گے۔
- علاء الدین خلجی کی سیاسی فتوحات سے واقف ہو سکیں گے۔
- علاء الدین خلجی کی مالگزاری و معاشی اصلاحات بیان کر سکیں گے۔
- علاء الدین خلجی کے نظم ونسق کے بارے میں روشنی ڈال سکیں گے۔
- خلجی سلطنت کے زوال کے اسباب کی وضاحت کر سکیں گے۔

9.2 جلال الدین فیروز خلجی (1290-1296)

9.2.1 خلجی حکومت کا قیام

جلال الدین فیروز خلجی کو دہلی سلطنت کی تاریخ میں خلجی خاندان کا بانی سلطان کہا جاتا ہے۔ اس کا تعلق ایک ترک خلجی قبیلے سے تھا

جس نے ترکستان سے ہجرت کر کے افغانستان میں تقریباً دو سو سالوں تک سکونت اختیار کی۔ اسی وجہ سے دہلی کے ترک امراء انہیں ترکی نہیں بلکہ افغان تصور کرتے تھے۔ سلطان بننے سے پہلے وہ اور اس کا بھائی شہاب الدین خلجی مملوک عہد حکومت میں سلطان بلبن کے دربار میں اہم عہدوں پر فائز تھے۔ جلال الدین فیروز خلجی ''سرِ جاندار'' کے عہدے سے ترقی کر کے سامانہ کا صوبیدار بنا۔ سامانہ کے گورنر کی حیثیت سے اس نے انتہائی اہم خدمات انجام دیں۔ اس نے منگولوں کے زبردست حملوں کا منہ توڑ جواب دیا اور انہیں پسپا ہونے پر مجبور کیا۔ سلطان بلبن کی وفات کے بعد درباری سازشی اور دہلی کے کوتوال ملک الامراء فخر الدین نے بلبن کے پوتے کیقباد کو ''معزالدین'' کے لقب سے دہلی کے تخت پر بٹھادیا۔ کیقباد وجیہہ شخصیت کا مالک مگر ایک کمزور حکمراں تھا۔ وہ شراب و شباب اور لہو و لعب کا دلدادہ تھا۔ اس درمیان انتظام حکومت فخر الدین کے بھتیجے اور داماد نظام الدین کے ہاتھوں میں آگیا۔ نظام الدین کو جب اس کے کسی درباری دشمن نے زہر دے کر مروادیا تو کیقباد نے جلال الدین فیروز خلجی کو سامانہ سے دہلی طلب کیا اور شائستہ خان کا خطاب دے کر ''عارض ممالک'' کے عہدے پر فائز کیا اور برن کا صوبے دار مقرر کیا۔

سلطان معزالدین کیقباد کی حکومت میں جلال الدین خلجی ایک بااثر عہدے دار تھا۔ کیقباد اپنی بے انتہا شراب نوشی کے باعث جسمانی اور دماغی لحاظ سے مفلوج ہو کر ناقابل علاج ہو گیا تو ملک لچھن اور ملک سرخہ نے اس کے کم سن بیٹے کیومرس کو شمس الدین دوم کا خطاب دے کر تخت پر بٹھادیا۔ اس کے بعد ترکی ملکوں نے جس میں ملک لچھن اور سرخہ سرِ فہرست تھے فیروز خلجی اور اس کے گروہ کے خاتمے کا منصوبہ بنایا۔ انہوں نے فیروز خلجی اور اس کے حامیوں کو سازش کے ذریعہ قتل کرنے کی ایک فہرست تیار کی جس میں فیروز خلجی کا نام سب سے اوپر تھا۔ فیروز خلجی کے بھتیجے ملک احمد چپ کو جو ''نائب امیرِ حاجب'' کے عہدے پر فائز تھا اس سازش کا علم ہو گیا۔ اس نے فیروز کو اس سازش سے باخبر کر دیا۔ اس نے فوراً اپنا کیمپ دہلی سے غیاث پور منتقل کر دیا اور اپنے تمام رشتے داروں کو منگولوں کے متوقعہ حملے کا خطرہ بتا کر برن (موجودہ بلند شہر) سے بلا لیا۔ اس کے علاوہ کئی ترک افسران جو اس سازش کا شکار بننے والے تھے، وہ انتقام کی غرض سے خلجیوں سے جا ملے۔ ترک افسران کی سازش ناکام ہوئی اور مقابلے میں ملک لچھن مارا گیا۔ فیروز کے لڑکے محل میں داخل ہوئے اور نو عمر سلطان کیومرس کو پکڑ کر اپنے کیمپ میں لے آئے۔ کچھ ترک افسران جن میں ملک سرخہ بھی شامل تھا کمسن سلطان کو چھڑانے کے لیے ان کے پیچھے گئے۔ ان کو پکڑ کر قتل کر دیا گیا۔ کیقباد کیلوکھڑی میں واقع اپنے محل کے ایک کمرے میں کسمپرسی کی زندگی گزار رہا تھا۔ فیروز نے ایک ملک کو جس کے باپ کو کیقباد نے مار ڈالا تھا، کیقباد کو قتل کرنے کے لیے بھیجا۔ اس نے کیقباد کے مفلوج جسم کو ایک چادر میں لپیٹ کر جمنا میں پھینک دیا اور اسی کے ساتھ سلطان قطب الدین ایبک کے عہد سے قائم البری ترک حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ جون 1990ء میں کیلوگڑھی کے محل میں شائستہ خان عرف جلال الدین فیروز خلجی نے دہلی سلطنت کا اقتدار سنبھالا اور خلجی خاندان کا پہلا سلطان بنا۔

9.2.2 جلال الدین فیروز خلجی کی فوجی مہمات اور کارنامے

سلطان معزالدین کیقباد کے قتل کے بعد جب فیروز خلجی کو تخت سلطنت کے لیے منتخب کیا گیا تو اس وقت اس کی عمر 70 سال تھی۔ وہ علم و حکمت کا شیدائی رحم دل اور ایک نرم خو حکمران تھا۔ اس کی نرم خوئی، رحم دلی اور نظم و نسق کی ڈھیل نے فسادی عناصر کو سر اٹھانے کا

موقعہ فراہم کیا۔اس کے مخالفین نے شر پسندوں کی حوصلہ افزائی کی، چنانچہ کئی علاقوں میں بد نظمی اور بغاوت کی راہ ہموار ہوئی۔ جہاں ایک طرف دہلی کی عوام جلال الدین خلجی کو امن پسند، مہربان اور ہمدرد دل رکھنے والا انسان تصور کرتی تھی تو دوسری طرف کچھ امراء نے اس کی نرم دلی کو اس کی کمزوری خیال کیا اور اس کے خلاف بغاوت کر دی۔

9.2.3 ملک چھجو کی بغاوت اور اس کا خاتمہ

اگست 1290ء میں سلطان غیاث الدین بلبن کے بھتیجے ملک چھجو کشلی خان نے جو مملوک سلاطین کے خاندان کا ایک سردار تھا جلال الدین فیروز خلجی کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا۔ وہ سلطنت کے مشرقی علاقوں کڑا مانِک پور کو ریاستی کنٹرول سے الگ تھلگ رکھنا چاہتا تھا۔اسے امید تھی کہ اس بغاوت میں وہ کیقباد کے باپ اور اپنے چچیرے بھائی بغرا خان کا جو 1287ء سے ہی مشرقی بنگال کے علاقوں کا خود مختار حکمران تھا اس کا تعاون حاصل کر لے گا۔ ملک چھجو نے سلطان مغیث الدین کا لقب اختیار کرتے ہوئے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔اس نے اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور اپنے نام کے سکے بھی جاری کیے۔اودھ کے صوبیدار علی حاتم خان اور مشرقی اضلاع میں تعینات دیگر امراء نے بھی اس کی حمایت کی۔ دوآب کے کچھ ہندو سرداروں نے بھی جو کچھ عرصے سے محصول نہیں دے رہے تھے ملک چھجو کی حمایت کی۔اسے یہ یقین ہو چلا کہ وہ جلد ہی جلال الدین سے زیادہ مقبولیت حاصل کر لے گا۔ چنانچہ اس نے دہلی اور اس کے گرد و نواح کے قدیم امراء کا تعاون حاصل کرنے کے لیے دہلی کا رخ کیا۔اس کا ارادہ تھا کہ وہ امروہہ کے راستے دہلی میں داخل ہو گا۔اس بغاوت کی اطلاع ملتے ہی جلال الدین نے اپنے سب سے بڑے لڑکے خانِ خاناں کو دہلی کا انچارج بنایا اور باغیوں کی سرکوبی کے لیے کول (علی گڑھ) کے راستے بدایوں کی طرف روانہ ہوا۔ اپنے دوسرے بڑے بیٹے ارکلی خان کی مدد سے اس نے ملک چھجو کی فوج کو رام گنگا ندی کے ساحل پر روک دیا اور خود بھوجپور (فرخ آباد) کے قریب دریائے گنگا عبور کر کے ملک چھجو کے حامیوں کو شکست دی۔ بعد ازآں ارکلی خان اور سلطان کی مشترکہ افواج نے ملک چھجو کے تمام حامیوں کو شکست دی۔ ملک چھجو گرفتار ہوا۔ روہیل کے سردار نے اطاعت قبول کی اور بھاری خراج ادا کیا۔ کہسن کا علاقہ تاراج کر دیا گیا۔ کچھ باغیوں کو پھانسی دے دی گئی اور کچھ کو غلاموں کی حیثیت سے فروخت کر دیا گیا۔اس طرح چھجو کی بغاوت کو بری طرح کچل دیا گیا۔

9.2.4 منگول حملے کا انسداد

ملک چھجو کی بغاوت کو فرو کرنے کے کچھ ہی دنوں بعد دہلی سلطنت کی شمال مغربی سرحدوں پر منگول آدھمکے۔ دیپال پور، ملتان اور سنام کی سرحد پر جہاں ارکلی خان کا حال ہی میں تقرر ہوا تھا ہلاکو خان کے پوتے عبداللہ کی قیادت میں منگولوں نے حملہ کر دیا۔ سلطان جلال الدین خلجی بذاتِ خود اپنی فوج کے ساتھ روانہ ہوا۔ ''بار رام'' کے مقام پر دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ معمولی لڑائی میں ہی دہلی کی فوج کا پلڑا بھاری رہا۔ منگول بنا لڑے واپس ہونے پر راضی ہو گئے۔اس طرح فیروز خلجی نے 1292ء میں منگولوں کے ایک زبردست حملے کے خلاف اپنی مملکت کا کامیاب دفاع کیا۔اس کے کچھ ہی وقت کے بعد ہلاکو خان کے ایک پوتے الغو خان کی قیادت میں کم و بیش 3000 منگولوں نے خود سپردگی کے بعد اسلام قبول کر لیا اور انہیں ''نو مسلم'' کہا جانے لگا۔ منگولوں کو ان کی شدید قتل و غارت گری اور تباہی اور بربادی پھیلانے کی وجہ سے دہلی میں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا،اس کے باوجود ان کی معافی طلبی کو سلطان نے قبول کیا اور ان کی خواہش پر انہیں ہندوستان

میں آباد ہونے کی اجازت دے دی۔ ضیاءالدین برنی کے مطابق ''انہیں مکان، وظائف اور سماجی مراتب عطا کیے گئے۔''

9.2.5 رنتھمبور کے خلاف کاروائی

اسی سال سلطان جلال الدین خلجی نے راجپوتانہ کے چوہانوں کے خلاف ایک مہم شروع کی جن کی قیادت رنتھمبور کا رانا ہمیر دیو یا رائے ہمیرا کر رہا تھا۔ وہ آس پاس کے علاقوں پر قبضہ کر کے اپنی طاقت بڑھانا چاہتا تھا۔ اس نے دہلی کے اہم سرحدی علاقے ہریانہ پر اپنا دباؤ بڑھانے کی کوشش کی۔ چوہانوں کی روک تھام ضروری ہو گئی۔ چنانچہ ریواڑی اور نارنول کے راستہ سلطانی افواج الور میں داخل ہوئیں اور ''منڈاور'' کا محاصرہ کر لیا۔ منڈاور شمال میں چوہانوں کی آخری چوکی تھی۔ یہاں کوئی خاص مزاحمت نہیں ہوئی۔ دیہاتی علاقوں سے کافی مالِ غنیمت اور مویشی ہاتھ لگے۔ دو ہفتے کے اندر اندر سلطانی افواج چوہانوں کی راجدھانی تک جانے والے راستے کے اہم مقام ''جھابن'' تک پہونچ گئیں۔ راجپوتوں نے قلعے کے باہر دو بدو مقابلہ کیا جس میں ان کا سالار مشہور جنگجو گردن سائنی مارا گیا اور نتیجتاً راجپوت ہراساں ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ کنواری، چمبل اور بنارس کے دریاؤں تک ان کا پیچھا کیا گیا۔ جھابن کے سردار نے قلعہ خالی کر دیا اور رنتھمبور چلا گیا۔

جھابن کے قلعے پر قبضہ کرنے کے بعد سلطان نے رنتھمبور پر چڑھائی کا منصوبہ بنایا۔ لیکن رنتھمبور کا قلعہ ڈھلوان پہاڑی پر واقع ہونے کی وجہ سے ناقابل تسخیر ثابت ہوا اور یہ مہم کھنچنے لگی۔ ادھر راجدھانی میں سازش کی اطلاع مل رہی تھی چنانچہ قلعہ فتح کیے بنا ہی واپس لوٹنے کا فیصلہ کیا گیا۔ رنتھمبور کی مہم کے دوران تاج الدین کوچی کے ذریعے سلطان کے قتل کے منصوبے کا راز فاش ہوا جس پر جلال الدین نے بڑی خوش اسلوبی قابو پا لیا۔ اس کے علاوہ وہ دہلی پہنچ کر سیدی مولا کی بغاوت کو بھی ناکام بنانے میں کامیاب ہوا۔

جلال الدین خلجی کے دور کا اہم ترین واقعہ دکن کی جانب مہم جوئی اور حملہ تھا جس کی قیادت سلطان کے بھتیجے اور داماد علی گرشاسپ نے کی تھی جو بعد میں علاءالدین خلجی کے نام سے مشہور ہوا۔ جلال الدین خلجی اپنے بھتیجے علی پر بہت ہی مہربان تھا اور اس پر بہت زیادہ بھروسہ کرتا تھا۔ اس نے علی کو کڑا کا صوبیدار مقرر کیا اور اسے مالوہ کی جانب پیش قدمی کرنے کی اجازت بھی دی۔ بہر حال علی نے اپنی کاروائی کو سلطانی دربار سے مخفی رکھا اور جنوب کی سمت آگے بڑھتا رہا۔ اپنے چچا کے ساتھ جھگڑے اور ایک جنوبی راجا کے تعاون کی خواہش کی افواہ پھیلا کر اُس نے اپنی تمام مخالفتوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اُس نے فوج کے ساتھ برار اور خاندیش سے گزرتے ہوئے اچانک یادو ریاست کی راجدھانی دیوگیری پر حملہ کر دیا اور اس کے راجا رام چندر کو ایلیچ پور (Ellichpur) سے دست برداری پر مجبور کیا۔ اس کے بعد وہ 1294ء میں سونے اور جواہرات کی شکل میں کثیر مال غنیمت کے ساتھ کڑا (موجودہ الہ آباد کا گردونواح) لوٹ گیا۔

علی کا دکن پر اچانک حملہ اور مالِ غنیمت میں سلطان کو حصہ نہ دینا اس کے باغیانہ عزائم کو پہچاننے کے لیے کافی تھا، لیکن جلال الدین نے اپنے بھتیجے سے بے لوث اخلاص و محبت کی وجہ سے اس کے عزائم پر شبہ نہیں کیا۔ اس نے مال غنیمت میں اپنی حصے داری کا حق حاصل کرنے کی امید سے کڑا کا سفر کیا۔ اپنی فوج کے بیشتر حصے کو پیچھے چھوڑ کر صرف چند معاونین کے ہمراہ اُس نے دریائے گنگا پار کیا۔ اس طرح خالی ہاتھ جانے کا مقصد صرف یہ تھا کہ علاءالدین، سلطان کی جانب سے کوئی خدشہ محسوس نہ کرے اور فرار نہ ہو جائے، لیکن ہوا اس کے بالکل برعکس۔

1296ء میں علی نے موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے چچا کو قتل کر کے سلطنت پر قبضہ کر لیا۔

9.3 علاءالدین خلجی (1296-1316ء)

علی گرشاسپ جو بعد میں علاءالدین خلجی کے نام سے مشہور ہوا سلطان جلال الدین کا بھتیجا اور اس کا داماد تھا۔ اس کے والد کا نام شہاب الدین تھا۔ تخت سلطنت پر قابض ہوتے ہی علاءالدین نے مرحوم سلطان کے تمام رشتے داروں اور حمایتیوں کو مار ڈالا اور ہر اُس شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیا جو اس کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اس نے چند طلائی (سونے کے) ٹکڑوں کی رشوت دے کر عوام کی ناراضگی کو بھی ختم کر دیا۔ تحفے تحائف اور دولت کی تقسیم کے ذریعے اس نے فوجیوں کا بھی دل جیت لیا۔ حالانکہ یہ بھی صحیح ہے کہ علاءالدین خلجی ایک لائق سپاہی اور طاقتور حکمراں تھا۔ اس نے دہلی سلطنت کی سرحدوں کو کافی حد تک وسیع کیا۔ منگولوں کی مداخلت کا سدباب کیا۔ سلطان کی حکومت کے ابتدائی سالوں میں کئی سازشیں اور بغاوتیں ہوئیں۔ اولاً تو اسے خود اپنے سپاہیوں کی بغاوت کو کچلنا تھا۔ گجرات کی فتح کے بعد جو مالِ غنیمت اور لوٹ کا سامان اس کے قبضے میں آیا تھا اس کی مروجہ شرعی تقسیم کو وہ بدل ڈالنا چاہتا تھا جس کے سبب اس کے سپاہی دولت کے ایک بڑے حصے سے محروم ہو رہے تھے اور یہی ان بغاوت کا اصل سبب تھا۔ مال غنیمت کی تقسیم کا مروج طریقہ یہ تھا کہ اس کا صرف پانچواں حصہ مملکت یا ریاست کی ملکیت ہوتا اور بقیہ تمام فوجیوں میں تقسیم ہو جاتا۔ علاءالدین نے اسے یکسر بدل ڈالا اور ریاست کا حصہ 5/4 کر دیا جبکہ فوجیوں کے لیے صرف پانچواں حصہ اس نے طے کیا۔

اپنی حکومت کے ابتدائی ایام میں فوجیوں کی بغاوت کے علاوہ اسے خود اپنے بھتیجوں کی سازشوں اور منظم شورشوں سے نمٹنا پڑا۔ ایک سازش کا سرغنہ اس کا بھتیجا اکت خان تھا۔ اکت خان نے علاءالدین خلجی پر قاتلانہ حملہ کیا جس میں سلطان شدید زخمی ہو گیا۔ سلطان کو قریب المرگ سمجھ کر اکت خان نے اپنی حکمرانی کا اعلان کر دیا اور طبقۂ اشراف سے عقیدت و احترام کا طالب ہوا لیکن جلد ہی علاءالدین کی صحت بحال ہوئی اور وہ فوج کے سامنے نمودار ہوا۔ فوج نے اس کے ساتھ وفاداری کا حلف لیا اور بالآخر اکت خان کو ہلاک کر دیا گیا۔ اس کے دو بھتیجوں نے بھی علمِ بغاوت بلند کیا لیکن انہیں بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ علاءالدین کو ایک غلام حاجی مولا کی بغاوت کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ اس نے التتمش کے ایک پوتے کو تخت نشین کیا۔ جیل کے دروازے کھول ڈالے اور کئی دنوں تک اودھم مچاتا رہا لیکن اس کی بغاوت بھی کچل دی گئی اور حاجی مولا سمیت اس کے آقا کا پورا خاندان موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ سابق حکمرانوں کی طرح علاءالدین کو بھی منگولوں کے حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔ 1297ء سے 1307ء کے عرصے میں کم و بیش پانچ چھ بار منگولوں نے دہلی سلطنت پر حملے کیے۔ بعض حملے تو انتہائی شدید تھے۔

علاءالدین کے کماندار ظفر خان نے منگولوں کے خلاف جرأت مندانہ کاروائیاں کیں۔ تاہم منگولوں نے دہلی کے گرد و نواح میں متعدد بار لوٹ مار کی لیکن شہر دہلی ان کے قابو میں آنے سے بچ گیا۔ اس صورت حال نے علاءالدین کو مؤثر اقدامات کرنے پر متوجہ کیا۔ اس نے دہلی کی قلعہ بندی میں کئی اہم فصیلوں کا اضافہ کیا۔ سرحدی علاقوں پر محافظ دستے مقرر کیے۔ اپنی فوج کی تعداد میں اضافہ کیا اور انہیں مزید فعال اور سریع الحرکت بنایا۔ ان موثر اقدامات کے بعد جب منگولوں نے دوبارہ چھاپہ مار کاروائیاں شروع کیں تو ان کا منہ توڑ جواب دیا گیا۔ اس

طرح علاءالدین خلجی کے باقی ماندہ دورِ حکومت میں ہندوستان کو منگولوں سے نجات حاصل ہوئی۔

9.4 توسیعِ سلطنت

9.4.1 شمالی ہند کا استحکام

سلطان علاءالدین خلجی ایک جنگجو اور جاہ طلب حکمران تھا۔ اس کے عہد میں ہی دہلی سلطنت کی توسیع پسندانہ کاروائیوں کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے اُس نے شمالی ہند پر اپنا مضبوط تسلط قائم کیا اور پھر جنوب کی طرف فاتحانہ پیش قدمی کی۔ اس کا اہم ترین کارنامہ یہ ہے کہ اس نے پورے ہندوستان کو اپنے قبضہ میں کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی پہلی فوجی مہم گجرات کے خلاف تھی جس پر کرن دیو نامی ایک بگھیل راجپوت فرمانروائی کر رہا تھا۔ 1297ء میں علاءالدین نے اپنے بھائی الغ خان کی ماتحتی میں ایک لشکر روانہ کیا جس نے گجرات کو فتح کر کے راجا کی بیوی کملادیوی کو گرفتار کر لیا۔ بعد ازاں یہ خاتون بادشاہ کی معزز شریکِ حیات بنی۔ علاءالدین کو اسی مہم میں ایک غلام ملک کافور حاصل ہوا جو بعد میں اس کی فوج کا ایک عظیم سپہ سالار بنا۔

گجرات کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد علاءالدین خلجی کو رنتھمبور کے مضبوط قلعے پر حملہ کرنے کا جواز مل گیا اور اس نے اپنی فوج اور اسلحہ خانے کا رخ رنتھمبور کی راجپوت ریاست کی طرف موڑ دیا۔ بہانہ صرف یہ تھا کہ اس قلعے کے حکمران ہمیر دیو نے دلی سلطنت کے کچھ باغیوں اور حکومت کے مخالف نو مسلموں کو پناہ دے رکھی ہے۔ 1299ء کے اس حملے میں قلعے والوں نے سلطانی فوج کا زبردست مقابلہ کیا اور قلعہ کا کامیاب دفاع کیا۔ سلطان کے بہادر سپاہیوں کو پسپا ہونا پڑا۔ اس صورت حال کے پیش نظر علاءالدین خود ایک زبردست فوج لے کر میدان میں آیا۔ اس نے براہِ راست خود قلعہ پر لشکر کشی کی اور 1301ء میں ایک سال کے طویل محاصرہ کے بعد رنتھمبور کے اس ناقبلِ تسخیر قلعہ کو بالآخر فتح کر لیا۔

اس کے بعد سلطان نے میواڑ کے راجدھانی چتوڑ پر چڑھائی کی۔ چتوڑ پر حملے کی وجوہات کی تفصیل کسی ہمعصر مورخ کے ذریعے نہیں ملتی، البتہ 1540ء میں ملک محمد جائسی کے ذریعے لکھے گئے من گھڑت افسانے ''پدماوت'' میں علاءالدین کو رانا رتن سنگھ کی رانی پدمنی کے عشق میں گرفتار دکھایا گیا اور یہ کہ وہ بہر صورت اُسے اپنے حرم میں لانا چاہتا تھا۔ لیکن علاءالدین کے قبضے میں آنے سے پہلے ہی دیگر راجپوت خواتین کے ساتھ پدمنی رسمِ جوہر ادا کرتے ہوئے آگ میں جل گئی۔ یہ افسانہ مکمل طور پر فرضی معلوم ہوتا ہے کیوں کہ اس کا ذکر کسی بھی ہم عصر مورخ نے نہیں کیا۔ بہر حال اس موقع پر گورا اور بادل نامی دو راجپوت قائدین نے چتوڑ کا بڑی جرأت مندی سے دفاع کیا لیکن ان کی مزاحمت ناکام رہی۔ 1303ء میں چتوڑ کو فتح کرنے کے بعد مالوہ کی تسخیر عمل میں آئی اور اُجین، مانڈو، اور چندیری کے شہر بھی علاءالدین نے معمولی مزاحمت کے بعد فتح کر لیے۔ اس طرح 1305ء کے اختتام تک علاءالدین خلجی عملاً پورے شمالی ہند کا حکمراں بن گیا تھا۔

9.4.2 جنوبی ہند کی جانب پیش قدمی

شمالی ہند فتح کرنے کے بعد اس نے جنوب کی طرف پیش قدمی کی۔ تخت وتاج کا اصل مالک بننے سے قبل ہی، علاءالدین دیوگیر پر چھاپہ مار چکا تھا جس میں اسے کافی دولت ہاتھ آئی تھی۔ دیوگیر کے رام چندر دیو نے گجرات کے کرن دیو کو پناہ دے رکھی تھی اور وہ تین برسوں سے باج گزاری کی وعدہ کردہ رقم کی ادائیگی کے سلسلے میں شدید کوتاہی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ چنانچہ علاءالدین کو اس پر حملہ کرنے کا بہانہ اور جواز مل گیا۔ اس نے 1307ء میں ملک کافور کی زیر قیادت ایک فوج روانہ کی۔ ملک کافور نے راجا کی سرحدوں میں بے تحاشا تباہی مچائی اور اُسے شکست تسلیم کرنے پر مجبور کیا۔ بالآخر رام چندر دیو سلطان کا تابع اور فرمانبردار بن گیا اور سلطان کو وقت پر خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ دیوگیر کو تابع اور مسخر کر لینے کے بعد ملک کافور کو وارنگل کے کاکتیہ حکمراں پرتاپ رودر دیو کے خلاف روانہ کیا گیا۔ معمولی مزاحمت کے بعد رودر دیو، سلطان کا باج گزار بننے پر راضی ہو گیا۔ ملک کافور کثیر مال و دولت لے کر جس میں ہاتھی اور گھوڑوں کے علاوہ ہیرے موتی اور زر و جواہرات بھی شامل تھے، دوبارہ دہلی روانہ ہوا۔

علاءالدین خلجی کے حکم پر ملک کافور 1310ء میں ایک اور اہم مہم پر روانہ ہوا۔ یہ مہم دوار سمدر کے ہوئے سال حکمراں راجا ویر بلّال کے خلاف تھی۔ کافور کے اچانک حملے نے اُسے بلا مزاحمت ہی دہلی سلطنت کی اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ بعد ازاں ملک کافور دوار سمدر سے کورومنڈل ساحل کی جانب بڑھا۔ اس وقت یہاں پانڈیا راجاؤں کی حکمرانی تھی۔ شاہی خاندان میں تخت کی جنگ کے دوران ایک فریق نے ملک کافور سے مدد طلب کی۔ چنانچہ 1311ء میں کافور مدد کے لیے مدورائی پہنچا اور اس مدد کے عوض میں کافی خزانہ حاصل کر کے دہلی کو واپس ہوا لیکن پھر 1312ء میں رام چندر دیو کے بیٹے شنکر دیو کی سرکوبی کے لیے اسے دیوگیری جانا پڑا۔ شنکر دیو نے اپنے باپ کی طے شدہ خراج کی رقم روک رکھی تھی۔ بالآخر شنکر دیو کو شکست ہوئی اور وہ مارا گیا۔ دکن کی جانب یہ کافور کی آخری مہم تھی اور اس کے ساتھ ہی پہلی بار جنوبی ہند کی طاقتوں نے دہلی کے سلطان کی عظمت اور برتری کا احساس کیا اور اطاعت قبول کی۔

شمالی ہند کے برخلاف، جنوبی ہند کی سرحدوں کو علاءالدین نے اپنی سلطنت میں ضم نہیں کیا بلکہ وہاں کے راجاؤں کو اس بات کا موقع دیا گیا کہ وہ اپنے علاقوں پر حکومت کرتے رہیں اور سلطان کے اقتدار کو تسلیم کرتے ہوئے اُسے سالانہ خراج ادا کرتے رہیں۔ یہ بڑی حد تک ایک دانش مندانہ فیصلہ تھا کیونکہ اُس دور میں جنوب کے دور دراز علاقوں پر کنٹرول قائم رکھنا اور نظم وضبط کو بحال رکھنا قطعاً آسان نہیں تھا۔ اگر جنوبی ہند کے حکمرانوں کو تابع دار نہ رکھا جاتا تو بے چینی اور بے اطمینانی بلکہ ناراضگی کے متعدد مراکز جنم لے لیتے۔

9.5 نظم ونسق

سلطان علاءالدین خلجی نے ایک شورش زدہ سلطنت پر قبضہ کیا تھا۔ اس نے اپنے چچا کو قتل کر کے تخت وتاج حاصل کیا تھا۔ یہ بات گزر چکی ہے کہ ابتدائی سالوں میں اس کو بھی کئی سازشوں اور بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ احوال واسباب کا تجزیہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ دہلی سلطنت میں بدنظمی کے چند بنیادی اسباب ہیں۔

- مرکز کی جانب سے جاسوسی کا ناقص نظام۔
- طبقۂ اشراف کا بکثرت شراب کی لت میں پڑ جانا۔
- امراء کا مضبوط سماجی تعلق اور ان کی آپسی رشتے داری۔
- دولت وثروت کا بعض افراد کے ہاتھوں میں اکٹھا ہو جانا جس کے سبب بغاوت کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

علاءالدین نے غدّاری اور سازشوں کی تہہ تک پہنچنے کے بعد ان کے خاتمے کے لیے بروقت ضروری اور سخت اقدامات کیے۔ پہلا اقدام یہ تھا کہ دولت اکٹھا کرنے کا جو چکر امرا کے درمیان چل رہا تھا اس کو ختم کیا۔ تمام مذہبی اوقاف کا خاتمہ کیا۔ اراضی کی عطیوں اور وظائف کو منسوخ کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر عوام روزی روٹی کی تلاش میں سرگرداں ہو جائیں گے تو بغاوت کا خیال دل میں نہیں لائیں گے۔ دوسرا یہ کہ اس نے جاسوسی کا ایک وسیع تر نظام تشکیل دیا اور واقعہ نویسوں اور جاسوسوں کے ذریعہ لوگوں کے چال چلن پر نظر رکھی۔ کہا جاتا ہے کہ جاسوسوں سے اشراف طبقہ اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ ان کی آپسی گفتگو سرگوشیوں اور اشاروں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ تیسرا قدم یہ اٹھایا کہ اس نے شراب نوشی کے اڈوں کو یکلخت ختم کر دیا۔ کیونکہ اسے یقین تھا کہ یہ مقامات دراصل سازشوں اور بغاوتوں کے گڑھ ہیں۔ چنانچہ اس نے شراب کے استعمال اور اس کے کاروبار کو قطعاً ممنوع قرار دیا اور بذات خود اپنی شراب کو سربازار پھینک کر اور اس کے ظروف کو توڑ کر اس نے ایک عمدہ مثال قائم کی۔ آخری اقدام کے طور پر اس نے گھریلو (گھریلو) اجتماعات اور نجی محفلوں پر پابندی لگادی اور اُس نے اعلیٰ طبقے کے افراد کو سلطان کی اجازت کے بغیر آپس میں شادی بیاہ کرنے سے روک دیا تاکہ مخصوص خاندان کے افراد حکومت کے خلاف متحد نہ ہو سکیں۔ نتیجتاً مرکز کی خوشی ومسرت کی فضاء کے بجائے آپسی بے اعتمادی اور شبہ کے بادل چھا گئے لیکن وقتی طور پر سازشوں کا بازار سرد پڑ گیا۔

علاءالدین خلجی کا اگلا قدم درمیانی اشخاص یا بچولیوں کی قوت اور ان کی آمدنی کو کم کرنا تھا۔ عہدِ وسطیٰ کے ہندوستانی سماج میں ریاست کسانوں سے سیدھے طور پر محصول وصول نہیں کرتی تھی بلکہ یہ کام بچولیے انجام دیتے تھے جنہیں خوط، مقدم اور چودھری کہا جاتا تھا۔ یہ بچولیے دیہی سماج کا ہی حصہ تھے لیکن ریاست کے سماجی ومعاشی نظام میں ان کو خاص مقام حاصل تھا۔ وہ کسانوں سے محصول لے کر اسے مرکز تک پہنچاتے تھے۔ بدلے میں انہیں نقد کمیشن مل جاتا یا پھر خود ان پر عائد ہونے والے محصول میں کمی کر دی جاتی تھی۔

چونکہ یہ لوگ بھی کسان طبقے کا ہی ایک حصہ تھے۔ اصولاً ان پر بھی لازم تھا کہ محصول کا اپنا حصہ بھی ادا کریں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ بچولیے خود اپنے محصول کا بوجھ کسانوں پر ڈالنے لگے۔ اس طرح کسانوں پر محصول کا دوگنا بوجھ پڑنے لگا۔ چونکہ ان پر کوئی مالی ذمہ داری عائد نہیں تھی لہٰذا یہ درمیانی لوگ کافی مال دار ہو گئے تھے۔ ضیاءالدین برنی نے لکھا ہے کہ وہ لوگ اتنے امیر ہو گئے تھے کہ ریشم کا لباس پہنتے، عربی گھوڑوں پر سواری کرتے اور پان چبایا کرتے تھے۔ یہ سب اس عہد میں عیش پرستی کی علامتیں تھیں۔ علاءالدین خلجی نے کچھ ایسا انتظام کیا کہ اب انہیں اپنا بوجھ کسانوں پر ڈالنے کا کوئی موقع نہیں رہا۔ ضیاءالدین برنی مزید رقم طراز ہیں کہ خوط، مقدم اور چودھری علاء الدین کے اقدامات کے بعد اتنے کنگال ہو گئے کہ ان کی بیویاں دوسروں کے گھروں میں خادمائیں بننے پر مجبور ہو گئیں۔ چونکہ محصول وصول

کرنے والے افراد زیادہ تر غیر مسلم تھے جو علاءالدین کے اقدامات سے شدید متاثر ہوئے اس لیے بہت سے مورخین نے ضیاءالدین برنی کی دی ہوئی تفصیلات کے جزوی استعمال کے سبب یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ان اصلاحات کے ذریعہ علاءالدین خلجی ہندوؤں کو زک پہنچانا چاہتا تھا لیکن یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ ان سخت اقدامات کا فائدہ بھی اکثریتی ہندو کسانوں کو ہی ہوا تھا۔ لہٰذا واقعات کی فرقہ وارانہ توجیہہ کرنا درست نہیں ہے۔ غالباً اسی وجہ سے محمد حبیب نے اسے دیہی انقلاب کا نام دیا ہے۔

9.6 علاءالدین خلجی کی معاشی اصلاحات

9.6.1 مالگزاری نظام کی تشکیل

مالگزاری نظام کو نئے سرے سے منظم کرنے سے علاءالدین کا اصل مقصد سلطنت کی آمدنی میں اضافہ اور اپنی عوام کو فاضل دولت سے دور رکھنا تھا تاکہ وہ انقلاب وبغاوت کے بارے میں سوچ ہی نہ سکیں۔ اس نے کسانوں سے سیدھے تعلقات قائم کیے تاکہ وہ اس بات سے واقف رہے کہ مالگزاری کے طور پر وہ کل کتنا ادا کرتے ہیں۔ کسانوں سے راست تعلق کے اس معاملے میں علاءالدین کو دیگر سلاطین دہلی پر اولیت حاصل ہے۔ بہر حال ان اقدامات کے ذریعے علاءالدین اس آمدنی پر بھی کنٹرول کرنا چاہتا تھا جو خوط، مقدم اور چودھری جیسے بچولیے کسانوں سے وصول کر رہے تھے۔ ان تمام مقاصد کے حصول کے لیے علاءالدین نے یہ حکم نامہ جاری کیا کہ پورے دوآب میں ریاست ہی سیدھے طور پر مالگزاری وصول کرے گی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کسی بھی دیہی علاقے کو اقطاع کے طور پر نہیں دیا جائے گا۔ اور دوآب کے علاقے میں حکومت کے کارندے جن کو عامل کہا جاتا تھا، مالگزاری وصول کریں گے۔ البتہ اس کام میں بچولیے عاملوں کا تعاون کریں گے۔ تمام کسانوں پر یہ بات لازم تھی کہ بلا تفریق ورعایت اپنی پیداوار کا نصف حصہ سلطنت کے حوالے کریں اور زمین کی آمدنی، فی بسوا کے حساب سے مقررہ مقدار میں ادا کریں۔ اس ادائیگی میں خوط اور بلہار کے درمیان کوئی امتیاز نہیں تھا۔ ایک دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ تمام دودھ دینے والے مویشیوں کے لیے چراگاہ کا ایک حصہ متعین کیا گیا اور مویشیوں کے مالک سے چرائی محصول وصول کیا جاتا تھا۔ مورخ فرشتہ نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ عام کسانوں اور مقدم دونوں کے لیے مویشیوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد مقرر تھی۔ زراعت کے لیے چار عدد بیل، دو عدد گائیں دو عدد بھینسیں اور ایک درجن بھیڑ بکریاں۔ خراج یا مالگزاری کی وصولی میں یہ اصول پیش نظر رکھا گیا تھا کہ کسی مالدار کا بوجھ کمزور پر نہ پڑے اور معاشی طور پر مضبوط کو غریب کے استحصال کا موقع نہ ملے اور سب پر ایک ہی قانون لاگو ہو۔

9.6.2 علاءالدین کی مارکیٹ کنٹرول پالیسی

اپنی ریاست میں بازار کی قیمتوں پر قابو پانا علاءالدین کے اہم ترین تجربات میں سے ایک تھا۔ چتوڑ کی مہم سے واپسی کے بعد اُس نے احکامات کا ایک سلسلہ جاری کیا۔ ان احکامات کے ذریعے اس نے غلّے سے لے کر گھوڑوں تک اور مویشیوں اور غلاموں سے لے کر قیمتی بیرونی ممالک کے کپڑوں تک تمام اشیاء کی قیمتوں کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی۔ اس مقصد کے لیے اس نے دہلی میں تین قسم کے بازار قائم کیے۔

- ایک منڈی غذائی اجناس سے متعلق تھی۔

- دوسری مویشیوں، گھوڑوں اور غلاموں سے متعلق تھی۔
- تیسری منڈی قیمتی اشیا سے متعلق تھی جس میں بیرونی ملبوسات بھی شامل تھے۔

سلطان علاءالدین خلجی کے لیے کھانے پینے کی قیمتوں پر کنٹرول رکھنا خصوصی توجہ کا طالب تھا کیونکہ شہروں میں کم قیمت پر غلّے کی فراہمی کے بغیر نہ تو داموں پر قابو رکھنا ممکن تھا اور نہ ہی یہ بات آسان تھی کہ رعایا اور سپاہیوں کی وفاداری کو برقرار رکھا جاسکے۔ علاءالدین خلجی کی مارکیٹ کنٹرول پالیسی کا اہم پہلو یہ ہے کہ اس نے یہ کام بڑی خوبی اور کمال کے ساتھ انجام دیا۔ دوآب یعنی دہلی تا اودھ کے علاقے کے کسانوں کو یہ حکم دیا کہ وہ حکومت کی مقرر کردہ شرح پر زمین کی مالگزاری بصورت جنس ادا کریں۔ غلّے کے تحفظ اور ذخیرے کے لیے شہروں میں گودام قائم کیے اور غلّے کی منتقلی کا کام بنجاروں کے ذمے کیا گیا۔ دکانداروں کو پابند کیا گیا کہ وہ قیمت میں ذرا بھی اضافہ نہ کریں۔ اپنے ان احکامات کی خلاف ورزی کو روکنے کے لیے اس نے اپنے آپ کو تمام معاملات سے باخبر رکھا۔ زیادہ قیمتوں، غلط اور ناقص پیمانہ جات نیز کاروبار میں دھوکہ دہی پر اس نے سخت سزائیں دیں۔ ضیاءالدین برنی نے لکھا ہے کہ قحط سالی کے زمانے میں بھی کسی کو ایک جیتل کا معمولی فرق کرنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ اس عہد میں اشیا، جانوروں اور غلاموں کی بازاری قیمتوں کی برنی نے جو فہرست دی ہے وہ کچھ اس طرح ہے:

اشیا کی قیمتیں		جانوروں کی قیمتیں		غلاموں کی قیمتیں	
گیہوں	7.5 جیتل فی من	اول قسم کا گھوڑا	100 سے 120 ٹنکہ	خوبصورت اور باصلاحیت	
جو	4 جیتل فی من	دوسری قسم کا گھوڑا	80 سے 90 ٹنکہ	جوان غلام	20 سے 30 ٹنکہ
چاول	5 جیتل فی من	تیسری قسم کا گھوڑا	50 سے 70 ٹنکہ	خوبصورت لونڈی	20 سے 30 ٹنکہ
ماش	5 جیتل فی من	معمولی ٹٹو	16 سے 25 ٹنکہ	باصلاحیت جوان غلام	10 سے 15 ٹنکہ
		بیل بوجھ ڈھونے والا	4 سے 5 ٹنکہ	باصلاحیت غلام	7 سے 8 ٹنکہ
		گائے دودھ کے لیے	3 سے 4 ٹنکہ	گھریلو کام کاج کے غلام	5 سے 12 ٹنکہ
		گائے بیل برائے گوشت	1.5 سے 2 ٹنکہ		
		بھینس دودھ کے لیے	10 سے 12 ٹنکہ		
		بھینس برائے گوشت	5 سے 6 ٹنکہ		

اشیاء خوردنی کی قیمتوں پر کنٹرول کے ساتھ ساتھ سلطان کے لیے یہ بات بھی اہم تھی کہ اسے گھوڑے واجبی داموں پر حاصل ہوں۔ اس کی فوج کے استحکام اور عمدہ کارکردگی کے لیے یہ بات بہت ضروری تھی۔ گجرات کی فتح کے نتیجے میں گھوڑوں کی رسد میں کافی بہتری آئی تھی۔ ایک اول درجہ کے گھوڑے کی قیمت جو علاءالدین نے مقرر کی تھی وہ کم و بیش سو یا ایک سو بیس ٹنکا یا اس کے مماثل تھی۔ مویشیوں اور غلاموں کی قیمتوں کو انتہائی باقاعدگی کے ساتھ منظم کیا گیا تھا۔ برنی کی قیمتوں کی فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی دور وسطیٰ میں غلاموں کی خرید و فروخت کا عام رواج تھا۔ سلطان کے لیے دیگر اشیا کی قیمتوں مثلاً کپڑوں اور عطریات پر کنٹرول رکھنا زیادہ اہم نہیں تھا لیکن ان کی قیمتیں بھی متعین کر دی گئی تھیں۔ کیونکہ اس بات کا امکان تھا کہ اگر ان اشیاء کے دام بڑھ جائیں تو دوسری اشیا کی قیمتوں کا توازن بگڑ سکتا

ہے۔ کپڑے وغیرہ کی قیمتوں کا تعین شاید اس لیے کیا گیا تھا کہ طبقۂ اشراف کو مطمئن اور خوش رکھا جائے جو کہ اس نوع کی اشیا کے بڑے خریدار تھے۔ تاہم یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان چیزوں کے دام مقرر کرنے میں تاجروں کو نسبتاً زیادہ آزادی حاصل تھی۔

عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ اشیاء کی قیمتیں متعین کرنے کے پس پردہ علاءالدین کی یہ خواہش تھی کہ فوجیوں کو معمولی تنخواہ پر بھرتی کیا جاتا ہے۔ دور وسطیٰ میں عام طور پر دائمی اور مستقل فوج کی حیثیت سے حکومت کے یہاں ایک معمولی سا دستہ ہوتا تھا۔ البتہ جنگوں کے موقع پر کرائے کے فوجیوں کو بھرتی کر لیا جاتا تھا اور مالِ غنیمت کا کچھ حصہ ان کو دے دیا جاتا تھا (گویا یہ ان کی آمدنی یا تنخواہ تھی)۔ علاءالدین خلجی دہلی سلطنت کا وہ پہلا حکمراں ہے جس نے اپنے سپاہیوں کو تنخواہ پر رکھا تھا۔ ایک گھڑ سوار سالانہ 238 ٹنکا بطور تنخواہ پاتا تھا تاکہ وہ اس رقم کے ذریعہ اپنا اور اپنے گھوڑے کا خرچ صحیح سے پورا کر سکے۔ اس تنخواہ کو بالکل معمولی نہیں سمجھا جا سکتا کیونکہ شہنشاہ اکبر کے دور میں جبکہ اشیا کی قیمتیں سستی نہ تھیں ایک مغل گھڑ سوار کا ماہانہ بھتہ صرف 20 روپے تھا۔ بہر حال تیرہویں اور چودھویں صدی عیسوی کے دوران ایک ترک سوار کو تقریباً ایک معزز شخص کی حیثیت حاصل تھی اور اس کی تنخواہ ایک باعزت زندگی کے لیے کافی تھی۔ ان ہی امور کے پیش نظر بازاروں پر یعنی اشیائے خرید و فروخت پر کنٹرول رکھنا ضروری تھا تاکہ فوجی اپنی مقررہ تنخواہ پر بآسانی زندگی بسر کر سکیں۔

9.6.3 مارکیٹ کنٹرول پالیسی کے مقاصد

ہمعصر مورخ ضیاءالدین برنی کے خیال میں بازاروں کو کنٹرول کرنے کے پیچھے علاءالدین کا خاص مقصد یہ تھا کہ ہندوؤں کو سزا دی جائے کیونکہ زیادہ تر تاجر ہندو ہی تھے اور انہوں نے ہی اشیائے خورد و نوش وغیرہ میں زیادہ سے زیادہ نفع خوری کو اختیار کیا ہوا تھا۔ تاہم یہ بات قابل ذکر ہے کہ زمینی تجارت کا بیشتر حصہ جو مغربی ایشیا سے لے کر وسطی ایشیا تک پھیلا ہوا تھا وہ خراسانیوں اور ملتانیوں کے ہاتھ میں تھا جن میں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ علاءالدین کے قیمتوں پر نگرانی کے عمل کا اثر سوداگروں کے ان مسلم طبقات تک بھی پہنچنا لازم تھا لیکن پتہ نہیں کیوں برنی نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ بہر حال اول تو یہ بات ناقابل فہم ہے کہ کسی خاص گروہ کو ہی کیوں کر نشانہ سمجھا جائے۔ دوسرے یہ کہ یہ بھی واضح نہ ہو سکا کہ آیا قیمتوں کے تعین کا معاملہ مرکزی علاقہ دہلی ہی تک محدود تھا یا پھر سلطنت کے دیگر علاقے بھی اس قانون کی زد میں براہِ راست آتے تھے۔ ضیاءالدین برنی نے اتنا تو ضرور بتایا ہے کہ یہ قوانین دہلی میں نافذ ہیں پر عمل کارجحان دیگر بستیوں میں بھی ہمیشہ پایا جاتا تھا۔ سلطان کی فوج صرف مرکزی علاقہ دہلی تک تو محدود نہیں تھی ریاست کے دیگر علاقوں میں بھی فوج کا قیام رہتا تھا۔ اگر قیمتوں سے متعلق قواعد فوج کی خاطر تھے تو پھر لازم ہے کہ دہلی کے علاوہ وہ دیگر علاقوں پر بھی نافذ ہوں۔ تاریخی مواد کی کم یابی کے باعث یقین سے اس معاملے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ البتہ تاجروں نے قیمتوں پر سخت نگرانی کے سلسلہ میں شکایات ضرور کی ہوں گی لیکن اشیاء خوردنی اور دیگر اشیاء کی ارزانی کے سبب نہ صرف فوج کو بلکہ بلالحاظ مذہب وملت سارے شہریوں کو براہِ راست فائدہ پہنچا ہوگا۔ علاءالدین کی وفات کے ساتھ ہی بازاری اصلاحات کا یہ معاملہ رفتہ رفتہ ختم ہو گیا لیکن اس کی زرعی اصلاحات جو اپنی نوعیت میں زیادہ مستقل اور پائدار تھیں برقرار رہیں۔ اس کی وفات کے بعد اس کے کچھ جانشینوں نے بھی اس کے مذکورہ اقدامات کو جاری رکھا۔ چنانچہ یہ کہنا قطعاً بے بنیاد نہیں ہوگا کہ بعد کے ادوار میں شیر شاہ سوری اور اکبر کی اصلاحات کے لیے علاءالدین کے اقدامات یقیناً بنیاد ثابت ہوئے ہوں گے۔

سلطان علاءالدین کے آخری ایام پریشانی میں گزرے۔ ملک کافور جو کبھی سلطان کا سپہ سالار تھا ان دنوں بڑا بااثر ہو گیا اور خود سلطان کو اس کے بے جا حرکتوں کا شکار بننا پڑا۔ کافور نے سلطان کے قابل مشیروں کو مرواڈالا یا قید کر دیا۔ گجرات اور دکن کے علاقوں میں بغاوتیں پھوٹ پڑیں اور چتوڑ پر راجپوت دوبارہ قابض ہو گئے۔ علاءالدین خلجی کی وفات کے بعد اقتدار کے لیے حسب معمول خونریز کشمکش شروع ہو گئی۔ عارضی طور پر امور حکومت ملک کافور کے ہاتھوں میں آ گئے تھے جس نے تخت سلطنت پر مرحوم سلطان کے شیر خوار لڑکے شہاب الدین کو بٹھادیا اور اس طرح (بالواسطہ لیکن) حقیقی طور پر مقتدر اعلیٰ بن بیٹھا۔ اس نے علاءالدین کے بڑے بیٹے خضر خان کو اندھا کر دیا اور شاہی خاندان کے متعدد افراد کو یا تو قتل کر دیا یا قید کر دیا لیکن محل کے غلام محافظین اس کی حکومت کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے اور شیر خوار بچے کے نام پر چلنے والی یہ حکومت محض 35 دنوں بعد ہی اختتام پذیر ہو گئی۔

ہمعصر مورخین نے علاءالدین خلجی کے دور کو خوب سراہا ہے۔ ابن بطوطہ نے ایک بہترین سلطان کے طور پر اس کا حوالہ دیا ہے اور ضیاءالدین برنی لکھتا ہے ''کہ اس کے دور حکمرانی میں ایسے کئی واقعات ظہور پذیر ہوئے جو کہیں نہ سننے میں آئے نہ دیکھنے میں اور شاید ایسے قابل دید و شنید حالات پھر کبھی رونما نہ ہو سکیں۔'' بلاشبہ علاءالدین خود اپنی مملکت کی ضروریات سے پوری طرح واقف تھا۔ اس نے جدید نظم و نسق کو ان کی تکمیل کے لیے لگا دیا۔ اس کے کام خود اس کے تخلیق کردہ تھے اور ایک تعمیری تدبر کا اس نے مظاہرہ کیا۔ بازار اور اس کی قیمتوں پر کامیاب کنٹرول اس کا منفرد تجربہ ہے جس کی کوئی نظیر ہندوستان کے عہد وسطیٰ میں نہیں ملتی۔ اس نے مذہب کو سیاست کے چنگل سے آزاد کیا اور نظم و نسق کو علماء کے اثر سے دور رکھا۔ اس نے علائی دروازے کی شکل میں فن تعمیر کو ایک نیا روپ بخشا۔ اسی کے کارہائے نمایاں کے سبب خلجی خاندان اصلاً ممتاز ہے اور کوئی حکمران اس کا ہم پلہ نہیں ہے۔

9.7 سلطان قطب الدین مبارک خلجی (1316-1320)

سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی، سلطان علاءالدین خلجی کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ وہ دیوگیری کے راجا رام چندر کی بیٹی جٹیا پالی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ علاءالدین کی وفات کے بعد جب ملک کافور نے اقتدار اپنے ہاتھ میں لیا تو اس نے مبارک خلجی کو گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا۔ بالآخر سلطان علاءالدین خلجی کے محافظ دستے کے سپاہیوں نے جنہیں پاٹک کہا جاتا تھا، ملک کافور کو قتل کر دیا اور مبارک خلجی کو قید سے آزاد کرایا۔ چونکہ ملک کافور کے قتل کے بعد نائب ملک یا ریجنٹ کا عہدہ خالی تھا، امراء نے مبارک خلجی کو نائب مملکت کی حیثیت دی۔ چند ہفتوں نائب کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد شہاب الدین کو قید کر کے گوالیار بھیج دیا اور 18 اپریل 1316ء کو بڑے تزک و احتشام سے مبارک خلجی، سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے لقب کے ساتھ دہلی سلطنت کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔

ضیاءالدین برنی لکھتا ہے کہ ''اپنی تخت نشینی کے وقت اس نے ایک صالح شہزادہ ہونے کا ثبوت دیا'' اپنی تخت نشینی کے پہلے دن ہی اس نے تمام قیدیوں کو جن کی تعداد تقریباً سترہ ہزار تھی آزاد کرنے کا حکم دیا۔ ان میں سیاسی جرائم پیشہ اور رشوت خور بھی تھے۔ وہ تمام رہا کیے گئے قیدی نئے سلطان کے مشکور ہوئے۔ مبارک خلجی نے اپنے والد کے سخت ضوابط کو منسوخ کیا۔ ضبط کی ہوئی تمام زمینیں ان کے مالکوں کے

حوالے کروائیں اور بازار کی قیمتوں پر کنٹرول کے نظام کو کالعدم قرار دیا۔ ضرورت مندوں کی درخواستیں جسے علاءالدین نے قبول کرنے سے منع کیا تھا دوبارہ لیے جانے کا حکم دیا۔ اس کے عہد میں سیدوں اور علماء کے عطیات میں اضافہ ہوا۔ سپاہیوں کی تنخواہیں بڑھائی گئیں۔ سلطان نے تمام بھاری ٹیکسوں کو معاف کر دیا اور سخت مطالبات کو ختم کر دیا۔ ضیاءالدین برنی لکھتا ہے کہ ''سلطان قطب الدین نے علاءالدین کے کسی بھی قانون یا ضابطے کا نفاذ نہیں کیا۔'' اس نے کچھ نئی تقرریاں بھی کیں اور نئے خطابات بھی عطا کیے۔ ملک دینار کو ظفر خان کا خطاب دیا۔ اس کی کچھ مہموں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اس نے اپنے ایک عہدے دار 'عین الملک' کے ذریعہ گجرات کی بغاوت کو فرو کیا۔ پھر اس نے اپنی افواج کا رخ دکن کی جانب کیا اور دیوگیر کے باغی راجا ہرپال کو شکست دے کر اسے دہلی سلطنت میں شامل کر لیا۔

دہلی واپس آنے کے بعد وہ بڑی کمزوریوں کا شکار ہو گیا۔ سلطنت کے تمام امور ایک نو مسلم کے ہاتھ میں دے دیے۔ اس نو مسلم کو اس نے خسرو خان کے لقب سے نواز کر بااختیار بنایا۔ یہ شخص مبارک کے سارے جرائم اور غلطیوں میں شریک تھا۔ اسی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے 1320 میں اپنے آقا کو قتل کر کے خود حکومت پر قبضہ کر لیا اور اس طرح خلجی خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ اس نے اپنے لیے نصیر الدین خسرو شاہ کا خطاب اختیار کیا۔ دہلی کے رذیل لوگ اس کے مددگار تھے اور کوئی پانچ ماہ تک یہ شہر بدامنی کا گہوارہ رہا۔ تاہم یہ افراتفری زیادہ دنوں باقی نہیں رہی۔ پنجاب کے گورنر غازی خان تغلق نے جو تاریخ میں غیاث الدین تغلق کے نام سے مشہور ہے، قدیم امرا طبقے کے تعاون سے خسرو شاہ کے خلاف پیش قدمی کی اور 1320ء میں اسے شکست دے کر قتل کر دیا۔ اب چونکہ خلجی خاندان کا کوئی فرد باقی نہیں تھا اس لیے امیروں نے غازی خان تغلق ہی کو تخت سلطانی پر مسند آرا کیا اور اس کے ساتھ تغلق خاندان کی حکومت کا آغاز ہوا۔

9.8 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

خلجی حکمرانوں نے 1290ء سے 1320ء تک دہلی پر حکومت کی۔ یہ اصلاً وسط ایشیا کے باشندے تھے۔ خاندان غلامان کے زوال کے زمانے میں کیقباد نے ملک فیروز کو ''عارض ممالک'' کے طور پر مقرر کیا تھا۔ ادھر بلبن کے جانشینوں کی نااہلی سے جو سیاسی خلا پیدا ہوا، اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ملک فیروز نے تخت سنبھال لیا۔ اس نے جلال الدین فیروز شاہ کا لقب اختیار کیا اور 1296ء تک دہلی کی سلطنت پر حکومت کرتا رہا۔ اس کے بھتیجے اور داماد علاءالدین خلجی نے سازش کے ذریعہ اپنے چچا کا کام تمام کیا اور سلطان بن گیا۔ علاءالدین کے دور حکمرانی کو خلجی سلاطین کا سنہرا دور کہا جاتا ہے۔ اس کی مالگزاری اور اشیاء کی قیمتوں سے متعلق اصلاحات تاریخ ساز ہیں۔ اس کے نظم و نسق میں تخلیقی جدت پسندی اس کی امتیازی شان ہے۔ ملک کافور علاءالدین کا انتہائی بھروسہ مند سپہ سالار تھا۔ علاءالدین کی وفات کے بعد اس نے شہاب الدین عمر کو جانشین بناتے ہوئے اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی لیکن خود ملک کافور کے ایک کارندے نے اسے ہلاک کر دیا۔ ملک کافور کے بعد علاءالدین کے ایک اور بیٹے مبارک خلجی نے عمر کو تخت سے دست بردار کر دیا اور 1316ء میں خود اقتدار سنبھال لیا۔ اس نے قطب الدین مبارک شاہ کے لقب سے حکومت کی تھی۔ اس کے آخری دور حکومت میں حقیقی اقتدار دراصل خسرو خان کے ہاتھ میں تھا جو کہ ایک معمولی ذات کا نو مسلم غلام تھا۔ مبارک نے اپنے شب و روز شراب و کباب اور رنگ رلیوں میں گزارنے شروع کر دیے۔ ان حالات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے خسرو نے مبارک شاہ کو ٹھکانے لگا دیا اور خود سلطان بن بیٹھا۔ اس طرح خلجی دور کا پوری طرح خاتمہ ہو گیا۔

9.9 کلیدی الفاظ (Keywords)

سرِ جاندار	:	شاہی حفاظتی دستہ کا سالارِ اعلیٰ
عارض ممالک	:	عہدِ سلطنت میں تمام فوجی اور عسکری معاملات کی نگرانی کرنے والا افسر
نائب امیرِ حاجب	:	عہدِ سلطنت میں شاہی اور درباری امور کی دیکھ ریکھ کرنے والا نائب افسر
مالِ غنیمت	:	کسی جنگ میں جیتنے والی فوج کو ہارنے والے سے حاصل ہونے والا ساز و سامان
خمس	:	مال غنیمت کا پانچواں حصہ
اقطاع	:	زمین کا وہ ٹکڑا جس کی آمدنی کسی عہدیدار کو اس کی خدمت کے بدلے میں دی جاتی تھی۔
عامل	:	محصول کی وصولی پر مامور حکومتی کارندہ یا سرکاری افسر
خوط، مقدم	:	گاؤں کا مکھیا یا چودھری جو حکومت اور کسان کے درمیان بچولیے کا کام کرتا تھا۔
پاٹک	:	سلطان کے درباری محافظ یا باڈی گارڈ
اشرافیہ طبقہ	:	عہد وسطی کے ہندوستان میں اعلیٰ حسب و نسب والے لوگ
فصیل	:	قلعے کی چہار دیواری
اوقاف	:	وقف کی جمع، وہ جائداد جو مذہبی یا رفاہی کاموں کے لیے عطیہ کی جائے۔
وظائف	:	وظیفے کی جمع، وہ تنخواہ یا مشاہرہ جو کسی فرد کو مذہبی یا سماجی خدمات کے عوض دیا جائے۔

9.10 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

9.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. خلجی خاندان (Khalji Dynasty) کا بانی کون تھا؟

(a) جلال الدین خلجی (b) علاؤالدین خلجی (c) قطب الدین مبارک شاہ (d) غیاث الدین تغلق

2. ملک چھجو (Malik Chhajju) کون تھا؟

(a) جلال الدین خلجی کا بھتیجا اور صوبیدار (b) علاؤالدین خلجی کا بھائی

(c) بلبن کا وزیر (d) محمد تغلق کا سپہ سالار

3. کملادیوی (Kamala Devi) کون تھی؟

(a) علاؤالدین خلجی کی بیوی (b) رانی کرن دیو کی بیوی (c) رانی کرن دیو کی والدہ (d) دیوگیر کے حکمران کی بیٹی

4. ملک کافور (Malik Kafur) کے حملے کے وقت دیوگیر کا حکمراں کون تھا؟

(a) رام چندر دیو (b) ہرپال دیو (c) سنگھنا دوم (d) رتن سنگھ

5. خلجی خاندان (Khalji Dynasty) کا آخری حکمران کون تھا؟

(a) جلال الدین خلجی (b) علاؤالدین خلجی (c) قطب الدین مبارک شاہ (d) خسرو خان

9.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. خلجی حکومت کے قیام میں جلال الدین خلجی کے کردار بیان کیجیے۔
2. ملک چھجو کی بغاوت پر روشنی ڈالیے۔
3. جلال الدین خلجی نے منگول حملوں کا انسداد کیسے کیا تھا؟
4. رنتھمبور پر جلال الدین فیروز کی کاروائی کا جائزہ لیں گے۔
5. علاء الدین خلجی کے مالگزاری نظام کی وضاحت کیجیے۔

9.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. سلطان فیروز خلجی کی عسکری مہمات کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔
2. علاء الدین خلجی کی مارکیٹ کنٹرول پالیسی پر اظہار خیال فرمائیں؟
3. سلطان قطب الدین مبارک خلجی کے عہد حکومت پر تفصیل سے روشنی ڈالیے۔

Answer Key:
1. (a) | 2. (a) | 3. (b) | 4. (a) | 5. (d)

اکائی 10۔ تغلق خاندان

(The Tughlaqs)

اکائی کے اجزا

10.0		تمہید
10.1		مقاصد
10.2		سلطان غیاث الدین تغلق
	10.2.1	ابتدائی حالات
	10.2.3	نظم ونسق کی بحالی
	10.2.2	سیاسی مسائل
10.3		سلطان محمد بن تغلق
	10.3.1	ابتدائی حالات اور تخت نشینی
	10.3.2	مسائل اور ان کا حل
	10.3.3	دکن پالیسی اور اقتدار کا انتہائے عروج
	10.3.4	سیاسی اور انتظامی منصوبہ بندیاں
10.4		سلطان فیروز شاہ تغلق
	10.4.1	ابتدائی حالات
	10.4.2	زرعی اصلاحات
	10.4.3	آب پاشی ذرائع کی مرمت اور تعمیر
	10.4.4	شہر کاری اور فن تعمیر
	10.4.4	غلامی کا نظام
	10.6.5	رفاہی اصلاحات
	14.4.6	فیروز شاہ تغلق کے عہدِ حکومت کا جائزہ

10.5 اکتسابی نتائج
10.6 کلیدی الفاظ
10.7 نمونہ امتحانی سوالات

10.0 تمہید (Introduction)

چودھویں صدی کے اوائل میں خلجی خاندان کے زوال کے بعد دہلی سلطنت پر ایک ایسا خاندان تخت نشین ہوا جس کو اس عہد کے دانشوروں امیر خسرو اور ابنِ بطوطہ نے تغلق خاندان کے نام سے موسوم کیا ہے۔ 1321ء میں غیاث الدین تغلق کی تخت نشینی سے تغلق دور کا آغاز ہوتا ہے۔ شمس سراج عفیف اور ابنِ بطوطہ نے لکھا ہے کہ تغلق خاندان علاءالدین خلجی کے زمانے میں ہندوستان آیا تھا۔ ایک تاریخی روایت کے مطابق غیاث الدین تغلق، سلطان بلبن کے ایک ترک غلام کا بیٹا تھا جبکہ اس کی ماں ہندو جاٹ خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اس نے خود کو خلجی سلاطین کے عہد میں ایک لائق اور قابل اعتماد سپاہی ثابت کیا اور ترقی کرتے ہوئے پنجاب کا صوبے دار بنا۔ پنجاب کے گورنر کی حیثیت سے اس نے منگولوں کے حملوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور انہیں دہلی سلطنت کی حدود میں داخل ہونے سے روکے رکھا اور بالآخر انہیں مار بھگانے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ تخت نشینی کے بعد اس نے لوگوں کا بھرپور اعتماد حاصل کیا اور اپنی ریاست کو مضبوطی اور استحکام فراہم کیا۔ دہلی کے قریب تغلق آباد کے نام سے اس نے ایک مضبوط قلعہ بھی تعمیر کروایا۔ تغلق حکمرانوں نے شمال مغربی سرحدوں پر فوجی چوکیاں قائم کر کے انہیں مزید مضبوط کیا تاکہ منگولوں کی جانب سے بار بار ہونے والے حملوں کا کامیابی سے دفاع کیا جاسکے۔ اس کے علاوہ ملک کے ایک بڑے حصے میں سیاسی انتشار کا خاتمہ کر کے ایک مضبوط مرکزی حکومت قائم کی۔ تغلق خاندان میں تین اہم اور قابل سلاطین ہوئے ہیں ایک خود غیاث الدین تغلق، دوسرا اس کا بیٹا محمد بن تغلق اور تیسرا اس کا بھتیجا فیروز شاہ تغلق۔ پہلے دو سلاطین نے ایک ایسی سلطنت قائم کی جو کم و بیش پورے ملک پر محیط تھی۔

10.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- تغلق سلطنت کے آغاز وارتقا کے اسباب کو جان سکیں گے۔
- محمد بن تغلق کی معاشی وزرعی پالیسی سے واقف ہو سکیں گے۔
- فیروز شاہ تغلق کے دور میں ہونے والی زرعی اصلاحات کا جائزہ لے سکیں گے۔
- تغلق عہد میں آب پاشی کے نظام (نہروں) کی تعمیر کے بارے میں جان سکیں گے۔
- تغلق عہد کی تعمیری و تہذیبی سرگرمیوں پر گفتگو کر سکیں گے۔
- تغلق سلطنت کے زوال کے اسباب سے واقف ہو سکیں گے۔

10.2 غیاث الدین تغلق

10.2.1 ابتدائی حالات

غازی ملک یا تغلق غازی کو جو بعد میں غیاث الدین تغلق کے نام سے مشہور ہوا ہندوستان میں تغلق خاندان کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔ سلطان غیاث الدین تغلق کے سلسلۂ نسب کے بارے میں مورخین میں کافی اختلاف ہے۔ابنِ بطوطہ نے ملتان کے صوفی بزرگ شیخ رکن الدین کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ''تغلق کا تعلق ترکوں کے قرونہ قبیلے سے تھا جو ترکستان اور سندھ کے درمیان پہاڑی علاقہ میں آباد تھا۔''تغلقوں کو مارکوپولو نے مخلوط نسل کا بتایا ہے جن کے باپ تاتاری اور مائیں ہندوستانی تھیں۔ فرشتہ کہتا ہے کہ ''غیاث الدین کا باپ، ملک تغلق، سلطان بلبن کا ایک ترکی غلام تھا اور اس کی ماں ایک مقامی جاٹ خاندان کی عورت تھی۔''بہر حال تغلق نے اس بات کا اقرار کیا تھا کہ وہ ابتداء میں کسی اہمیت کا حامل شخص نہیں تھا۔ غالباً وہ ہندوستان میں پیدا ہوا تھا۔ خسرو کے مطابق جلال الدین خلجی کے انتقال کے بعد ملک تغلق کسی خاص عہدے پر نہیں تھا۔ اس نے علاءالدین کے بھائی الغ خان کی ملازمت اختیار کی اور اس کا ملازمِ خاص بن گیا۔ الغ خان کے انتقال کے بعد وہ علاءالدین خلجی کی ملازمت میں آگیا۔ علاءالدین خلجی کے عہد میں ترقی کرتے ہوئے وہ کئی اہم عہدوں پر فائز ہوا۔ اس نے جلد ہی سلطان کو اپنی شجاعت، بہادری اور عسکری ہنر مندی سے متاثر کیا۔ اسے سرحدی علاقوں کا مشکل ترین انتظام و انصرام سونپا گیا۔ اس نے انتہائی دانشمندی اور حسن اسلوبی سے اسے انجام دیا۔ اس نے پہلے ملتان اور دیپال پور کے گورنر کی حیثیت سے عمدہ خدمات انجام دیں اور منگولوں کے حملوں کا کامیابی کے ساتھ دفاع کیا۔ سرحدی شہروں کی بہترین قلعہ بندی کی۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ ''اس نے ملتان کی ایک مسجد میں ایک کتبہ دیکھا تھا جس میں منگولوں کے خلاف اس کی 29 فتوحات کا ذکر ملتا ہے لیکن امیر خسرو نے صرف اٹھارہ فتوحات کا ہی ذکر کیا ہے۔ بہر حال ان کامیاب کاروائیوں سے اس کی انتظامی صلاحیتوں، عسکری مہارتوں اور حسنِ تدبیر کا پتہ چلتا ہے۔

وہ اپنے سلطان علاؤالدین خلجی سے مکمل وفادار تھا۔ اپنی تخت نشینی کے موقعے پر اس نے اپنے ساتھیوں سے اس بات کا برملا اظہار کیا کہ ''سلطان کی عنایتوں کی وجہ سے ہی اسے یہ مقام حاصل ہوا ہے۔''مبارک خلجی نے بھی اس کی اعلیٰ خدمات کا اعتراف کیا اور اس کے سابقہ عہدوں پر اس کو قائم رکھا۔ قطب الدین مبارک خلجی کے دور میں غازی تغلق نے قابلِ ستائش سفارتی خدمات بھی انجام دی تھیں۔ بالآخر ناصر الدین خسرو خان کے خلاف جنگی مہم میں بھی اس نے بڑی ہوشیاری اور جوانمردی سے ایک نڈر اور پختہ تجربہ کار قائد کی حیثیت سے اپنا لوہا منوایا۔ چنانچہ امراء نے نئے سلطان کے عہدے کے لیے غازی ملک کا انتخاب کیا۔ غازی ملک نے غیاث الدین تغلق کا لقب اختیار کیا۔

10.2.3 نظم و نسق کی بحالی

تخت نشینی کے وقت انتظامی اور مالی حالات خستہ تھے۔ افسروں اور ماتحتوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے رشوتیں دی گئی تھی۔ روپیوں کی بے تحاشہ تقسیم سے خزانہ خالی ہو گیا تھا۔ علاءالدین خلجی کا قائم کردہ محصول اور بازار کا نظام درہم برہم ہو گیا تھا۔ چنانچہ حکومت کے مالی نظام کو شدید نقصان پہونچا تھا۔ غیاث الدین نے جلد ہی صورتِ حال کا درست اندازہ لگایا اور انتہائی موزوں اور جرأت مندانہ اقدامات

کے ذریعے سلطنت کی سیاسی، معاشی اور انتظامی رفتار کو معمول پر لے آیا۔ برنی لکھتا ہے کہ ''جس کام کو انجام دینے میں دوسروں کو سالوں کی ضرورت ہوتی وہ اس کو دنوں میں کر دیتا۔''اس نے جلد ہی ایک ایسی مضبوط اور چاق و چوبند انتظامیہ قائم کیا جس نے لوگوں کے لیے امن اور خوش حالی فراہم کی ضیاءالدین برنی کے مطابق ''لوگ یہ محسوس کرنے لگے کہ گویا علاءالدین دوبارہ زندہ ہو گیا ہے۔ ''

تخت نشینی کے بعد جلد ہی اس نے اپنی توجہ اپنے خالی خزانے کی بحالی، ریاستی مالیات کی فراہمی اور اس کو نئے سرے سے منظم کرنے پر مبذول کی۔ اس نے محصول کے نظام میں ایک متوازن اور اعتدال پسند طریقہ اختیار کیا جس میں علاءالدین خلجی کے نظام کی سختی اور مبارک خلجی کے عہد کا ڈھیلا پن ہر گز نہ تھا بلکہ اس نے ایک درمیانہ راستہ اختیار کیا۔ اس نے مقطیوں، مقدموں اور کسانوں کے ساتھ اس طرح کے سلوک کا حکم دیا کہ وہ نہ تو بہت زیادہ دولت منداور باغی ہو جائیں اور نہ ہی بالکل مفلس ہو جائیں۔ غیاث الدین تغلق نے محصول کے معاملات کو سختی کے ساتھ مگر ہمدردی سے حل کرنے کی ایک کامیاب اور سنجیدہ کوشش کی۔ اس نے کوشش کی تھی کہ 1/10 یا 1/11 سے زیادہ محصول میں اضافہ نہ کیا جائے۔ اس سے کسانوں کو راحت ملنے اور مالیات بحال ہونے کی توقع تھی۔ افسروں کو ہدایت دی کہ زراعت میں ہر سال اضافہ ہونا چاہئے اور اسی تناسب میں محصول بھی بڑھنا چاہیے۔ سلطان کی معاشی تدابیر سے شاہی خزانے کی آمدنی کافی بڑھ گئی اور سلطان کو اپنی سیاسی اور انتظامی اسکیموں پر عمل کرنے کا بھرپور موقعہ ملا۔

سلطان غیاث الدین ایک تجربہ کار آزمودہ فوجی رہنما تھا اس نے اپنی فوج کو موثر طور پر نئے سرے سے منظم کیا۔ اس کی عسکری پالیسی کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ اپنے سپاہیوں کو معاشی اور دیگر لحاظ سے مطمئن رکھا جائے۔ گھوڑوں کی حفاظت کے لیے اس نے حلیہ اور داغ سے متعلق علاءالدین خلجی کے ضوابط کا سختی سے نفاذ کیا۔

10.2.2 سیاسی مسائل

غازی ملک یعنی غیاث الدین تغلق جو سلطنت ملی تھی وسیع ہونے کی وجہ سے بہت سے مسائل سے گھری ہوئی تھی۔ کئی صوبوں میں بغاوتیں ہو رہی تھیں۔ سندھ پر برائے نام ہی کنٹرول تھا۔ مرکز کی پریشانیوں سے فائدہ اٹھا کر وہاں کے امراء اور سرداروں نے ٹھٹھ اور سندھ کے نچلے حصے پر قبضہ کر لیا تھا اور سلطان بننے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ اسی طرح عین الملک ملتانی کی عدم موجودگی میں گجرات بھی شورش کا شکار ہو گیا تھا۔ مشرق میں بنگال کی وفاداری وقتی نوعیت کی تھی اور سنار گاؤں اور لکھنوتی پر مرکزی اقتدار ڈھیلا ہو رہا تھا۔ ترہٹ اور جاج نگر باغی ہندو رایوں کے قبضے میں تھے۔ راجپوتانہ میں چتوڑ، ناگور اور جالور میں راجپوتوں نے اپنی طاقت بڑھانی شروع کر رکھی تھی۔ دکن کے حالات بھی اطمینان بخش نہیں تھے۔ علاءالدین نے ان علاقوں پر قبضہ کر کے ان کے حکمرانوں کو خراج کی ادائیگی کی شرط پر انہیں لوٹا دیا تھا۔ ان کے حکمراں موقع کے منتظر تھے۔ مبارک خلجی نے دیوگیری کے آخری یادو حکمراں کو شکست دے کر اسے دہلی سلطنت کا ایک صوبہ بنا لیا تھا اور وہاں مرکزی قوانین نافذ کر دیے تھے۔ تلنگانہ کو بھی مرکزی طاقت کا احساس کرایا گیا۔ مبارک شاہ کی آنکھ بند ہوتے ہی تلنگانہ کے رائے پرتاپ رودر دیو نے دہلی کی ماتحتی کا جوا اتار پھینکا۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے غیاث الدین تغلق نے اپنے بیٹے جوناخان (بعد میں محمد بن تغلق) کو

دکن کی جانب روانہ کیا۔ابتدا میں محمد بن تغلق کو کافی پریشانی اور راستے کی مشکلات کا سامنا پڑا لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری اور اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ بالآخر اسے کامیابی نصیب ہوئی اور اس نے بیدر اور وارنگل کو فتح کر لیا۔

اس دوران سلطان غیاث الدین تغلق نے بنگال کی جانب پیش قدمی کی تاکہ اپنی عظمت کا سکہ شمال مشرقی علاقوں پر بھی قائم کر سکے۔ وہاں اُس نے جانشینی کے ایک جھگڑے کو مسئلے کو سلجھایا۔اس نے سونار گاؤں تک اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔ بنگال سے واپسی کے سفر میں اس نے ترہٹ کو اپنی سلطنت میں شامل کیا اور دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ بنگال کی مہم سے لوٹنے پر جوناخان نے اپنے والد سے ملاقات کے لیے دہلی کے نواحی علاقے میں ایک استقبالی شہہ نشین تیار کروایا۔ سلطان کے استقبال کے موقع پر ہاتھیوں کی پریڈ کروائی گئی تو یہ شہہ نشین منہدم ہو گیا اور سلطان بھی اس حادثے میں جاں بحق ہو گیا۔ کچھ دانشوروں کا خیال ہے کہ شہزادے جوناخان نے باپ کو راستے سے ہٹانے کے لیے جان بوجھ کر ایسا کروایا، لیکن ایسا قرین قیاس نہیں لگتا کیونکہ شہزادہ پہلے ہی باپ کا پسندیدہ اور ولی عہد تھا۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ غیاث الدین تغلق نے شیخ نظام الدین اولیاؒ کو درباری علماء کے کہنے پر محفل سماع (قوالی) کو بند کرنے کا حکم دیا تھا لیکن آپ نے شاہی فرمان کو تسلیم نہیں کیا۔ اس کے علاوہ آپ کبھی دربار میں سلطان کو تسلیم بجالانے نہیں جاتے تھے یہ بھی سلطان کو برا لگتا تھا۔ یہ تکرار بڑھتی گئی اور سلطان آپ سے ناراض رہنے لگا یہاں تک کہ اس نے بنگال جاتے وقت شیخ کے لیے آخری انتباہ جاری کیا کہ جیسے ہی وہ بنگال کی مہم سے واپس ہو اس سے پہلے شیخ دہلی چھوڑ دیں۔ یہ اطلاع جب شیخ تک پہنچی تو آپ نے بے ساختہ کہا "ہنوز دلّی دور است" (ابھی دلّی دور ہے)۔ بہر حال سلطان دہلی پہنچنے سے قبل ہی حادثے کا شکار ہو گیا۔ الغرض مرحوم سلطان غیاث الدین کی تدفین خود اس کے تعمیر کردہ مقبرے میں عمل میں آئی جو دہلی کے تغلق آباد میں واقع ایک فوجی نوعیت کا قلعہ معلوم ہوتا ہے۔

10.3 محمد بن تغلق (1325-1351ء)

10.3.1 ابتدائی حالات اور تخت نشینی

غیاث الدین تغلق کا جانشین اور تغلق خاندان کا دوسرا سلطان محمد بن تغلق 1290ء میں دہلی میں پیدا ہوا۔ 20 مارچ 1351ء کو سندھ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے 1325 سے 1351ء تک تقریباً چھبیس سال دہلی سلطنت پر حکومت کی۔ اسے فخر ملک، جوناخان اور الغ خان کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ سلطان محمد بن تغلق کو عہدِ وسطیٰ کی تاریخ میں ایک ممتاز شخصیت کا مالک تصور کیا جاتا ہے۔ اس کی ذاتی زندگی ان تمام برائیوں سے پاک صاف تھی جو اس عہد کے حکمرانوں کا خاصہ ہوا کرتی تھی۔ وہ انتہائی باصلاحیت اور ذہین تھا۔ ادب، تاریخ، فلسفہ، خطابت، شاعری، منطق، ریاضی، طب، ہیئت اور خطاطی جیسے علوم و فنون سے اچھی طرح واقف تھا۔ مضبوط اور توانا جسمانی ساخت کے ساتھ ساتھ نہایت جری اور بہادر تھا۔ تخت نشینی سے پہلے بھی اس کی بیشتر زندگی میدانِ جنگ میں گزری تھی۔ 1325ء میں اپنے والد غیاث الدین تغلق کے انتقال کے بعد اس نے محمد بن تغلق کے نام سے اپنی حکومت کا آغاز کیا۔ چونکہ غیاث الدین تغلق نے الغ خان کو اپنی زندگی ہی میں اپنا ولی عہد نامزد کر دیا تھا لہٰذا اس کی تخت نشینی کسی جھگڑے یا انتشار کے بغیر نہایت پر سکون ماحول میں ہوئی۔ اس نے اپنے والد کی موت پر

چالیس دنوں کا ریاستی سوگ منانے کے بعد فروری 1325ء کو دہلی میں اپنی رسم تاج پوشی ادا کی۔ عوام میں اپنی حمایت اور مقبولیت حاصل کرنے کے لیے اس نے اپنی دولت بے دریغ عوام میں لٹائی اور وافر مقدار میں انہیں سونا اور چاندی تقسیم کیا۔

10.3.2 مسائل اور ان کا حل

محمد بن تغلق کو اپنی حکومت کے ابتدائی دور میں کئی اہم مسائل اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان تمام مسائل پر اس نے بڑی ہمت، جواں مردی اور سوجھ بوجھ سے قابو پایا۔ سب سے پہلے اس کے چچازاد بھائی بہاؤالدین گرشاسپ نے جسے دکن میں ساگر کی جاگیر ملی تھی اس کی جانشینی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور 1326ء میں اپنے سلطان ہونے کا دعویٰ کیا۔ سلطان محمد بن تغلق نے نہ صرف اس کی بغاوت کو سختی سے کچلا بلکہ سزا کے طور پر اس کی کھال ادھیڑ دی۔ اگلے ہی سال ملتان کے گورنر بہرام ایبہ کشلو خان نے بغاوت کر دی۔ محمد بن تغلق اس وقت دیوگیری میں تھا وہ تیزی کے ساتھ ملتان روانہ ہوا۔ بہرام کو شکست دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اسی دوران غیاث الدین بہادر شاہ نے جو بھورا کے نام سے مشہور تھا سلطان کے خلاف بغاوت کر دی۔ یہ بغاوت سلطان کو خبر ملنے سے پہلے ہی ختم کر دی گئی۔ سندھ میں کمال پور کے باشندوں نے وہاں کے قاضی اور خطیب کے اشاروں پر بغاوت کی۔ سلطان کے حکم پر خواجہ جہاں نے ان کی بغاوت کو کچل دیا اور باغیوں کو عبرت ناک سزائیں دیں۔ اس کے فوراً بعد ہی ترماشیرین اپنی منگول فوج کے ساتھ ہندوستان پر حملہ آور ہوا اور پنجاب میں قتل و غارت مچاتے ہوئے دہلی کے مضافات میں میرٹھ تک پہنچ گیا۔ سلطان نے یوسف بغرا خان کو دس ہزار گھوڑ سواروں کے ساتھ میرٹھ بھیجا اور خود بھی اس کے پیچھے روانہ ہوا۔ ترماشیریں کو بری طرح شکست ہوئی اور منگولوں کا قتل عام کیا گیا۔ کسی طرح ترماشیریں جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب رہا حالانکہ سلطان نے کلانور تک اس کا پیچھا کیا۔

10.3.3 دکن پالیسی اور اقتدار کا انتہائے عروج

اس سے پہلے دکن کے علاقے کو علاءالدین نے فتح کیا تھا لیکن اُسے اپنے مرکز سے ملحق نہیں کیا۔ وہاں کے حکمرانوں کو علاءالدین نے مرکزی اقتدار تسلیم کر کے خراج ادا کرنے کے وعدے پر حکمرانی کرنے دی گئی۔ محمد بن تغلق نے اپنے پیشرو سلطان کے برخلاف ان علاقوں کا دہلی سلطنت میں الحاق کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح وہ مقامی حکمرانی کی جگہ مرکز کی براہ راست حکمرانی قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنی حکومت کے ابتدائی دور میں محمد بن تغلق نے کاکتیہ سلطنت کے علاقے وارنگل کو فتح کر کے اس کی حکمرانی اپنے ایک امیر کو سونپ دی۔ جب مدورائی فتح ہوا تو احسان شاہ کو اس کا گورنری مقرر کیا گیا لیکن بہر حال یہ دور دراز کے علاقے تھے اور ان پر مرکزی نگرانی آسان نہیں تھی۔ لہٰذا جب دکن کے صوبے دار بہاءالدین گرشاسپ نے بغاوت کی تو دکن کے علاقوں پر موثر کنٹرول کی ضرورت محسوس کرنے لگا۔ خود دولت آباد کو راجدھانی بنانے کا خیال ابھی اس کے ذہن میں اس لیے آیا کہ دکن کے غیر یقینی حالات پر قابو پایا جا سکے۔

مرکزی اقتدار میں اضافہ کرتے ہوئے محمد بن تغلق نے اقطاع داروں (گورنروں) کے معینہ وقت پر تبادلے پر زور دیا تاکہ وہ لوگ وہاں اپنی پکڑ مضبوط بنا کر خود مختار نہ ہو جائیں۔ اقطاع چونکہ قانونی طور پر قابل منتقلی زمینی محصول کا عطیہ ہوا کرتا تھا اور اقطاع دار اقطاع کا مالک

نہ ہو کر منتظم ہوا کرتا تھا۔ سلطان کی اس پالیسی کی بھرپور مخالفت ہوئی۔ زیادہ تر امیر (گورنر) جو مالدار اور بڑے صوبوں جیسے بنگال ،مالوہ، گجرات، ملتان وغیرہ کے اقطاع دار تھے، وہ اپنے صوبے چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتے تھے اور منتقلی کے شاہی فرمان کو ماننے سے انکار کر دیتے تھے۔ شاہی فرمان کی حکم عدولی کا مطلب عبرت ناک سزا کو دعوت دینا ہوتا تھا اس لیے یہ باغی امیر سلطان کے خلاف اپنی فوج تیار کرنے لگ جاتے تھے، تاکہ عتاب شاہی سے بچ سکیں۔ محمد بن تغلق کے پورے دور حکومت میں لگاتار بغاوتوں کے پیچھے یہی پالیسی کارفرما تھی۔

10.3.4 سیاسی اور انتظامی منصوبہ بندیاں

سلطان محمد بن تغلق ایک قابل، باصلاحیت، محنتی اور زیرک حکمران تھا۔ اس نے اپنے عہد میں کئی انتظامی اصلاحات کیں اور ان کو نافذ کرنے کے لیے بھرپور محنت کی لیکن عوام کی بے صبری اور افسروں کی سختی اور جلد بازی نے اس کی کئی اہم اصلاحات اور منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔ ضیاءالدین برنی نے سلطان کی پانچ اہم منصوبوں کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے۔

1. دوآب میں محصول میں اضافہ
2. راجدھانی کی دیوگیری منتقلی
3. علامتی سکوں کا اجراء
4. خراسان پر حملہ
5. قراچل مہم

دوآب میں محصول کا اضافہ

کسی بھی حکمراں کے لیے محصول یا مال گزاری میں اضافہ اس کی اولین ترجیحات میں شامل ہوتا ہے۔ سلطان محمد بن تغلق نے زمینوں کے محصول سے متعلق رجسٹروں کی ترتیب اور تیاری کا حکم جاری کیا۔ صوبوں کے تمام گورنروں کو مال گزاری سے متعلق جملہ مواد اکٹھا کرنے کی ہدایات دیں۔ حکومتی آمدنی بڑھانے کے مقصد سے اس نے گنگا جمنا دوآب کے زرخیز علاقے میں محصول کی شرح میں اضافہ کیا۔ اس کے علاوہ اشیاء کی درآمد و برآمد پر محصول میں بھی بڑھوتری کی اور اس کی وصولی کے لیے مختلف چنگیاں قائم کیں۔ جس وقت یہ فیصلہ لیا گیا اس وقت ملک شدید قحط سے دوچار تھا۔ اس سب کے باوجود جب محصولوں کی وصولی میں عاملوں نے جابرانہ طریقہ اپنایا تو حالات اور بدتر ہو گئے اور یہ منصوبہ ناکام ہو گیا۔

سلطان نے کسانوں کے حالت کو سدھارنے کی بھرپور کوشش کی۔ محصولات کو مناسب حد تک کم کیا۔ آب پاشی کے لیے بہت سے کنوے کھدوائے۔ غیر مزروعہ زمینوں کو زیر کاشت لانے کی سہولیات فراہم کروائی۔ دہلی کے عوام کے لیے غذائی اشیاء کی فراہمی اور کسانوں کو تقاوی (قرض دینے کی سہولیات) کا بھی انتظام کیا لیکن اس کام کے نگراں افسروں کی بے ایمانی اور بددیانتی اور عوام کی جلد بازی اور صحیح جگہ قرضوں کے استعمال نہ کرنے کی وجہ سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ محصول کے بوجھ اور قرضوں کی سختی سے وصولی سے

تنگ آ گئے اور وہ اپنی مزروعہ زمینوں کو چھوڑ کر جنگلاتی علاقوں میں چھپنے لگے۔ سرکاری افسروں نے کسانوں کو ان کے کھیتوں پر لوٹانے کے لیے مزید بے رحمی کا مظاہرہ کیا۔ اس طرح کی ناقابل برداشت کاروائی سے سلطان کی مقبولیت روز بروز متاثر ہوتی گئی اور آخر کار سلطان نے اپنے منصوبے کو واپس لے لیا۔

راجدھانی کی دیوگیری منتقلی

سلطان محمد بن تغلق کے متعدد منصوبوں میں لوگوں کو سب سے زیادہ زحمت و پریشانی میں مبتلا کرنے منصوبہ راجدھانی کو دہلی سے دیوگیری منتقل کرنا تھا۔ اس نے دیوگیری کو دولت آباد کا نام دیا اور اُسے راجدھانی بنانے کا فیصلہ کیا۔ جغرافیائی عوامل کے حساب سے راجدھانی کی ہندوستان کے وسطی علاقے میں منتقلی در حقیقت نامناسب نہیں تھی۔ دہلی شمالی سرحدی راہداری سے قریب ہونے کے سبب حملہ آوروں کی زد میں رہتی تھی۔ مزید یہ کہ دکنی علاقوں کو دہلی سلطنت میں شامل ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ لہٰذا یہ علاقہ مرکز کی جانب سے زیادہ توجہ کا طالب تھا۔ راجدھانی کی تبدیلی سے جہاں ایک طرف سلطان نئے مفتوحہ علاقوں کو اپنی راست نگرانی میں رکھ سکتا تھا وہیں مرکز کو شمال مغرب کے حملہ آوروں سے کافی راحت مل سکتی تھی۔ بہر حال بتایا جاتا ہے کہ اپنے اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس نے اپنے افسران، متمول لوگوں نیز صوفیا اور علمائے کرام کو دیوگیری جانے کا حکم دیا۔ البتہ عوام کو نئے مقام کی جانب منتقل ہونے کا حکم نافذ نہیں کیا گیا تھا۔ شاہی افسران نے فرمان شاہی کو سبھی لوگوں کے لیے سمجھ کر دہلی کے تمام باشندوں اور شہریوں کو ایک ساتھ دہلی سے دیوگیری کی جانب کوچ کے لیے مجبور کیا۔ اس جبر و ظلم کا نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی کچھ عرصے کے لیے تقریباً ویران سی ہو گئی۔

محمد بن تغلق نے دہلی سے دولت آباد تک کشادہ سڑک تعمیر کروائی۔ اس کے دونوں جانب کارواں سرائیں بنوائیں تاکہ مسافر حسب ضرورت وہاں آرام کر سکیں۔ لیکن چونکہ منتقلی کا یہ عمل موسم گرما میں شروع ہوا تھا اس لیے کئی افراد سفر کی تکالیف اور بے انتہا گرمی کے سبب راستے ہی میں جاں بحق ہو گئے اور جو لوگ جوں توں کر کے نئی راجدھانی پہنچے انہیں وطن کی یاد نے بے چین کر ڈالا۔ وہ نسل در نسل دہلی دہلی کے قدیم باشندے تھے اور وہاں سے ان کی یادیں جڑیں تھیں۔ انہیں یہ نئی جگہ راس نہیں آئی۔ اس تعلق سے وی۔ اے اسمتھ عجیب و غریب دلیل دیتا ہے کہ ''راجدھانی کی اس تبدیلی کے پیچھے سلطان کا انتقام کا احساس کار فرما تھا۔ وہ دہلی کے باشندوں کو سزا دینا بلکہ دہلی کو برباد کرنا چاہتا تھا اور یہ اس وجہ سے تھا کہ دہلی کے بعض باشندوں نے اس کی پالیسیوں کی ہجو (برائی) لکھ کر کے اس کے دیوان عام میں پھینکنے کی جسارت کی تھی۔'' اسمتھ کا یہ خیال بہت سطحی مشاہدے کا نتیجہ ہے کیوں کہ کوئی بھی سلطان چاہے کتنا بھی جابر کیوں نہ ہو جان بوجھ کر اپنی خوشحال راجدھانی کو نہیں برباد کر سکتا۔ راجدھانی کی تبدیلی کو ابھی چند سال ہی گذرے تھے کہ محمد بن تغلق نے دولت آباد کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس عملی تجربے نے اُسے یہ بات پوری طرح سمجھا دی تھی کہ جس طرح وہ دہلی میں رہ کر دکن پر حکومت نہیں کر سکتا اسی طرح دولت آباد میں قیام پذیر ہو کر شمالی ہند کو اپنی حکمرانی میں نہیں رکھ سکتا۔

اگرچہ دولت آباد کو راجدھانی بنانے کی تمام تر کوششیں وقتی طور پر ناکام رہیں لیکن بڑے پیمانے پر لوگوں کی یہ منتقلی کئی طویل مدتی

فوائد کا باعث بنی۔ شاہراہ اور کاروان سرایوں کی تعمیر سے لوگوں کے ادھر سے ادھر جانے میں اضافہ ہوا اور شمالی ہند اور دکن گویا قریب آ ملے۔ بیشتر عوام نے جن میں صوفیا بھی شامل تھے دولت آباد میں مستقل سکونت اختیار کی۔ اس طرح شمالی ہند کی ہند اسلامی تہذیب یا ترک فارسی ثقافت کے دکن میں پھیلنے کا راستہ کھلا۔ شمالی اور جنوبی ہند کے درمیان اس ثقافتی تال میل سے جنوبی ہند میں مخصوص دکنی تہذیب کا ارتقا ہوا۔

علامتی سکے کا اجراء

محمد بن تغلق کا ایک اور منصوبہ کرنسی نظام میں تبدیلی اور نئی کرنسی کا آغاز تھا۔ چنانچہ اس نے کئی طرح کی نئی کرنسی جاری کرنے کا عملی تجربہ کیا۔ اس تجربے کی بنیاد پر ہی اسے ''شاہ رقومات'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس نے سکوں کے ڈھالنے کے پورے نظام میں ترمیم کرتے ہوئے مختلف النوع سکوں کو چاندی اور سونے کی تبدیل شدہ قدروں سے مربوط اور ہم آہنگ کیا ہے۔ اس کا سب سے بے باک قدم، اور قابل ذکر تجربہ ایک نئی کرنسی کی ابتدا ہے۔ عہد وسطیٰ کے پورے عرصے میں کرنسی کی قیمت کا تعین، سکے کی اصل دھاتی قدر کے مطابق ہوتا تھا۔ یعنی کہ سکہ کی ظاہر قیمت (Face Value) اور اس کی اصل قدر ہمیشہ یکساں ہوا کرتی تھی یعنی دھات کی قیمت و قدر کو جس قدر نقصان پہنچتا سکے کی ظاہری قیمت میں بھی اتنی ہی کمی مان لی جاتی۔

محمد بن تغلق نے ایک چینی حکمران کی جانب سے جاری کردہ کاغذی کرنسی سے تحریک پاکر اختراعی انداز میں تانبے کے سکوں کی کرنسی کو متعارف کرنے کی کوشش کی۔ اس نے وافر مقدار میں تانبے کے سکے ڈھالنے کا حکم دیا اور ان تانبے کے سکوں کو رائج الوقت چاندی کے سکے ٹنکے کے بالمقابل پیش کیا، لیکن یہ اس کے بس میں نہ تھا کہ گھریلو طور پر تیار تانبے کے نقلی سکوں کی روک تھام کر سکے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نقلی سکہ ڈھالنے کی ہوڑ لگ گئی۔ سرکاری محصول نقلی سکوں میں ادا کیا جانے لگا۔ نقلی سکے لاکھوں کی تعداد میں ڈھالے جا رہے تھے اور سرکاری خزانہ انہیں سے بھر رہا تھا۔ اس طرح سرکاری خزانہ اصلی سونے چاندی سے محروم ہوتا چلا گیا۔ بیرونی کاروبار میں جمود آ گیا تھا کیونکہ سرکاری خزانہ بے وقعت ہو چکا تھا۔ ان علاقوں میں جہاں سلطان کا حکم نہ چلتا تھا یہ کرنسی قابل قبول نہیں تھی۔ مجبوراً سلطان کو سکوں کے قدیم نظام کی جانب واپس آنا پڑا۔ عوام کو موقع دیا گیا کہ وہ اپنی کرنسی کا سرکاری خزانے میں موجود چاندی کے اصل سکوں سے مبادلہ کر لیں۔ نتیجتاً علامتی سکوں کے ساتھ ساتھ نقلی کرنسی بھی سرکاری خزانے میں جمع ہوتی چلی گئی اور حکومت کو زبردست خسارے سے دوچار ہونا پڑا۔ کہا جاتا ہے کہ عوام نے تغلق آباد میں علامتی سکوں کا ڈھیر لگا دیا تھا۔

خراسان مہم

دور وسطیٰ کے رائج طریقوں کے مطابق حکومت کی کوئی باضابطہ اور مستقل فوج نہیں ہوتی تھی۔ اصل فوج سپاہیوں کی محدود و مختصر تعداد پر مشتمل ہوا کرتی تھی۔ البتہ جنگ کے زمانے میں حسب ضرورت عارضی لشکر تشکیل دے دیا جاتا تھا جو کسی مہم کی تکمیل کے لیے وقف ہوتا اور متعلقہ جنگ میں جو مال غنیمت حاصل ہوتا اسی سے سپاہیوں کا معاوضہ بھی ادا کر دیا جاتا۔ علاءالدین خلجی کی طرح محمد بن تغلق بھی اپنے اقتدار کی دنیا بھر میں توسیع چاہتا تھا۔ جب بعض خراسانی سرداروں نے اس کے سامنے یہ بات رکھی کہ خراسان بآسانی قابل فتح ہے تو سلطان

نے ایک محدود وقت میں عظیم الشان عارضی لشکر تیار کیا تاکہ خراسان اور عراق کو اپنے زیر نگیں لایا جاسکے۔ سال بھر کی تنخواہ فوج کو ادا کر دی گئی لیکن فوج عملی طور پر کچھ بھی نہ کر سکی۔ پھر سلطان کو یہ اندازہ ہو گیا کہ جغرافیائی رکاٹیں اس کے منصوبے کو برباد کر سکتی ہیں اور ایسے عظیم منصوبے کے لیے اس کے پاس مزید سرمایہ بھی نہیں ہے، تو اسے تسخیر عالم کی اس مجوزہ مہم سے دست بردار ہونا پڑا۔ مرکز کو اس اسکیم سے کوئی فائدہ تو نہیں ہوا البتہ اس ادھوری مہم نے مزید خزانہ خالی کر دیا۔

قراچل پر حملہ

قراچل کے بارے میں ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ ''یہ علاقہ دہلی سے دس کوس کی دوری پر تھا۔'' حبیب اور نظامی نے اس کی شناخت باوثوق طور پر وسطی ہمالیائی خطے میں ضلع کانگڑا سے کی ہے۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ ''ہمالیہ کی آزاد راجپوت ریاستوں میں چینی مداخلت محمد بن تغلق کے لیے تشویش کا باعث تھی۔ چینیوں نے عسکری اہمیت کے ایک مقام پر ایک مندر تعمیر کیا تھا اور اس علاقہ میں اپنے اختیارات کی توسیع کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ چنانچہ اس علاقہ کی قلعہ بندی سلطان کی ایک وسیع پالیسی کا حصہ تھی۔ اس کے لیے سلطان نے اپنے بھانجے خسرو ملک کی قیادت میں تفصیلی ہدایات کے ساتھ دس ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک فوج روانہ کی۔ یہ فوج جریال لہر پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ سلطان نے اپنے سپہ سالار کو اس سے آگے نہ جانے کی تلقین کی لیکن کامیابی کے غرور میں اس نے سلطان کا فرمان نہیں مانا اور تبت کی جانب آگے بڑھ گیا جہاں سنگلاخ چٹانوں اور پہاڑوں میں پیش قدمی ناممکن ہو گئی۔ فرشتہ کے مطابق یہ پورا لشکر ہمالیائی سلسلے میں ضائع ہو کر رہ گیا۔ تاہم ایک ہمعصر مورخ ضیاء الدین برنی لکھتا ہے کہ مذکورہ مہم جوئی چین کے خلاف نہیں بلکہ ہندوستان اور چین کے درمیان واقع کوہ قراچل کے ایک باغی سردار کے خلاف تھی۔ اس مہم کا فوری مقصد تو پورا ہو گیا یعنی سرکش پہاڑی لوگ مصالحت پر راضی ہو گئے اور انہوں نے خراج کی ادائیگی تسلیم کی لیکن سلطان کا پورا لشکر راستے کی مشکلات کا شکار ہو کر تباہ و برباد ہو گیا۔

دیوانِ کوہی کا قیام

محمد بن تغلق نے زرعی ترقی کے لیے اپنی ذہانت کا بھرپور استعمال کیا۔ سائنسی انداز میں مسائل کی تہہ تک رسائی کی کوشش کی۔ دیوان کوہی کے نام سے ایک علاحدہ زرعی شعبہ قائم کیا جس کا مقصد غیر مزروعہ اراضی کو براہِ راست سرکاری نظم و نسق کے تحت زیر کاشت لانا تھا۔ اس نے ایک وسیع زمینی علاقے کا انتخاب کیا اور یہ جاننے کے لیے کہ کس نوع کی فصل کے لیے کون سی اراضی زیادہ موزوں رہے گی اس نے مختلف اقسام کی فصلوں کی کاشت کروائی۔ اس اعلیٰ ترین منصوبہ کو بروئے کار لانے کے لیے اس نے کافی خطیر رقم خرچ کی لیکن بدنظمی اور بدعنوانی کے منفی عناصر نے اس منصوبے کو ناکام بنا دیا۔ یہاں یہ بات ضرور ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ واقعی اس کے یہ تجربات لائق تحسین اور قابل قدر تھے۔ کیونکہ چند صدیوں بعد یعنی انیسویں صدی میں جب دنیا کے طول و عرض میں زراعتی شعبہ کے تربیتی ادارے قائم کیے جا رہے تھے اس وقت بھی زمینی پیداوار میں اضافے کی خاطر مختلف اراضی کی مناسب و موزونیت کا پتہ محصول ے کے لیے مماثل تجربات کیے گئے۔

محمد بن تغلق بحیثیت حکمراں

محمد بن تغلق کے جدید منصوبے اگرچہ نیک نیتی اور اخلاص پر مبنی تھے لیکن ان کو عملی جامہ پہنانے میں کئی کوتاہیاں سرزد ہوئیں۔ نتیجتاً اس کے منصوبے نہ صرف یہ کہ ناکام ہوئے بلکہ ان کے سبب رعایا کو نہایت ہی تکلیف دہ حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ سلطان محمد بن تغلق ہندوستان کے دور وسطیٰ کا غیر معمولی اور نمایاں شخص تھا۔ اس کی شخصیت کچھ ایسی پیچیدہ اور منفرد تھی کہ اس کے کردار کو کسی خاص متعین خانے میں نہیں رکھا جاسکتا۔ دور جدید کے ماہرین نے اس کی فطانت وذہانت کا کھلے طور پر اعتراف کیا ہے لیکن ساتھ ہی اس کو خبطی یا جنونی کہنے سے بھی احتراز نہیں کیا۔ اس کا ذکر مرکب اضداد اور تضادات کے مجموعے کے طور پر کیا گیا ہے۔ حالانکہ وہ ایک باصلاحیت اور مختلف صفات اور خوبیوں والا انسان تھا لیکن عملی زندگی میں وہ بری طرح ناکام رہا۔ وہ ایک جید عالم تھا اور ایک قادر الکلام مقرر بھی تھا۔ فن خطاطی میں بھی اسے ملکہ حاصل تھا۔ علم منطق اور یونانی فلسفے پر اسے عبور حاصل تھا نیز علم ریاضی اور علوم طبعی سے اسے گہری دلچسپی تھی لیکن یہ سب خوبیاں اس کے کچھ کام نہ آسکیں اور اس کی پوری زندگی صرف فطری اور خیالی منصوبوں کی نذر ہو کر رہ گئی اور عملی طور پر اس نے اپنی رعایا کو سہولیات فراہم کرنے کے بجائے مزید مسائل ومصائب الجھا دیا۔ الغرض اس کا عہد انسانیت سوز سختیوں کا ایسا دور ثابت ہوا کہ جس کے سبب سلطنت دہلی کا شیرازہ منتشر ہونے لگا۔

اپنے اسلاف کے بالمقابل محمد بن تغلق کو کافی وسیع، عظیم تر، اور خوش حال ریاست یا مملکت نصیب ہوئی تھی۔ ایک ہمعصر مصنف کے مطابق کل 23 صوبے جات اس کے زیر نگیں تھے۔ شمال مغرب میں پنجاب سے شروع ہو کر مشرق میں بنگال تک جبکہ جنوب میں اس کی ریاست، میسور کے علاقوں تک پھیلی ہوئی تھی اور ان علاقوں میں معبر یا کورومنڈل ساحل بھی شامل تھا۔ اپنی حکومت کے آخری ایام میں محمد بن تغلق کو ہر جانب سے بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ زندگی کے آخری سالوں میں بھی وہ بغاوتوں کو کچلنے میں مصروف تھا۔ 1350ء میں گجرات میں ہونے والی بدامنی کا اس نے ازالہ کیا اور دوسرے ہی برس 1351ء میں جبکہ وہ سندھ کے علاقے ٹھٹھ میں ایک باغی سردار کا تعاقب کر رہا تھا اس کا انتقال ہو گیا۔

4.4 سلطان فیروز شاہ تغلق (1351-1388ء)

10.4.1 ابتدائی حالات

سلطان محمد بن تغلق کی وفات پر سندھ میں اس کی فوج کو قائد کی عدم موجودگی کی بنا پر سندھ کے باغیوں اور منگولی دستوں کے ہاتھوں شدید مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ اس بدحالی کے عالم میں فوج کے سالاروں نے مرحوم سلطان کے بھتیجے کمال الدین فیروز کو اس کا جانشین منتخب کیا۔ کمال الدین فیروز، محمد بن تغلق کے چھوٹے بھائی ملک رجب کا بیٹا تھا۔ اس کی ماں دیپال پور کے رائے انمل بھٹی کی راجپوت بیٹی شہزادی انیلا تھی۔ فیروز انہیں کے گھر میں 1309ء کو پیدا ہوا۔ ابھی وہ سات برس کا تھا کہ اس کے والد ملک رجب کا انتقال ہو گیا۔ سلطان محمد نے اسے اپنے بیٹے کی طرح پال اور حکومت کے تمام سول محکموں جیسے ریاستی پالیسی، انتظامیہ، حساب کتاب اور تقرری وغیرہ کی مکمل تربیت دی۔ فیروز

امیر حاجب یا باربک کے عہدے پر فائز تھا لیکن سلطان نے متعدد اہم فرائض اس کو سونپ رکھے تھے۔ فیروز نے اپنے چچا کی پُر خلوص اور وفادارانہ اطاعت کی تھی۔ ابتدا میں وہ سلطنت کی باگ ڈور سنبھالنے میں پس و پیش کا شکار تھا۔ امراء، فوجی افسران اور سلطان کے بہی خواہوں کے اصرار پر فیروز نے اپنی رضامندی ظاہر کی اور فوج کو واپس دہلی لے آیا۔ وہاں دہلی میں سلطان مرحوم کے ایک نقلی فرزند کو تخت و تاج حوالے کرنے کا ایک منصوبہ زیر غور تھا جو فیروز کے دہلی پہنچنے پر ناکام ہو گیا۔ اس وقت سے کوئی 38 سال تک ہندوستان میں پر امن طریقہ سے فیروز کی حکومت جاری رہی۔ اس کے دور میں مجموعی طور پر امن و امان قائم رہا۔ دہلی آنے کے بعد اکیس دنوں تک جشن اور خوشی منائی گئی۔

سلطان فیروز شاہ تغلق ایک رحم دل اور نیک طبیعت کا مالک اوسط ذہن کا آدمی تھا مگر وہ کمزور شخص نہیں تھا۔ اس کے تجربات الگ تھے اور وہ ظالم و جابر ہر گز نہیں تھا۔ البتہ اس دور میں قیادت و سالاری کے لیے جو صفات متوقع اور ضروری تھیں وہ اس میں مفقود تھیں۔ اس نے بنگال کو دہلی سلطنت کے تحت لانے کے لیے دو مرتبہ چڑھائی کی لیکن یہ کوششیں نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکیں۔ آخر کار 1360ء میں اس نے بنگال کے ساتھ امن و امان کا معاہدہ کر لیا اور اس طرح اس نے بنگال کی آزادی کو عملاً تسلیم کر لیا۔ دہلی کی طرف واپسی کے سفر میں اس نے جاج نگر (اڑیسہ) پر چھاپہ مارا اور اس کے حکمران کو پابند عہد کیا کہ وہ ہر سال بطور خراج ہاتھیوں کی ایک مقررہ تعداد دہلی روانہ کرے گا۔ اس کا دوسرا اہم فوجی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے نگر کوٹ (کانگڑہ) کے دشوار ترین قلعے پر قبضہ کیا۔ بعد ازاں اس نے سندھ پر چڑھائی کی۔ ابتدائی ناکامیوں کے باوجود فیروز نے اپنی کوششیں جاری رکھیں اور بالآخر سندھ کے حکمراں کو اطاعت تسلیم کرنی پڑی۔ دہلی آنے کے کچھ ہی دنوں بعد سلطان فیروز شاہ تغلق نے اپنی حکومت کی بہتری کے لیے کئی اہم قانونی انتظامی اقدامات بھی کیے۔

10.4.2 زرعی اصلاحات

سلطان فیروز شاہ تغلق کو اس کے کئی اہم منصوبوں اور اصلاحات کی بنا پر آج تک یاد کیا جاتا ہے۔ اُس نے کسانوں کے حالات سدھارنے کے لیے کئی مخلصانہ کوششیں اور اہم اقدامات کیے۔ اس نے مرحوم سلطان محمد کی جانب سے دور قحط سالی میں کسانوں کو جو قرضے دیے گئے تھے انہیں معاف کر دیا۔ پھر اس نے مال گزاری نظام کی اصلاح کی جانب توجہ مبذول کی۔ وہ زراعت اور اس کے نظام کو حیات تو بخشنا چاہتا تھا جو سابق حکومت کی تباہ کن محصول پالیسی کے سبب تقریباً تباہ ہو چکا تھا۔ اس نے کئی غیر واجبی محصولات کو ختم کر دیا اور محصول وصولی کے دوران ہونے والی زیادتیوں کا خاتمہ کر دیا۔ محصولات کو کم سے کم کر دیا اور حکومت کے متعینہ محصول کے علاوہ ریاست کے تمام غیر واجبی مطالبات کو معاف کر دیا۔ اس نے فاضل یا متروک زمینوں کو زیر کاشت لانے کے لیے آب پاشی کی سہولیات فراہم کیں اور زراعت کو فروغ بخشا۔ اس نے سرکاری نہروں سے استفادہ کرنے والی زرعی زمینوں کی پیداوار پر دس فیصد محصول عائد کیا۔ ان اقدامات کے ذریعے زراعت کو فروغ حاصل ہوا اور کسانوں کی خوشحالی لوٹ آئی۔

10.4.3 آب پاشی ذرائع کی مرمت اور تعمیر

تاریخِ مبارک شاہی میں فیروز شاہ کے نہر کے نظام کا مفصل تذکرہ موجود ہے۔ 1355ء کو فیروز شاہ نے دیپال پور کا رخ کیا اور وہاں

ستلج سے جہباز (Jahbaz) تک ایک نہر کھدوائی۔ دوسرے ہی سال، منڈل اور سرمور کے نواحی علاقے میں دریائے جمنا سے ایک نہر کھدوائی جس میں سات معاون نہروں کا پانی آکر ملتا تھا اور اصل نہر کو ہانسی تک پہنچایا پھر ہانسی سے بارہ لسان تک اور پھر مزید آگے حصار فیروز تک اسے بڑھایا اور حصار فیروزہ کے شاہی محل کے قرب وجوار میں ایک وسیع تالاب تعمیر کروایا جس میں مذکورہ نہر کے ذریعے پانی جمع ہوتا تھا۔ اس نے گھاگر سے ایک اور نہر کھدوائی جو سرتا قلعہ کی جانب سے گزرتے ہوئے ہری گھری تک پہنچتی تھی۔ نیز بدمنی کے پاس دریائے جمنا سے ایک اور نہر کھدوائی جو حصار فیروز کے قریب ایک تالاب میں شامل ہوتے ہوئے آگے بڑھ جاتی۔

ملتان کے گورنر کی حیثیت سے عین الملک ماہرو نے جو اصول وضع کیا تھا غالباً اسے پورے نہری نظام پر منطبق کیا گیا۔ بڑی نہروں کی تعمیر مرکزی حکومت کی ذمہ داری تھی اور ذیلی نالوں کی تعمیر، خواہ وہ معاون نالے ہوں یا کھیتوں تک پانی پہنچانے والے ذیلی نالے، ان کی تعمیر اور ان کا تحفظ سرکاری افسران کے ذمے تھا لیکن اس تعمیر و تحفظ کی قیمت کسانوں سے حاصل کی جاتی تھی۔ پانی استعمال کرنے کے لیے انہیں اس کی قیمت ادا کرنا ضروری تھی۔

10.4.4 شہر کاری اور فن تعمیر

سلطان فیروز شاہ تغلق ایک قابل حکمراں اور تعمیرات کا شائق تھا۔ اس نے اپنی سلطنت میں کئی اہم عمارتیں، شہر اور نہریں تعمیر کروائیں۔ وہ مختلف شہروں، مسجدوں تعلیمی اداروں، شفاخانوں، باندھوں اور نہروں کی تعمیر کے لیے بجا طور پر مشہور ہے۔ اس نے دہلی میں فیروز آباد کے نام سے ایک نئی راجدھانی تعمیر کرائی اور حصار فیروزہ، فتح آباد اور جون پور شہروں کی بنیاد رکھی۔ دہلی کے آس پاس میں کئی باغ لگوائے جس سے نہ صرف اس کے جمالیاتی ذوق کی تسکین ہوئی بلکہ خزانے کو بھی فائدہ ہوا۔

10.4.5 غلامی کا نظام

سلطان فیروز شاہ نے غلامی کو ایک منظم ادارے کی شکل دی۔ اس نے اپنے افسران کو ہدایت دی کہ جنگ کے موقع پر زیادہ سے زیادہ قیدیوں کو گرفتار کر لیا جائے اور ان میں سے بہتر کو دربار کی خدمات کے لیے دہلی روانہ کیا جائے۔ اس نے غلاموں کی نگرانی اور تعلیم و تربیت کی جانب خصوصی توجہ دی۔ انہیں فوجی، محافظ اور کاریگروں کی حیثیت سے استعمال کیا۔ غلاموں کے لیے ایک علاحدہ محکمہ قائم کیا جس کے لیے الگ سے عہدے داروں اور خزانے کا انتظام کیا۔ جنگ میں پکڑے گئے غلاموں کو صوبائی دارالحکومت کے لیے روانہ کر دیا جاتا اور باقی کو دہلی میں ہی روک لیا جاتا۔ غلاموں کو یا تو فوجیوں کی طرح زمین کی مالگزاری سے حصہ ادا کیا جاتا یا ان کی نقد تنخواہ مقرر ہوتی۔ مختلف دست کاریوں کے لیے تقریباً بارہ ہزار غلاموں کو تربیت دی گئی تھی۔ تقریباً سبھی وزارتوں، محکموں اور کارخانوں میں غلام موجود تھے۔ اس پورے نظام کا مرکز چالیس ہزار غلاموں کا ایک جتھہ تھا جو شاہی محل کی نگرانی و خدمت پر مامور تھا۔ انہوں نے آپس میں اپنا ایک مضبوط اتحاد قائم کر لیا اور وہ شاہ دہلی کے وفادار نہ تھے۔

10.6.5 رفاہی اصلاحات

فیروز نے صوبوں کے مابین تجارت میں حائل چنگی کے بعض محصولات کو منسوخ کر کے داخلی تجارت کو فروغ دیا۔ اذیت رسانی اور ہاتھ پاؤں کاٹنے کی سزاؤں کو خاتمہ کیا۔ شہر دہلی میں مفت شفاخانوں کا قیام، بے روزگاری کے مسئلہ سے نمٹنے کے لیے ایک دفتر روزگار کی تشکیل نیز ضرورت مند والدین کے لیے مسلم لڑکیوں کی شادی کے سلسلے میں مالی تعاون کی فراہمی وغیرہ اس کے دیگر رفاہی اور فلاحی کام ہیں۔ اس نے دوبارہ اپنے فوجی عہدیداروں کو نقد تنخواہوں کے بجائے مال گزاری کے ساتھ جاگیریں عطا کرنے کا طریقہ شروع کیا۔ علاءالدین خلجی نے سرکاری عہدیداروں کو تنخواہوں کی ادائیگی کا یہ طریقہ اس لیے منسوخ کر دیا تھا کہ اس کی وجہ سے بغاوتیں جنم لے رہی تھیں۔

14.4.6 فیروز شاہ تغلق کے عہدِ حکومت کا جائزہ

فیروز جب عمر طبعی کو پہنچا تو اس نے مملکت کے اکثر معاملات وزراء کے حوالے کر دیے۔ یہ منصوبہ اسی طرح ناکام ہو گیا جس طرح اس سے قبل اپنے بیٹوں کو حکومت اور اختیارات میں اپنے ساتھ شریک کرنے کی کوشش ناکام ہو چکی تھی۔ 1388ء میں یہ معمر سلطان نیک نامی کے ساتھ اس دار فانی سے رخصت ہوا۔ اس کا دور حکومت نرم دلی، انسانیت اور روشن خیالی کے لیے مشہور ہے۔ ایک بہترین حکمراں ہونے کے باوجود وہ ایک اچھا سپہ سالار نہیں تھا۔ بنگال میں اس کی طویل ترین فوجی مہمات بے نتیجہ رہیں اور سندھ کی جانب اس کی پیش قدمی جزوی طور پر کامیاب رہی اور اس کا بھی کوئی مفید نتیجہ نہیں نکل سکا۔ اس نے دکن کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ذاتی طور پر اسے فتوحات سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اور وہ شکار کا شوقین بھی نہیں تھا۔ اسے علم تاریخ اور تعمیرات سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔

اس کے چند اقدامات سے آئندہ دنوں میں چند مسائل کھڑے ہوئے۔ جاگیرداری نظام کا احیا، مرکز کی کمزوری کا سبب بنا اور جاگیردار مرکزی اقتدار کو چیلنج کرنے لگے۔ بڑی تعداد میں غلاموں کے تقرری کے باعث سرکاری خزانہ خالی ہو گیا اس کے علاوہ ان کی وفاداری بھی بھروسے کے قابل نہ تھی بلکہ ان کا وجود خود سلطنت کے لیے ایک خطرہ بنا ہوا تھا۔ اس کی وفات کے ساتھ ہی اس کے فرزندوں اور اس کے پوتوں میں حسب روایت جانشینی کے جھگڑے شروع ہو گئے۔ اقتدار کی خاطر آپسی کشمکش نے سلطنت کو انتشار اور پریشانی میں ڈھکیل دیا۔ دہلی سلطنت کی یہ کمزوری، 1398ء میں تیمور کے دہلی پر حملے کی وجہ سے اور بھی زیادہ ہو گئی۔ دہلی کی جانب پیش قدمی کرنے والی تیمور کی فوج نے راستے میں کئی شہروں کو بے رحمی سے تخت و تاراج کیا۔ بالآخر تیمور دہلی میں داخل ہوا اور بے دردی کے ساتھ اسے بھی تباہ و برباد کر ڈالا۔ اس موقع پر بے شمار مرد، عورت اور بچے مارے گئے۔ وہ دولت کے ساتھ ساتھ، ہندوستانی کاریگروں، ماہرین تعمیر، سنگ تراشوں اور نجاروں وغیرہ کو اپنے ساتھ لے گیا۔ تیمور کے اس حملے کے ساتھ دہلی سلاطین کے استحکام کا دور اپنے اختتام کو پہنچا حالانکہ تغلق خاندان کی حکومت 1412ء تک جوں توں کر کے چلتی رہی۔

10.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

تغلق سردار غازی ملک نے غاصب خسرو پر حملہ کر کے اسے ہلاک کر دیا۔ 1320ء میں غازی ملک دہلی کا سلطان بنا اور اس نے

تغلق سلطنت کی بنیاد رکھی۔اس نے اپنا خطاب غیاث الدین تغلق شاہ رکھا۔اس نے بنگال فتح کیا اور دوسرے صوبوں میں بھی امن وامان قائم کیا۔دہلی کی طرف واپسی کے وقت ایک عارضی شامیانے کے گرنے سے اس کی موت ہوگئی۔دہلی کے قریب شہر تغلق آباد کا بانی غیاث الدین تغلق ہے۔ صحیح معنوں میں تغلق سلطنت کو پروان چڑھانے والا بادشاہ محمد بن تغلق ہے۔کیونکہ وہ ایک نظری وفکری شخص تھا اس لیے اس نے کئی اہم منصوبے اور اسکیمیں بنائیں۔ کم وبیش اس کے سارے ہی منصوبے ناکام ہو کر رہ گئے۔دہلی کے بجائے دولت آباد کو راجدھانی بنانے کی کوشش، نقالوں سے مناسب تحفظ کے بغیر تانبے کے سکوں کو رائج کرنے کا فیصلہ جیسی غلط پالیسیوں نے اسے عوام میں غیر مقبول کر دیا۔ محمد بن تغلق کے بعد فیروز شاہ تغلق تخت وتاج کا مالک بنا۔اپنی حکمرانی کے 38 سالہ طویل دور میں فیروز شاہ نے قابل ذکر اصلاحات کے ذریعے کئی انتظامی خامیوں کو دور کیا۔فیروز شاہ نے خود اپنی زندگی میں ہی اپنے بیٹے محمد شاہ کو اقتدار سونپ دیا۔اس کے نااہل ثابت ہونے کے سبب غیاث الدین تغلق دوم کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور آگئی لیکن شاہی گھرانے میں موجود اقتدار کے بھوکے شہزادوں کی آپسی کشمکش پر وہ قابو نہ پاسکا اور اقتدار کی خاطر یہ رسہ کشی تقریباً پچیس سال تک چلتی رہی۔اس کے علاوہ 1398ء میں امیر تیمور کے دہلی پر حملے نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔دہلی کی معاشی اور سیاسی پوزیشن برباد ہو کر رہ گئی اور اس طرح تغلق سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

10.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

قراؤنہ: ترکستان اور سندھ کے درمیان آباد ترکو کا ایک قبیلہ، مارکوپولو کے مطابق اس سے مراد وہ مخلوط نسل جن کے باپ تاتاری اور مائیں ہندوستانی تھیں۔

شہرِ رقومات : محمد بن تغلق کا لقب، چونکہ اس نے اپنے عہدِ حکومت میں کئی جدید قسم کے سکے اور کرنسیاں جاری کی تھیں اس وجہ سے اس کو یہ خطاب دیا گیا تھا۔

تنکہ: سلطان التتمش کے دور میں جاری کیا گیا چاندی کا ایک سکہ

قراچل: کماؤں اور گڑھوال کے قریب ضلع کانگڑا کا وسطی ہمالیائی علاقہ۔

دیوانِ کوہی: یا دیوانِ امیر کوہی، محمد بن تغلق کے زمانے میں زراعت کی ترقی کی خاطر قائم کیا جانے والا ادارہ۔

10.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

10.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. تغلق خاندان (Tughlaq Dynasty) کا بانی کون تھا؟

(a) غیاث الدین تغلق (b) محمد بن تغلق (c) فیروز شاہ تغلق (d) ناصر الدین محمود شاہ

2. محمد بن تغلق نے کون سا زرعی شعبہ قائم کیا تھا؟

(a)دیوانِ کوہی(Diwan-i-Kohi)　(b)دیوانِ انشاء(Diwan-i-Insha)

(c)دیوانِ رسالت(Diwan-i-Risalat)　(d)دیوانِ عرض(Diwan-i-Arz)

3. ''ہنوز دلی دور است''کس نے کہا تھا؟

(a) خواجہ معین الدین چشتی　(b) شیخ نظام الدین اولیاء

(c)امیر خسرو　(d) شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی

4. ''الغ خان (Ulugh Khan) ''کس کا لقب تھا؟

(a)غیاث الدین تغلق　(b)محمد بن تغلق　(c)جلال الدین خلجی　(d)بلبن

5. محمد بن تغلق کا جانشین کون تھا؟

(a)فیروز شاہ تغلق　(b)غیاث الدین تغلق　(c)ناصر الدین محمود شاہ　(d)نصرت شاہ

10.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. سلطان غیاث الدین تغلق کی ابتدائی مشکلات بیان کیجیے۔
2. سلطان محمد بن تغلق کی مالگزاری پالیسی پر ایک جامع نوٹ تحریر کیجیے۔
3. سلطان محمد بن تغلق کے دو اہم منصوبوں کا جائزہ لیجیے۔

10.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. سلطان غیاث الدین تغلق کے ابتدائی مسائل کیا تھے اور اس نے ان پر کیسے قابو پایا، وضاحت کیجیے۔
2. سلطان محمد بن تغلق کی راجدھانی منتقلی کے اسباب و وجوہات بیان کیجیے۔
3. سلطان فیروز شاہ تغلق کی زرعی اصلاحات پر تفصیل سے روشنی ڈالیے۔

اکائی 11۔سیداورلودھی خاندان

(The Syeds and the Lodis)

اکائی کے اجزا

11.0 تمہید

11.1 مقاصد

11.2 سید خاندان

11.2.1 خضر خان

11.2.2 سید مبارک شاہ

11.2.3 سید محمد شاہ

11.2.4 علاءالدین عالم شاہ

11.3 لودھی خاندان

11.3.1 ہندوستان میں افغانوں کی آمد

11.3.2 بہلول لودھی

11.3.3 سکندر لودھی

11.3.4 ابراہیم لودھی

11.4 اکتسابی نتائج

11.5 کلیدی الفاظ

11.6 نمونہ امتحانی سوالات

11.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

11.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

11.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

11.0 تمہید (Introduction)

فیروز شاہ تغلق کی وفات کے بعد دہلی سلطنت بتدریج سیاسی کمزوری، امراء کی باہمی رقابت، صوبائی بغاوتوں اور مرکزی اقتدار کے زوال کا شکار ہوگئی۔ تیمور کے حملۂ ہند (1398ء) نے اس کمزوری کو مزید گہرا کر دیا، جس کے نتیجے میں سلطنت کے مختلف حصوں میں مقامی طاقتیں مضبوط ہونے لگیں اور دہلی کا اقتدار محدود ہو کر رہ گیا۔ آخری تغلق حکمراں محمود تغلق کے عہد میں سلطنت کی سیاسی اور انتظامی صورتِ حال انتہائی ابتر ہو چکی تھی۔ مختلف مقطیوں، جاگیرداروں اور مقامی سرداروں نے مرکز سے عملی طور پر آزادی اختیار کر لی تھی، جبکہ دہلی کی حکومت مسلسل داخلی انتشار اور بیرونی خطرات سے دوچار تھی۔ ان حالات میں 1414ء میں ملتان کے گورنر خضر خان نے دہلی پر قبضہ کر کے سید خاندان کی حکومت قائم کی، جو 1451ء تک قائم رہی۔ سید حکمرانوں میں خضر خان، سید مبارک شاہ، سید محمد شاہ اور علاء الدین عالم شاہ شامل تھے۔ ان کے دورِ حکومت کا بیشتر حصہ سلطنت کے محدود اقتدار کو برقرار رکھنے، باغی سرداروں کی سرکوبی اور مرکز کی بالادستی قائم رکھنے کی کوششوں میں گزرا۔ اگرچہ وہ دہلی سلطنت کی سابقہ وسعت اور طاقت بحال نہ کر سکے، تاہم انتشار کے اس دور میں انہوں نے سلطنت کے وجود کو برقرار رکھنے کی مسلسل کوشش کی۔

1451ء میں سید خاندان کے خاتمے کے بعد دہلی سلطنت پر لودھی خاندان کا اقتدار قائم ہوا، جو دہلی کا پانچواں اور آخری سلطنتی خاندان اور ہندوستان کا پہلا افغان حکمراں خاندان تھا۔ لودھی حکمرانوں نے 1451ء سے 1526ء تک حکومت کی۔ اس دور میں ایک طرف افغان قبائلی روایات اور مرکزی اقتدار کے درمیان توازن قائم رکھنے کی کوشش کی گئی، تو دوسری طرف سلطنت کے سیاسی استحکام، انتظامی تنظیم اور علاقائی توسیع پر بھی توجہ دی گئی۔ بہلول لودھی نے منتشر سلطنت کو دوبارہ منظم کیا، سکندر لودھی نے انتظامی، معاشی، تعلیمی اور تہذیبی میدانوں میں اہم اصلاحات نافذ کیں، جبکہ ابراہیم لودھی کے عہد میں افغان امراء سے اختلافات، داخلی انتشار اور بابر کے حملے کے نتیجے میں 1526ء کی پہلی جنگِ پانی پت واقع ہوئی، جس کے ساتھ دہلی سلطنت کا خاتمہ اور ہندوستان میں مغل سلطنت کا آغاز ہوا۔

اس طرح سید اور لودھی خاندان دہلی سلطنت کے آخری مرحلے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس دور کی تاریخ سیاسی انتشار، علاقائی طاقتوں کے عروج، مرکزیت کی بحالی کی کوششوں اور اقتدار کی مسلسل کشمکش سے عبارت ہے۔ اسی عہد نے ایک طرف سلطنتِ دہلی کے اختتام کی راہ ہموار کی، تو دوسری طرف ہندوستان میں مغل دور کے آغاز کے لیے بھی سیاسی بنیادیں فراہم کیں۔ اس اکائی میں سید اور لودھی خاندانوں کے قیام، اہم حکمرانوں، سیاسی و انتظامی سرگرمیوں اور ان کے عروج و زوال کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا جائے گا۔

11.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- سید خاندان کے قیام اور اس کے سیاسی حالات سے واقف ہو سکیں گے۔
- خضر خان اور دیگر سید حکمرانوں کی اہم کارگزاریوں کا جائزہ لے سکیں گے۔

- سید عہد کی بغاوتوں اور انتظامی مسائل کو بیان کر سکیں گے۔
- ہندوستان میں افغانوں کی آمد اور لودھی خاندان کے قیام کو سمجھ سکیں گے۔
- بہلول، سکندر اور ابراہیم لودھی کی سیاسی و انتظامی خدمات کا جائزہ لے سکیں گے۔
- لودھی سلطنت کے عروج و زوال کے اسباب بیان کر سکیں گے۔
- سید اور لودھی ادوار کی اہم خصوصیات اور دہلی سلطنت کی تاریخ میں ان کی اہمیت کا تجزیہ کر سکیں گے۔

11.2 سید خاندان

11.2.1 خضر خان

سید خاندان سے متعلق سب سے اہم ماخذ یحییٰ احمد سرہندی کی کتاب **"تاریخ مبارک شاہی "** ہے۔اس کے مطابق سید خاندان کے بانی خضر خان کا تعلق پیغمبر اسلام ﷺ کے خانوادے سے تھا۔ خضر خان، سلطان فیروز شاہ تغلق کے ممتاز امیر ناصر الملک مردان الدولہ کے متبنّٰی ملک سلیمان کا بیٹا تھا۔ ملک سلیمان فیروز شاہ تغلق کے عہدِ حکومت میں ایک اہم امیر تھا۔اس کے انتقال کے بعد سلطان محمد شاہ نے خضر خان کو ملتان کا گورنر (مقطی) مقرر کیا۔96-1395 ء میں لاہور اور دیپال پور کے گورنر سارنگ خان سے جنگ میں اسے شکست ہوئی اور ملتان کی گورنری اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔اس کے بعد اس نے میوات کے مقطی بہادر ناہر کے ہاں پناہ لی، لیکن تیمور کے حملۂ ہند کے بعد اس کی سیاسی حیثیت دوبارہ مستحکم ہو گئی۔یحییٰ سرہندی کے مطابق تیمور نے خضر خان پر خاص عنایت کرتے ہوئے ملتان اور دیپال پور اس کے سپرد کیے، جس سے شمالی ہند میں اس کی پوزیشن مضبوط ہوئی، اگرچہ اس کے سامنے تغلق امراء کی مخالفت، قحط، وبائی امراض اور سیاسی انتشار جیسے مسائل موجود تھے۔

اس زمانے میں ملّو اقبال دہلی اور دوآب میں اپنی طاقت مستحکم کر رہا تھا، جبکہ خضر خان ملتان، دیپال پور اور بالائی سندھ میں اپنی حیثیت مضبوط بنانے میں مصروف تھا۔06-1405ء میں دونوں کے درمیان اجودھن کے قریب دریائے دھندا کے کنارے جنگ ہوئی، جس میں ملّو اقبال شکست کھا کر مارا گیا۔اس کامیابی کے بعد خضر خان کا سب سے بڑا سیاسی حریف ختم ہو گیا۔ ملّو اقبال کی وفات کے بعد سلطان محمود تغلق کچھ عرصہ دہلی پر قابض رہا، لیکن 1412ء میں اس کی وفات کے بعد دولت خان نے اقتدار سنبھال لیا۔ خضر خان نے حالات کا جائزہ لینے کے بعد 1413ء کے اواخر میں دہلی کی طرف پیش قدمی کی اور چار ماہ کے محاصرے کے بعد دولت خان کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔6 جون 1414ء کو وہ دہلی میں داخل ہوا اور سید حکومت کی بنیاد رکھی۔

اقتدار سنبھالنے کے بعد خضر خان نے عوام میں تحائف اور وظائف تقسیم کیے، اہم امراء کو مناصب عطا کیے اور انتظامیہ کو منظم کرنے کی کوشش کی۔تاج الملک کو وزیر، سید سلیم کو مشیرِ خاص، علاء الملک کو فتح پور کا مقطی، ملک سرور کو شحنۂ شہر اور دیگر امراء کو مختلف ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ خضر خان کے پورے عہدِ حکومت میں کٹیہر، بدایوں، اٹاوہ، گوالیار، بیانہ، ناگور، میوات اور سرہند سمیت مختلف علاقوں میں

بغاوتیں ہوتی رہیں۔ان شورشوں کے انسداد کے لیے اس نے تاج الملک، زیرک خان اور دوسرے امراء کی مدد سے متعدد فوجی مہمات روانہ کیں۔ان کارروائیوں کے نتیجے میں باغیوں نے کئی مواقع پر اطاعت قبول کی، خراج ادا کیااور وقتی طور پر سلطنت کا اقتدار بحال ہوا، لیکن مرکزی فوجوں کے واپس ہوتے ہی اکثر علاقوں میں دوبارہ بغاوتیں سر اٹھانے لگیں۔اس طرح خضر خان کا بیشتر عہدِ حکومت داخلی استحکام برقرار رکھنے اور سلطنت کے مختلف حصوں کو مرکز سے وابستہ رکھنے کی کوششوں میں گزرا۔ 1421 ء میں اس کے قابل وزیر تاج الملک کا انتقال ہو گیااور چند ماہ بعد 20 مئی 1421ء کو خود خضر خان بھی وفات پا گیا۔ مختصر مدتِ حکومت کے باوجود خضر خان ایک قابل، دور اندیش اور معاملہ فہم حکمراں تھا۔اس نے انتہائی مشکل سیاسی حالات میں دہلی سلطنت کو منظم رکھنے، بغاوتوں پر قابو پانے اور مرکزی اقتدار کو برقرار رکھنے کی مسلسل کوشش کی۔ اگرچہ اس کی بیشتر کامیابیاں عارضی ثابت ہوئیں، تاہم اس نے منتشر سلطنت کو سنبھالنے میں اہم کردار ادا کیا۔ مورخ فرشتہ کے مطابق رعایااس کے طرزِ حکومت سے مطمئن تھی اوراس کی وفات پر عوام نے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔

11.2.2 سید مبارک شاہ

خضر خان کے بعد اس کا بیٹا سید مبارک شاہ (1421ء–1434ء) تخت نشین ہوا۔ اس کا اصل نام مبارک خان تھا اور اقتدار سنبھالنے کے بعد اس نے **معزالدین مبارک شاہ** کا لقب اختیار کیا۔ خضر خان نے اپنی وفات سے قبل اسے ولی عہد مقرر کر دیا تھا، جسے تمام اہم امرااور ملکوں نے قبول کر لیا۔ 22 مئی 1421ء کو وہ باضابطہ طور پر دہلی کے تخت پر بیٹھا۔ تخت نشینی کے بعد اس نے سابقہ اقطاعات اور انتظامی تقرریوں کی توثیق کی، البتہ حالات کے تقاضوں کے مطابق بعض ذمہ داریوں میں ردوبدل بھی کیا تاکہ انتظامیہ کو زیادہ مؤثر بنایا جا سکے۔

مبارک شاہ کے دورِ حکومت کا بیشتر حصہ مختلف بغاوتوں کے انسداد میں گزرا۔اس نے سب سے پہلے پنجاب اور سرہند کے علاقوں میں کھوکھروں کی شورش کو دبانے کی کوشش کی۔ جسرتھ کھوکھر کے خلاف متعدد فوجی کارروائیاں کی گئیں، جن کے نتیجے میں وقتی طور پر امن قائم ہوا۔اس دوران لاہور کی ازسرِنو آبادکاری، قلعہ اور شہر کی مرمت اور دفاعی انتظامات پر بھی توجہ دی گئی۔اسی طرح کٹیہر، بدایوں، اٹاوہ، گوالیار اور دیگر علاقوں میں بھی بار بار بغاوتیں ہوئیں۔ سلطان نے مختلف فوجی مہمات کے ذریعے باغیوں کو اطاعت اور خراج کی ادائیگی پر مجبور کیا، تاہم یہ کامیابیاں زیادہ تر عارضی ثابت ہوئیں اور مناسب موقع ملتے ہی مقامی سردار دوبارہ سرکشی اختیار کر لیتے تھے۔ مبارک شاہ کے عہد میں میواتیوں کی بغاوتیں بھی ایک بڑا مسئلہ رہیں۔ بہادر ناہر کی اولاد اور دیگر میواتی سرداروں نے کئی مرتبہ بغاوت کی، جس کے نتیجے میں سلطان کو بارہا میوات کی طرف فوج کشی کرنا پڑی۔اندور، الور، تجارہ اور دیگر علاقوں میں کارروائیاں کی گئیں، قلعوں کا محاصرہ کیا گیااور باغیوں کو خراج اور اطاعت پر مجبور کیا گیا، لیکن میوات مکمل طور پر سلطنت کے قابو میں نہ آ سکا۔ان کے علاوہ بیانہ، گوالیار اور دیگر علاقوں میں بھی وقتاً فوقتاً شورشیں ہوتی رہیں۔ سلطان نے ان تمام بغاوتوں کے خلاف مسلسل کارروائیاں جاری رکھیں اور سلطنت کے نظم و نسق کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔اس نے یکم نومبر 1433ء کو **مبارک آباد** شہر کی بنیاد بھی رکھی، لیکن اسی دوران درباری سازشیں شدت اختیار کر گئیں۔

19 فروری 1434ء کو نمازِ جمعہ کے لیے روانگی کے وقت میراں صدر، سرور الملک اور ان کے ساتھیوں کی سازش کے نتیجے میں مبارک شاہ قتل کر دیا گیا۔یحییٰ سرہندی کے مطابق اس نے تقریباً سترہ برس حکومت کی۔ مورخین کے نزدیک وہ ایک باصلاحیت، شائستہ اور

جری حکمراں تھا، لیکن اس کا بیشتر عہد مسلسل فوجی مہمات اور داخلی انتشار سے عبارت رہا۔

11.2.3 سید محمد شاہ

سید مبارک شاہ کے قتل کے بعد اس کا بھانجا سید محمد شاہ 19 فروری 1434ء کو تخت نشین ہوا۔ چونکہ مرحوم سلطان نے اسے گود لیا تھا، اس لیے امراء، علما، مشاہیر اور قضاۃ کی تائید سے وہ دہلی کے تخت کا مالک بنا۔ تخت نشینی کے بعد اس نے سرور الملک کو **خانِ جہاں** اور میراں صدر کو **معین الملک** کا خطاب عطا کیا۔ ابتدائی دور میں سرور الملک نے انتظامیہ پر اپنی گرفت مضبوط کرنے اور مرحوم سلطان کے وفادار امراء کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی۔ اس نے بعض اہم افسروں کو قتل اور متعدد کو قید کر دیا، جس سے امراء میں شدید بے چینی پیدا ہوئی۔ دوسری طرف کمال الملک اور دوسرے بااثر امراء مبارک شاہ کے قتل کا بدلہ لینے کے خواہاں تھے۔ حالات اس وقت فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوئے جب 14 اگست 1434ء کو سرور الملک اور اس کے ساتھیوں نے سلطان کو قتل کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ ناکام رہے۔ اس کارروائی میں سرور الملک اور اس کے ساتھی مارے گئے، جس کے بعد سلطان محمد شاہ کو عملی طور پر اقتدار حاصل ہو گیا اور تمام امراء نے دوبارہ اس سے وفاداری کا اظہار کیا۔

اس کے عہد میں کھوکھروں کی بغاوت بھی ایک اہم مسئلہ رہی۔ 1436ء میں سمانہ کے کھوکھروں نے سرکشی اختیار کی، جس کے انسداد کے لیے فوج روانہ کی گئی، لیکن مستقل کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ 1441ء میں جسرتھ کھوکھر نے دوبارہ بغاوت کی۔ سلطان نے بہلول لودھی کو دیپال پور اور لاہور کا انتظام دے کر اس کی سرکوبی کا حکم دیا، مگر بہلول نے جسرتھ سے مصالحت کر لی اور رفتہ رفتہ اپنی سیاسی حیثیت مضبوط کر لی۔ اس دوران اس نے پانی پت تک کے علاقوں پر بھی اپنا اثر قائم کر لیا، جس سے دہلی سلطنت مزید کمزور ہو گئی۔ محمد شاہ کا تقریباً دس سالہ دورِ حکومت اندرونی انتشار، امرا کی رقابتوں اور صوبائی بغاوتوں سے عبارت رہا۔ 1443ء میں اس کی وفات کے ساتھ اس کا عہد اختتام پذیر ہوا۔

11.2.4 علاءالدین عالم شاہ

محمد شاہ کی وفات کے بعد اس کا فرزند علاءالدین عالم شاہ تخت نشین ہوا۔ ملک بہلول لودھی اور دوسرے امراء نے ابتدا میں اس کی اطاعت قبول کی، لیکن جلد ہی واضح ہو گیا کہ وہ ایک کمزور اور غیر مؤثر حکمراں ہے۔ اس کے دورِ حکومت میں کوئی نمایاں سیاسی یا عسکری کامیابی نظر نہیں آتی۔ 1445ء میں وہ بدایوں چلا گیا، جہاں وہ پہلے بھی صوبہ دار رہ چکا تھا۔ وزیر حسام خان نے اسے دہلی نہ چھوڑنے کا مشورہ دیا، لیکن اس نے اس رائے کو قبول نہیں کیا اور دہلی کا انتظام اپنے رشتہ داروں کے سپرد کر کے خود بدایوں میں مقیم ہو گیا۔ اس کے بعد دہلی میں انتظامی انتشار بڑھ گیا اور مقرر کردہ حکام باہمی کشمکش کا شکار ہو گئے۔ ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دہلی کے امراء نے بہلول لودھی کو اقتدار سنبھالنے کی دعوت دی۔ بہلول نے بظاہر سلطان کے ساتھ خیر خواہی کا اظہار کیا، جبکہ علاءالدین عالم شاہ نے بھی بدایوں پر اکتفا کرتے ہوئے باقی سلطنت اس کے حوالے کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ چنانچہ 1451ء میں بہلول لودھی دہلی کے تخت پر متمکن ہوا اور اس طرح سید

خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ علاءالدین عالم شاہ اپنی وفات تک بدایوں میں مقیم رہا۔ اس کی وفات کے بعد اس کے زیرِ انتظام علاقے بھی جون پور کی سلطنت میں شامل ہو گئے۔ اس طرح 1414ء میں قائم ہونے والی سید سلطنت، جو ابتدا میں دہلی سلطنت پر محیط تھی، بتدریج سکڑتے ہوئے بدایوں کے ایک محدود علاقے تک رہ گئی۔ سید خاندان کا عہد دہلی سلطنت کی تاریخ میں سیاسی کمزوری، اندرونی انتشار اور مرکزیت کے زوال کا ایک اہم مرحلہ سمجھا جاتا ہے۔

11.3 لودھی خاندان

11.3.1 ہندوستان میں افغانوں کی آمد

لودھی خاندان کا تعلق روہ کے افغان قبیلے سے تھا، جس نے 1451ء سے 1526ء تک دہلی سلطنت پر حکومت کی۔ یہ دہلی سلطنت کا پانچواں اور آخری، نیز ہندوستان کا پہلا افغان حکمراں خاندان تھا۔ ان کے پچھتر سالہ دورِ حکومت میں مسلسل جدوجہد، باہمی کشمکش اور سیاسی اتار چڑھاؤ نمایاں رہے، تاہم ان کی خدمات کو سابقہ مملوک، خلجی، تغلق اور سید حکمرانوں سے کم نہیں سمجھا جا سکتا۔ لودھی حکمرانوں کے ہاں مضبوط مرکزی حکومت کا رجحان نسبتاً کم تھا، کیونکہ افغان قبائلی روایات مساوات اور باہمی برابری پر مبنی تھیں اور تمام قبائلی سرداروں کو **ملک** کہا جاتا تھا۔ ہندوستان میں افغانوں کی آمد دہلی سلطنت کے قیام کے ساتھ ہی شروع ہو گئی تھی، لیکن سلطان ناصر الدین محمود اور خصوصاً سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں ان کی تعداد اور اثر و رسوخ میں نمایاں اضافہ ہوا۔ بلبن نے میواتیوں کے خلاف مہمات میں افغان سپاہیوں سے بھرپور استفادہ کیا، انہیں دہلی اور اس کے نواح میں فوجی چوکیاں قائم کرنے کی ذمہ داری دی اور اہم فوجی عہدوں پر فائز کیا۔ رفتہ رفتہ افغان امراء نے اپنی سیاسی حیثیت مضبوط کی اور بالآخر 1451ء میں بہلول لودھی کی قیادت میں دہلی پر اپنا اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ملک بہرام، جو ملتان میں آباد ہونے والا ایک افغان تاجر تھا، اس خاندان کی سیاسی ترقی میں اہم حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بیٹوں، خصوصاً ملک سلطان شاہ (اسلام خان)، نے خضر خان کی خدمت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اسلام خان کی وفاداری اور عسکری خدمات کے صلے میں اسے سرہند کی صوبہ داری ملی، جبکہ اس کے خاندان کے دوسرے افراد کو بھی اہم مناصب دیے گئے۔ اسی خاندان میں بعد میں بہلول لودھی پیدا ہوا، جس نے ہندوستان میں پہلی افغان سلطنت کی بنیاد رکھی۔

11.3.2 بہلول لودھی

بہلول لودھی ہندوستان میں لودھی خاندان کا بانی اور دہلی سلطنت کا پہلا افغان سلطان تھا۔ اس کے والد کا نام ملک کالا اور چچا ملک سلطان شاہ (اسلام خان) تھا، جنہوں نے اس کی پرورش کی اور بعد میں اپنی بیٹی کا نکاح بھی اس سے کر دیا۔ اسلام خان نے اپنی زندگی ہی میں بہلول کی صلاحیت، بہادری اور سیاسی بصیرت کو دیکھتے ہوئے اپنے بیٹوں کے بجائے اسے اپنا جانشین نامزد کیا۔ تاہم اسلام خان کی وفات کے بعد افغان سردار مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گئے اور جانشینی کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ بہلول نے اپنی معاملہ فہمی، عسکری صلاحیت اور سیاسی حکمتِ عملی سے مخالفین پر قابو پایا، سرہند میں اپنی پوزیشن مستحکم کی اور رفتہ رفتہ افغان سرداروں کی تائید حاصل کر لی۔

اسی دوران مالوہ کے سلطان محمود خلجی نے دہلی پر حملہ کیا تو سلطان محمد شاہ نے بہلول سے مدد طلب کی۔ بہلول نے افغان اور مغل سپاہیوں کے ساتھ دہلی پہنچ کر سلطان کی مدد کی اور دشمن کو پسپا ہونے پر مجبور کیا۔ اس خدمت کے صلے میں سلطان نے اسے **خانِ خاناں** کا خطاب عطا کیا۔ اس کامیابی کے بعد اس کی سیاسی حیثیت میں مزید اضافہ ہوا اور دہلی کے دربار میں اس کا اثر و رسوخ بڑھ گیا۔ اس نے مناسب مواقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی طاقت کو مزید مستحکم کیا اور دہلی کی سیاست میں ایک اہم قوت کے طور پر ابھر آیا۔ سلطان علاءالدین عالم شاہ کے بدایوں منتقل ہونے اور دہلی میں سیاسی انتشار پیدا ہونے کے بعد بہلول لودھی کو اقتدار سنبھالنے کا موقع ملا۔ دہلی کے بااثر امراء نے بھی اسے سلطنت کے استحکام کے لیے موزوں امیدوار سمجھا۔ چنانچہ 19 اپریل 1451ء کو بہلول لودھی دہلی کے تخت پر متمکن ہوا اور **بہلول شاہ غازی** کا لقب اختیار کیا۔ اس طرح سید خاندان کا خاتمہ ہوا اور دہلی سلطنت میں لودھی خاندان کی حکومت کا آغاز ہوا۔

تخت نشینی کے بعد بہلول لودھی نے سب سے پہلے سلطنت میں امن و امان قائم کرنے اور انتظامی نظام کو مستحکم کرنے پر توجہ دی۔ اس نے شاہی خزانے اور فوجی انتظامات کو منظم کیا، اہم عسکری و انتظامی عہدوں پر قابل اعتماد افغان امراء کو مقرر کیا اور سلطنت کے مختلف علاقوں کی نگرانی اپنے بیٹوں اور معتمد سرداروں کے سپرد کی۔ اس کی کوشش تھی کہ افغان سرداروں کے درمیان باہمی اعتماد برقرار رہے اور سلطنت کا نظم مضبوط بنیادوں پر استوار ہو۔ اسی پالیسی کے نتیجے میں وہ مختصر مدت میں سلطنت کے مختلف حصوں پر اپنی گرفت مضبوط کرنے میں کامیاب ہوا۔ بہلول کے عہد کا سب سے اہم واقعہ جونپور کی شرقی سلطنت کے خلاف طویل جدوجہد تھی۔ حسین شاہ شرقی دہلی سلطنت کے لیے مسلسل خطرہ بنا ہوا تھا اور دونوں سلطنتوں کے درمیان کئی برس تک کشمکش جاری رہی۔ بہلول نے صبر و تحمل اور تدبر سے کام لیتے ہوئے مختلف مراحل میں شرقی فوجوں کا مقابلہ کیا اور بالآخر 1479ء میں حسین شاہ شرقی کو شکست دے کر جونپور کو دہلی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس کامیابی سے نہ صرف شرقی سلطنت کا خاتمہ ہوا بلکہ دہلی سلطنت کی مشرقی سرحد بھی مضبوط ہو گئی اور اس کا اقتدار بنارس تک وسیع ہو گیا۔

جونپور کی فتح کے بعد بہلول نے کالپی، دھول پور، برن، حصار فیروزہ، گوالیار اور اٹاوہ سمیت متعدد علاقوں پر اپنا اقتدار مستحکم کیا۔ کئی راجپوت حکمرانوں نے بھی اس کی بالادستی تسلیم کرتے ہوئے خراج ادا کیا۔ اس طرح اس نے منتشر سلطنت کو دوبارہ منظم کیا اور دہلی کے مرکزی اقتدار کو بڑی حد تک بحال کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ ان مسلسل فوجی مہمات کے بعد واپسی کے سفر میں بہلول شدید گرمی کے باعث بیمار ہو گیا اور 12 جولائی 1489ء کو ملولی کے مقام پر اس کا انتقال ہو گیا۔ اس نے تقریباً اڑتیس برس حکومت کی، جو سلاطینِ دہلی کے طویل ادوارِ حکومت میں شمار ہوتی ہے۔ بہلول لودھی ایک مدبر، سادہ مزاج، انصاف پسند اور بہادر حکمراں تھا۔ وہ افغان قبائلی روایات کا احترام کرتا تھا اور امراء کو ساتھ لے کر حکومت چلانے پر یقین رکھتا تھا۔ اس کے دور میں پنجاب سے بہار کی سرحد تک دہلی سلطنت کا اقتدار دوبارہ مستحکم ہوا، جبکہ گوالیار، دھول پور اور دیگر راجپوت ریاستوں نے بھی اس کی بالادستی قبول کی۔ اپنی سیاسی بصیرت، تحمل اور عملی حکمتِ عملی کی بدولت اس نے لودھی سلطنت کی مضبوط بنیادیں قائم کیں، جنہیں بعد میں سکندر لودھی نے مزید مستحکم کیا۔

11.3.3 سکندر لودھی

بہلول لودھی کی وفات کے بعد امرائے دہلی نے ملولی میں اس کے جانشین کے انتخاب کے لیے اجلاس منعقد کیا۔ جانشینی کے لیے

نظام خاں، بار بک شاہ اور اعظم ہمایوں کے نام زیر غور آئے، لیکن بالآخر 14 جولائی 1489ء کو نظام خاں دہلی کے تخت پر متمکن ہوا اور **سلطان سکندر شاہ** کا لقب اختیار کیا۔ تاریخ میں وہ **سکندر لودھی** کے نام سے مشہور ہوا۔ تخت نشینی کے بعد اسے اپنے بھائی بار بک شاہ، بعض افغان امراء اور صوبائی سرداروں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، لیکن اس نے تدبر، سیاسی بصیرت اور عسکری صلاحیت کے ذریعے ان تمام مشکلات پر قابو پا کر اپنی حکومت کو مستحکم کیا۔ ابتدا میں اس نے جونپور میں اپنی پوزیشن مضبوط کی، جہاں بار بک شاہ نے اس کی اطاعت سے انکار کر دیا تھا۔ سلطان نے اسے شکست دے کر دوبارہ جونپور کا حاکم تو مقرر کر دیا، لیکن جب وہ مقامی بغاوتوں پر قابو نہ پا سکا تو اسے معزول کر کے وہاں اپنے معتمد امراء مقرر کیے، جس سے جونپور پر مرکزی اقتدار مضبوط ہو گیا۔

جونپور کے استحکام کے بعد سکندر لودھی نے بہار کی طرف توجہ دی، جہاں حسین شاہ شرقی اس کے خلاف سرگرم تھا۔ بنارس کے قریب دونوں کے درمیان جنگ ہوئی جس میں حسین شاہ کو شکست ہوئی اور وہ بہار کی طرف فرار ہو گیا۔ سلطان نے اس کا تعاقب کیا اور بہار میں اپنا اقتدار مستحکم کرنے کے بعد بنگال کی سرحد تک پیش قدمی کی۔ اس نے بنگال کے سلطان کے ساتھ عدم جارحیت کا معاہدہ کیا، ترہٹ کے راجا سے خراج وصول کیا اور اس کے بعد گوالیار، دھول پور، نروار اور چندیری کے حکمرانوں کو اپنی اطاعت قبول کرنے پر مجبور کیا۔ اس طرح اس کی سلطنت پنجاب سے بنگال کی سرحد تک وسیع ہو گئی، جبکہ بندیل کھنڈ اور ستلج کے علاقے بھی اس کے زیر اثر آ گئے۔ اپنے عہد کے آخری دور میں اس نے رنتھمبور کی طرف بھی فوج کشی کی۔ اگرچہ قلعہ فتح نہ ہو سکا، لیکن وہاں کے حکمران نے اس کی برتری تسلیم کر لی۔

سکندر لودھی نے 1506ء میں آگرہ شہر کی بنیاد رکھی، جو اس کے عہد کا ایک نہایت اہم کارنامہ تھا۔ اس نے نئے شہر کے قیام کے لیے موزوں مقام کے انتخاب میں غیر معمولی احتیاط سے کام لیا۔ ماہرین پر مشتمل ایک جماعت نے دریائے جمنا کے کناروں کا معائنہ کیا، جس کے بعد سلطان نے خود بھی اس مقام کا جائزہ لیا اور اسے نئی راجدھانی کے لیے موزوں قرار دیا۔ آگرہ کو دارالحکومت بنانے کا مقصد سلطنت کے مشرقی اور وسطی علاقوں پر مؤثر نگرانی قائم کرنا تھا، کیونکہ دہلی کے مقابلے میں آگرہ سے جونپور، بہار، گوالیار اور دیگر اہم علاقوں کا انتظام نسبتاً آسان تھا۔ بعد کے زمانے میں یہی شہر مغل سلطنت کا بھی ایک اہم سیاسی اور تہذیبی مرکز بن گیا۔ سکندر لودھی ایک باصلاحیت اور فعال منتظم تھا۔ اس نے سلطنت میں امن وامان کے قیام کو اپنی اولین ترجیح بنایا۔ شاہراہوں کو ڈاکوؤں اور لٹیروں سے محفوظ کیا، دور دراز علاقوں کی نگرانی کے لیے مضبوط جاسوسی نظام قائم کیا اور اس امر کو یقینی بنایا کہ صوبائی حکام اور امرا کی سرگرمیوں کی اطلاع براہ راست سلطان تک پہنچتی رہے۔ اس کے دور میں عدالتی نظام کو بھی منظم کیا گیا۔ اہم مقدمات کا فیصلہ وہ خود کرتا تھا، جبکہ دوسرے معاملات کے لیے ذمہ دار حکام مقرر کیے گئے۔ عوامی شکایات کے فوری ازالے پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی اور متعلقہ افسران کو مسلسل دربار میں حاضر رہنے کی ہدایت تھی، تاکہ رعایا کو بروقت انصاف مل سکے۔

سکندر لودھی نے انتظامی استحکام کے ساتھ ساتھ معاشی اصلاحات پر بھی خصوصی توجہ دی۔ اس کے عہد میں زرعی پیداوار میں اضافہ ہوا اور کسانوں کے مفادات کے پیش نظر بعض محصولات میں تخفیف کی گئی۔ غلے پر عائد محصول ختم کیا گیا اور زمین کی پیمائش کے لیے **گزِ**

سکندری کے نام سے ایک معیاری پیمانہ رائج کیا گیا، جو بعد کے ادوار، خصوصاً مغل دور تک استعمال ہوتا رہا۔ اس کے زمانے میں بازاروں کی نگرانی کا مؤثر انتظام تھا۔ روزانہ اشیائے ضروریہ کی قیمتوں کی رپورٹ سلطان کے سامنے پیش کی جاتی تھی، جس سے قیمتوں میں استحکام اور عوام کو ضروری اشیاء مناسب نرخوں پر دستیاب رہتی تھیں۔ امن و امان، زرعی ترقی اور منظم نظم و نسق کے باعث سلطنت معاشی طور پر خوشحال رہی۔

سکندر لودھی علم و ادب، تہذیب و ثقافت اور فنونِ لطیفہ کا بھی سرپرست تھا۔ وہ علماء، صوفیہ، شعراء اور اہلِ علم کی بڑی قدر کرتا تھا اور انہیں شاہی سرپرستی فراہم کرتا تھا۔ خود بھی شاعری کا ذوق رکھتا تھا اور "گل رخ" کے تخلص سے شعر کہتا تھا۔ اس کی دعوت پر ایران اور عرب سے متعدد علماء ہندوستان آئے، جنہوں نے اس وقت کے تعلیمی نصاب میں معقولات اور دیگر علوم کو شامل کر کے تعلیمی نظام کو وسعت دی۔ اس نے مدارس کی سرپرستی کی اور تعلیم کے فروغ کے لیے متعدد اقدامات کیے، جس سے علمی سرگرمیوں کو نئی تقویت ملی۔ رفاہِ عامہ کے میدان میں بھی اس کی خدمات قابلِ ذکر ہیں۔ اس نے غریبوں اور محتاجوں کے لیے لنگر کا انتظام کیا، وظائف مقرر کیے اور ضرورت مندوں کی مالی امداد کا باقاعدہ نظام قائم کیا۔ رعایا کی فلاح و بہبود کو اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے اس نے انتظامیہ کو ہدایت دی کہ عوامی مسائل کے حل میں تاخیر نہ کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے عہد کو امن، خوشحالی اور منظم نظم و نسق کا دور قرار دیا جاتا ہے۔ مذہبی معاملات میں سکندر لودھی نسبتاً سخت گیر تھا۔ اس نے بعض ایسی رسوم اور روایات پر پابندی عائد کی جنہیں وہ اسلامی تعلیمات کے منافی سمجھتا تھا۔ بہرائچ میں سالار مسعود غازی کے میلے، مزارات پر خواتین کی آمد اور بعض عوامی مذہبی رسومات کی حوصلہ شکنی اسی پالیسی کا حصہ تھی۔ اگرچہ اس کے یہ اقدامات مختلف زاویوں سے دیکھے جاتے ہیں، تاہم اس کی بنیادی توجہ اپنے تصور کے مطابق مذہبی اور سماجی نظم برقرار رکھنے پر تھی۔

مجموعی طور پر سکندر لودھی لودھی خاندان کا سب سے قابل، مدبر اور منظم حکمران تھا۔ اس نے سلطنت کی سیاسی بنیادوں کو مضبوط کیا، انتظامی اصلاحات نافذ کیں، معاشی استحکام پیدا کیا اور علم و ادب کی سرپرستی کے ذریعے تہذیبی زندگی کو فروغ دیا۔ افغان قبائلی روایات سے وابستہ ہونے کے باوجود اس نے سلطنت کے وقار اور مرکزی اقتدار کو مستحکم کرنے کی کوشش کی۔ 21 نومبر 1517ء کو اس کا انتقال ہوا، لیکن اپنی سیاسی بصیرت، انتظامی صلاحیت اور اصلاحی اقدامات کی بدولت وہ لودھی خاندان کا کامیاب ترین سلطان سمجھا جاتا ہے۔

11.3.4 ابراہیم لودھی

سکندر لودھی کی وفات کے بعد 22 نومبر 1517ء کو اس کا بڑا فرزند ابراہیم لودھی دہلی کے تخت پر متمکن ہوا۔ اس کی تخت نشینی کے موقع پر افغان امراء نے یہ رائے دی کہ سلطنت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ اقتدار ایک ہی شخص کے ہاتھ میں مرتکز نہ رہے۔ اس تجویز کے مطابق ایک حصہ ابراہیم لودھی اور دوسرا اس کے چھوٹے بھائی جلال خان کے سپرد کیا جانا تھا۔ جونپور اور اس سے ملحقہ علاقے جلال خان کے لیے تجویز کیے گئے، لیکن راپڑی کے جاگیردار خان جہاں لودھی کے مشورے پر ابراہیم نے اس تقسیم کو قبول نہ کیا اور پوری سلطنت پر اپنی حکمرانی برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا۔ بعدازاں 29 دسمبر 1517ء کو اس کی باقاعدہ تاج پوشی عمل میں آئی۔

تخت نشینی کے فوراً بعد اسے اپنے بھائی جلال خان اور بعض افغان امراء کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ جلال خان نے چند ناراض سرداروں کی مدد سے اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن کامیاب نہ ہو سکا اور گوالیار کے راجا کے پاس پناہ لینے پر مجبور ہوا۔ ابراہیم لودھی نے گوالیار پر حملہ کر کے قلعے کا محاصرہ کیا اور اسے اپنے قبضے میں لے لیا۔ جلال خان وہاں سے فرار ہو کر مالوہ کی طرف روانہ ہوا، لیکن راستے میں قتل کر دیا گیا۔ اس طرح جانشینی کا تنازع تو ختم ہو گیا، لیکن افغان سرداروں کی ناراضگی بدستور باقی رہی۔ ابراہیم لودھی نے سلطنت کے وقار اور مرکزی اقتدار کو مضبوط بنانے کے لیے درباری نظم وضبط اور شاہی آداب پر خاص زور دیا۔ اس کا خیال تھا کہ سلطان کی عظمت اور اقتدار کو ہر حال میں برقرار رکھا جائے، لیکن افغان قبائلی روایات اس طرزِ حکومت سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔ افغان سردار اپنے آپ کو سلطان کا ہم مرتبہ سمجھتے تھے اور سخت شاہی آداب کے پابند ہونے کو اپنی روایات کے خلاف تصور کرتے تھے۔ نتیجتاً سلطان اور امراء کے درمیان اختلافات بڑھتے گئے اور متعدد بااثر سردار حکومت سے بدظن ہو گئے۔

سلطان نے ان بغاوتوں کو سختی سے دبانے کی کوشش کی اور مرکزی اقتدار کو مضبوط کرنے کے لیے کئی اقدامات کیے، لیکن ان پالیسیوں سے حالات بہتر ہونے کے بجائے مزید پیچیدہ ہوتے گئے۔ مختلف صوبوں میں افغان سردار ایک دوسرے سے رابطہ قائم کرنے لگے اور حکومت کے خلاف ناراضگی میں اضافہ ہوتا گیا۔ بنگال میں دریا خان لوہانی نے بغاوت کر دی، جبکہ دوسرے صوبوں میں بھی بعض بااثر امراء نے مرکز سے فاصلہ اختیار کرنا شروع کر دیا۔ اگرچہ سلطان نے ان تحریکوں کو دبانے کی کوشش کی، لیکن وہ افغان اشرافیہ کا اعتماد دوبارہ حاصل نہ کر سکا۔

سیاسی اختلافات کے ساتھ ساتھ سلطنت کے مختلف حصوں میں انتظامی مشکلات بھی بڑھتی گئیں۔ بعض صوبائی حکام مرکز کے احکام پر پوری طرح عمل نہیں کرتے تھے اور کئی مقامی طاقتیں دوبارہ خود مختاری حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس صورتِ حال نے سلطنت کی داخلی طاقت کو کمزور کر دیا اور مرکز و صوبوں کے درمیان تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو گئی، جس کا فائدہ بعد میں بابر کو ہندوستان پر حملے کے موقع پر ملا۔ سلطنت کے اندر بڑھتی ہوئی بے چینی کے ساتھ ساتھ پنجاب میں بھی حالات ابراہیم لودھی کے خلاف ہوتے گئے۔ پنجاب کے گورنر دولت خان لودھی اور سلطان کے چچا عالم خان حکومت سے ناخوش تھے۔ دونوں کا خیال تھا کہ سلطان کی سخت پالیسیوں اور افغان امراء سے نامناسب طرزِ عمل نے سلطنت کو بحران میں مبتلا کر دیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے کابل کے حکمران ظہیر الدین بابر سے رابطہ قائم کیا اور اسے ہندوستان پر حملے کی دعوت دی۔ بابر پہلے بھی چند مرتبہ پنجاب پر حملے کر چکا تھا، اس لیے اسے ہندوستان کی سیاسی صورتِ حال اور لودھی سلطنت کی کمزوریوں کا بخوبی اندازہ تھا۔ افغان امراء کی باہمی اختلافات نے بابر کے لیے دہلی کی طرف پیش قدمی مزید آسان بنا دی۔

بابر نے اپنی فوج کو منظم انداز میں ترتیب دیا اور جدید جنگی حکمتِ عملی اختیار کی۔ اس نے توپ خانے اور آتشیں اسلحے کو مؤثر طریقے سے استعمال کیا، جبکہ فوج کی صف بندی بھی نہایت منظم انداز میں کی گئی۔ تقریباً سات سو گاڑیوں کو مضبوط رسیوں کے ذریعے آپس میں باندھ کر دفاعی رکاوٹیں قائم کی گئیں اور ان کے عقب میں توپچی اور بندوق بردار تعینات کیے گئے۔ فوج کے دونوں بازوؤں کو محفوظ بنانے کے لیے

خندقیں کھدوائی گئیں اور مناسب مقامات پر حفاظتی انتظامات کیے گئے، تاکہ دشمن کی پیش قدمی کو روکا جاسکے۔ ابراہیم لودھی نے بھی ایک بڑی فوج کے ساتھ بابر کا مقابلہ کرنے کی تیاری کی، لیکن اس کی فوج منظم قیادت، جدید حربی حکمتِ عملی اور توپ خانے سے محروم تھی۔ دونوں افواج کئی دن تک پانی پت کے میدان میں آمنے سامنے رہیں۔ بالآخر 21 اپریل 1526ء کو فیصلہ کن جنگ شروع ہوئی۔ بابر کی منظم جنگی حکمتِ عملی اور توپ خانے کے مؤثر استعمال نے لودھی فوج کو شدید نقصان پہنچایا۔ جنگ کے دوران ہزاروں سپاہی مارے گئے اور خود ابراہیم لودھی بھی میدانِ جنگ میں لڑتے ہوئے مارا گیا۔ بابر نے اس کی آخری رسومات ادا کرنے کا حکم دیا اور اسے باعزت طریقے سے دفن کیا گیا۔ ابراہیم لودھی کی وفات کے ساتھ ہی لودھی خاندان کا خاتمہ ہو گیا اور دہلی سلطنت کا تقریباً تین سو بیس سالہ دور اپنے اختتام کو پہنچا۔ اس جنگ کے نتیجے میں ہندوستان میں مغل سلطنت کی بنیاد پڑی، جس نے آئندہ تین صدیوں تک برصغیر کی سیاست، معیشت اور تہذیب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

ابراہیم لودھی ذاتی طور پر بہادر، خود اعتماد اور جنگجو سلطان تھا، لیکن وہ اپنے والد سکندر لودھی اور دادا بہلول لودھی کی طرح سیاسی تدبر اور امراء کو ساتھ لے کر چلنے کی صلاحیت نہ رکھتا تھا۔ افغان سرداروں کے ساتھ مسلسل کشیدگی، داخلی بغاوتیں، مرکز اور صوبوں کے درمیان بڑھتے ہوئے اختلافات اور بدلتے ہوئے جنگی حالات اس کی حکومت کی بڑی کمزوریاں ثابت ہوئیں۔ اگرچہ اس نے سلطنت کی مرکزیت کو مضبوط بنانے کی کوشش کی، لیکن اس کی سخت پالیسیوں نے افغان اشرافیہ کو اس سے دور کر دیا۔ یہی داخلی کمزوریاں بابر کی کامیابی اور لودھی سلطنت کے زوال کا بنیادی سبب بنیں۔

11.4 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ تیمور کے حملے کے بعد دہلی سلطنت شدید سیاسی انتشار کا شکار ہو گئی تھی۔ انہی حالات میں 1414ء میں سید خاندان برسرِ اقتدار آیا، لیکن خضر خان، مبارک شاہ، محمد شاہ اور علاء الدین عالم شاہ اپنے بیشتر عہد میں داخلی بغاوتوں اور مرکزیت کے استحکام کی کوششوں میں مصروف رہے۔ مسلسل سیاسی کمزوری کے باعث 1451ء میں سید خاندان کا خاتمہ ہوا اور دہلی سلطنت پر لودھی خاندان کا اقتدار قائم ہوا۔ لودھی ہندوستان کا پہلا افغان حکمراں خاندان تھا۔ بہلول لودھی نے منتشر سلطنت کو دوبارہ منظم کیا، جونپور اور دیگر علاقوں کو سلطنت میں شامل کر کے دہلی کی سیاسی حیثیت مضبوط کی۔ سکندر لودھی نے انتظامی اصلاحات، زرعی ترقی، عدالتی نظام، تعلیم و تہذیب اور نئے شہر آگرہ کے قیام کے ذریعے سلطنت کو استحکام بخشا۔ اس کے بعد ابراہیم لودھی کے دور میں افغان امراء سے اختلافات، صوبائی بغاوتیں اور داخلی انتشار میں اضافہ ہوا، جس کے نتیجے میں بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ 1526ء کی پہلی جنگ پانی پت میں ابراہیم لودھی کی شکست کے ساتھ دہلی سلطنت کا خاتمہ اور مغل سلطنت کا آغاز ہوا۔

11.5 کلیدی الفاظ (Keywords)

ملک	:	افغان قبائلی سرداروں کا خطاب۔
امیرانِ صدہ	:	ایسے امراء جن کے زیرِ انتظام تقریباً سو سپاہی ہوتے تھے۔
خانِ خاناں	:	اعلیٰ فوجی یا انتظامی خدمات کے اعتراف میں دیا جانے والا خطاب۔
اقطاع	:	ریاستی خدمات کے عوض عطا کی جانے والی زمین۔
ضابطہ	:	دستور، قانون
شق دار	:	کسی بھی پرگنہ کی ایک شق کا اہلکار
خالصہ زمین	:	وہ زمین جو براہِ راست سلطان یا ریاست کے زیرِ انتظام ہو۔
گزِ سکندری	:	زمین کی پیمائش کا وہ معیار جسے سکندر لودھی نے رائج کیا۔

11.6 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

11.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. بہلول لودھی (Bahlul Lodi) نے کس خاندان کا خاتمہ کیا؟

(a) تغلق خاندان (b) سید خاندان (c) خلجی خاندان (d) غلام خاندان

2. آگرہ شہر کی بنیاد کس سلطان نے رکھی؟

(a) سکندر لودھی (b) بہلول لودھی (c) ابراہیم لودھی (d) فیروز شاہ تغلق

3. گزِ سکندری (Gaj-i-Sikandari) کس حکمراں نے رائج کیا؟

(a) بہلول لودھی (b) سکندر لودھی (c) ابراہیم لودھی (d) شیر شاہ سوری

4. خضر خان (Khizr Khan) کو ملتان کی گورنری کس کے عہد میں ملی؟

(a) فیروز شاہ تغلق (b) محمد بن تغلق (c) تیمور (d) نصیر الدین محمود شاہ تغلق

5. بابر (Babur) نے کس سلطان کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ کیا؟

(a) سکندر لودھی (b) ابراہیم لودھی (c) بہلول لودھی (d) دولت خان لودھی

11.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. مبارک شاہ کے دور کی اہم خصوصیات بیان کیجیے۔
2. بہلول لودھی کی کامیابیوں پر مختصر نوٹ لکھیے۔

3. سکندر لودھی کی انتظامی اصلاحات بیان کیجیے۔
4. لودھی سلطنت کے زوال کے اسباب پر روشنی ڈالیے۔

11.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. سید خاندان کے سیاسی کردار اور اس کے زوال کا تفصیلی جائزہ پیش کیجیے۔
2. ابراہیم لودھی کے عہد اور لودھی سلطنت کے زوال کے اسباب پر تفصیل سے روشنی ڈالیے۔

Answer Key:
1. (b) | 2. (a) | 3. (b) | 4. (a) | 5. (b)

اکائی 12۔ حکمراں طبقہ: امراء، اقطاع دار اور دیہی اشرافیہ

(The Ruling Class: Umrah, Iqtadars and Rural Aristocracy)

اکائی کے اجزا

12.0		تمہید
12.1		مقاصد
12.2		حکمراں طبقہ
	12.2.1	سلطان
	12.2.2	امراء
	12.2.3	اقطاع دار
	12.2.3	دیہی اشرافیہ
	12.2.5	انتظامی افسران اور علماء
	12.2.6	معیار زندگی
12.4		اکتسابی نتائج
12.5		کلیدی الفاظ
12.6		نمونہ امتحانی سوالات
	12.5.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	12.5.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	12.5.3	طویل جوابات کے حامل سوالات

12.0 تمہید (Introduction)

دہلی سلطنت کے قیام نے شمالی ہندوستان کے سماجی ڈھانچے، بالخصوص حکمران طبقے کی ساخت میں گہری اور دوررس تبدیلیاں پیدا کیں۔ برطانوی اور قوم پرست مورخین کے مطابق ایک اجنبی مسلم حکومت کے قیام سے سابقہ سماجی و ثقافتی ڈھانچے کو شدید نقصان پہنچا، جبکہ مارکسوادی اور آزاد خیال مورخین یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ ایک جامد ہندوستانی سماج پر اس کا کوئی خاص منفی اثر نہیں پڑا۔ در حقیقت، سلطنت کے قیام سے عوام کی طرزِ زندگی میں فوری تبدیلیاں تو نہیں آئیں، لیکن اقتدار کی منتقلی کا سب سے گہرا اثر سابقہ حکمران طبقے، یعنی راجپوتوں اور برہمنوں نے محسوس کیا۔ شمالی ہندوستان میں گپت سلطنت کے تنزل کے بعد ایک ایسا دور ابھرا تھا جس میں علاقائی سطح پر اعلیٰ زمیندار طبقے کی طاقت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ بعض مورخین اسے ہندوستانی جاگیرداری (Indian Feudalism) کا نام دیتے ہیں، اگرچہ اس میں یورپی جاگیرداری کی بنیادی خصوصیات جیسے مینر نظام (Manor System) اور ماتحتی نظام (Vassalage) موجود نہیں تھیں۔ دہلی سلطنت نے اس پرانے نظام کی جگہ ایک نیا مرکزیت پسند (Centralised) ڈھانچہ متعارف کرایا۔ سابقہ حکمرانوں کی جگہ ایک نئے ترک اور افغان طبقہ امرا (Nobility) نے لے لی۔ اس نئی تنظیم میں اقطاع داری نظام (Iqta System) کو کلیدی حیثیت حاصل تھی، جس کے ذریعے امرا اور فوجی سالاروں (اقطاع داروں) کو زمینوں کے محاصل تفویض کیے گئے۔ اس اکائی میں ہم اسی نئے حکمران طبقے کے ارتقا، امرا کی طاقت کی کشمکش، اقطاع داری نظام کے خدوخال اور مرکزی حکومت کے ساتھ مقامی دیہی اشرافیہ (خوت، مقدم اور چودھری) کے پیچیدہ سماجی و سیاسی رشتوں کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔

12.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- دہلی سلطنت کے قیام کے بعد حکمران طبقے میں آنے والی گہری تبدیلیوں کو سمجھ سکیں گے۔
- سلاطین کے سماجی پس منظر اور امراء کے مختلف درجات اور ان کی سیاسی و سماجی حیثیت پر روشنی ڈال سکیں گے۔
- اقطاع داروں کے حقوق اور سلطنت میں ان کے کلیدی کردار کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- دیہی اشرافیہ کی اہمیت اور مرکزی حکومت کے ساتھ ان کے رشتوں کو سمجھ سکیں گے۔
- حکمران طبقے، امراء اور انتظامی افسران کے مسرفانہ طرزِ زندگی اور معیارِ زندگی کا مطالعہ کر سکیں گے۔

12.2 حکمراں طبقہ

12.2.1 سلطان

دہلی سلطنت کے سلاطین کا سماجی پس منظر اس لحاظ سے انتہائی منفرد ہے کہ ان میں سے بیشتر نے اقتدار موروثی حق کے طور پر نہیں پایا بلکہ سماجی ڈھانچے کی نچلی سطح سے جدوجہد کر کے تختِ دہلی تک رسائی حاصل کی۔ ابتدائی سلاطین، جنہیں مملوک یا خاندانِ غلاماں کہا جاتا

ہے، کا تعلق خالصتاً غلام طبقے سے تھا۔ قطب الدین ایبک، شمس الدین التتمش اور غیاث الدین بلبن جیسے نامور حکمرانوں کی زندگیاں وسطی ایشیا کے بازاروں میں بکنے والے ترک غلاموں کی حیثیت سے شروع ہوئیں، لیکن اپنی بے مثال عسکری مہارت، شجاعت اور وفاداری کی بدولت یہ عام غلاموں سے ترقی کرتے ہوئے سلطنت کے تاج دار بنے۔ ان سلاطین کے ابھار میں ایک اور نہایت اہم رجحان 'پہلے ملک، پھر سلطان' کا نظر آتا ہے۔ دہلی سلطنت میں متعدد حکمرانوں نے براہ راست بادشاہت کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ اپنے سفر کا آغاز عسکری اور صوبائی عہدوں سے کیا۔ جلال الدین خلجی، غیاث الدین تغلق اور بہلول لودھی جیسی شخصیات پہلے بحیثیت 'ملک' (گورنر یا سپہ سالار) سرحدی علاقوں کے محافظ رہے اور منگولوں کے خلاف اپنی طاقت کا لوہا منوایا۔ جب مرکزی حکومت کمزور پڑی تو ان تجربہ کار اور طاقتور 'ملکوں' نے اپنی ذاتی قابلیت اور فوجی قوت کے بل بوتے پر تختِ دہلی پر قبضہ کر لیا۔ اقتدار پر فائز ہونے والے ان سلاطین کے سماجی اور نسلی پس منظر میں بھی وقت کے ساتھ واضح ارتقاء دیکھنے کو ملتا ہے؛ جہاں ابتدائی دور کے سلاطین ترک النسل ہونے اور خاندانی برتری پر زور دیتے تھے، وہیں خلجی اور تغلق سلاطین کے دور تک آتے آتے مسندِ اقتدار پر بیٹھنے کے لیے خاندانی یا نسلی پس منظر کے بجائے تلوار کی طاقت اور عسکری وانتظامی اہلیت ہی سب سے فیصلہ کن شرط بن گئی۔

12.2.2 امراء

تیرھویں صدی میں شمالی ہندوستان میں جو سب سے اہم طبقہ اُبھرا وہ حکمراں طبقہ تھا جس میں امراء بھی شامل تھے۔ عام طور پر امراء کو تین درجوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ 'خان' جو سب سے اعلیٰ درجہ تھا، اور اس کے بعد 'ملک' اور 'امیر' آتے تھے۔ بہر حال یہ درجہ واری تقسیم کبھی بہت واضح یا صاف نہیں رہی۔ دربار میں، اور اس سے ملحق سب سے نچلے درجے کے عہدوں پر مقرر افراد۔ جیسے 'سر جاندار' (بادشاہ کی ذاتی فوج کے کمانڈر) 'ساقی خاص' (پانی اور دوسرے مشروبات کے منتظم) اور ان کے ساتھ کے کارکن بھی جو 'سپہ سالار' 'سر خیل' (فوج کے چھوٹے کماندار) وغیرہ ہوتے تھے 'امیر' کے خانے میں آتے تھے۔ بعد میں 'امیر' کا لفظ کچھ آسان سے معنی میں استعمال ہونے لگا اور ہر وہ شخص جو کچھ دولت یا سرکار میں اثر ورسوخ رکھتا تھا، امیر کہلایا جانے لگا۔ بہر حال سب سے اہم درجے 'ملک' اور 'خان' کے تھے۔ حکومت کے تمام عہدے اسی زمرے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے پاس ہوتے تھے۔ امراء کی جو فہرستیں منہاج سراج اور برنی نے دی ہیں ان میں صرف 25 ملکوں' کا ذکر ہے۔ 'خان' لفظ اصل میں منگولوں سے لیا ہوا تھا کیونکہ ان میں قاآن (خان) 10000 سپاہیوں کا کمانڈر ہوتا تھا۔ دہلی سلطنت میں خان کا لفظ ایک مخصوص اور اعلیٰ حیثیت دینے کے لیے استعمال ہوتا تھا کیونکہ بلبن کو الغ خان کہا جاتا تھا۔ امراء کو کچھ اور خطابات دے کر ان کی حیثیت میں امتیاز پیدا کیا جاتا تھا، جیسے 'خواجہ جہاں' 'عماد الملک' نظام الملک وغیرہ۔ انہیں کچھ اور مراعات یا حقوق (مراتب) بھی دیے جاتے تھے جیسے مختلف قسم کی خلعتیں، تلوار و خنجر، نشان (جھنڈا)، نوبت وغیرہ۔ ان کی ہمیشہ بڑی قدر و منزلت ہوتی تھی چونکہ ان سے حیثیت یا اقتدار اور بادشاہ سے قربت کا احساس ہوتا تھا۔ گھوڑے اور ہاتھی مع مرصع ساز و سامان بھی ان امراء کو مختلف موقعوں پر عطا کیے جاتے تھے۔

کسی خاص وقت میں کسی دربار میں امراء کی تعداد کا صحیح علم نہیں ہے۔ منہاج سراج نے التمش کے عہد میں 32 ملکوں کی فہرست دی

ہے جن میں 8 وسطی ایشیا سے بر طرف شدہ حکمراں بھی تھے۔ شاید 'ترکانِ چہل گانی' (چالیس ترک) کی اصطلاح برنی نے صرف چوٹی کے امراء کے اظہار کے لیے استعمال کی ہے۔ بلبن کے عہد میں اس نے قاضیوں کے علاوہ 36 ملکوں کی فہرست دی ہے۔ علاءالدین خلجی کے دور میں امراء کی تعداد 48 تک پہنچ گئی جن میں 7 افراد رشتے دار تھے جن میں سلطان کے بیٹے بھی تھے۔ اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اس وقت جب علاءالدین خلجی کی موت کے بعد سلطنت میں زیادہ توسیع نہیں ہوئی، ملک میں چوٹی کے امراء یا ملکوں کی تعداد کافی کم تھی اور جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں امراء کے اس چھوٹے سے زمرے میں بھی آپسی کشمکش اور کافی کھینچ تان تھی۔ اس کشمکش میں آپسی تعلقات یا نسلی قربت یا فرق بھی اہم کردار ادا کرتے تھے۔ ترک خود کو تمام دوسری نسلوں سے متعلق لوگوں جیسے تاجکوں، خلجیوں، افغانوں، ہندوستانیوں وغیرہ سے افضل اور اعلیٰ سمجھتے تھے۔ التمش کی موت کے بعد تاجکوں کو خارج کر دیا گیا اور اعلیٰ عہدوں پر لگ بھگ ترکوں کی گرفت قائم ہو گئی۔ خلجیوں کے عروج سے یہ گرفت ٹوٹی۔ پھر خلجیوں اور تغلق کے دور میں ہندوستانی مسلمان آگے بڑھے، مگر محض اپنی ذاتی صلاحیت اور مستعدی کے بل پر۔ پھر بھی غیر ملکی خون یا کسی مشہور و اعلیٰ خاندان کا وراثتی تعلق کافی حد تک سماجی قدر و منزلت کا پیمانہ رہا جس کی مراکش کے سیاح ابن بطوطہ نے بھی تصدیق کی ہے۔

بلند مرتبہ امراء کے سماجی پس منظر کے بارے میں ہمارے پاس کوئی خاص معلومات موجود نہیں ہیں۔ شروع کے دور میں حرکت یا سماجی طور پر منتقلی کی کیفیت کسی حد تک موجود تھی۔ اور ایک وسیع سماجی پس منظر رکھنے والے وہ افراد جو فوجی سلسلے میں اپنے ساتھ ایک تابعدار جمعیت پیدا کر لینے کی صلاحیت اور طاقت بھی رکھتے تھے، یا جو سلطان کی نظر التفات حاصل کر لیتے تھے اور اگر اُن کی قسمت ان کا ساتھ دیتی تھی تو وہ 'ملک' کے عہدے پر پہنچ سکتے تھے۔ بہت سے امراء نے حقیقت میں اپنی زندگی کی ابتدا غلام کی حیثیت میں کی تھی اور سماجی زینے کے اونچے درجوں پر آہستہ آہستہ چڑھے تھے۔ امراء کے زمرے میں یہ فراخی تیرھویں صدی تک شاہی خاندانوں کے تیز عروج و زوال کی وجہ سے رہی جس کے نتیجے میں پچھلی سلطنت کے دور کے زیادہ تر امراء تبدیلی کی نظر ہو جاتے تھے۔ اسی لیے تیرھویں صدی کے درمیان ہمیں ایسے خاندان مشکل سے نظر آتے ہیں جن کے افراد ایک نسل سے زیادہ کسی مرتبہ امارت پر باقی رہے ہوں۔

چودھویں صدی میں خلجیوں کے عروج اور پھر تغلق خاندان کے عروج کے ساتھ ساتھ، جنہوں نے لگ بھگ سو سال حکومت کی، امرا اور زمرے کی سماجی بنیاد پھیلی بھی اور زیادہ مضبوط اور مستحکم بھی ہوئی۔ اعلیٰ عہدوں پر ترک امراء کے اجارے کے کے ساتھ طبقہ امراء میں داخل ہونے کے لیے بھرتی کا میدان بھی وسیع ہوا۔ بہت سے خلجی، افغانی اور ہندوستانی طبقہ امراء میں شامل ہوئے۔ ترکوں کو نکال باہر کرنے کی کوئی خاص کوشش بھی نہیں کی گئی۔ بہر حال، جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا تھا اگر کبھی امیر اپنے اقتدار اور عہدے سے ہٹایا بھی جاتا تھا تو اس کی سماجی حیثیت اور سابقہ اقتدار اس کے ورثاء میں پہنچ جاتا تھا اور ان ورثاء کو یہ یقین ہوتا تھا کہ کھوئی ہوئی طاقت یا اقتدار کی واپسی صرف کسی مناسب وقت اور موقع کی منتظر ہے۔

مذہبی افراد کے ساتھ یہ زمرے وہ حلقہ بناتے تھے جسے عرف عام میں 'اشراف' کا نام دیا جاتا تھا اور انہیں محترم اور قابلِ تعظیم مانا جاتا تھا۔ اُس دور کے اندازِ فکر کے مطابق حکومت پر اس حلقے کے سلسلے میں ایک مخصوص ذمے داری عائد ہوتی تھی، جو صرف ان کی ملازمت سے

ہی تعلق نہیں رکھتی تھی بلکہ ان کی بیواؤں کو پنشن دینے اور ان کی غیر شادی شدہ لڑکیوں کی شادی کے لیے بھی ذمہ دار تھی۔ عام طور پر 'اہل سیف' (جنگجو) اور اہلِ قلم (پڑھنے لکھنے والے لوگوں کے درمیان) ایک تقسیم بھی خاصی واضح تھی۔ موخر الذکر کو عدالتی اور تحریری کاموں سے متعلق عہدوں کے لیے چنا جاتا تھا۔ علما بھی اسی زمرے میں آتے تھے۔ جب تک منحرف یا ضدی قسم کے سرداروں، مقدموں اور کسانوں سے محصول وصول کرنے کے سلسلے میں انتظامیہ کا کام فوجی خدمات کے مترادف یا متوازی تھا، پڑھے لکھے زمرہ کو انتظامیہ سے عام طور پر الگ رکھا جاتا تھا، لیکن اس کے باوجود زور اسی بات پر دیا جاتا تھا کہ وزیر کو علم والے زمرے سے چنا جانا چاہیے۔ عام طور پر امراء، علم والے طبقے کو کچھ حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور انہیں انتظامی اور سیاسی معاملات کے لیے ناموزوں تصور کرتے تھے۔ چنانچہ علاؤالدین خلجی نے قاضی مغیث کے اس مشورے کو کہ منگولوں سے کسی قسم کے معاہدے کی کوشش کی جائے نہ صرف مسترد کیا بلکہ ایک نویسندہ ابن نویسندہ (یہ کلرک کا بیٹا کلرک) ہوتے ہوئے فوجی اور سیاسی امور میں مشورہ دینے کے لیے اس کا تحقیراً مذاق بھی اڑایا۔

'اشراف' سے اس حلقے یا جماعت سے جس سے امراء کا انتخاب ہوتا تھا، اس کے اثر سے امراء کو ایک استحکام تو ضرور نصیب ہوا اگر اس سے مسلم سماج میں بھی ایک طرح کی درجہ بندی یا طبقہ واریت پیدا ہو گئی۔ 'اشراف' کے مقابلے میں 'اذلاف' یا 'کم اصل' (نچلے درجے) کے لوگوں کا طبقہ ہوتا تھا۔ اس نچلے درجے میں عام شہری اور پیشہ ور لوگ، جیسے جُلاہے، کسان، مزدور وغیرہ ہوتے تھے۔ اشراف اور اذلاف کے طبقوں کے درمیان صرف شادی بیاہ ہی ناممکنات میں سے نہیں تھا بلکہ ان میں سماجی تعلقات بھی بہت مشکل سے قائم ہوتے تھے۔ اس قسم کی سماجی درجہ بندی گو کہ مغربی اور وسط ایشیا کے مسلمانوں میں کسی قدر پہلے بھی موجود تھی، یہ ہندوستان پہنچ کر جہاں دیرینہ روایت کے تحت ذات پات ورثے میں ملتی تھی اور زیادہ سخت ہو گئی۔

اس گہری سماجی تقسیم سے ہی یہ تصور پیدا اور راسخ ہوا تھا کہ حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر پہنچنے کا حق صرف 'باعزت' طبقے کے افراد کو حاصل ہے۔ اس لیے جب محمد بن تغلق نے اعلیٰ عہدوں پر، صرف مستعدی اور کارکردگی کی بنیاد پر، 'نچلے' درجے یا 'ذات' سے تعلق رکھنے والے مسلمان یا ہندوؤں جیسے شراب کشید کرنے والے، نائی، باورچی، مالی، دکاندار (بازاری) وغیرہ کا تقرر کیا تو اعلیٰ طبقے کے لوگوں میں کافی وسیع پیمانے پر مزاحمتی انداز نظر آیا۔ کچھ مختلف وجوہات کے نتیجے میں اس کا یہ تجربہ ناکام ہوا۔ دوسری طرف فیروز تغلق نے جب اپنے امراء میں صرف 'باعزت' طبقے سے ایسے لوگوں کو مقرر کیا جن کے آباواجداد بادشاہ کی خدمات انجام دے چکے تھے تو اس کی بہت تعریف و توصیف کی گئی اور اعلیٰ طبقے نے اسے بہت پسند کیا۔ فی الحقیقت یہ تعصب صرف 'ہندوستانیوں' کے خلاف نہیں بلکہ پورے نچلے طبقے کے خلاف تھا، خواہ وہ ہندوستانی مسلمان ہی کیوں نہ ہوں۔ اس کیفیت کا ثبوت اس بات سے مل جاتا ہے کہ فیروز کا وزیر خانِ جہاں جو ایک برہمن نو مسلم تھا اُسے مسلمانوں کے ہر طبقے نے خوشی سے قبول کر لیا تھا۔ اس کے بالکل برعکس 'بارادوئی' اور 'پرواری' جنہیں غلطی سے نچلے درجے کے نو مسلم تصور کر لیا گیا تھا اور جو علاءالدین خلجی کے انتقال کے بعد کچھ عرصے کے لیے چوٹی پر پہنچ گئے تھے، ان پر برنی نے بڑی سخت تنقید کی تھی۔ برنی کہتا ہے کہ بلبن کے عہد میں جب امراء کے پاس بظاہر بہت زیادہ نقد روپیہ موجود نہیں تھا، یہ لوگ جب کوئی مجلس یا عیش و عشرت کی محفل سجانا چاہتے تھے تو ان کے کارندے روپیے قرض لینے، ساہاؤں، اور ملتانیوں، کے پاس دوڑے چلے جاتے تھے، جس کے نتیجے میں ان کے اقطاع

سے حاصل ہوئی ساری آمدنی ان لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ جاتی تھی اور سوناچاندی صرف تاجروں کے گھروں میں پایا جاتا تھا۔

علاءالدین خلجی کے برسر اقتدار آنے اور اس کے تحت محصول کے ایک نئے مرکزی نظام کے اُبھرنے سے اس صورت حال میں کسی حد تک تبدیلی پیدا ہوئی۔ یہ نظام خلجی حکمرانوں تک باقی رہا۔ اس نئے محصولی نظام میں ترجیح اس بات کو دی جاتی تھی کہ محصول نقد رقم میں ادا کیا جائے اور یہ طریقہ صرف خالصہ علاقوں۔ جن کی آمدنی براہ راست مرکزی خزانے میں جاتی تھی۔ پر ہی عائد نہیں ہوتا تھا بلکہ اُن علاقوں کے لیے بھی تھا جو 'اقطاع' کے طور پر دیے گئے تھے۔ اس طرح جب ابنِ بطوطہ کو منصف مقرر کیا گیا اور اس کی تنخواہ 5,000 مقرر کی گئی تو اسے ایسے ڈھائی گاؤں دے کر اس کی ادائیگی کی گئی جن کی سالانہ آمدنی اس رقم کے برابر ہوتی تھی۔ اب ہمیں بڑی بڑی تنخواہیں پانے والے امراء کا بھی علم ہے۔ چنانچہ ملک کو 50,000 سے 60,000 ٹنکہ تک تنخواہ ملتی تھی۔ امیر کو 30,000 سے 40,000 ٹنکہ کے درمیان اور سپہ سالار کو 20,000 ٹنکہ ملتے تھے۔ فیروز تغلق کے عہد میں تنخواہیں اور زیادہ تھیں۔ چنانچہ خانِ جہاں مقبول کو 13 لاکھ ٹنکے ملتے تھے اور ان کے علاوہ اس کی فوج اور ملازمین کے اخراجات اور اس کے بیٹوں اور دامادوں کے بھتے (الاؤنس) الگ تھے۔ دوسرے امراء کو چار سے آٹھ ٹنکے سالانہ تنخواہ ملتی تھی۔ مجموعی طور پر اس کا مطلب یہ تھا کہ دیہی علاقوں سے ہونے والی زائد یا اضافی آمد مرکز میں کچھ اعلیٰ طبقے کے ہاتھوں میں مرکوز ہو رہی تھی۔ بڑی بڑی تنخواہوں کا مطلب صرف یہی نہیں تھا کہ فضول خرچی بڑھ رہی تھی، اس سے دولت کی ذخیرہ اندوزی کے امکانات بھی بڑھ رہے تھے۔ ملک شاہین جو فیروز کا نائب امیر مجلس تھا، اس نے اپنے بعد ہیرے جواہرات، زیورات اور بیش قیمت خلعتوں کے علاوہ 50 ٹنکے چھوڑے۔ عمادالملک بشیر سلطانی نے جو بادشاہ کا غلام رہ چکا تھا، 13 کروڑ ٹنکے اپنی موت کے بعد چھوڑے جن میں سے 9 کروڑ سلطان نے ضبط کر لیے۔ بہر حال ان مثالوں کو معمول نہیں مستثنیات سمجھنا چاہیے۔ بعد کے غیر یقینی حالات میں ایک تحفظ یا سہارا بن جانے کے علاوہ ایسے خزانوں کی تعداد میں اضافہ اس بات کا بھی اظہار کرتا ہے جس سے ملک میں نقد زر پر مبنی معیشت سست رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی۔ بہر طور نقد زر پر مبنی معیشت کے ابھرنے اور مستحکم ہونے سے تجارت اور تاجروں کے حق میں اندازِ فکر میں بھی تبدیلی پیدا ہونے لگی تھی۔ ابن بطوطہ نے دہلی کے سلطان کی ملکیت میں پانی کے جہازوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ ایک موقع پر سلطان محمد بن تغلق نے شہاب الدین قزرونی کو، جو اس کا دوست تھا اور سمندری تجارت کا ماہر اور 'شاہ تجار' کہلاتا تھا، اسے تین جہاز سونپ دیے۔ غالباً پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ تاجروں نے انتظامیہ میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اسی وجہ سے محمد بن تغلق نے کھمبایت شہر کا انچارج شہاب الدین کو مقرر کر دیا تھا۔ اگر ابن بطوطہ کے بیان کو صحیح مان لیا جائے تو سلطان نے اُسے وزیر مقرر کرنے کا بھی وعدہ کیا تھا مگر دہلی کی طرف آتے ہوئے اسے وزیر خانِ جہاں نے قتل کروا دیا۔

ایسی اطلاعات بھی موجود ہیں کہ عراق کا ابوالحسن عبادی، جو دہلی میں قیام رکھتا تھا، وہ سلطان محمد بن تغلق کے پیسے سے تجارت کرتا تھا اور اس کے لیے عراق اور خراسان سے ہتھیار اور دوسری اشیاء خریدتا تھا۔ ممکن ہے دوسرے امراء نے بھی سلطان کی مثال پر عمل کیا ہو مگر اس کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔ دوسری طرف اس کا اظہار زیادہ ہوتا ہے کہ امراء کی سرمایہ کاری زیادہ تر تجارت کی بجائے باغات پر ہوتی تھی جن کی تعداد فیروز کے عہد میں امراء کی خوشحالی میں اضافے کے ساتھ بہت تیزی سے بڑھی۔ بہر طور، امراء کی طرف سے پیداواری سرمایہ

کاری کے اُبھرنے میں ابھی کچھ وقت اور درکار تھا اور اسے اکبر کے عہد کی نو مرکزیت کا انتظار تھا۔

ترک امراء کی تعلیم اور ثقافتی طرزِ فکر کے بارے میں بہت کم معلومات موجود ہیں۔ ظاہری طور پر وہ ناخواندہ تو نہیں تھے۔ یہاں تک کہ سمرقند و بخارا کے غلاموں کو بازاروں میں دوبارہ بیچنے سے پہلے پڑھنا لکھنا سکھایا جاتا تھا۔ حالانکہ غلاموں میں بہت سے غلام تازہ نو مسلم ہوتے تھے مگر یہ وسطِ ایشیا اور خراسان وغیرہ میں اس وقت کے اسلامی ثقافتی اور مذہبی معمولات سے بخوبی واقف ہوتے تھے۔ بہر حال یہ ایک دیرینہ اور مستحکم امراء طبقے جیسی ثقافتی شان و شوکت مشکل سے ہی اپنا سکتے تھے۔ نہ ان امراء سے ایسی کسی بات کی توقع کی جاسکتی تھی کہ یہ باشعور انداز میں ثقافت کے مربی یا سرپرست رہے ہوں گے، گو کہ شعراء اور ادیبوں کی سرپرستی امارت اور عظمت کی علامت سمجھی جاتی تھی اور کبھی بھی انہیں غیر معمولی انعام واکرام سے بھی نوازا جاتا تھا۔ اس صورت حال میں امیر خسرو اور ان کے ساتھی امیر حسن سجزی کے منظر عام پر آنے سے تبدیلی پیدا ہونا شروع ہوئی۔ تیرھویں صدی کے آخر میں یہ صورتِ حال پیدا ہوئی اور پھر رفتہ رفتہ ایک نئی ہندو مسلم 'ثقافت اُبھرنا شروع ہوئی جس کی نشو و نما میں بہت سے امراء اور صوفیاء نے قابل قدر انداز میں حصہ لیا۔ اسی طرح ضیاء نخشبی (فوت 1350) نے بہت سے موضوعات پر لکھا جن میں شعر و سخن بھی شامل تھا اور انہوں نے بہت سی سنسکرت تحریروں کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ اس طرح ضدی قسم کے جنگجو کی حیثیت سے امراء رفتہ رفتہ ثقافت کے مربی اور سرپرست بھی ہوتے چلے گئے۔

12.2.3 اقطاع دار

دہلی سلطنت کے سماجی اور سیاسی ڈھانچے میں 'اقطاع دار' (جنہیں مقطع یا والی بھی کہا جاتا تھا) کو سب سے اعلیٰ اور کلیدی حیثیت حاصل تھی۔ جب ترکوں نے شمالی ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کی، تو انہوں نے پرانے مقامی حکمرانوں، راجپوت سرداروں اور اعلیٰ برہمنوں کی جگہ ایک نیا حکمران طبقہ (Nobility) متعارف کرایا جس کی بنیاد اقطاع داری نظام پر استوار تھی۔ اقطاع دار دراصل وہ اعلیٰ فوجی سالار، امرا اور شاہی خاندان کے افراد ہوتے تھے جنہیں سلطان کی جانب سے ان کی عسکری اور انتظامی خدمات کے صلے میں مخصوص علاقوں (اقطاع) کا محاصل یا لگان وصول کرنے کا حق تفویض کیا جاتا تھا۔ سماجی درجہ بندی میں یہ طبقہ براہِ راست سلطان کے بعد آتا تھا اور سلطنت کے طاقتور ترین اشرافیہ میں شمار ہوتا تھا۔ چونکہ ان کے پاس وسیع اراضی کا مالیاتی کنٹرول، کثیر مال و دولت اور اپنی ذاتی فوج (حشم و قلب) رکھنے کا قانونی اختیار ہوتا تھا، اس لیے ان کی سماجی حیثیت محض ایک سرکاری اہلکار کی نہیں بلکہ ایک طاقتور علاقائی نواب یا چھوٹے حکمران جیسی ہوتی تھی، جس کا عوام اور مقامی اشرافیہ پر گہرا دبدبہ اور اثر و رسوخ تھا۔

اقطاع داروں کی سماجی حیثیت اور ان کے بے پناہ اثر و رسوخ کا اندازہ ان کے شاہانہ طرزِ زندگی اور سماجی سرپرستی (Patronage) سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ یہ امرا اپنے زیرِ کنٹرول علاقوں میں باقاعدہ دربار لگاتے، عالیشان محلات بنواتے اور ایک بڑی تعداد میں ملازمین، غلاموں، اور حاشیہ نشینوں کا طائفہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ سماجی سطح پر اپنی دھاک بٹھانے اور اپنے وقار میں اضافے کے لیے یہ اقطاع دار علم و ادب، فنونِ لطیفہ اور مذہب کے بڑے سرپرست ہوا کرتے تھے۔ وہ علما، صوفیائے کرام، شعرا اور ہنرمند دستکاروں کو دل کھول کر عطیات،

جاگیریں (مددِ معاش) اور وظائف دیتے تھے، جس کی وجہ سے معاشرے کا پڑھا لکھا اور بااثر طبقہ ہمیشہ ان کے گرد جمع رہتا تھا۔ ان کی محفلیں، لباس، اور طرزِ زندگی اکثر مرکزی شاہی دربار کی نقل ہوا کرتے تھے۔ اس بے پناہ دولت اور اعلیٰ سماجی مرتبے کی بدولت، اقطاع دار نہ صرف اپنے علاقے کے سیاہ و سفید کے مالک سمجھے جاتے تھے بلکہ مرکزی اقتدار (سلطان کی طاقت) کے استحکام یا زوال اور تخت نشینی کی کشمکش میں بھی ان کا کردار فیصلہ کن حیثیت اختیار کر گیا تھا۔

اگرچہ اقطاع دار، سماج کی مطلق العنان اشرافیہ (Absolute Elite) کا حصہ تھے، لیکن ان کی اس سماجی اور سیاسی حیثیت کی نوعیت وقت کے ساتھ تبدیل ہوتی رہی اور اس کا انحصار براہِ راست سلطان کی طاقت پر ہوتا تھا۔ ابتدائی دہلی سلطنت (خاص طور پر التتمش، بلبن اور علاؤالدین خلجی کے ادوار) میں اقطاع دار کی حیثیت موروثی (Hereditary) نہیں تھی۔ سلطان جب چاہتا ان کا تبادلہ کر دیتا یا ان کی اقطاع چھین لیتا تھا، تاکہ وہ کسی ایک علاقے میں جڑیں مضبوط کر کے بغاوت نہ کر سکیں۔ مقامی دیہی اشرافیہ (جیسے خوت، مقدم اور چودھری) کے مقابلے میں اقطاع داروں کو ریاستی طاقت کے نمائندے کے طور پر دیکھا جاتا تھا، جو مقامی آبادی اور دہلی کے مرکز کے درمیان رابطے کا اہم ذریعہ تھے۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ، بالخصوص فیروز شاہ تغلق کے دور میں، جب اقطاع کا نظام بڑی حد تک موروثی ہو گیا، تو ان اقطاع داروں کی سماجی جڑیں مقامی معاشرے میں مزید گہری ہو گئیں اور وہ مستقل خاندانی نوابوں میں تبدیل ہو گئے، جس نے ہندوستانی معاشرے میں ایک نئے، طاقتور اور مستقل جاگیردارانہ طبقے کو مستحکم کر دیا۔

12.2.4 دیہی اشرافیہ

حالانکہ راجپوت لگ بھگ پورے شمالی ہندوستان میں اپنا اقتدار کھو چکے تھے اور اب صرف راجستھان اور اُس کے آس پاس کے علاقوں اور دور افتادہ ہمالیہ کے پہاڑی علاقوں، بندیل کھنڈ وغیرہ میں ہی ان کا کچھ اقتدار باقی تھا لیکن راجپوت راجا، مرکز کے زیر انتظام پنجاب، دوآب، بہار، گجرات وغیرہ کے بڑے بڑے علاقوں پر اب بھی خاصی مضبوط گرفت رکھتے تھے۔ یہ لوگ 'رائے'، 'رانا'، راوت وغیرہ کے ناموں سے جانے جاتے تھے۔ ان کے اپنے مسلح فوجی دستے ہوتے تھے اور یہ لوگ عام طور پر دیہی علاقوں میں اپنے چھوٹے قلعوں یا گڑھیوں میں رہتے تھے۔ ان کی تعداد یا ان کی فوجی طاقت کا انداز و بہت کم موجود ہے۔ بہر حال یہ دیہی علاقوں کی معاشی اور سماجی زندگی اور وہاں کی سیاسی صورت حال میں اہم حیثیت کے حامل تھے۔ حالانکہ اس وقت کے مآخذ انہیں پوری طرح دشمن کے طور پر پیش کرتے ہیں جن سے مستقل جہاد صرف جائز ہی نہیں لازمی تھا۔ لیکن ایک مستقل دشمنی کا ماحول نہ ترکی سلطانوں کے لیے کوئی پر سکون صورت حال تھی نہ خود ان راجاؤں کے لیے۔ ترکی سلطانوں کے حق میں یہی صورت حال مناسب تھی کہ انہیں اپنے اپنے علاقوں میں اس وقت تک حکومت کرنے دیں جب تک کہ یہ خراج کے طور پر ایک مقررہ رقم پابندی سے ادا کرتے رہیں اور عام طور پر وفاداری اور تابعداری کا اظہار کرتے رہیں۔

ترک حکمرانوں اور ہندو سرداروں کے درمیان بڑھتے ہوئے سیاسی تعلق کے سلسلے میں شہادتیں بھی موجود ہیں۔ چنانچہ بتایا جاتا ہے یہ ہندو رائے سوسو کوس کی دوری سے بلبن کے دربار کی شان و شوکت دیکھنے آیا کرتے تھے۔ بنگال میں بلبن کی طغرل پر فتح کے بعد اودھ میں

بہت سے لوگ اُسے خوش آمدید کہنے آئے جن میں اس علاقے کے رائے بھی تھے۔ کچھ عرصے بعد میں جب فیروز تغلق نے بنگال پر حملہ کیا تو مشرقی اتر پردیش کے رائے اس کے ساتھ تھے جن میں سب سے اہم شخصیت گورکھ پور اور چمپارن کے رائے اودے سنگھ کی تھی۔ اس نے خراج کے بیس لاکھ بھی ادا کیے جو اس پر ادھار تھے۔ ایک اور موقع پر جب بلبن کے ایک بھتیجے ملک چھجو نے جو کڑا کا گورنر تھا، جلال الدین خلجی کے خلاف بغاوت کی تو وہاں کے مقامی رائے، راوت اور پایک اس کے ساتھ شامل ہو گئے اور ''چیونٹیوں اور ٹڈیوں کی طرح اس کے ارد گرد منڈلانے لگے۔'' جلال الدین خلجی سے مقابلے میں وہ اس کے ساتھ جمے رہے۔ ملک چھجو کو تو شکست ہوئی مگر اس واقعے کے بعد سے ہندو سردار دربار میں سلطان کے سامنے حاضر رہنے لگے۔ اُس طرح یہ بھی سنا جاتا ہے کہ فیروز تغلق کے عہد میں 'انی رتھو' جو ''دو شاہی چھتروں کا مالک'' تھا، رائے مدار (یا بلار) دیو، رائے سمیر، راوت ادھی رام وغیرہ کو دربار میں صرف حاضر ہونے کی ہی اجازت نہیں تھی بلکہ دربار میں بیٹھنے کی بھی اجازت تھی۔

سلطنت عہد میں ان بڑھتے ہوئے سیاسی رشتوں کے باوجود سرداروں کی حیثیت بہت حد تک غیر یقینی ہی تھی۔ دہلی کے سلطانوں کی پالیسی میں ایک حصہ یہ بھی تھا کہ جب بھی ممکن ہو ہندو سرداروں کو بے دخل کر دیا جائے یا مستقل طور پر یہ کوشش جاری رکھی جائے کہ ان سرداروں کے مقبوضہ علاقوں میں شاہی محصول انتظامیہ کو عائد کر کے ان کی طاقت، اختیارات اور سہولتوں کو متواتر گھٹایا جائے۔ حالانکہ اس طرز عمل سے غالباً کسانوں پر پڑنے والے مجموعی بار میں تو تخفیف نہیں ہوئی ہو گی مگر اس سے سرداروں اور دوسرے بچولیوں کے حقوق اور بالائی آمدنی میں غالباً کچھ کمی ضرور آئی ہو گی۔ چودھویں صدی کی ابتدا تک ہمیں 'زمینداروں' کا ذکر بھی بار بار ملنے لگتا ہے۔ یہ اصطلاح جو ہندوستان سے باہر کہیں استعمال نہیں ہوئی، ایسے ایسے بچولیوں کے لیے متواتر استعمال کی جانے لگی جو موروثی حقوق رکھنے والے تھے۔ امیر خسرو نے اسے سب سے پہلے استعمال کیا۔ کچھ عرصے بعد رفتہ رفتہ یہ اصطلاح خوطوں، مقدموں اور چودھریوں بلکہ ان سابقہ سرداروں کے لیے بھی استعمال ہونے لگی جنہیں اس بات کے لیے مجبور کر دیا گیا تھا کہ وہ ایک متعینہ مجموعی رقم ادا کرنے کے بجائے محصول کے تخمینے کی بنیاد پر مقرر کی جانے والی رقم ادا کریں۔ مغلوں کے عہد میں لفظ 'زمیندار' ان تمام لوگوں کے لیے جو زمین کی موروثی ملکیت رکھتے تھے یا محصول میں موروثی حصہ رکھتے تھے، استعمال ہونے لگا۔ سردار تک بھی اسی زمرے میں شمار کیے جانے گئے۔ ان حقوق یافتہ دیہی لوگوں کے طرز زندگی کے بارے میں بہت کم معلومات موجود ہیں۔ بہر حال ان کے تمول یا دولتمندی کا باقی لوگوں کی غربت سے مقابلہ کیا جاتا ہے۔

12.2.5 انتظامی افسران اور علماء

حکمراں طبقہ، خصوصاً امراء نچلے درجے کے کارکنوں کی مدد حاصل کیے بغیر کام کر ہی نہیں سکتے تھے۔ ان کے علاوہ ان کے بہت سے ملازمین، غلام اور دوسرے مصاحبین وغیرہ بھی ہوتے تھے۔ ان کارکنوں کو مجموعی طور پر دو اقسام میں بانٹا جا سکتا ہے۔ عدالتی اور مذہبی کارکن اور دوسرے محصول اور انتظامیہ سے متعلق کارکن۔ اول الذکر میں قاضی اور مفتی ہوتے تھے جو اُن تمام شہروں میں مقرر کیے جاتے تھے جہاں مسلمانوں کی قابل ذکر آبادی ہوتی تھی۔ یہ لوگ مسلمانوں کے معاملات میں دیوانی مقدمات فیصل کرتے تھے اور ہندوؤں کے معاملات کو اُن کے روایتی قوانین اور دھرم شاستر کے مطابق فیصلوں کے لیے چھوڑ دیتے تھے۔ یہ فوجداری مقدموں کا بھی فیصلہ کرتے تھے۔ ان کا افسر

اعلیٰ قاضی القضاۃ یا سب سے بڑا قاضی ہوتا تھا۔ پایہ تخت اور شاید دوسرے شہروں میں ایک 'داد بک' ہوتا تھا جو بے حساب عاید کیے ہوئے محصولوں کی وقتاً فوقتاً جانچ پڑتال کرتا تھا، اور ان امیروں پر نگرانی اور گرفت رکھنے کے لیے ذمے دار ہوتا تھا جو محصول کی وصولی کی غرض سے مسلمانوں کی املاک کا سروے کر کے ان کا حساب رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ محتسب بھی ہوتا تھا جو کوتوال کے ماتحت کام کرتا تھا اور اس پر نگاہ رکھنے کا ذمہ دار ہوتا تھا کہ سلطان اعلانیہ شریعت کے خلاف کام نہ کریں یا روزہ نماز جیسے فرائض کی پابندی سے منہ نہ موڑیں۔ وزن اور ناپ تول کی نگرانی بھی اس کی ذمے ہوتی تھی۔

یہ سب تنخواہ دار عہدے دار ہوتے تھے اور جیسے جیسے مسلمان آبادی بڑھی ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ پھر امام اور موذن وغیرہ بھی ہوتے تھے جن کا تقرر مسجدوں میں کیا جاتا تھا۔ مقبروں وغیرہ پر قرآن شریف کی تلاوت کے لیے قاری رکھے جاتے تھے۔ انہیں دوسری تقریبات کے موقعوں پر بھی بلایا جاتا تھا۔ ان کے علاوہ مذہبی قابل احترام لوگوں کو مختلف اسکولوں (مکتبوں) اور کالجوں (مدرسوں) میں مقرر کیا جاتا تھا۔ یہ سب لوگ دینی یا مذہبی طبقے میں شمار ہوتے تھے اور علماء کہے جاتے تھے۔ علماء کا بہت احترام کیا جاتا تھا۔ عام اصول کے مطابق یہ لوگ مسلم قوانین (شریعت)، منطق اور دینیات وغیرہ میں باقاعدہ تربیت یافتہ ہوتے تھے اور عربی زبان کی بھی کچھ واقفیت رکھتے تھے۔ ان سرکاری طبقوں کے علاوہ بھی مسلم علماء اور دیندار لوگوں کا ایک طبقہ تھا جنہیں حکومت کی طرف سے وظائف اور محصول معاف زمینیں اور دوسرے عطیات دیے جاتے تھے۔

اس وسیع اور غیر منظم قسم کے زمرے کی سماجی بنیاد کے بارے میں معلومات بہت کم موجود ہیں۔ مجموعی طور پر اس زمرے کو وہ طبقہ کہا جاسکتا ہے جسے جدید اصطلاح میں نچلا درمیانی یا درمیانی طبقہ کہا جاتا ہے۔ گو کہ انہیں میں سے کچھ علماء قاضی القضاۃ کے درجے پر بھی پہنچے اور بڑی حد تک ان کا شمار حکمراں طبقے میں ہونے لگا۔ اکثر اوقات شعراء، علماء، مورخ، طبیب اور حکومت کے نچلے درجے کے کارکن، عامل (محصول وصولی کارکن) محرر (اکاؤنٹنٹ) وغیرہ بھی اسی سماجی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اسے ہم 'خواندہ' طبقہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں اس ملک میں جہاں کی آبادی کا بڑا حصہ ناخواندہ ہو وہاں تعلیم یافتہ لوگ خاص طور پر جو مذہبی معلومات کا بھی دعویٰ رکھتے ہوں، انہیں بڑا اعزاز واحترام حاصل ہو جاتا ہے۔ پھر بھی علماء بحثیت ایک طبقہ، بااثر اور رسوخ دار قسم کے حلقوں میں کسی خاص اہمیت سے نہیں دیکھے جاتے تھے۔ بلبن کے بیٹے بغرا خان نے بعد کے دور کے دینی افراد کے متعلق اپنے بیٹے کیقباد کو ''لالچی اور چالباز لوگ جنہیں اس دنیا کے علاوہ آخرت کی کوئی فکر نہیں'' کے الفاظ کے ساتھ متنبہ کیا تھا۔ امیر خسرو نے حکومت میں قاضیوں کے طبقے کو بے ایمان (بدعنوانیاں کرنے والے)، جاہل اور حکومت میں کسی قسم کی ذمہ دار حیثیت کے لیے نااہل افراد کہا تھا۔ یہ لوگ عام طور پر گستاخ، مغرور، بے حقیقت اور ابن الوقت قسم کے لوگ کہے جاتے تھے جو کسی وقت بھی اپنے اصول وعقائد کو بااقتدار لوگوں کو خوش رکھنے کی خاطر قربان کر سکتے تھے۔ عام طور پر سلطان سیاسی معاملات میں انہیں کسی قسم کا مشورہ دینے کی بھی اجازت نہیں دیتے تھے اور انہیں صرف عدالتی معاملات کو فیصل کرنے، مذہبی امور اور تعلیم کے سلسلے تک محدود رکھتے تھے۔ اس کے باوجود علماء نے عام مسلمانوں اور حکمران طبقے کے درمیان ایک عبوری سلسلے یا پل کا کردار ادا کیا اور مسلمانوں میں ایک اتحاد کا احساس پیدا کیے رہنے میں مدد کی۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ بہت سے علماء غیر ملکی تھے جنہوں نے یا تو منگولوں کے دباؤ سے بچنے کے لیے ہندوستان میں پناہ لی تھی یا ہندوستان کی خوشحالی نے انہیں یہاں کھینچ لیا تھا۔ انہیں ہندوستان کے بارے میں بہت کم واقفیت تھی اور انہوں نے ہندوستانی دینی حلقے کے ایک طبقے کے ساتھ مل کر مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان تناؤ بنائے رہنے کا کام کیا اور عوام میں جو ایک سماجی بھائی چارہ یا عام ہم آہنگی پیدا ہو گئی تھی اسے نظر انداز کیا۔

مرکز میں انتظامیہ کے متواتر اُبھرتے ہوئے آلہ کار کے لیے اور علاء الدین خلجی کے شروع کیے ہوئے نئے محصولی نظام کو مختلف صوبوں اور شہروں میں عائد کرنے کے لیے بہت بڑی تعداد میں کلرکوں اور دوسرے دفتری کارکنوں کی بھی ضرورت تھی۔ افسروں کے اس زمرے کی سرکاری طاقت، بدعنوانیوں کے امکانات اور ان کی طرف سے کی جانے والی زیادتیوں، اور پھر ان کی اصلاح کے لیے علاء الدین خلجی کے اٹھائے ہوئے متعدد اقدامات وغیرہ کو برنی نے بڑی وضاحت اور مثالوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔ سرکاری خدمات میں بھرتی ہونے والے اس گروپ کے سماجی پس منظر کی معلومات موجود نہیں ہیں۔ ان میں سے بہت سے افراد ہندوستانی نو مسلم یا علماء طبقے سے تعلق رکھتے ہوں گے۔ اگر ہم مقدموں اور پٹواریوں کو اس طبقے سے مستثنا کر دیں جو ہندو تھے، اور جو گاؤوں میں رہتے تھے تو ان نچلے درجے کے افسروں میں زیادہ تر مسلمان ہوں گے۔ بہر حال لگتا ہے کہ محمد بن تغلق کے عہد تک ہندو بھی اس حلقے میں داخل ہونے لگے تھے کیونکہ یہی وہ حلقہ تھا جس سے اس نے اعلیٰ حیثیتوں کے لیے کچھ تھوڑی سی تعداد میں افراد کا انتخاب کیا تھا۔ اس طرح اس وقت تک فارسی داں ہندوؤں کا بھی ایک طبقہ اُبھر آیا تھا۔

12.2.6 معیار زندگی

اس دور کے مورخوں نے سلطان کے مسرفانہ طرز زندگی کو بیان کرنے میں بڑی فراخدلی سے کام لیا ہے۔ ان کے محلات، ان کے ساز و سامان، ان کے حرموں میں بہت بڑی تعداد میں عورتوں اور اعزاء کی فضول خرچیاں، اُن کے قیمتی کپڑے اور زیورات، شاہی اصطبل پر زبردست اخراجات اور امراء، شعراء، علماء اور صوفیاء کو دیے جانے والے قیمتی تحفے تحائف کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ طرز زندگی ایک مستقل انداز بن گیا تھا اور یہ بھی خیال کیا جاتا تھا کہ درباریوں اور رعایا کے ذہنوں پر اس کا اثر پڑتا تھا۔ سلطان بہر طور سرپرستی کا مرکز ہوتا تھا اور سماج میں سب سے اعلیٰ یا سرپرست کی حیثیت رکھتا تھا اور سماج کے اعلیٰ طبقے کے طرزِ زندگی اور انداز فکر پر بڑا گہرا اثر رکھتا تھا۔

دہلی سلطنت کے دوران سلطان کی سماجی حیثیت اور طرزِ زندگی بے حد شاندار اور اعلیٰ تھا، جو اس وقت کی اسلامی دنیا کے طاقتور ترین حکمرانوں کے ہم پلہ تھا۔ سلطان اور اس کے خاص امراء کی معاشرت کا معیار اس عہد کی دنیا میں اعلیٰ ترین تھا، اور وہ مغربی اور وسطی ایشیا کے مسلمان حکمرانوں کے برابر تھے۔ اس دور میں جب کہ یورپ پسماندگی کا شکار تھا، اسلامی دنیا کے حکمرانوں کی خوشحالی اور تمول پوری دنیا کے لیے باعثِ رشک بنی ہوئی تھی۔ عام طور پر تمام ہندوستانی سلطانوں نے ہندو حکمرانوں کی طرح اپنے لیے عظیم الشان محل بنوائے۔ دربار کی شان و شوکت اس طرح کی ہوتی تھی کہ آنے والوں کو مرعوب کیا جا سکے، جس کی واضح مثال بلبن کے دربار میں دیکھی گئی۔ ابن بطوطہ کے

مطابق، محمد تغلق کے محل میں سلطان سے ملنے کے لیے آنے والے شخص کو تین ایسے دروازوں سے گزرنا پڑتا تھا جن پر کڑا پہرہ ہوتا تھا۔ اس کے بعد ایک ہزار ستونوں پر مشتمل لکڑی کا ایک بہت بڑا ہال تھا جسے 'ہزار ستون' کہا جاتا تھا، جہاں سلطان کا دربارِ عام لگتا تھا۔

سلطان اپنی بے پناہ دولت اور شان و شوکت کا اظہار قیمتی عطیات اور تحائف کے ذریعے بھی کرتے تھے۔ محمد تغلق اپنے ہر امیر کو سال میں دو بار (گرمی اور سردی میں) خلعتیں (شاہی لباس) دیا کرتا تھا، اور قیاس کے مطابق ایک سال میں ایسی تقریباً دو لاکھ خلعتیں عام طور پر دی جاتی تھیں۔ یہ کپڑے ریشم، مخمل اور اون جیسے قیمتی مواد سے بنے ہوتے تھے جن پر سونے کی کڑھائی ہوتی تھی، اور ان پر خطیر رقم خرچ ہوتی تھی۔ سلاطین کی تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے شاہی کارخانے قائم کیے گئے تھے، جہاں سونا، چاندی، ریشم اور دیگر قیمتی چیزوں سے نایاب اور شاندار سامان تیار کیا جاتا تھا۔ فیروز تغلق نے کارخانوں کے ناظموں کو حکم دے رکھا تھا کہ جہاں کہیں بھی عمدہ چیز ملے اسے فوراً شاہی ذخیرے کے لیے خرید لیا جائے، چاہے اس کی قیمت کچھ بھی ہو۔ اس شاہانہ طرزِ زندگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ سلطان کے لیے ایک جوتا 70,000 ٹنکے میں خریدا گیا تھا، اور روزمرہ استعمال کی بیشتر اشیاء سونے چاندی اور ہیرے جواہرات سے جڑی ہوتی تھیں۔

شاہی کارخانے شاہی حرم کی خواتین کی ضروریات بھی پوری کرتے تھے۔ سلطان کے حرم میں مختلف ممالک کی غلام لڑکیاں اور بیگمات شامل ہوتی تھیں، جن کی دیکھ بھال اور حفاظت کے لیے کثیر تعداد میں خدام اور خواجہ سرا مقرر تھے۔ سلطان کے رشتے کی تمام عورتیں، جیسے اس کی ماں، چچی، اور خالہ وغیرہ بھی حرم میں الگ الگ رہائش گاہوں میں رہتی تھیں۔ سلطان کی اس عظیم الشان سماجی حیثیت اور طرزِ زندگی کا گہرا اثر امراء پر بھی پڑتا تھا، جو سلطان کے ٹھاٹ باٹ کی نقل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ امراء بھی شاندار محلوں میں رہتے، سونے چاندی کے برتن استعمال کرتے، اور بڑی بڑی دعوتوں کے انعقاد کے ذریعے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔

ہم تغلق کے دور سے امراء کی بڑھتی ہوئی خوشحالی اور فضول خرچی کو پہلے دیکھ چکے ہیں۔ بہر حال بلبن کے عہد میں، جیسا کہ ذکر ملتا ہے، اس کے رشتے کے بھائی ملک کشلی خان نے ایک موقعے پر اپنے تمام گھوڑے اور 10,000 ٹنکے اپنے شاعروں اور بھانڈوں کو دے دیے تھے۔ بلبن کا ماتحت کوتوال فخر الدین 12,000 قرآن پڑھنے والوں کو مالی امداد دیا کرتا تھا اور ایک ہزار لڑکیوں کو ہر سال جہیز دیتا تھا۔ اس نے نہ کبھی ایک لباس کو دوبارہ پہنا نہ ایک بستر پر دوبارہ سویا۔ بلبن کا دیوان عرض، عماد الملک اپنے دستر خوان (کھانوں) کے لیے مشہور تھا جو پچاس سے ساٹھ قابوں (ڈشوں) پر مشتمل ہوتا تھا جنہیں اس کے کارکنوں اور کلرکوں میں ہر روز تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ میر مقبول 'محمد بن تغلق کا ایک امیر' اپنے ذاتی اخراجات کے لیے ساڑھے تین لاکھ ٹنکے خرچ کیا کرتا تھا۔ فیروز کے وزیر خان جہاں کے حرم میں 20,000 عورتیں تھیں۔ امراء کے اسراف کی ان مثالوں کو اکا دکا نہیں تصور کیا جاسکتا، انہیں پھیلایا جاسکتا ہے۔

امراء کے اس طرزِ زندگی کی مانگوں کو پورا کرنے کے نتیجے میں کچھ مخصوص قسم کی صنعتوں کے ابھرنے کے مواقع پیدا ہوئے۔ ایسی صنعتوں میں کتنے لوگ برسرروزگار تھے یا کتنے لوگ اس سلسلے میں دوسری خدمات انجام دیتے تھے اس کا اندازہ محصول امشکل ہے لیکن یہ تعداد خاصی بڑی ہوگی چونکہ زیادہ تر امراء اپنی دولت کو جمع کر کے نہیں رکھتے تھے۔ نہ یہ امراء اپنے پیسے کو کسی پیداواری عمل میں سرمایے کے

طور پر لگاتے تھے۔ جو کچھ بھی سرمایہ کاری تھی وہ محمد بن تغلق اور اس سے بھی زیادہ فیروز تغلق کے عہد میں باغات محصول ے کی تھی۔ کمتر درجے کے سرکاری کارکنوں، عدالتی کارکنوں، مذہبی کارکنوں اور حکیموں، شاعروں، موسیقاروں اور دوسرے پیشہ وروں کے معیار زندگی کے بارے میں بھی واقفیت زیادہ موجود نہیں ہے۔ کچھ بہت مشہور حکیم بہت متمول اور رئیس ہوتے تھے۔ شعر کا انحصار اس پر تھا کہ انہیں کیسا مربی یا سرپرست نصیب ہوا ہے۔ چنانچہ امیر خسرو کے والد کو، جس وقت وہ امیر تھے، بلبن کے دربار میں 1,200 ٹنکے سالانہ کا وظیفہ ملتا تھا۔ بلبن کے عارض نے شاہی موسیقاروں کو ایک بار اپنے گھر پر گانے کے لیے 10,000 ٹنکے، 100 گھوڑے اور 320 لباس دیے تھے۔ عام طور پر یہ طبقے نسبتاً آرام کی زندگی گزارتے تھے مگر فضول خرچی یا اسراف کی زندگی نہیں گزار سکتے تھے۔

جہاں تک شہر کی عام آبادی کا سوال ہے اُن کے معیار زندگی کا انحصار عام طور پر قیمتوں اور ان کی تنخواہوں پر ہی تھا۔ علاءالدین خلجی سے پہلے قیمتوں کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔ بازاروں پر گرفت کے ذریعے علاءالدین نے کھانے کے سستے سامان کی فراہمی کو یقینی بنادیا۔ چنانچہ برنی بتلاتا ہے کہ گیہوں ساڑھے سات جیتل فی من، جو 4 جیتل فی من، اور اچھے قسم کا پاول 5 جیتل فی من کے حساب سے بکتا تھا۔ بہر حال اگر ضروریات زندگی کی قیمتیں کم تھیں تو تنخواہیں بھی کم تھیں۔ علاءالدین کے عہد میں کاریگر کی تنخواہ 2 یا 3 جیتل یومیہ تھی جس کا مطلب ہے صرف ڈیڑھ یا 2 ٹنکے (1) مہینہ۔ برنی لکھتا ہے کہ 6 جیتل کی روٹی اور دم پخت گوشت، یعنی صرف زندگی گزارنے برابر غذا، سات آٹھ لوگوں کے لیے کافی ہوتی تھی۔ ذاتی ملازموں کی تنخواہ 10 سے 12 ٹنکے سالانہ ہوتی تھی۔ ایک گھوڑ سوار سپاہی کی تنخواہ جو علاوالدین نے 234 کے سالانہ یا لگ بھگ 20 ٹنکے مہینہ مقرر کی تھی، اتنی تھی کہ اُس میں ایک سپاہی اور اس کا گھوڑا ڈھنگ سے زندگی گزار سکتے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ علاءالدین کی موت کے بعد، قیمتوں پر کنٹرول کا نظام بگڑ کر ختم ہو گیا اور قیمتیں بہت تیزی سے بڑھیں اور ان کے ساتھ ساتھ تنخواہیں چار گنا بڑھ گئیں۔ بہر حال ان اعداد کا بالکل صحیح صحیح حساب نہیں لگایا جاسکتا۔ ابن بطوطہ کی دی ہوئی قیمتوں کا تجزیہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قیمتیں ڈیڑھ گنی سے زیادہ بڑھیں۔ تنخواہیں بھی اسی تناسب سے بڑھی ہوں گی۔ فیروز کے عہد کے شروع میں قیمتیں اور تنخواہیں اور زیادہ تھیں۔ عفیف کے بیان کے مطابق، سلطان کی کسی قسم کی کوشش کے بغیر قیمتیں خود بخود علاءالدین دور کی حد تک نیچے آگئیں۔ بہر حال تنخواہیں پھر بھی اونچی رہیں۔ خوردنی اشیاء کی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ بہتر فصل کی وجہ سے تھا یا زراعت میں توسیع کی وجہ سے، یا بین الاقوامی سطح پر چاندی کی قلت کی وجہ سے۔ یہ مسئلہ اب بھی مورخوں کے درمیان زیر بحث ہے۔

12.3 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ دہلی سلطنت کے قیام نے شمالی ہندوستان کے سماجی اور سیاسی ڈھانچے میں دور رس تبدیلیاں پیدا کیں، جس کے نتیجے میں سابقہ حکمرانوں کی جگہ ایک نئے ترک اور افغان طبقہ امرا نے لے لی۔ دہلی کے بیشتر سلاطین نے اقتدار موروثی حق کے طور پر نہیں پایا بلکہ وہ اپنی بے مثال عسکری مہارت اور قابلیت کے بل بوتے پر نچلی سطح (غلامی) سے ترقی کرتے ہوئے تختِ دہلی تک پہنچے۔ اس نئے مرکزیت پسند نظام میں امراء اور اقطاع داروں کو کلیدی حیثیت حاصل تھی۔ اقطاع داروں کو محاصل تفویض کیے گئے جو وقت کے ساتھ ساتھ، خاص طور پر فیروز شاہ تغلق کے دور میں، موروثی ہو کر ایک مستحکم جاگیردارانہ طبقے میں تبدیل ہو گئے۔ دیہی سطح پر

پرانے راجپوت سرداروں اور مقامی اشرافیہ کا اثر ورسوخ برقرار رہا، جنہیں خراج کی باقاعدہ ادائیگی کے عوض اپنے علاقوں میں حکومت کرنے کی اجازت دی گئی، اور چودھویں صدی تک ان کے لیے 'زمیندار' کی اصطلاح عام ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی، مسلم سماج میں 'اشراف' اور 'اذلاف' کی طبقاتی تقسیم گہری ہو گئی۔ حکمران طبقے، خصوصاً سلطانوں اور امراء نے ایک انتہائی شاہانہ، مسرفانہ اور اعلیٰ معیارِ زندگی اپنایا جس نے دیہی پیداوار اور دولت کے بڑے حصے کو مرکز میں سمیٹ لیا۔

12.4 کلیدی الفاظ (Keywords)

اقطاع داری نظام: یہ دہلی سلطنت کا متعارف کردہ ایک نیا مرکزیت پسند ڈھانچہ تھا جس کے تحت اعلیٰ فوجی سالاروں اور امراء (اقطاع داروں) کو ان کی عسکری اور انتظامی خدمات کے صلے میں مخصوص علاقوں (اقطاع) سے محصول وصول کرنے کا حق تفویض کیا جاتا تھا۔ ابتدائی دور میں یہ نظام موروثی نہیں تھا اور سلطان کسی بھی وقت اقطاع واپس لے سکتا تھا، تاہم فیروز شاہ تغلق کے عہد میں یہ بڑی حد تک موروثی ہو گیا۔

امراء (خان، ملک، امیر): یہ سلطنت کا طاقتور اور بااثر حکمران طبقہ تھا جسے بنیادی طور پر تین درجات میں تقسیم کیا گیا تھا۔ 'خان' سب سے اعلیٰ درجہ تھا (یہ لفظ منگولوں سے مستعار لیا گیا تھا)۔ اس کے بعد 'ملک' اور پھر سب سے نچلے درجے پر 'امیر' آتے تھے۔ حکومت کے تمام اہم عہدے انہی کے پاس ہوتے تھے اور بادشاہ کی قربت کی وجہ سے ان کی بڑی قدر و منزلت ہوتی تھی۔

اشراف اور اذلاف: یہ مسلم سماج کی دو واضح اور گہری سماجی پرتیں تھیں۔ 'اشراف' سے مراد محترم اور باعزت طبقہ تھا جس میں امراء اور مذہبی افراد شامل تھے اور اعلیٰ عہدوں پر تقرر ان کا حق سمجھا جاتا تھا۔ اس کے برعکس 'اذلاف' یا 'کم اصل' طبقے میں عام شہری، پیشہ ور لوگ (جیسے جلاہے، نائی، باورچی)، مزدور اور کسان شامل تھے۔ ان دونوں طبقات کے درمیان سماجی تعلقات اور شادیاں ناممکنات میں شمار ہوتی تھیں۔

دیہی اشرافیہ (رائے، رانا، راوت): یہ ہندوستانی سماج کے پرانے حکمران (جیسے راجپوت سردار) تھے جو دیہی سطح پر اب بھی خاصی مضبوط گرفت رکھتے تھے۔ یہ دیہات میں اپنے چھوٹے قلعوں میں رہتے تھے اور ان کے اپنے مسلح دستے ہوتے تھے۔ ترک سلاطین نے خراج کی پابندی سے ادائیگی کی شرط پر انہیں اپنے علاقوں میں حکمرانی کی اجازت دے رکھی تھی۔

زمیندار: یہ اصطلاح سب سے پہلے امیر خسرو نے استعمال کی تھی، جو ہندوستان سے باہر کہیں استعمال نہیں ہوتی تھی۔ چودھویں صدی کی ابتدا میں یہ لفظ ان بچولیوں (جیسے خوط، مقدم اور چودھری) اور سرداروں کے لیے متواتر استعمال ہونے لگا تھا جو زمین یا محاصل میں موروثی حقوق رکھتے تھے۔

ترکانِ چہل گانی: ضیاء الدین برنی نے 'ترکانِ چہل گانی' (چالیس ترک) کی اصطلاح سلطنت کے محض چوٹی کے اور اعلیٰ ترین امراء کی طاقتور جماعت کے اظہار کے لیے استعمال کی ہے۔

12.5 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

12.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. دہلی سلطنت میں طبقہ امراء کو عام طور پر کتنے درجات میں تقسیم کیا جاتا تھا اور ان میں سب سے اعلیٰ درجہ کون سا تھا؟

(a) دو، امیر (b) تین، خان (c) چار، ملک (d) تین، سر جاندار

2. دہلی سلطنت کی تاریخ میں لفظ 'زمیندار' سب سے پہلے کس نے استعمال کیا؟

(a) ضیاءالدین برنی (b) ابن بطوطہ (c) امیر خسرو (d) منہاج سراج

3. کس سلطان کے دورِ حکومت میں اقطاع کا نظام بڑی حد تک موروثی ہو گیا تھا؟

(a) التتمش (b) علاؤالدین خلجی (c) غیاث الدین بلبن (d) فیروز شاہ تغلق

4. علاءالدین خلجی نے منگولوں سے معاہدے کا مشورہ دینے پر کس کو 'نویسندہ ابن نویسندہ' (کلرک کا بیٹا کلرک) کہہ کر تحقیراً مسترد کیا تھا؟

(a) قاضی مغیث (b) نظام الملک (c) عماد الملک (d) شہاب الدین قزرونی

5. محمد بن تغلق کے محل میں ہال 'ہزار ستون' کس چیز سے بنا ہوا تھا؟

(a) سنگِ مرمر (b) سونے اور چاندی (c) لکڑی (d) سرخ پتھر

12.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. دہلی سلطنت کے سیاق و سباق میں 'پہلے ملک، پھر سلطان' کے رجحان کی وضاحت کیجیے۔
2. سلطنت کے دور میں 'اشراف' اور 'اذلاف' کی سماجی درجہ بندی سے کیا مراد تھا اور اس کا اعلیٰ عہدوں کے تقرر پر کیا اثر پڑا؟
3. ترک حکمرانوں کی دیہی اشرافیہ (رائے، رانا اور سرداروں) کے ساتھ سیاسی حکمتِ عملی کیا تھی؟

12.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. دہلی سلطنت میں طبقہ امرا کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے امیروں کی سماجی، سیاسی اور مالی حیثیت میں آنے والے ارتقاء کا تفصیلی جائزہ پیش کیجیے۔
2. عہد وسطیٰ میں سلاطینِ دہلی اور ان کے امراء کے معیارِ زندگی اور مسرفانہ طرزِ معاشرت پر روشنی ڈالیے۔

اکائی 13۔انتظامی نظام: مرکزی اور مقامی حکومتیں

(Administrative System: Central and Local Governments)

اکائی کے اجزا

13.0 تمہید

13.1 مقاصد

13.2 مرکزی نظم ونسق

13.3 سلطان کا مرتبہ اور اختیارات

13.4 وزرا، محکمہ جات اور ان کے فرائض

13.4.1 وزیر

13.4.2 دیوان وزارت

13.4.3 دیوان رسالت

13.4.4 دیوان عرض

13.4.5 دیوان انشا

13.4.6 دربار اور شاہی حرم کے امور

13.4.7 عدل وانصاف

13.4.8 امیر داد

13.4.9 ڈاک، پولیس اور خفیہ نظام

13.4.10 محکمہ مالیات/نظام مال گزاری

13.2 اقطاع داری نظام

13.3 صوبائی ومقامی حکومت

13.3.1 صوبیدار یا والی

13.3.2 برید

13.3.3 دیوان
13.3.4 شق
13.3.5 پرگنہ
13.3.6 مقامی عہدیدار
13.4 ذرائع آمدورفت
13.5 امن وامان
13.5 اکتسابی نتائج
13.6 کلیدی الفاظ
13.7 نمونہ امتحانی سوالات

13.0 تمہید (Introduction)

دہلی سلطنت کا قیام قطب الدین ایبک کے ہاتھوں 1206ء میں ہوا۔ 1206 سے 1526 کا زمانہ دہلی سلطنت کا دور کہلاتا ہے جو کہ تاریخ ہند کا اہم دور ہے۔ اس دور میں نہ صرف سیاسی و معاشی سطح پر بھی بہت سی تبدیلیاں آئیں بلکہ نظم ونسق پر توجہ دی گئی۔ یہاں ہم صرف دلی سلطنت کے مرکزی ڈھانچے اور اس کے نظم ونسق سے متعلق بات کریں گے لیکن اس سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم یہ بھی جان لیں کہ دہلی سلطنت کی نوعیت اور ماہیت کیا تھی۔

قانوناً دہلی سلطنت خلافت کا ایک حصہ تھی، بغداد کے نام نہاد خلفا کا سلسلہ ختم ہونے پر بھی خلیفہ کی اطاعت کے مفروضے کو جاری رکھا گیا تھا، سوائے علاالدین خلجی اور اس مختصر زمانے کے جب کہ قطب الدین مبارک شاہ نے خلیفہ کا منصب خود اختیار کر لیا۔ محمد بن تغلق نے مصری عباسیوں کی بالادستی کو قبول کیا۔ پہلا سید حکمراں، خضر خان تیمور اور شاہ رخ کی سیادت تسلیم کرتا تھا۔ بعد کے سلاطین نے ایک گم نام خلیفہ کی اطاعت کے اقرار کی روایت قائم رکھی۔ عملاً سلطنت مستقل بالذات تھی اور ایک مقتدر مملکت کے تمام اختیارات رکھتی تھی۔ اس کا طرز حکومت مطلق العنان تھا۔ سلطان مملکت کا سربراہ اور اس کی افواج کا سپہ سالار اعظم ہوتا تھا۔ شاہی خانوادہ مسلم شریعت کا پابند ہوتا تھا جس کی حفاظت اور نفاذ اس کا فرض تھا۔ جو ترک ہندوستان آئے ان کے ذہنوں پر بھلے ہی ریاست یا سلطنت کے سلسلے میں اسلامی تصور یا عمل کا بڑا گہرا اثر تھا لیکن وہ اپنے قبائلی اور خاندانی رسم ورواج کو بھی پوری طرح فراموش یا مسترد نہیں کر پائے تھے۔ انہوں نے سیاسی معاملات اور ان کے حل کرنے کے سلسلے میں عملی پختگی کا بھی اظہار کیا اور ساتھ ہی ساتھ اسلامی قوانین کے نفاذ کی بھی کوشش کی۔ شریعت کے ساتھ ساتھ انہوں نے ضوابط (Secular Laws) بھی بنائے تاکہ وہ اپنی غیر مسلم رعایا کے ساتھ بھی انصاف کر سکیں۔ برنی انہیں ضوابط کو

جہانداری کا نام دیتا ہے۔

تاریخ فیروز شاہی کا مصنف ضیاءالدین برنی، علاالدین خلجی کے عہد کے ایک قاضی مغیث الدین کی سلطان سے بات چیت کا ذکر کرتا ہے۔ یہ بات چیت مال غنیمت کی تقسیم کے سلسلے میں ہے۔ قاضی مغیث نے کہا کہ شریعت (اسلامی قانون) کے مطابق مال غنیمت کا زیادہ حصہ سلطان اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ جواب میں سلطان نے یہ کہا کہ وہ ریاست کی ضرورتوں کے مطابق ہی کام کرے گا چاہے شریعت میں اس کی اجازت ہو یا نہ ہو۔ وہ ریاست کی فلاح و بہبود کو ترجیح دے گا۔ سلطان کے اس ایک جملے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دہلی سلطنت عملاً مذہبی ریاست نہیں تھی حالانکہ سلاطین، مذہب اسلام کے پیرو تھے پھر بھی ریاست کے اصول وضوابط کا تعین خاص ضرورتوں اور حالات کے مد نظر ہی ہوتا تھا۔ اس طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ دہلی سلطنت اپنی ان کے معتد بہ حصے میں قانوناً مشرقی خلافت کا ایک حصہ رہی مگر تمام عملی اعتبارات سے وہ ایک آزاد مملکت تھی۔

عہد سلطنت میں صوبائی علاقائی حکومتوں کے ڈھانچے اور طریقہ کار کے متعلق بہت کم معلومات موجود ہیں۔ ابتدا میں سلطنت خود ایک لچک دار ڈھانچے کی شکل میں تھی جو متعدد فوجی کمانوں (علاقوں) پر مشتمل تھی۔ کمان دار اپنے اپنے علاقوں میں ہندو سرداروں کو زیر نگیں کرنے اور ان سے اپنی فوج کے اخراجات پورے کرنے کے لیے رقمیں حاصل کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ ایسے حالات میں پوری قلمرو میں شہری انتظامیہ کا تصور بڑا مشکل تھا۔ خلجی عہد میں ہمیں والی اور مقطی کے نام نظر آتے ہیں جو ان ٹکڑوں کے کمانڈر اور منتظم ہوتے تھے جنہیں اقطاع یا ولایت کہا جاتا تھا۔ ان الفاظ کے لیے جو اصطلاح استعمال کی جاسکتی ہے وہ صوبہ ہے اور ان کا سربراہ گورنر کہلاتا تھا۔ گورنر اور مقطی کے اختیارات حالات کی مناسبت سے مختلف ہوتے تھے۔ دہلی کی وسیع سلطنت انتظامی سہولتوں کے لحاظ سے متعدد ولایتوں، اقلیموں اور اقطاع میں تقسیم کی گئی تھی۔ یہاں کے حاکموں کو والی یا مقطی کہا جاتا تھا، صوبہ کی اصطلاح کا رواج بعد میں ہوا۔ آسانی کے لحاظ سے مورخین نے ولایتوں، اقلیموں اور اقطاع کے لیے (Province) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ہم بھی جب اس اصطلاح کو استعمال کریں گے تو اس سے مراد وہی حصے ہونگے جن کا ذکر فارسی ماخذ میں اقلیم، ولایت یا اقطاع کے تحت کیا گیا ہے۔ صوبوں کی تعداد سلطنت کی وسعت کے لحاظ سے بدلتی رہی ہے۔ گورنر (والی یا مقطی) اپنے صوبہ میں فوجی اور انتظامی معاملات کا مکمل اختیار رکھتا تھا۔ صوبہ کا انتظام قریب قریب اسی طریقہ اور طرز پر ہوتا تھا جو مرکز میں تھا۔ اس دور میں گورنر کے اختیارات بہت وسیع تھے، رسل ورسائل کے ذرائع اس قدر کم اور کم رفتار تھے کے دور دراز کے علاقوں میں بڑے گورنر جن کے وسائل زیادہ ہوتے تھے کم و بیش نیم خود مختار حکمران بن جاتے تھے۔ لکھنوتی یعنی بنگال کے گورنر کی مثال اس سلسلہ میں پیش کی جاسکتی ہے۔ وہ دہلی سے دور بھی ہوتا تھا اور اس کی ولایت بھی وسیع تھی چنانچہ اس کو مرکز کے خلاف بغاوت میں سہولت تھی، یہی سبب تھا کہ علاءالدین خلجی نے ابتدا میں دکن کی ریاستوں کو ان کے قدیم حکمرانوں کے ہی سپرد کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان حکمرانوں کے اختیارات بہت وسیع تھے، گورنروں کے جملہ اختیارات سے متعلق تاج المآثر کا مصنف حسن نظامی لکھتا ہے کہ وہ ایک اعلی عہدیدار ہوتا تھا جس سے یہ امید کی جاتی تھی کہ وہ حکومت کے جملہ ملازمین کی نگرانی کرے گا جن میں فوجی بھی شامل ہیں۔ اس کام میں اس کو بہت احتیاط سے کام لینا پڑتا تھا تاکہ وہ شجاعت وسخاوت کی ان روایات کو قائم رکھ سکے جن کے ذریعہ ابدی نیک نامی حاصل ہوتی ہے۔ گورنر کے فرائض سلطان کی

مخصوص پالیسیوں کے پیش نظر کم زیادہ ہوتے رہتے تھے، لیکن اس کا اہم ترین فرض یہ تھا کہ مرکز کی پالیسی کو عملی شکل دینے کی ہر کوشش کرے۔

13.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- دلی سلطنت کے مرکزی نظم ونسق کو سمجھ سکیں گے۔
- وزرا، محکمہ جات اور ان کے فرائض کی جانکاری حاصل کر سکیں گے۔
- دہلی سلطنت میں اقطاع نظام کے بارے میں جان سکیں گے۔
- دہلی سلطنت میں صوبائی و مقامی نظم ونسق کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- انتظامی تقسیم جیسے، اقطاع، شق، پرگنہ وغیرہ کے بارے میں سمجھ سکیں گے۔
- صوبوں میں آمد ورفت اور امن وامان کے قیام میں انتظامیہ کے کردار کا جائزہ لے سکیں گے۔

13.2 مرکزی نظم ونسق

دہلی سلطنت کے مرکزی نظم نسق کے امور سلطان کی موجودگی میں مختلف وزیروں یا امیروں کی دیکھ ریکھ میں انجام پذیر ہوتے تھے۔ سلاطین ریاست کی فلاح وبہبود کو مد نظر رکھتے ہوئے ضابطے اور توانین بناتے تھے، خطبہ اور سکے اقتدار کا مظہر سمجھے جاتے تھے۔ خطبہ جو ایک مذہبی پیغام ہوا کرتا تھا اور خصوصا جمعہ کی نماز سے پہلے دیا جاتا تھا اس میں سلطان کا نام خاص طور سے لیا جاتا تھا۔ سکوں کو جاری کرنا بھی اقتدار اعلیٰ کا مظہر تھا اور سکوں پر سلطان کا نام کندہ ہوا کرتا تھا۔ پوری سلطنت میں نظم ونسق کو قائم رکھنے امن وامان بنائے رکھنے کے لیے بہت سے انتظامی شعبے قائم کیے گئے تھے۔ ان انتظامی شعبہ جات کا مطالعہ کرنے سے سلطان کا مرتبہ اور اختیارات کے بارے میں معلومات فراہم کر لیں۔

13.3 سلطان کا مرتبہ اور اختیارات

دہلی سلطنت میں انتظامیہ کی جو ساخت ابھری وہ بنیادی طور پر عباسی طرز حکومت اور اس کے بعد غزنوی اور سلجوقی نظام حکومت پر مبنی تھی۔ اس پر قدیم ہندوستانی انتظامیہ اور کسی قدر ہندوستان کے حالات اور یہاں کی روایات کا بھی اثر تھا۔ سلاطین دہلی نے سلطنت کو بحسن و خوبی چلانے کے لیے ایک مستحکم نظام حکومت قائم کیا جس کی پیروی شیر شاہ سوری اور اس کے بعد مغل حکمرانوں نے بھی کی۔ سلطان مملکت کا سربراہ اور اس کی افواج کا سپہ سالار اعظم ہوتا تھا۔ قانوناً وہ شریعت کا پابند ہوتا تھا۔ وہ نظم حکومت کا محور ہوتا تھا۔ اس کا دربار ہی سلطنت کی سیاسی اور معاشی زندگی کا مرکز ہوتا تھا۔ سلطان علوم وفنون کا سب بڑا سرپرست تھا۔ سلطان کو شریعت کے لازمی اجزا میں ردوبدل کا کوئی اختیار نہیں

تھا مگر وہ قانون کی تفسیر و تشریح کا محدود حق رکھتا تھا۔

دہلی سلطنت میں سلطان کو ایک مرکزی حیثیت حاصل تھی، وہ انتظامیہ کا محور، فوج کا سپہ سالار اعظم اور تمام عدالتی معاملات میں منصف اعلیٰ ہوتا تھا، وہ عزت و اقتدار کا منبع اور سرچشمہ تھا، ضیاالدین برنی کے مطابق ''بادشاہ کا قلب خدا کا آئینہ تھا یعنی وہ اللہ کی منشا کا مظہر تھا جس کا مطلب یہ بھی تھا کہ بادشاہ کے افعال پر نکتہ چینی نہیں کی جاسکتی تھی، پورے سلطنت عہد میں سلطان ہی حکمرانی اور حکومت کا محور و مرکز ہوتا تھا، طاقتور سلاطین جیسے بلبن اور علاالدین خلجی آمرانہ انداز میں کام کرتے تھے، اس عہد میں تخت نشینی کا کوئی باضابطہ قانون نہیں تھا حصول اقتدار کے لیے بھائیوں کے مابین جنگ ہوا کرتی تھی، سلاطین کا دربار سیاسی ہوا کرتا تھا، سلطان عام طور پر مملکت کے اہم ترین امور کو اپنی مجلس (جسے مجلس خلوت بھی کہتے تھے) میں بحث کے لیے رکھتا تھا، اس مجلس میں وزرا کے علاوہ معتمد عہدہ دار بھی حاضر رہتے تھے لیکن اس مجلس کی کوئی دستوری حیثیت نہیں تھی بلکہ یہ ایک مشاورتی مجلس ہوتی تھی، اس کے فیصلے سلطان پر لاگو نہیں ہوا کرتے تھے۔

حکمرانی کے عمل میں سلطان کو بہت سے وزیر مدد دیتے تھے۔ ہر ایک وزیر کو سلطان منتخب کرتا تھا اور وہ سلطان کی مرضی تک اپنے فرائض انجام دیتا تھا۔ سلطان کا مشیر خاص وزیر ہوتا تھا اور وہی عام طور پر حکومت کے پورے تنظیم کا نگراں بھی مانا جاتا تھا۔ اس کے کاموں میں اہم ترین کام شعبہ مالیات کا انتظام ہوتا تھا۔ ہر کام بحسن و خوبی انجام پائے اس کے لیے عہدیداروں، نقیبوں اور چوبداروں کے ایک بڑے عملے کی ضرورت ہوتی تھی۔ سلطان کا حفاظتی دستہ، اس کے ذاتی خدام، محل کا محافظ دستہ، شاہی محل میں رہنے والوں کی خدمت کے لیے عملہ اور بہت سے دوسرے کارکنوں کی ایک بڑی فوج ہوتی تھی۔ مملکت کے نظم و نسق میں شاہی محل کا بھی حصہ ہوتا تھا جس میں وکیل در، امیر حاجب، نقیب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مرکزی حکومت کو چلانے کے لیے مختلف وزارتوں کے تحت بہت سے محکمے بھی قائم تھے۔

13.4 وزرا محکمہ جات اور ان کے فرائض

وزرا اور مختلف قسم کے عہدیداران سلطان کی مدد کیا کرتے تھے، وزیروں کی تعداد متعین نہیں تھی، وہ وزرا جو سلطان کی مدد کیا کرتے تھے، ان میں وزیر کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی، وزیروں کی کوئی کونسل تشکیل نہیں دی جاتی تھی، کیونکہ مشترکہ ذمہ داری کا تصور ہی پیدا نہیں ہوا تھا۔

13.4.1 وزیر

وزیر کی صلاحیت، لیاقت، حکومت میں اس کے کردار اور اختیارات وغیرہ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، جو قیوں کے وزیر نظام الملک (جن کی کتاب سیاست نامہ ہے) کے مطابق وزیر کو اہل کتاب ہونا چاہیے یعنی جنگجو کے مقابلے میں صاحب علم و فضل ہونا چاہیے، اسے وسیع تجربہ کار، فہیم و ذکی اور ہوشمند ہونا چاہیے تاکہ سلطان اس سے کسی مسئلے میں مشورہ کر سکے، اسے موقع شناس بھی ہونا چاہیے، مسلم سیاسی مفکرین کے مطابق دو قسم کے وزیر ہوتے تھے:

1۔ وزیر تفویض: وہ وزیر جسے اپنا جانشین مقرر کرنے کے علاوہ ہر طرح کے لامحدود اختیارات حاصل ہوتے تھے۔

2۔وزیر تنفیذ: وہ وزیر جو صرف حکمراں کے احکامات کی تعمیل کا ذمہ دار ہوتا تھا۔
دہلی سلطنت میں مذکورہ دونوں طرح کے وزرا ہوا کرتے تھے۔

مسلم سیاسی مفکر وزیر کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔الفخری کہتا ہے کہ ''وزیر فرماں روا اور رعایا کے بیچ میں ہوتا ہے''فخر مدبر لکھتا ہے کہ ''کوئی سلطنت وزیر کے بغیر پائیدار یا خوش حال نہیں ہوسکتی''، وزارت قانوناً سلطان یا خلیفہ کی نیابت ہے۔اکثر وزیر مخصوص اور محدود اختیارات رکھتے تھے۔جن وزرا کو غیر محدود اختیار حاصل تھا، وہ سلاطین کے نام سے سلطنت پر حکومت کرتے تھے۔سلاطین دہلی کے ماتحت وزیر مہذب اور تعلیم یافتہ ہوتے تھے۔خان جہاں مقبول جو قابل ترین وزرا میں سے تھا باوجود ناقص تعلیم کے سب سے زیادہ دانش مند تھا۔سلطنت دہلی کی تاریخ میں وہی ایک ایسا وزیر تھا جو کم پڑھا لکھا تھا۔سلاطین اکثر دربار عام میں وزیر کی معرفت تمام سوالات کرتے تھے۔ وزیر کے فرائض منصبی میں فوجی مہمات کی رہنمائی کرنا، ممالک کو فتح کرنا،انعامات دینا اور بزم ورزم میں آب وتاب کے ساتھ نمایاں ہونا، خزانے میں دولت جمع کرنا، عہدیداروں کا تقرر کرنا وغیرہ، غرض کہ وزیر پورے نظام حکومت کا سربراہ ہوتا تھا، مرکزی دیوان مالیات سے اس کا براہ راست تعلق ہوتا تھا، وزیر مختلف اقسام کے مصارف کی نگرانی بھی کرتا تھا، وزیر کا فرض ہوتا تھا کہ وہ فرماں روا کو بہت سے مختلف النوع مسائل پر مشورہ دیتا رہے۔

13.4.2 دیوان وزارت

وزیر کا محکمہ دیوان وزارت کہلاتا تھا، مالیات سے اس کا تعلق ہوتا تھا،اس کی مدد ایک نائب وزیر کرتا تھا،اس کے بعد مشرف ممالک ہوتا تھا جو پوری سلطنت کا محاسب اعلیٰ (اکاونٹنٹ جنرل) ہوتا تھا، مستوفی ممالک حسابات کی جانچ پڑتال کرتا تھا (یہ آڈیٹر جنرل کے مشابہ ہوتا تھا) مشرف کا فرض ہوتا تھا کہ صوبوں اور مختلف محکموں سے جو حسابات موصول ہوں انہیں درج کرلے اور مستوفی ان کی جانچ پڑتال کرتا تھا، حسابات کے گوشواروں کی الگ الگ نقلیں مشرف اور مستوفی کو بھیجی جاتی تھیں، فیروز شاہ کے زمانے میں مشرف آمدنی سے واسطہ رکھنے لگا اور مستوفی کا تعلق خرچ سے ہوگیا، مشرف کی مدد کے لیے ایک ناظر ہوتا تھا جو مال گزاری کی وصولیابی کا نگراں ہوتا تھا، وہ مقامی حسابات کی جانچ پڑتال بھی کرتا تھا، مشرف ممالک اور مستوفی ممالک دونوں وزارتی درجے کے عہدے دار ہوتے تھے اور سلطان کی خدمت میں براہ راست رسوخ رکھتے تھے، وزیر کو عموماً ''صدر عالی'' کہا جاتا تھا اور خواجہ جہاں بھی کہا جاتا تھا یہی زیادہ مستعمل تھا، اسی طرح دیوان وقوف (خرچ کے کاغذات کو تیار کرنے والا شعبہ) دیوان مستخرج (وصول کیے گئے ایڈیشنل محصول کی دیکھ بھال کرنے والا شعبہ) اور دیوان امیر کوہی (نظام مال گزاری اور زراعت کی ترقی کے لیے شعبہ) دیوان وزارت سے متعلق ہوتا تھا، اس کے علاوہ تین اور بڑی وزارتیں تھیں، جن میں دیوان رسالت، دیوان عرض یا عارض ممالک اور دیوان انشا قابل ذکر ہیں۔

13.4.3 دیوان رسالت

دیوان رسالت ان چار خاص وزارتوں میں سے ایک ہے جن کا ذکر ضیاء الدین برنی نے کیا ہے، دیوان رسالت کے ذریعہ مذہبی اور

دینی امور انجام پاتے تھے۔ مستحق علما و صلحا کو وظائف بھی دیوان رسالت ہی سے ملتے تھے، اس کا صدر صدر الصدور کہلاتا تھا جو عموماً قاضی ممالک بھی ہوتا تھا اور اس حیثیت سے محکمہ عدل کی نگرانی بھی کرتا تھا، وظائف اور بے محصول زمینیں عطا کرنے کے علاوہ صدر کے محکمے کا ایک کام عوامی اخلاق کے نگراں محتسبوں کا تقرر بھی کرنا تھا۔ محتسب کا کام تھا کہ لوگ شراب نوشی سے باز رہیں، نماز روزہ کے پابند ہیں اور شرع کی پابندی کریں، ساتھ ہی ناپ تول کی جانچ پڑتال بھی محتسب کے ذمہ ہوتی تھی اور یہ سب کام دیوان رسالت کے دائرۂ اختیار میں آتے تھے، فیروز شاہ تغلق نے عوام کی شکایات سننے والا ایک محکمہ بھی قائم کیا اور اسے دیوان رسالت کا نام دیا، اس کا سربراہ کوئی ممتاز امیر غالباً وکیل در ہوتا تھا، اسی طرح علاالدین خلجی نے بازاروں پر نگاہ رکھنے کے لیے شحنہ مقرر کیا اور ان کے کام کی نگرانی کے لیے ایک بڑے امیر کو مقرر کیا، می دیوان رسالت کہلاتا تھا، اس طرح دیوان رسالت کی شکل مختلف حکمرانوں کے عہد میں مختلف رہی لیکن ضرورت مندوں میں وظائف اور بے محصول زمینوں کی تقسیم کے کام غالباً تمام عرصے میں دیوان رسالت کے پاس ہی رہا۔

13.4.4 دیوان عرض

ایک وزارت جنگ کے لیے ہوتی تھی جسے دیوان عرض کہتے تھے، عارض ممالک اس کا سربراہ ہوتا تھا، یہ فوجی معاملات کے پورے نظم و نسق کا ذمہ دار ہوتا تھا، وہ فوجی بھرتی کے لیے صدر عہدے دار کی حیثیت سے کام کرتا تھا اور فوجیوں کی تنخواہ مقرر کرتا تھا، ہر چھ سال میں کم سے کم ایک مرتبہ سوار سپاہیوں کا معائنہ کرتا تھا اور ہر سوار کے ساز و سامان اور سواری کے گھوڑے کی حالت جانچتا تھا، سپاہیوں کی ترقی اور تنزل کا انحصار عارض پر ہوتا تھا، جب بھی کوئی مہم شروع کی جاتی تو اس کی تیاریاں عارض کے ذمہ ہوتیں، فوج کی تنخواہوں کی ادائیگی کا ذمہ دار بھی عارض ہوتا تھا، تمام اہم جنگوں میں عارض خود فوج کے ساتھ ہوتا تھا، رسد اور حمل و نقل کے معاملات کی نگرانی بھی عارض کرتا تھا، عارض کی مدد کے لیے محرروں کا ایک بڑا عملہ ہوتا تھا اور مرکز و صوبوں میں اس کے نائبین ہوتے تھے، عارض ممالک گھوڑوں اور آدمیوں کے حلیوں کی فہرست رکھتا تھا اور وہ خود افواج کا نگران اعلی ہوتا تھا، عارض کا عہدہ بڑی اہمیت کا حامل ہوتا تھا اور یہ وزیر کے اختیارات کو بھی کسی قدر محدود کرتا تھا۔

13.4.5 دیوانِ انشاء

دیوان انشا، یہ خط و کتابت کا شعبہ تھا، اس کا افسر دبیر خاص یا امیر منشی کہلاتا تھا، شاہی اعلانات اور فرامین کا مسودہ تیار کرنا اور انہیں متعلقہ افسران تک بھیجنا ری کا کام تھا، دبیر خاص کی مدد کے لیے بہت سے دبیر (منشی) ہوا کرتے تھے، دیوان انشا سے ہی سے سلطان کے فرمان جاری ہوتے تھے، دیوان انشا کے فرائض میں یہ بات شامل تھی کہ وہ پڑوسی ملک کے حالات پر متواتر نگاہ رکھے اور ان سے حکمراں کو مطلع کرتا رہے، کبھی کبھی پڑوسی حکمراں اور شہزادوں کو باقاعدہ شاہی تحریریں بھیجی جاتی تھیں جن کے ذریعہ کی نئی تخت نشینی، کسی اہم واقعے بات کی اطلاع دی جاتی تھی، اہم اقطاع داروں اور آس پاس کے راجاؤں کو بھی دبیر ہی مختلف قسم کے خطوط اور پیغامات بھیجنے کا ذمہ دار ہوتا تھا، یہ بڑی اہمیت اور ذمہ داری کا عہدہ تھا۔

13.4.6 دربار اور شاہی حرم کے امور

شاہی حرم کے امور کا سب سے اہم افسر وکیل در ہوتا تھا۔ یہ شاہی حرم کے تمام کاموں کا نگراں ہوتا تھا جس میں شاہی مطبخ اور شاہی اصطبل شامل تھا۔ شہزادوں کی تعلیم کی ذمہ داری بھی اسی کی ہوتی تھی، یہ عہدہ بہت اعلیٰ رتبے کے امیر کو سونپا جاتا تھا۔ ایک عہدہ امیر حاجب کا ہوتا تھا جسے بار بک بھی کہتے تھے۔ یہ درباری تقریبات کا منتظم ہوتا تھا۔ سلطان کے سامنے پیش کی جانے والی تمام درخواستیں اور استغاثے اسی کے توسط سے آگے بڑھتے تھے۔ ایک شعبہ برید خاص کا تھا۔ یہ جاسوسی یا خبر رسانی شعبے کا سربراہ ہوتا تھا۔ جاسوس یا برید سلطنت کے مختلف حصوں میں مقرر کیے جاتے تھے اور سلطان کو تمام معاملات سے مطلع کرنا انہیں کی ذمہ داری ہوتی تھی۔ ایک محکمہ کارخانہ یا شاہی اسٹور اور دوسرا امور عامہ (پبلکس ورکس) کا شعبہ تھا جس کا کوئی امیر نگراں ہوتا تھا۔ کارخانہ شاہی ضرورتوں اور شاہی حرم کے لیے تمام ضروری اشیا کی پیداوار اور فراہمی کا ذمہ دار تھا۔

13.4.7 عدل وانصاف

عدل وانصاف کے لیے دیوان قضا قائم تھا جس کا سربراہ قاضی ممالک ہوتا تھا۔ اسے قاضی القضاہ بھی کہا جاتا تھا اور اس کا دفتر دارالحکومت میں ہی ہوتا تھا۔ سلطنت کے تمام مقدمات اسی کی نگرانی میں فیصل ہوتے تھے۔ حالانکہ آخری اپیل سلطان کے حضور کی جاسکتی تھی جس کا فیصلہ حتمی تھا۔ اس کے علاوہ تمام شرعی اور مذہبی امور کی دیکھ بھال قاضی القضاۃ کی ذمے داری تھی۔ وہ ماتحت عدالتوں کے فیصلے کے خلاف اپیلوں کی سماعت کرتا تھا اور مقامی قاضی مقرر کرتا تھا۔ دارالحکومت کے علاوہ ہر شہر میں ایک قاضی ہوتا تھا۔

13.4.8 امیر داد

انصاف سے متعلق ایک اور عہدے دار بھی ہوتا تھا جسے امیر داد کہتے تھے۔ دارالحکومت میں امیر داد کا عہدہ اہمیت رکھتا تھا۔ سلطان کی غیر حاضری میں امیر داد ہی عدالت کا مسند نشین ہوتا تھا اور سلطان کی موجودگی میں وہ عدالت کے انتظام وانصرام اور اس کے فیصلوں پر عمل درآمد کرانے کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ امیر داد مسجدوں اور عمارت عامہ کی دیکھ بھال کے علاوہ کوتوال، پولیس اور محتسب کا نگراں ہوتا تھا۔

13.4.9 ڈاک، پولیس اور خفیہ نظام

سلطنت کے تمام حصوں سے اطلاعات فراہم کرنے، امن وامان قائم رکھنے اور امرا پر کنٹرول بنائے رکھنے کے لیے ڈاک، پولیس اور جاسوسی کا سہارا لیا جاتا تھا۔ پولیس کے محکمے کے روزمرہ کے فرائض کوتوال انجام دیتا تھا۔ اس کا دائرہ اختیارات دیہاتی علاقوں پر بھی محیط ہوتا تھا۔ مقدمات کی تفتیش کے علاوہ امن وامان بنائے رکھنے کی ذمہ داری کوتوال کی ہوتی تھی۔ بلبن اور علاء الدین خلجی نے ایک جاسوسی کا شعبہ بھی قائم کیا تھا جہاں سے سلطان کو ہر اہم واقعہ کی خبر مل جایا کرتی تھی۔

13.4.10 محکمہ مالیات نظام مال گزاری

عہد وسطی میں دہلی سلطنت کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ زمین کا محصول تھا۔ زیر کاشت زمین دو قسموں میں منقسم تھی:

- **عشری**۔ عشری زمین وہ ہوتی تھی جس پر مسلمان کاشت کرتے تھے۔ عشری زمین خراجی کے مقابلہ میں بہت کم تھی۔
- **خراجی**۔ خراج کا لفظ آرامی زبان میں پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے موجود تھا۔ وہ تمام زمینیں جو طاقت کے زور پر فتح کرنے کے بعد مسلم سپاہیوں میں نہ تقسیم کر کے غیر مسلم حکمرانوں یا غیر مسلم کسانوں کو دے دی گئی ہوں، خراجی زمینیں کہلاتی تھیں۔

ان زمینوں پر حکومت کے حصے کی رقم یا محصول کتنا مقرر کیا جائے اس کا فیصلہ تجربہ کار اور مہارت رکھنے والے لوگ کھڑی فصل کی قیمت کے اندازہ سے کرتے تھے اور اسی بنیاد پر حکومت اور محصول دینے والے کے درمیان معاملہ طے پاجاتا۔ ایک دوسرا طریقہ یہ تھا کہ گزشتہ برسوں کی پیداوار کی بنیاد پر قیمت کا اندازہ لگا لیا جاتا تھا اور اسی حساب سے حکومت کے حصے کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ اس کے لیے زمین کی پیمائش ضروری تھی جسے مساحت کہا جاتا تھا۔ یہی طریقہ تھا جن کا سلطنت کے مختلف علاقوں میں رواج تھا اور ان ہی کے ذریعے حکومت/سلطنت کے حصے کی رقم یا قیمت مقرر کی جاتی تھی۔

سلطان علاءالدین خلجی کے عہد تک بٹائی کا رواج عام تھا کیونکہ برنی کے بیان کے مطابق اس نے پیمائش کا طریقہ اختیار کیا۔ غیاث الدین تغلق نے اس کو بدل کر بٹائی کو ترجیح دی لیکن کہیں کہیں پیمائش کا طریقہ بھی جاری رہا۔ پیداوار پر محصول کی شرح کیا تھی اس سے متعلق دستیاب شہادتوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قطب الدین ایبک نے پیداوار کا پانچواں حصہ مقرر کیا تھا۔ علاءالدین خلجی کے عہد میں اس میں اضافہ کیا گیا۔ دوآب میں اس نے بعض انتظامی اور زرعی ضرورتوں کے تحت شرح محصول بڑھا کر پیداوار کا نصف کر دی تھی، جبکہ دوسری جگہوں پر پیداوار کا 1/3 لیا جاتا رہا۔ حکومت کے واجبات نقد اور جنس دونوں شکلوں میں لیے جاتے تھے۔ علاءالدین خلجی نے جب اشیا کے نرخ مقرر کیے اور سرکاری گودام اور ذخیرے قائم ہوئے تو اس نے دوآبہ کے علاقہ میں حکومت کا محصول جنس کی شکل میں وصول کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ محمد بن تغلق نے اپنے پیشرو کی مقرر کی ہوئی شرح کو جاری رکھا لیکن دوآبہ کے علاقہ میں جہاں کے لوگوں کو وہ آئے دن کی بغاوتوں کی سزا دینا چاہتا تھا اس نے اضافہ کیا جو کہیں پانچ اور کہیں دس فیصد تھا۔ سلطنت دہلی نے فصلوں کی مکمل یا جزوی خرابی کے لیے مراعات دی تھیں۔ برنی نے بٹائی کے طریقے کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس کی وجہ سے آفات ارضی و سماوی کا لحاظ رکھنا یا ان زمینوں میں جن سے پیداوار ہوتی ہے اور جن سے پیداوار نہیں ہوتی امتیاز کرنا ضروری نہیں رہا۔

محصولات

دہلی سلطنت میں زکوٰۃ، جزیہ، خراج، جزاری، گھرائی، چرائی وغیرہ جیسے محصول لیے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ مال غنیمت میں سے بھی حکومت کو ایک مخصوص حصہ ملتا تھا۔

زکوٰۃ: زکوٰۃ یہ مال پر ڈھائی فیصد تھی۔ زکوۃ سونے چاندی اور دوسرے مال پر اس وقت واجب ہوتی ہے جب اس کی مقررہ مقدار (نصاب) ایک شخص کی ملکیت میں سال بھر سے زیادہ رہے اور نصاب سے اوپر رہے تو اس پر ڈھائی فیصد زکوٰۃ واجب ہے۔ میر شاہ نے زکوٰۃ کو حکومت کے باضابطہ محاصل میں شامل کیا ہے جب کہ فقہ فیروز شاہی میں زکوۃ کے لیے ایک علاحدہ خزانے کا تذکرہ ہے۔

جزیہ: یہ ان غیر مسلموں پر لگایا جاتا ہے جو اسلامی ریاست کے شہری ہوں ان کو ذمی کہتے ہیں۔ ذمی اسلامی ریاست میں فوجی خدمات سے بری تھے اس لیے ان کو ایک مقررہ رقم ادا کرنی پڑتی تھی۔ جزیہ عورتوں بچوں اور ضعیفوں سے نہیں لیا جاتا تھا بلکہ غربا بھی اس سے مستثنیٰ تھے۔ برہمنوں اور پنڈتوں سے بھی جزیہ نہیں لیا جاتا تھا، جزیہ کی رقم زیادہ نہ تھی اور سلطنت میں سب سے کم استطاعت رکھنے والا طبقہ دس تنکہ، متوسط طبقہ بیس تنکہ، اور مالدار طبقہ چالیس تنکہ ادا کرتا تھا۔ چونکہ دہلی سلطنت اسلامی ریاست نہیں تھی، اس لیے اس کو جزیہ وصول کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

خراج: خراج کو دو قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

- **خراج وظیفہ:** خراج وظیفہ جو نقد اور جنس کی شکل میں رقبے کی وحدت پر پیدا شدہ فصلوں کی اقسام کے مطابق مقرر کی جاتی ہیں۔
- **خراج مقاسمہ:** پیداوار کے ایک خاص حصے کو لینے کے طریقہ کو خراج مقاسم کہتے ہیں۔

ان ٹیکسوں کے علاوہ بہت سے چھوٹے چھوٹے محصول بھی بعض سلاطین کے زمانہ میں وصول کیے جاتے تھے مثلاً جزاری (ذبح کیے جانے والے جانوروں پر) چرائی وغیرہ (مویشیوں کی چرائی پر)۔ ان میں سے بہت سے محصول ہندوستان میں پہلے سے رائج تھے مسلمانوں نے ان کو جاری رکھا لیکن فیروز شاہ کے عہد میں شرعی قوانین سے جواز نہ ملنے کی وجہ سے انہیں بند کر دیا گیا۔

مال غنیمت:. جنگ میں جو مال ہاتھ لگے اسے ''غنیمت'' کہتے ہیں۔ قانوناً ایسے تمام مال کو جمع کرنا چاہیے اور اس کا پانچواں حصہ (خمس) مملکت کے لیے علیحدہ کر دینا چاہیے۔ باقی کو تمام سپاہوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ سلطان یا سپہ سالار کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اپنی پسند کا کوئی جانور یا تلوار یا کوئی اور چیز اپنے استعمال کے لیے غنیمت کی تقسیم سے قبل الگ کر لے۔ اسے ''صفیہ'' کہتے ہیں اور تقسیم کے وقت اسے شمار نہیں کیا جاتا۔ جو حصہ بیت المال میں داخل ہوتا ہے وہ قانوناً ''خمس'' کہلاتا ہے۔ سلطنت دہلی میں بتدریج یہ طریقہ رائج ہو گیا کہ سپاہیوں میں پانچواں حصہ تقسیم کیا جاتا اور 4/5 حصہ بیت المال میں رکھ لیا جاتا۔ فیروز شاہ کے علما نے اسے خلاف شرع قرار دیا اور اس نے پرانے طریقے کو پھر قائم کر دیا۔ جب غنیمت تقسیم ہوتی تھی تو ایک سوار سپاہی کو پیادے کے مقابلے میں دوگنا اور بعض اوقات تین گنا مال دیا جاتا تھا۔

13.2 اقطاع داری نظام

التتمش نے سلطنت دہلی کے حکومتی ڈھانچے کو ایک شکل دی، اس نے اقطاع، فوج اور سکوں کا انتظام کیا۔ التتمش نے نظام حکومت میں جو اصلاحات کیں ان میں اقطاع داری نظام کی حیثیت ایک محور کی تھی۔ اقطاع کے لفظی معنی ایک ٹکڑے کے ہوتے ہیں۔ اسلامی فقہ کی

اصطلاح میں قابل منتقلی زمینی محصول کا عطیہ (Transferrable Land Revenue Assignment) اقطاع کہلاتا تھا۔ اس کا مطلب حکمراں کی جانب سے کسی فرد کو زمین کا محصول عطا کرنا ہے جو کبھی بھی واپس لیا جاسکتا ہے۔ ماوردی دو قسم کے اقطاع کا حوالہ دیتا ہے:

- اقطاع تملیک، جو کھیتی باڑی والی یا بنا کھیتی باڑی والی یا پھر کانوں والی زمین پر مشتمل تھی۔
- اقطاع استغلال کا تعلق وظائف یا بھتوں سے ہوتا تھا۔

سیاسی اور معاشی اداروں کی ترقی میں اقطاع کی ایک طویل اور دلچسپ تاریخ ہے۔ اس کا وجود اسلام کے ابتدائی زمانہ سے ہی ہے۔ دہلی کے ابتدائی ترک سلاطین نے اس ادارے کا استعمال خصوصاً ہندوستانی سماج سے جاگیر دارانہ نظام کے خاتمہ کے لیے اور سلطنت کے دور دور تک پھیلے ہوئے حصوں کو ایک ہی مرکز سے جوڑ دینے کے لیے کیا۔ اس کے ذریعہ رسل ورسائل کے سلسلے کی مشکلات پر قابو پایا جاسکا اور نئے نئے مفتوحہ علاقوں سے مال گزاری اکٹھا کرنا ممکن ہوا۔ اس سے سلطنت کے تمام حصوں میں نظم وضبط کا قیام بھی ممکن ہو سکا۔

اقطاع داری نظام کے تحت جو اقطاع دیے جاتے تھے وہ دو قسم کے ہوتے تھے۔

- چھوٹے اقطاع جن کے ساتھ کسی طرح کی انتظامی ذمہ داری متعلق نہ تھی اور نہ ہی مرکزی خزانہ کو جواب دہی کرنا پڑتی تھی۔ چھوٹے اقطاع داروں کو صرف عسکری خدمات کے عوض زمین کے کسی حصہ کی مال گزاری کی وصولی کی اجازت تھی۔
- بڑے اقطاع (صوبے) جو باحیثیت لوگوں کی نگرانی میں دیے جاتے تھے۔ ان کے ساتھ انتظامی ذمہ داری بھی متعلق تھی اور اقطاع دار سے یہ توقع رکھی جاتی کہ وہ اپنے علاقہ میں نظم وضبط بنائے رکھے اور ہنگامی حالات میں مرکز کو فوجی دستے بھیجے۔

التتمش نے ترکوں کو بڑے پیمانے پر اقطاع دیے۔ اس کا مقصد مقبوضہ علاقوں پر سخت کنٹرول رکھنا اور ہندوستان کے جاگیر دارانہ نظام کا استیصال کرنا تھا۔ اقطاع داری نظام میں ایسے عناصر موجود تھے جو جاگیر دارانہ خصوصیات اختیار کر سکتے تھے، اس لیے التتمش نے سختی سے اقطاع داروں کے اپنی جڑیں جما لینے کی روک تھام کی اور جاگیر دارانہ موروثی نظام کو رد کر دیا۔ جاگیر داری کے برخلاف اقطاع کو نہ تو باپ دادا کی جائیداد سمجھا جاسکتا تھا نہ ہی مقطی ایک اقطاع سے دوسرے اقطاع میں منتقلی سے انکار کر سکتا تھا۔

اقطاع کی بناء اس اصول پر تھی کہ جو زمین بیکار پڑی ہے اسے لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ زراعت کو ترقی ہو اور پیداوار بڑھے۔ لیکن اقطاع کا تعلق محض زمین کی آبادکاری سے نہیں تھا بلکہ اس کا تعلق نظم ونسق، عمل داری اور سیاسی ضروریات سے بھی تھا۔ اگرچہ فتوحات اور انتظامی وفوجی ضروریات کی وجہ سے اقطاع کے اصول پر مختلف طریقے سے عمل کیا جاتا تھا، لیکن اس کا حتمی مقصد بہر حال یہ تھا کہ زمین غیر آباد نہ پڑی رہے اور اس کی زرعی پیداوار میں اضافہ ہو۔ اقطاع کو زیادہ تر عسکری وں ہی کے لیے موزوں سمجھا جاتا تھا۔ جب تک اقطاع دار مملکت کی خدمت انجام دیتے، اقطاع کی آمدنی انہیں کو ملتی تھی۔ ان کی موت پر اقطاع پھر مملکت کو منتقل ہو جاتی تھی۔ رہے ان کے ورثاء تو انہیں دوسرے ذرائع سے کچھ وظیفہ دے دیا جاتا تھا۔ اقطاع دار کے بیمار پڑنے پر اور کام کے لائق نہ ہونے پر کچھ گذارا بھتہ مقرر کر دیا جاتا البتہ اقطاع دار کو نہ زمین کی ملکیت کا حق پہنچتا تھا اور نہ ہی وہ اسے وارثوں کو منتقل کر سکتا تھا۔

13.3 صوبائی اور مقامی حکومت

ضیاءالدین برنی کے مطابق جب تک دہلی سلطنت میں جنوبی علاقہ شامل نہیں تھا، سلطنت میں کل بیس صوبے تھے۔ حالانکہ مغل سلطنت کے صوبوں کے مقابلے میں یہ چھوٹے تھے۔ محمد بن تغلق کے عہد میں شہاب الدین عمری کے مطابق صوبوں کی کل تعداد 24 تھی، جس میں مالا بار تک پورا ملک تقسیم تھا۔ صوبے کے علاوہ ضلع یا تعلقہ وغیرہ جیسی چھوٹی اکائیوں سے متعلق کوئی مستند معلومات دستیاب نہیں ہیں، البتہ پرگنہ صدی اور چوراسی کا ذکر ملتا ہے۔ صدی سو گاؤں کے مجموعے کو کہتے تھے جہاں چودھری، عامل یا محصول وصول کرنے والے مقرر کیے جاتے تھے۔ خوط اور مقدم کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مقامی انتظامیہ بھی موجود تھی۔ نظم ونسق کی سہولت کے لیے سلطنت کو کئی اکائیوں میں تقسیم کیا گیا تھا، سب سے بڑی اکائی صوبہ یا اقطاع تھی۔ ان کی تعداد متعین نہیں تھی بلکہ گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ سبھی اقطاع میں ایک جیسی انتظامی ساخت بھی نہیں تھی۔ ابتدا میں فاتح، فوجی سپہ سالار کو مفتوحہ علاقوں کا نظم ونسق سونپ کر اس علاقہ کو اقطاع کی شکل دے دیا کرتے تھے۔ سلطنت کی توسیع کے ساتھ ہی اقطاع کے علاوہ صوبے بھی بنائے گئے جیسے بنگال، گجرات، جونپور، مالوہ اور کچھ دکن کی ریاستیں وغیرہ۔ اس وجہ سے اقطاع اور مقطی سے زیادہ اہم صوبیدار، والی، ناظم یا نائب سلطان ہو گئے اور یہی پورے صوبے کے مالک ہوا کرتے تھے۔

13.4 صوبے دار یا والی

صوبیدار یا والی پوری ریاست کے مالک ہوا کرتے تھے۔ مرکز کا کنٹرول ان پر ہوتا تھا لیکن اندرونی معاملات میں انہیں پوری خود مختاری حاصل تھی۔ یہ اپنی فوج رکھتے تھے اور محصول کی وصولی کرتے تھے۔ صوبے میں نظم وضبط اور امن وامان بنائے رکھنا ان کی ذمہ داری ہوتی تھی۔ یہ سلطان کو معاشی اور فوجی مدد بھی فراہم کرتے تھے۔ سلطان کی اجازت سے نئے علاقوں پر حملہ کر کے اسے فتح بھی کر سکتے تھے۔ طاقتور سلطان تو ہمیشہ ان صوبے داروں کو اپنے کنٹرول میں رکھتے تھے لیکن مرکزی طاقت کے کمزور پڑتے ہی اکثر یہ صوبے دار بغاوت کر دیا کرتے تھے۔ والی کا درجہ مقطی سے زیادہ بلند ہوتا تھا، کیوں کہ مقطی ہر صوبے دار کے لیے استعمال ہوتا تھا جب کہ والی کی اصطلاح صرف ان صوبے داروں کے لیے مخصوص تھی جو غیر معمولی اختیارات رکھتے تھے۔ صوبے دار کی ذمہ داریوں کا اندازہ ہم فیروز شاہ کی درج ذیل ہدایات سے لگا سکتے ہیں جو اس نے سندھ کے صوبے دار فتح خاں کو دی تھیں:

- انتظامیہ کے اعلیٰ عہدیدار کی حیثیت سے کام کرنا۔
- رعایا کی حفاظت کرنا اور ان کے مفادات کی پاسبانی کرنا۔
- علما اور مذہبی لوگوں کی مدد کرنا۔
- فوج کو خوش اور مطمئن رکھنا۔
- صوبائی دیوان (شعبہ مالیات) کے کام کی نگرانی کرنا۔

- کسانوں کو استحصال اور ظلم سے محفوظ رکھنا۔
- سرکاری عہدیداروں کے کام کی نگرانی کرنا۔

فیروز شاہ نے یہ بھی ہدایات دی تھیں کہ صوبوں کے حکام تجارت کی ہمت افزائی کریں اور عام فلاح و بہبود کو ترقی دیں۔ والی ایسے عہدیدار ہوتے تھے جنہیں سلطان ان کے صوبوں میں متعین کرتا تھا اور ان کا تبادلہ، برخاستگی یا سزا اس کی مرضی پر موقوف ہوتی تھی۔ وہ اپنے صوبوں کا انتظام سلطان کے زیر احکام کرتے تھے اور وزارت مالیات کا ان پر سخت مالی انضباط ہوتا تھا۔ مور لینڈ کا یہ استدلال صحیح ہے کہ اس قسم کے عہدیدار کسی طرح جاگیر دارانہ نوعیت کے نہیں ہوتے تھے بلکہ خالصتاً نوکر شاہی کے سیدھے سادھے رکن ہوتے تھے۔

13.5 برید

ایک برید یا جاسوس افسر بھی صوبے میں متعین ہوتا تھا کہ وہ سلطان کو حالات سے باخبر رکھے۔ سلطان کے برید جو تمام سلطنت میں مختلف مقامات پر تعینات ہوتے تھے، اسے خبریں بھیجا کرتے تھے۔ سلطنت میں غیر ملکیوں کی آمد، خاص دلچسپی کے امور، مختلف عہدیداروں کے اعمال، بازاری گپ شپ سے متعلق خبریں برید دیتے تھے۔ برید سے قریبی تعلق رکھنے والا طریقہ گماشتوں اور جاسوسوں کا تھا جو مرکزی حکومت کو تمام واقعات سے باخبر رکھتا تھا۔ جہاں تک خبر رسائی کا تعلق ہے غیر ملکی سیاح سلاطین دہلی کے انتظامات خبر رسانی کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں۔ ابن بطوطہ کہتا ہے کہ شاہی ڈاک کے ذریعے پانچ دن میں سندھ کے خطوط دہلی پہنچے جاتے تھے، حالانکہ عام مسافر اس کو پچاس دن میں طے کرتے تھے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ خبریں دو طریقوں سے پہنچائی جاتی تھیں، ایک گھڑ سواروں کے ذریعہ اور دوسرے ہرکاروں کے ذریعہ۔ پہلے طریقے کے لیے ہر چار کروہ (کوس) پر گھوڑے بدلے جاتے تھے۔ ہرکاروں کو لیے ہر چوتھائی کروہ پر ایک اڈہ ہوتا تھا۔ ہر اڈے پر تین چھپرے ہوتے تھے جن میں پہلے سے آدمی تیار بیٹھے رہتے تھے کہ خط آئے اور اسے لے کر دوسری چوکی تک تیزی سے دوڑ جائیں۔ دوڑنے والا ہرکارہ ایک لاٹھی لیکر چلتا تھا جس کے دوسرے سرے پر گھنگرو بندھے ہوتے تھے۔ ان گھنگروؤں کی آواز سے معلوم ہو جاتا تھا کہ ہرکارہ پہنچ رہا ہے۔ ایسے دس دوڑنے والے جنہیں ''دھاوے'' کہتے تھے ہر چوکی پر رکھے جاتے تھے۔ دھاووں کی یہ ڈاک گھوڑوں کی ڈاک سے زیادہ تیز ہوتی تھی، اسے الاغ کہتے تھے۔

محمد بن تغلق نے ہرکاروں کی ڈاک کے علاوہ ایک اور طریقہ کار بھی منظم کیا جس سے علامتی اشاروں کو بڑی سرعت کے ساتھ منتقل کیا جا سکتا تھا۔ بڑے بڑے شہروں کے درمیان نقارخانوں کا ایک سلسلہ قائم کیا گیا تھا جس کے ذریعے خطرے کا ڈنکا اگر کسی دور دراز سرحد پر بجتا تھا تو بڑی تیزی سے سلطان تک پہنچ جاتا تھا۔ یہ امر مشتبہ ہے کہ ڈاک سے نجی خطوط بھی جاتے تھے مگر یہ امر یقینی ہے کہ جو سپاہی فوجی مہمات پر جاتے تھے وہ اپنے خاندانوں کے ساتھ خط و کتابت کر سکتے تھے۔ ڈاک سے قریبی تعلق رکھنے والا ایک طریقہ گماشتوں اور جاسوسوں کا تھا جو مرکزی حکومت کو تمام واقعات سے باخبر رکھتا تھا اس کا اثر مقامی عہدیداروں پر بہت اچھا ہوتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے اعمال سلطان اور اس کے وزرا سے پوشیدہ نہیں رہیں گے۔

13.6 دیوان

ہر صوبے میں ایک دیوان ہوا تھا جسے آسانی کے لیے خواجہ کہتے تھے اور جس کا تقرر سلطان، وزیر کی سفارش پر کرتا تھا وہ عموماً ایک ماہر محاسب ہوتا تھا اس کا فرض یہ ہوتا تھا کہ حسابات رکھے اور راجدھانی کو مکمل گوشوارے بھیجتا رہے۔ وزیر کا محکمہ ان ہی گوشواروں کی بنا پر مقطی سے تمام حساب کتاب طے کرتا تھا۔ سرکاری طور پر دیوان (خواجہ) حاکم صوبہ کے ماتحت ہوتا تھا مگر براہ راست سلطان کی طرف سے اس کے تقرر اور وزیر کے ساتھ اس کے روابط کے باعث وہ بڑا ذی اقتدار ہوتا تھا اور اس کی موجودگی حاکم صوبہ کے اختیارات پر ایک بندش کا کام دیتی تھی۔ ابن بطوطہ نے ایک صوبے میں کسی امیر کے ساتھ ایک والی الخراج کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ اول الذکر حاکم صوبہ ہے اور موخر الذکر خواجہ۔ ابن بطوطہ نے دیوان کے لیے والی کا لفظ استعمال کیا ہے اس بات کا مظہر ہے کہ اس کے اختیارات وسیع تھے، بعض اوقات حاکم صوبہ کا ایک نائب بھی ہوتا تھا جسے سلطان مقرر کرتا تھا۔

13.7 شقیں

مور لینڈ لکھتا ہے کہ چودھویں صدی کے دوران (شق) کا لفظ ان اصطلاحات کے لیے استعمال ہونے لگا تھا جن کا ترجمہ میں نے ''صوبہ'' کے لفظ سے کیا ہے مگر قرین قیاس یہ ہے کہ ہندو سرداروں کا اقتدار ختم ہونے اور براہ راست انتظام کے نشو و نما پانے پر اصلی صوبے بہت زیادہ بڑے ثابت ہوئے۔ اور ان میں سے بعض صوبوں کو چھوٹے چھوٹے انتظامی علاقوں میں تقسیم کر دیا گیا مثلاً محمد بن تغلق نے دکن کی ولایت کو چار شقوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اسی سلطان نے دوآب کے صوبے میں بغاوت کو جس طرح فرو کیا تھا اس پر برنی کہتا ہے کہ شق داروں اور فوج داروں کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ باغیوں کو لوٹ لیں اور گرفتار کر لیں۔'' اس سے یہ ظاہر ہے کہ اس صوبے میں متعدد شق دار تھے اور اگر وہ انتظامی عہدے دار تھے تو لازماً ان کی متعدد شقیں ہونگی۔ دوآب براہ راست مرکزی حکومت کے ماتحت تھا اس لیے شق دار غالباً سب سے بڑے عہدیدار تھے جنہیں بغاوت کو ختم کرنے کا حکم دیا جا سکتا تھا۔ برنی نے شق کے لفظ کو انتظامی وحدت کے لیے استعمال کیا ہے۔ اس کے علاوہ قطب الدین ایبک کے زمانے سے بڑی ولایتیں چھوٹی چھوٹی وحدتوں میں منقسم چلی آتی تھیں جنہیں، ''طرف'' کہتے تھے۔ صوبوں کی پرانی اور نئی تقسیم چودھویں صدی کے دوران شقیں کہلائی جانے لگیں۔ جب بہلول لودھی نے کمپل، پٹیالی، شمس آباد، سکیٹ، کوئل، مارہرہ اور جلالی کے پرگنے سلطان حسین شرقی سے فتح کیے تو اس نے ان میں سے ہر پرگنے میں ایک شق دار مقرر کیا۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ شق کا ادارہ کبھی عام طور پر چلن میں نہیں تھا اور صرف حد سے زیادہ بڑے صوبے ہی اس قسم کی اکائیوں میں تقسیم ہوتے تھے۔ چھوٹے صوبے اور بڑی بڑی ولایتوں کی شقیں، سرکاروں کے نام سے موسوم کی جانے لگیں۔ شق دار ایک صوبے کے حصے کا ناظم ہونے کے باعث نئی انتظامیہ میں پرگنے کا سربراہ ہو گیا۔ والی اور مقطی قدرتاً غائب ہو گئے۔

13.8 پرگنہ

صوبے سے چھوٹی وحدت شق اور سرکار کے بعد پرگنہ تھی جسے مور لینڈ نے قصبے کے مترادف بتایا ہے۔ جو پرانے معنٰی کے حساب

سے دیہات کا مجموعہ ہوتا تھا۔ اس کے بعد کی تقسیم میں جو آخری اکائی ہوتی تھی وہ دیہات تھی۔ ابن بطوطہ کے مطابق پرگنہ تقریباً سو دیہاتوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ پرگنے میں ایک چودھری ہوتا تھا جو ہندوؤں کا سربراہ ہوتا تھا اور ایک متصرف ہوتا تھا جو محصول وصول کرتا تھا۔ برنی نے متصرف کو عامل کہا ہے اور اسی کے ساتھ مشرف، محاصل، گماشتوں، سرہنگوں اور دفاتر کے عملے کا بھی ذکر کیا ہے۔ مشرف معائنہ کرنے والا عہدے دار ہوتا تھا جو فیصلوں کو دیکھتا تھا اور حکومت کا حصہ متعین کرتا تھا۔ محصل کسانوں سے محصول جنس اور نقد کی صورت میں بھی وصول کرتا تھا۔ گماشتہ جو کسی کی طرف سے کسی کے کام کے لیے متعین ہوتا تھا اور سرہنگ موجودہ دور کے چپراسیوں کی طرح کسانوں یا مقدموں پر سرکاری احکام یا سمن تعمیل کراتے تھے۔ برنی کارکنان کا لفظ بھی استعمال کرتا ہے جو پرگنہ سطح پر کام کرتے تھے۔ کارکن وہ محرر ہوتے تھے جو حسابات رکھتے تھے۔

13.9 مقامی عہدیدار

جب محمد بن قاسم نے سندھ کو فتح کیا تو شہریوں اور دیہاتیوں کو اس کی اجازت دے دی گئی تھی کہ وہ محصول وصول کرنے والوں کو خود مہیا کریں۔ یہی وجہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے علاقوں اور محاصل کا انتظام ہندوؤں کے ہاتھوں میں تھا۔ قطب الدین ایبک نے اسی روایت کو جاری رکھا اور تمام سلاطین دہلی اسے قائم رکھتے رہے۔ حکومت کا معاملہ کسان سے دیہات (گاؤں) کے سربراہ کی معرفت ہوتا تھا جسے 'مقدم' یا 'مکھیا' کہتے تھے۔ مقدم کی اصطلاح مشہور اشخاص اور دیہات کے سربراہ دونوں کے لیے ہوتی تھی۔ 'مکھیا' ایک ہندو خطاب ہے اور اس کا ذکر فارسی کی تاریخوں میں کہیں نہیں ہے مگر یہ اب بھی اتر پردیش میں استعمال ہوتا ہے اور مسلمانوں کے عہد سے پہلے سے جاری ہے۔

محاسب یا پٹواری اراضی کے محصول کے کاغذات رکھتا تھا۔ ارتھ شاستر میں اسے 'گوپ' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ خوط اور بلاہر دیہاتی سماج کے دو انتہائی جزو ہوتے تھے۔ خوط کی اصطلاح برنی نے استعمال کی ہے۔ بلاخ مین نے بلاہر کے لیے یہ لکھا ہے وہ ادنیٰ ذات کے لوگ ہوتے تھے۔ مورلینڈ کے مطابق خوط اس ہندو سردار کو کہتے ہیں جو سلطان کی رعیت ہوتا تھا۔ اسی طرح رائے اور رانا باج گزار ہوتے تھے جو خود مختار علاقوں پر حکومت کرتے تھے اور سلطان کو مقررہ باج ادا کرتے تھے، مگر خوط محض کارندے ہوتے تھے جو حکومت کے زیر انتظام علاقوں کے محاصل کے تعین اور وصول یابی میں مدد دیتے تھے۔

مسلم حکومت کے آغاز سے ہی مقدموں اور خوطوں کو بڑی مراعات حاصل تھیں اور وہ بڑے آرام و آسائش کی زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن علاءالدین خلجی نے ان مراعات کو واپس لے لیا کیونکہ یہ لوگ بغاوت کے وسائل جمع کرنے میں اپنی دولت کا استعمال کرتے تھے۔ سلطان غیاث الدین تغلق نے اپنے عہدیداروں کو ہدایت کی کہ وہ خود خوطوں اور مقدموں کی زبردست ذمے داری کے پیش نظر ان سے چرائی یا خراج کا مطالبہ نہ کریں۔ خوط ایک یا ایک سے زیادہ گاؤں کا زمیندار ہوتا تھا اور مقدم گاؤں کا مکھیا ہوتا تھا۔ پٹواری بھی ایک دیہی افسر تھا کیونکہ علاءالدین خلجی نے عاملوں اور متصرفوں کی دھوکا دھڑی کی تحقیق کے لیے پٹواریوں کے حساب کتاب کے کھاتوں کی چھان بین کی تھی اور انہیں سخت سزائیں دی تھیں۔ اس طرح ایک بنیادی یا ابتدائی قسم کا نظام گاؤں کی حد تک موجود تھا۔ عدل و انصاف سے متعلق صوبوں میں

سر گرمیاں مرکزی حکومت کے ڈھانچے کے مطابق تھیں۔ صوبوں میں قاضی اور صدر کی عدالتیں تھیں۔ کوتوال کا کام حالات اور نظم ونسق بنائے رکھنا تھا۔ دیہی سطح پر یعنی گاؤں میں دیوانی اور افراد سے متعلق معاملات کی سنوائی گرام سبھا کرتی تھی۔

13.10 ذرائع آمدورفت

سلاطین دہلی کو یہ احساس تھا کہ بغیر اچھے راستوں اور سڑکوں کے ملک پر اچھی طرح سے کنٹرول ممکن نہیں ہو سکتا اس لیے قطب الدین ایبک نے جن مقطیوں کا تقرر کیا تھا ان کا ایک فرض یہ بھی تھا کہ وہ سڑکوں کی حفاظت کریں۔ التتمش اور بلبن نے جنگلوں کو کاٹ کر سڑکیں بنائیں تاکہ اندرون ملک میں آمدورفت آسان ہو اور سرداروں کے لیے بغاوت کرنا مشکل ہو جائے۔ علاؤالدین خلجی نے سڑکوں کی حفاظت کے لیے پرزور تدابیر اختیار کی تھیں۔ غیاث الدین تغلق نے اسی حکمت عملی پر عمل کیا اور محمد بن تغلق کے عہد میں ابن بطوطہ کو ملک میں طویل سڑکوں کا جال بچھا ہوا ملا۔ دھار اور دہلی کے درمیان شاہراہ کا فاصلہ 24 دن کی مسافت تھا اور تمام راستے میں 'کروہ مینار' بنے ہوئے تھے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے دریا آمدورفت کا ایک اہم ذریعہ تھے۔ دریائی آمدورفت اور نقل وحمل کی حفاظت ایک دریائی پولیس کرتی تھی جو میر بحر کے ماتحت تھی۔ مسلمانوں کے آنے سے قبل شمال اور جنوب کے علاقے علاحدہ علاحدہ تھے۔ ان کے درمیان آمدورفت اور تجارت وغیرہ کا سلسلہ بہت کم تھا۔ بہت سے علاقوں میں علاءالدین خلجی کی فوجوں نے اکثر راستے پہلی مرتبہ طے کیے تھے لیکن اس کے بعد آمد ورفت کا سلسلہ برابر بڑھتا رہا۔ محمد بن تغلق کے عہد میں اس نے بہت ترقی کی۔

13.11 امن وامان

آمدورفت کے راستوں اور مواصلات کو ڈاکوؤں سے محفوظ رکھنا پڑتا تھا۔ ہندو سردار مسافروں اور تاجروں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ صوبوں کے حکام امن وامان قائم رکھنے کے ذمہ دار ہوتے تھے۔ فن حرب کے اعتبار سے اہم مقامات پر قلعے تعمیر کیے جاتے تھے اور وہاں کوتوالوں کو تعینات کیا جاتا تھا تاکہ وہ راستوں کی حفاظت کریں اور چوروں کو سزا دیں۔ بعد میں یہ کوتوال فوج دار کہے جانے لگے۔ دوسرے مقامات پر تھانے قائم کیے گئے جن میں فوجی سپاہیوں کی ٹکڑیاں ہوتی تھیں۔ امن قائم رکھنے کے لیے باغی قبائل کے درمیان جنگجو مسلمانوں کو بسایا جاتا تھا۔ مثلاً بلبن نے مسلمانوں کے لیے ایسی بستیاں ہندوؤں کے مستحکم علاقے کمپیل، پٹیالی اور بھوج پور میں بسائیں اور یہاں پر قلعے اور مسجدیں تعمیر کرائیں۔ اس کی وجہ سے مشرقی ہندوستان کو جانے والی سڑک فیروز شاہ کے عہد تک آمدورفت کے لیے محفوظ رہی۔ خسرو علاءالدین کے عہد کے متعلق خزائن الفتوح میں لکھتا ہے کہ ''وہی چور جو اس سے قبل دیہات کو آگ لگاتے تھے اب چراغ جلا کر شاہراہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ اگر کسی مسافر کا کوئی دھاگے کا ٹکڑا کھو جاتا ہے تو اس نواح کے باشندے یا تو اسے تلاش کر کے دیتے ہیں یا اس کی قیمت ادا کرتے ہیں۔'' خسرو کے الفاظ میں ''دریائے سندھ کے منبع سے لیکر ساحل بحر تک کوئی شخص چور، ٹھگ یا ڈاکو کا نام بھی نہیں سنتا تھا۔'' امن وامان کی یہ کیفیت قطب الدین مبارک شاہ کے ماتحت بھی بغیر کسی کوشش کے جاری رہی۔ محمد بن تغلق کے عہد میں امن وامان ضرور ختم ہو گیا تھا لیکن فیروز شاہ نے ایک بار پھر امن بحال کیا لیکن زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔ بعد کے ادوار میں شرقی سلطانوں اور سید اور لودھی

حکمرانوں نے امن وامان قائم کرنے کی کافی حد تک کامیاب کوششیں کیں تھیں، لیکن پورے شمالی ہند میں مکمل امن وامان شیر شاہ کے عہد میں جا کر ہی قائم ہوا۔

13.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

مرکزی نظام حکومت میں سب سے اہم سلطان ہوا کرتا تھا۔ وہ انتظامیہ کا محور، فوج کا سپہ سالار اور عدالتی معاملات میں منصف اعلیٰ ہوتا تھا۔ نظام حکومت کو بحسن وخوبی چلانے کے لیے سلطان کو بہت سے افسران مدد دیتے تھے، جن کو سلطان منتخب کرتا تھا۔ افسران جو سلطان کی مدد کیا کرتے تھے ان میں وزیر کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔

دہلی سلطنت کے نظم ونسق کو چلانے کے لیے دیوان وزارت، دیوان رسالت، دیوان عرض اور دیوان انشاء جیسے اہم محکمے قائم تھے۔ وزیر کا محکمہ دیوان وزارت کہلاتا تھا اس کا تعلق مالیات سے ہوتا تھا۔ محکمہ مالیات یا نظام مالگزاری کے تحت عشری اور خراجی زمینوں سے حکومتی آمدنی کا تعین، تشخیص اور اور وصولیابی کو انجام دیا جاتا تھا۔ دیوان رسالت کے ذریعہ مذہبی اور دینی امور انجام پاتے تھے۔ اس کا صدر صدرالصدور کہلاتا تھا۔ دیوان عرض کا سربراہ عارض ممالک ہوتا تھا۔ یہ فوجی معاملات کے نظم ونسق کا ذمہ دار تھا۔ دیوان انشاء خط وکتابت کا شعبہ تھا۔ خطوط اور پیغامات بھیجنے کا کام اسی کے تحت ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ سلطنت کے نظم ونسق کے لیے وکیل در، امر حاجب، برید خاص، برید ممالک، قاضی ممالک اور امیر داد نام کے عہدے یا شعبے بھی تھے۔ ڈاک، پولیس اور خفیہ نظام بھی تھا جس کی مدد سے حکومتی کام کاج کو بہتر طریقے سے انجام دیا جاتا تھا۔

اس اکائی کے مطالعے سے طلبا کو یہ معلوم ہوا کہ صوبائی حکومت، مرکزی حکومت کا حصہ ہوتی تھی۔ صوبے کا حاکم یا مقطی سلطان کا نمائندہ اور صوبائی حکومت کا سربراہ ہوتا تھا۔ صوبائی شعبہ جات، مرکزی شعبوں یا محکموں کی نقل ہوتے تھے۔ صوبائی محکموں کی نگرانی عموماً دارالحکومت سے کی جاتی تھی، مگر دور دراز کے صوبے یا وہ صوبے جہاں مشکلات پیش آتی تھیں وہ اپنے محکموں کا انتظام خود کرتے تھے۔ مقامی حکومت کی اکائی دیہات یا گاؤں ہوتا تھا جس میں ایک مکھیا (مقدم) اور ایک جمع خرچ لکھنے والا (پٹواری) ہوتا تھا۔ دیہات کو ملا کر پرگنے بنتے تھے اور پرگنوں کو ملا کر شقیں بنتی تھیں۔ مقامی نظم ونسق زیادہ تر مقامی لوگوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ فوجی اہمیت کے مراکز پر محافظ فوجیں متعین کر کے اور جنگجو مسلم سپاہیوں کی نوآبادیاں بسا کر امن وامان قائم رکھا جاتا تھا۔

13.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

وزیر تفویض : ایسا وزیر جسے اپنا جانشین مقرر کرنے کے علاوہ لامحدود اختیارات حاصل ہوں۔

وزیر تفیذ : ایسا وزیر جو صرف سلطان کے احکام کی تعمیل کا ذمہ دار ہے۔

مشرف ممالک : پوری سلطنت کا محاسب (اکاؤنٹنٹ جنرل)

مستوفی ممالک	:	حسابات کی جانچ پڑتال کرنے والا افسر (آڈیٹر جنرل)
دیوان وقوف	:	خرچ کے کاغذات کو تیار کرنے والا شعبہ
دیوان مستخرج	:	وصول کیے گئے اضافی محصول کی دیکھ بھال کرنے والا شعبہ
دیوان امیر کوہی	:	نظام مال گزاری اور زراعت کی ترقی سے متعلق شعبہ
عارض ممالک	:	فوج کی بھرتی، سپاہیوں کے معائنے، تنخواہ کی ادائیگی اور محکمہ رسد کا ذمہ دار ہوتا تھا۔
دبیر	:	منشی
مساحت	:	زمین کی پیائش
والی/مقطی	:	صوبے دار یا گورنر، صوبے کے فوجی اور انتظامی معاملات ان کے اختیارات میں ہوتے تھے۔
اقطاع	:	قابل منتقلی زمینی مالگذاری کا عطیہ جو موروثی یا مستقل نہیں ہوتا تھا۔
اقطاع تملیک	:	مزروعہ یا غیر مزروعہ یا پھر کانوں والی زمین
اقطاع استغلال	:	وظیفوں یا بھتوں سے متعلق زمین جس کی آمدنی ان کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔
متصرف	:	محاصل وصول کرنے والا۔ برنی نے متصرف کو عامل کہا ہے۔
مشرف	:	فصلوں کا معائنہ کرنے والا عہدیدار
برید	:	اطلاع وخبر دینے والا
پٹواری	:	قدیم ہندوستان میں اسے گوپ کہا جاتا تھا۔ گاؤں کی زمین کا حساب کتاب رکھنے والا۔
الاغ	:	تیز رفتار دوڑنے والے ہرکاروں یا دھاووں کی ڈاک
بلاہر	:	چھوٹے اور نچلے درجے کے کسان
چودھری	:	100 گاؤں یا پرگنے کا پرمکھ
خوط	:	گاؤں کا مقامی افسر۔ مال گزاری وصول کرنے والا
مقدم	:	مکھیا، گاؤں کا پردھان

13.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

13.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. قانوناً دہلی سلطنت (Delhi Sultanate) کس کا ایک حصہ تھی؟

(a) خلافتِ عباسیہ (Abbasid Caliphate)　　(b) خلافتِ عثمانیہ (Ottoman Caliphate)

(c) سلطنتِ فارس (Persian Empire)　　(d) منگول سلطنت (Mongol Empire)

2. خطبہ (Khutba) اور سکے (Coins) کس چیز کا مظہر سمجھے جاتے تھے؟

(a) مذہبی عقیدے کا (b) سلطان کی خود مختاری کا (c) فوجی طاقت کا (d) معاشی خوش حالی کا

3. مسلم سیاسی مفکرین کے مطابق کتنے قسم کے وزیر (Wazir) ہوتے تھے؟

(a) دو (b) تین (c) چار (d) پانچ

4. دیوانِ رسالت (Diwan-i-Risalat) کے ذریعے کون سے امور انجام پاتے تھے؟

(a) فوجی امور (b) مذہبی اور عدالتی امور (c) مالی امور (d) ڈاک اور مواصلات

5. علاؤالدین خلجی (Alauddin Khalji) نے بازاروں پر نگاہ رکھنے کے لیے کسے مقرر کیا؟

(a) کوتوال (b) محتسب (c) شاہنہ منڈی (d) امیرِ حاجب

13.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. سلطان کے مرتبہ اور اختیارات کو متعین کیجیے۔
2. دیوان رسالت پر ایک مختصر اَنوٹ لکھیں۔
3. دیران عرض سے کیا مراد ہے؟ اس کے دائرہ کار متعین کیجیے۔
4. مال غنیمت پر ایک مختصر نوٹ لکھیں۔

13.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. وزیروں کے محکموں پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. سلطان کے مرتبے اور اس کے اختیارات پر ایک تفصیلی مضمون تحریر کیجیے۔

Answer Key:
1. (a) | 2. (b) | 3. (a) | 4. (b) | 5. (c)

اکائی 14۔ معیشت: زرعی معیشت، مالگزاری، تجارت اور کاروبار

(Economy: Agricultural Economy, Taxation, Trade and Commerce)

اکائی کے اجزا

14.0		تمہید
14.1		مقاصد
14.2		معیشت
	14.2.1	زرعی معیشت
	14.2.2	نظام محصول
	14.2.3	غیر زرعی پیداوار
	14.2.4	کپڑے کی صنعت
	14.2.5	دھات کا کام
	14.2.6	عمارتی صنعت
	14.2.7	دوسرے حرفے
14.3		تجارت اور کاروبار
	14.3.1	اندرونی تجارت
	14.3.2	غیر ملکی تجارت
	14.3.3	تاجر اور سرمایہ کار طبقہ
14.4		اکتسابی نتائج
14.5		کلیدی الفاظ
14.6		نمونہ امتحانی سوالات

14.0 تمہید (Introduction)

ہندوستان کی معاشی تاریخ میں دہلی سلطنت کا قیام، استقرار یا جمود کی جگہ ایک واضح تبدیلی اور ارتقا کا دور ہے۔ زیرِ نظر عہد سے قبل، شمالی ہندوستان میں ایسا دور گزر چکا تھا جس میں شہروں اور دور دراز کے علاقوں سے تجارت میں نمایاں کمی واقع ہوئی تھی۔ سونے کے سکے تقریباً ناپید ہو چکے تھے اور چاندی کی کرنسی میں بھی ملاوٹ اور انحطاط نظر آتا تھا۔ تاہم، جدید دور کے معروف تاریخ داں پروفیسر محمد حبیب کے مطابق، ترک سلطانوں کی حکومت نے ہندوستانی سوسائٹی اور معاشی زندگی میں دور رس تبدیلیوں کی راہیں کھولیں۔ ان کے نزدیک ترک سلطنت نے ایک ایسی نئی معاشی تنظیم کو جنم دیا جو اپنے سے قبل کی تنظیم سے بدرجہا بہتر اور اعلیٰ تھی۔ اس دور میں زرعی رشتوں اور نظامِ محاصل (Taxation) میں بنیادی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ کسان جو پہلے راجپوتوں اور مقامی سرداروں کو لگان دیتا تھا، اب براہِ راست سلطنت کے اہلکاروں کو خراج ادا کرنے لگا۔ اس مستحکم نظام نے ایک طرف تو زرعی فواضل (Agrarian Surplus) کو مرکز تک پہنچایا اور دوسری طرف شہروں کے پھیلاؤ (جسے پروفیسر حبیب 'شہری انقلاب' یا Urban Revolution کا نام دیتے ہیں) کے مواقع پیدا کیے۔ اس اکائی میں ہم دہلی سلطنت کی زرعی معیشت، خراج و دیگر محاصل کے ڈھانچے، اور نئی تکنیکی ایجادات (جیسے رہٹ اور چرخہ) کے معیشت پر اثرات کا جائزہ لیں گے۔ اس کے علاوہ، ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ کس طرح نقد کرنسی (ٹنکہ اور جیتل) کے رواج اور مستحکم ریاستی سرپرستی نے داخلی و خارجی تجارت اور شہری دستکاریوں کو ایک نئی زندگی بخشی۔

14.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- دہلی سلطنت کے مجموعی معاشی اور اقتصادی حالات کا باریک بینی سے جائزہ لے سکیں گے۔
- زراعت، دیہی معیشت میں تجارتی فصلوں کی اہمیت اور دیہی صنعت و حرفت کے ارتقا کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- خلجی اور تغلق سلاطین کے دور میں متعارف ہونے والے نظامِ محصول اور ان کی زرعی اصلاحات کی وضاحت کر سکیں گے۔
- غیر زرعی پیداوار، خاص طور پر کپڑے کی صنعت، نئی ایجادات (جیسے چرخہ) اور تعمیراتی ترقی کے معاشی اثرات بیان کر سکیں گے۔
- ملکی و غیر ملکی تجارت کے خدوخال اور اس میں تاجروں اور سرمایہ کار طبقے (جیسے ملتانیوں اور ساہاؤں) کے کردار پر تبصرہ کر سکیں گے۔

14.2 معیشت (Economy)

14.2.1 زرعی معیشت

دہلی سلطنت کی دیہی معیشت اس سلطنت کا بنیادی ستون تھی۔ اگرچہ گاؤں کی سطح پر زراعت کے بنیادی طریقے زیادہ تر روایتی ہی رہے، لیکن اس دور میں زرعی پیداوار کے حجم، تجارتی (نقد آور) فصلوں کے رجحان اور ریاستی سرپرستی میں بننے والے آبپاشی کے نظام میں نمایاں توسیع دیکھنے میں آئی۔ تاریخی حوالوں، خاص طور پر ابن بطوطہ کے سفر نامے 'کتاب الرحلہ' اور ضیاء الدین برنی اور شمس سراج عفیف

جیسے مورخین کی تحریروں کی روشنی میں، ہم اس دور کے زرعی منظر نامے کی ایک جامع تصویر کھینچ سکتے ہیں۔

زمین کی زرخیزی اور فصلوں کی ترتیب

ہندوستانی زمین کی زرخیزی پر ابن بطوطہ کی حیرت بالکل بجا تھی۔ زرعی نظام، مانسون کی بارشوں کے ساتھ گہرائی سے جڑا ہوا تھا، جس کی وجہ سے کسان باقاعدگی سے دو بڑی فصلیں حاصل کرتے تھے: خریف (برسات کی فصل) اور ربیع (سردیوں کی فصل)۔ خاص طور پر زرخیز اور بہتر آبپاشی والی ندیوں کی وادیوں میں ایک تیسری درمیانی فصل، جسے 'زاید' کہا جاتا ہے، بھی کاشت کی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ابن بطوطہ نے سال میں تین بار چاول کی فصل حاصل کرنے کا ذکر کیا ہے۔ فصلوں کی جغرافیائی تقسیم بہت واضح اور مخصوص تھی۔ مرطوب اور پانی سے مالا مال مشرقی اور جنوبی علاقے (جیسے بنگال اور دکن کے حصے) چاول اور گنے کی پیداوار کے اہم مراکز تھے۔ اس کے برعکس، خشک اور قدرے ٹھنڈے شمالی میدانوں میں گیہوں، جو، سرسوں اور چنے کا غلبہ تھا۔ یہ اضافی زرعی پیداوار سلطنت کے بڑھتے ہوئے شہری مراکز اور فوجی چھاؤنیوں کی غذائی ضروریات پوری کرنے کے لیے انتہائی اہم تھی۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے، چودھویں صدی کا زرعی منظر نامہ آج کے دور سے ایک خاص لحاظ سے بالکل مختلف تھا: اس میں "نئی دنیا" (امریکہ) کی فصلوں کا مکمل فقدان تھا۔ جدید ہندوستانی خوراک کے اہم اجزاء جیسے آلو، ٹماٹر، مکئی، لال مرچ اور تمباکو سے اس وقت کے لوگ بالکل ناواقف تھے۔ سلطنت دور کے کھانوں میں تیزی اور مصالحے کا ذائقہ لال مرچ کے بجائے کالی مرچ، ادرک اور پیپلی (Long pepper) سے حاصل کیا جاتا تھا۔

تجارتی زراعت اور دیہی صنعتوں کا عروج

سلطنت کا دور محض گزارے کی کھیتی باڑی تک محدود نہیں تھا؛ بلکہ تجارتی یا نقد آور فصلوں پر بہت زور دیا گیا جس نے مقامی دیہی صنعتوں کو زبردست فروغ دیا۔ اس دور میں چرخے اور روئی دھنکنے والی کمان کا وسیع استعمال شروع ہوا، جس نے کپڑے سازی (ٹیکسٹائل) کی صنعت میں انقلاب برپا کر دیا۔ بڑے رقبے پر کپاس کاشت کی جاتی تھی، جو سوت کاتنے اور کپڑا بننے کی ان بڑی صنعتوں کو خام مال فراہم کرتی تھی جنہوں نے ہندوستانی کپڑے کو دنیا بھر میں مشہور کیا۔ گنے کی وسیع کاشت سے مقامی کولہو چلتے تھے جن سے گڑ اور دیسی چینی تیار کی جاتی تھی۔ تیل کے بیجوں جیسے تل اور سرسوں کو جانوروں سے چلنے والے روایتی کولہو (گھانی) میں پیرا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ، خاص طور پر بیانہ اور گجرات کے علاقوں میں نیل کی کاشت بہت منافع بخش بن گئی تھی۔ ملکی سطح پر کپڑے رنگنے کے لیے اور مشرق وسطیٰ کو برآمد کرنے کے لیے نیل کی زبردست مانگ تھی۔

تغلق دور کی زرعی اصلاحات

چودھویں صدی، خاص طور پر تغلق خاندان کے دور میں، زرعی محاصل وصول کرنے کے روایتی طریقے سے ہٹ کر زراعت میں ریاست کی براہ راست اور فعال مداخلت کا آغاز ہوا۔ محمد بن تغلق نے یہ محسوس کیا کہ محصولات کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کے لیے قابلِ کاشت رقبے میں اضافہ انتہائی ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے اس نے 'دیوانِ امیر کوہی' کے نام سے زراعت کا ایک الگ محکمہ قائم کیا۔

ریاست نے کسانوں کو بیج خریدنے، کنویں کھودنے اور کاشت بڑھانے کے لیے بڑے پیمانے پر زرعی قرضے فراہم کیے جنہیں 'سوندھر یا تقاوی' کہا جاتا تھا۔ اس نے فصلوں کی باری باری کاشت (Crop rotation) کو نافذ کرنے اور کم تر فصلوں کی جگہ اعلیٰ درجے کی نقدی فصلیں (جیسے گنا اور گیہوں) بونے کی بھی کوشش کی، حالانکہ اس کے یہ طویل المدتی منصوبے اہلکاروں کی بدعنوانی اور ناتجربہ کاری کے باعث زیادہ تر ناکام رہے۔ فیروز شاہ تغلق نے بنیادی ڈھانچے کی ترقی پر زیادہ توجہ دی، جس کی وجہ سے آج کے ہریانہ جیسے علاقوں میں زراعت کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ صرف بارش پر منحصر زراعت غیر یقینی ہوتی ہے، اس نے عہد وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ کا سب سے بڑا نہری منصوبہ شروع کیا۔ اس نے دریائے جمنا اور ستلج سے پانی نکال کر بڑی نہروں کا ایک جال بچھایا، جن میں 'الغ خانی' اور 'رجب واہ' سب سے مشہور ہیں۔ ان نہروں نے حصارِ فیروزہ اور سرسا کے خشک علاقوں کو سیراب کر دیا، جس سے تقریباً 160 میل کا رقبہ زیرِ کاشت آ گیا اور کسانوں کو ان علاقوں میں گیہوں اور گنے جیسی پانی مانگنے والی فصلیں اگانے کا موقع ملا جہاں پہلے صرف موٹا اناج پیدا ہوتا تھا۔ اس سہولت کے بدلے فیروز شاہ نے آبپاشی والی زمینوں کی پیداوار پر 10 فیصد کی شرح سے پانی کا ٹیکس (حقِ شرب) نافذ کیا۔ مزید برآں، اس نے دہلی کے ارد گرد 1,200 پھلوں کے باغات لگوائے، جس سے نہ صرف انگور اور سیب جیسے پھلوں کی قیمتوں میں نمایاں کمی آئی بلکہ شاہی خزانے کو بھی ایک بڑی اور مستقل آمدنی حاصل ہونے لگی۔

14.2.2 نظام محصول

شمالی ہندوستان میں ترکوں کی آمد سے پہلے زرعی پالیسیوں اور عملی صورت حال کی معلومات ہمارے پاس بہت کم ہیں۔ فصلیں اگانے والوں کو بہت سے محصول یا چنگیاں جیسے 'بھاگ' بھوگ (محصول) اور 'کر' (غیر معمولی محصول) ادا کرنے ہوتے تھے لیکن فصل کا کتنا حصہ اس طرح نکل جاتا تھا۔ انفرادی یا اجتماعی طور پر نہ اس کا کوئی تخمینہ لگایا جا سکتا ہے نہ یہ کہ اس کا کتنا حصہ حکمراں کو پہنچتا تھا اور کتنا اس کے ماتحت کارندوں اور زمیندار رؤسا کو۔ دھرم شاستروں کے مطابق پیداوار میں سے روایتی طور پر صرف چھٹا حصہ (6/1) دینا ہوتا تھا لیکن جنوبی ہندوستان میں ایسے حکمرانوں کا ذکر بھی موجود ہے جو پیداوار کا تیسرا حصہ (3/1) یا دو تہائی (3/2) تک طلب کرتے تھے۔ چول خاندان کے ایک ایسے بادشاہ کا ذکر بھی ملتا ہے جس نے اپنے جاگیرداروں کو پیداوار کا آدھا حصہ جمع کر لینے کی اجازت دے دی تھی۔ بہر حال، عملی صورت یہ تھی کہ محصول کی مانگ اس بات پر منحصر تھی کہ کسان کو کتنا ادا کرنے پر مجبور کیا جا سکتا تھا۔

تیرھویں صدی میں بھی دیہی سماج کے ڈھانچے میں مشکل سے ہی کوئی تبدیلی رونما ہوئی تھی اور چونکہ شروع دور کے ترک سلاطین محصول وصولی کے لیے ہندو سرداروں پر ہی منحصر تھے اس لیے انہوں نے اس کی وصولی کا کام اس وقت کے موجودہ طریقوں کے مطابق انہیں پر چھوڑ دیا تھا لیکن اس سے بھی اس محصول کی شرح کا اندازہ نہیں ہو سکتا جو حقیقت میں اس وقت کسانوں سے طلب کیا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں ترکی حکمراں طبقے کی عام طرز فکر کو برنی نے لگ بھگ سو سال کے بعد بیان کیا تھا۔ اس کے مطابق بلبن نے بغراخاں کو اتنا زیادہ محصول (خراج) وصول نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا کہ جو کسان کو مفلسی کی حد تک پہنچا دے اور اتنا کم بھی نہ وصول کرنا چاہیے کہ ان کے پاس ضرورت سے زیادہ پیسہ ہو جائے اور وہ باغی ہو جائیں۔ اسے کس طرح عاید کیا گیا تھا یا یہ کس طرح عمل میں آتا تھا اس کا کوئی علم نہیں ہے۔ عام

طور پر اس کو اس نقطہ نظر سے عاید کیا جاتا تھا کہ اس سے اس وقت کے موجود دیہی ڈھانچے میں مداخلت نہ ہو۔

جیسا کہ ہم اس سے پہلے ابواب میں دیکھ چکے ہیں چودھویں صدی میں کئی نئی چیزیں ابھریں۔ علاؤالدین خلجی نے محصول کی مانگ اوپری دوآب کے علاقوں میں علی گڑھ تک اور راجستھان اور مالوا میں پیداوار کے نصف کی حد تک بڑھادی۔ اسی علاقے کو 'خالصہ' قرار دے دیا گیا تھا جس کا مطلب تھا کہ اس کا محصول براہِ راست شاہی خزانے میں پہنچتا تھا۔ محصول کی مانگ ہر کسان کی مزروعہ زمین کے رقبہ کی بنیاد پر مقرر کی جاسکتی تھی۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی تھی کہ دہلی کو چھوڑ کر، باقی علاقوں کے کسانوں کو نقد محصول دینے کی ترغیب دی جاتی تھی۔ علاؤالدین نے بھی اس بات کو یقین بنانے کی کوشش کی کہ کسان اپنی کھڑی فصلوں کو ہی بنجاروں کو بیچ میں اور انہیں اپنے کھیتوں یا گوداموں میں نہ لے جائیں تاکہ ان کی زیادہ بہتر قیمت حاصل کرنے کی امید میں ذخیرہ اندوزی نہ کی جائے۔ بہر حال، عمل میں اس طریقہ کار میں ترمیم کرنی ضروری ہوگئی کیونکہ یہ ذکر بھی ملتا ہے کہ بہت سے کسان خود اپنا غلہ بیچنے کے لیے مقامی منڈیوں میں لے آتے تھے مگر ظاہر ہے یہ دولت مند کاشتکار ہوں گے۔

علاؤالدین کے اپنائے ہوئے زرعی طریقہ کار دیہی معاملات میں زبردست مداخلت کے مترادف تھے۔ ان طریقوں سے وہ دیہات کے ترجیح یافتہ طبقے 'خوط، مقدم اور چودھریوں' اور کچھ حد تک ان دولت مند کسانوں کے حقوق کے خلاف عمل کرنے کی کوشش کر رہا تھا، جن کے پاس ان کی اپنی ضرورت سے زیادہ غلہ بازار میں بیچنے کے لیے موجود تھا۔

'خوط' اور مقدموں کے سلسلے میں یہ شبہ تھا کہ وہ اپنے اوپر عائد ہونے والے محصولوں کا بوجھ کمزور طبقے پر منتقل کر دیتے تھے اور گھر ہی اور چرائی محصول ادا نہیں کرتے تھے۔ برنی کے دلفریب بیان کے مطابق خوط اور مقدم اتنے غریب ہو گئے تھے کہ وہ نہ قیمتی لباس پہن سکتے تھے نہ عربی اور عراقی گھوڑوں پر سوار ہو سکتے تھے اور ان کی عورتوں کو مسلمانوں کے گھروں میں کام کرنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔ برنی بہر حال مبالغے سے کام لیتا ہے لیکن خوطوں اور مقدموں کے یا زمین مالک اعلیٰ طبقے کے تمام حقوق اور آسانیاں جو انھیں باپ دادا سے ملتی چلی آرہی تھیں انہیں یکسر سلب کر لینے کی کوشش اور عالموں کی ایک پوری فوج مقرر کر ہے۔ جن میں زیادہ تر رشوت خور اور بے ایمان ثابت ہوئے۔ بہر طور ان تمام کوششوں کو ناکام ہی ہونا تھا۔

بتایا جاتا ہے کہ علاوالدین کے عاید کردہ محصول کے سلسلے کے تمام اقدام اس کی موت کے ساتھ ہی خود بخود ختم ہو گئے۔ مگر یہ معلومات موجود نہیں کہ اس سے پیائش کا پورا نظام یا دوآب کے علاقوں میں خالصہ کی نصف پیداوار محصول میں لے لینے کا طریقہ بھی ختم ہو گیا۔ خوط اور مقدموں کے حقوق اور آسانیوں کی بحالی کا مطلب تھا کہ حکومت اب مزروعہ زمین کی بنیاد۔ یعنی ہر کسان کے زیر کاشت علاقے کی پیائش پر محصول مقرر نہیں کرتی تھی، بلکہ اب یہ پورے علاقے سے ایک بالمقطعی (کل ملی جلی) رقم وصول کرتی تھی اور انفرادی محصول کا تخمینہ محصولے کا کام مقدموں اور خوطوں کا ہی تھا۔ اس طرح یہ دیہی علاقوں میں مقدموں اور خوطوں کے معاشی اور سماجی اقتدار کی تصدیق بھی تھی۔

غیاث الدین تغلق نے پیائش کے نظام کو بدل کر خالصہ علاقوں کی پیداوار میں شرکت کا مکمل اقدام کیا۔ اسے کسانوں کی بہتری کا اقدام مانا گیا کیونکہ پیائش کے طریقے میں فصل اگانے میں آخر تک جو خدشات رہتے ہیں ان کا زیادہ بڑا حصہ کسان کو ہی برداشت کرنا ہوتا تھا لیکن حصہ داری یا بٹائی میں فائدہ اور نقصان، دونوں میں کاشتکار اور حکومت دونوں شریک ہوتے تھے۔ غیاث الدین نے ایک اور اہم اقدام بھی کیا۔ ان علاقوں میں جہاں اقطاع رکھنے والے لوگ تھے، یعنی خالصہ کے علاوہ علاقے، اس نے ان کے متعلق حکم جاری کیا کہ ان پر محصول محض تخمینے یا یکمشت حساب کر کے نہ بڑھا دیا جائے، ''بلکہ بتدریج اور آہستہ آہستہ بڑھایا جائے کیونکہ یکمشت اضافے سے دیہات تباہ ہو جائیں گے اور خوشحالی میں رکاوٹ پیدا ہو گی''۔ برنی نے ان معتدل انداز کے اضافوں کی پالیسی کو اس طرح بیان کیا ہے کہ اقطاع والے علاقوں سے محصول کی مانگ ''دس یا گیارہ میں ایک'' کی شرح سے نہیں بڑھائی جانی چاہیے۔ اس جملے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اضافہ ایک بٹا دس (10/1) یا ایک بٹا گیارہ (11/1) ہو سکتا ہے۔ نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ محصول دسواں حصہ ہو، یا جیسا کہ کچھ نئے مورخوں نے فرض کر لیا ہے ،(اسلامی) بنیادی تصور کے مطابق کم سے کم پانچواں حصہ ہو۔ برنی نے محصول کے پیمانے یا شرح کا کہیں ذکر نہیں کیا نہ دوآب کے خالصہ علاقوں کے سلسلے میں نہ اقطاع کے بارے میں۔ شاید خالصہ سے باہر کے علاقوں میں محصول کی مانگ وہی سابقہ یعنی ایک تہائی رہی تھی۔

محمد بن تغلق نے علاء الدین کے نظام کو پھر عاید کرنے کی کوشش کی اور اسے اپنی پوری سلطنت میں پھیلانا چاہا، لیکن اس کے اقدامات نے دوآب کے علاقے میں ایک زبردست قسم کی کسان شورش کھڑی کر دی۔ اس کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ انفرادی طور پر محصول کا تخمینہ محصول ے میں، پیائش کے وقت حقیقی پیداوار کی بجائے پہلے سے طے شدہ (غیر حقیقی) پیداوار کو اپنایا گیا۔ مزید براں پیداوار کو نقد رقم میں تبدیل کرتے وقت بھی حقیقی قیمتوں کی بجائے سرکار کی طرف سے طے کردہ قیمت اپنائی گئی۔ مویشیوں اور گھروں پر محصول محصول ے کے سلسلے میں بھی سختی برتی گئی۔ اس طرح حقیقی محصول یا محصول کی مانگ کافی بڑھ گئی یعنی نصف یا اس سے بھی زیادہ۔

علاء الدین خلجی کی زرعی اصلاحات کی طرح محمد بن تغلق کے اقدامات کو اس مقصد کے پیش نظر تیار کیا گیا تھا کہ دیہی علاقوں میں متمول طبقے، خاص طور پر خوط اور مقدم کو ملے حقوق و سہولیات میں کچھ تخفیف کی جا سکے۔ مگر اس کے اقدامات سے اوسط کسان کو بھی پریشانی ہوئی۔ فی الحقیقت دوآب کے علاقے میں اس کے خلاف کافی سخت بغاوت کی یہی وجہ تھی۔

محمد بن تغلق نے اس کے بعد بالکل مختلف یا مخالف سمت میں اقدامات کرنے کی کوشش کی۔ دوآب جو براہ راست حکومت کے زیر انتظام (خالصہ) علاقہ تھا، یہاں اس نے فصلوں کے پرانے طریقے کو بدل کر انہیں بہتر کرنے کی کوشش کی اور نچلے درجے کی فصلوں کے بدلے اعلیٰ درجے کی فصلیں اگانے کی ترغیب دی۔ اس سلسلے میں جو سب سے اہم ترغیب دی گئی وہ کنوؤں وغیرہ کے لیے قرض دیا جانا تھا۔ یہ پالیسی صرف متمول اور رئیس قسم کے کسانوں اور خوطوں اور مقدموں کے تعاون سے ہی کامیاب ہو سکتی تھے کیونکہ انہیں کے پاس سب سے بڑے زمین کے قطعے اور دوسرے ذرائع موجود تھے۔ مگر یہ قدم بھی ناکام ہوا کیونکہ اس کام کے لیے جو افسر مقرر کیے گئے وہ ان علاقائی کیفیات سے ناواقف تھے اور وہ صرف خود پروری اور زیادہ سے زیادہ خود کمانے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ فیروز کو ہریانہ میں کسانوں کو نہروں کا نظام فراہم کر کے، اس پر دس فیصدی کا غیر معمولی محصول بڑھا کر اور فصلوں کا چناؤ خود کاشتکار پر چھوڑ کر زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔

مجموعی طور پر اندازہ یہی ہوتا ہے سلطانوں کے عہد، خصوصاً چودھویں صدی میں محصول خاصہ زیادہ تھا اور نصف کے آس پاس رہتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ پرانے بلیوں۔ رائے، رادت، خوط اور مقدم وغیرہ کے حقوق و سہولیات کو متواتر گھٹاتے رہنے کی کوشش بھی اس میں واضح طور پر موجود تھی۔ پہلی بار اتنی بڑی مقدار میں محصول کا تخمینہ لگایا گیا تھا اور میں اتنے وسیع اور زرخیز علاقے سے کئی عشروں تک جمع کیا جاتا رہا تھا۔ اس کے لیے جو انتظامی طریقے اپنائے گئے ان سے اور اتنی بڑی آمدنی کے ذرائع کو ایک مرکزیت مل جانے اور اس کے حکمراں طبقے کے ہاتھوں میں آجانے سے جو اثرات پیدا ہوئے ان کے نتائج دیہی زندگی اور شہری صناعوں، کاریگروں، تجارت اور کاروبار، سب پر بہت اہم تھے۔

فیروز تغلق کے زمانے کو عام طور پر دیہی خوشحالی کا دور مانا جاتا ہے۔ برنی اور عفیف کا کہنا ہے کہ سلطان کے احکامات کے نتیجے میں صوبوں میں زراعت بڑھی اور جتائی بوائی کو اتنا فروغ ہوا کہ دوآب میں کوئی گاؤں غیر مزروعہ نہیں رہا۔ ہریانہ میں نہری نظام سے جتائی بڑھی۔ عفیف کے مطابق ''رعیت (کسانوں) کے گھروں میں اتنا غلہ، دولت، گھوڑے اور ساز و سامان جمع ہو گیا کہ اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔'' کوئی کسان عورت ایسی نہیں تھی جس کے پاس زیور نہ ہو اور ''ہر کاشتکار کے گھر میں بہت اچھی چارپائیاں اور ان پر صاف دھلی چادریں، بہت سا ساز و سامان اور دولت'' موجود تھی۔ ظاہر ہے یہ صورتِ حال عام طور پر زیادہ بڑے اور رئیس قسم کے کسانوں اور دیہات کے اونچے طبقے خوط مقدم وغیرہ سے تعلق رکھتی تھی۔ اس طرح دیہی سماج میں غیر برابری اور فرق متواتر باقی رہا اور دیہات کی زائد پیداوار شاہی پالیسی کے تحت دیہات سے باہر نکلتی رہی۔ بہر حال، دیہات کی معاشی کیفیت میں بہتری پیدا کرنے کی کوششوں میں کسی حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی تھی لیکن اس کے زیادہ بڑے حصے سے عام طور پر دیہات کے اوپری طبقے اور حقوق یافتہ افراد ہی مستفید ہوئے تھے۔

14.2.3 غیر زرعی پیداوار

سلطنت دور میں ملک کے معاشی ذرائع کا کوئی تفصیلی ذکر موجود نہیں ہے اور جو کچھ ہے اس میں ابوالفضل کی آئین اکبری میں دیے ہوئے بیانات بھی شامل کرنے ضروری ہیں، جو سولہویں صدی کے آخری حصے میں تحریر میں آئے تھے۔ مختصراً مصنوعات میں سب سے اہم کپڑا، دھات کی مصنوعات، عمارتی کام اور کچھ اور ضمنی کام، جیسے چمڑے کا کام، کاغذ سازی، کھلونے بنانا وغیرہ شامل تھے۔

14.2.4 کپڑے کی صنعت

کپڑے کی صنعت ہندوستان کی سب سے بڑی صنعت رہی ہے اور پرانے وقتوں سے چلی آرہی ہے۔ اس میں سوتی کپڑا، اونی اور ریشم ہر طرح کا کپڑا شامل تھا۔ سوتی کپڑے کو بھی دو قسم کے کپڑوں میں بانٹا جا سکتا ہے، موٹا (کمین) اور عمدہ قسم کا (مہین)۔ موٹا یا گھٹیا قسم کا کپڑا 'پاٹ' کہلاتا تھا اور اسے غریب لوگ اور فقراء پہنتے تھے۔ ظاہر ہے یہ دیہات میں گھروں میں ہی بنا جاتا تھا لیکن کچھ علاقوں میں باقاعدہ طور پر بھی تیار کیا جاتا تھا جیسے اودھ میں، اور وہاں سے دہلی لایا جاتا تھا۔ کچھ بہتر قسم کا سوتی کپڑا، سادا کپڑا (کرپاس) کہلاتا تھا اور یہی عام طور پر استعمال میں آتا تھا۔ عمدہ قسم کا کپڑا ململ یا تن زیب ہوتا تھا جو بنگال میں سلہت اور ڈھاکہ میں اور دکن میں دیوگیری میں بنتا تھا۔ یہ اتنا باریک، ایسا نفیس اور

اتنا قیمتی ہوتا تھا کہ اسے صرف رؤسا اور دربار کے امراء ہی پہنتے تھے۔ گجرات میں بھی کئی طرح کا نفیس سوتی کپڑا تیار ہوتا تھا۔ باربوسا نے لکھا ہے کہ کیمبے (کھم بایت) ہر قسم کے گھٹیا اور نفیس سوتی کپڑے کی پیداوار کا مرکز تھا اور اس کے علاوہ کچھ سستی قسم کی مخمل، ساٹن، ٹافٹا (ریشمی کپڑا) اور دبیر دری بھی تیار ہوتے تھے۔

مختلف قسم کے کپڑوں کی رنگائی اور چھپائی ہوتی تھی اور چھپائی میں لکڑی کے بوٹے استعمال کیے جاتے تھے۔ اس لیے چودھویں صدی کے صوفی ہندی شاعر ملا داؤد نے چھپے (کھنڈ چاپ) کپڑے کا ذکر کیا ہے۔ کپڑے کی تیاری کے علاوہ دوسری مختلف مصنوعات، جیسے دری، جانمازیں، غلاف، دریاں، نواڑ وغیرہ بھی گجرات کے دوسرے حصوں میں تیار کی جاتی تھیں۔

اس دور میں کپڑے کی صنعت میں چرخے کی آمد سے بھی بہتری ہوئی تھی۔ جدید دور کے ایک مورخ، عرفان حبیب کے مطابق چرنے کی موجودگی کی تصدیق ایران کے بارہویں صدی کے متعدد معروف شعراء کے کلام سے ہو جاتی ہے۔ ہندوستان میں اس کا سب سے پہلا حوالہ چودھویں صدی کے وسط میں ملتا ہے۔ اس طرح یہ ترکوں کے ساتھ ہندوستان آیا ہو گا اور چودھویں صدی کے وسط تک عام استعمال میں آنے لگا ہو گا۔ بتایا جاتا ہے کہ سب سے سیدھے سادے چوٹے سے کاتنے والے کی پیداواری صلاحیت ہاتھ کی تکلی سے سوت کاتنے والے کے مقابلے میں چھ گنا بڑھ گئی۔ ایک اور اوزار جس کا اس عرصے میں استعمال شروع ہوا وہ دھنیے کی کمان یا دھنگی تھی جس سے بنولوں سے روئی کو چھڑانے کا کام کافی تیزی سے ہونے لگا۔

ریشم بنگال سے درآمد کیا جاتا تھا جہاں ریشم کے کیڑے پالے جاتے تھے۔ بہر طور ریشم کے دھاگے کی زیادہ مقدار میں سپلائی، جس میں کچا ریشم بھی شامل تھا ایران اور افغانستان سے ہوتی تھی۔ ریشمی، اور سوت اور ریشم کے ملے جلے کپڑے کی مانگ دہلی اور اس کے قرب و جوار میں بہت تھی۔ کھمبایت کا ریشم کپڑے کی اُن قیمتی قسموں میں تھا جن پر علاءالدین خلجی نے کنٹرول کیا تھا۔ گجرات کے طرح طرح کے ڈیزائن والے 'پٹولا' کی بہت قدر تھی۔ گجرات سونے چاندی سے کڑھائی کے کام کے لیے بھی مشہور تھا جو عام طور پر ریشم پر ہوتی تھی۔

گو کہ بھیڑیں میدانی علاقوں میں بھی پالی جاتی تھیں مگر اون پہاڑی علاقوں سے حاصل کیا جاتا تھا۔ بہترین قسم کا اونی کپڑا اور سمور زیادہ تر باہر سے درآمد کیا جاتا تھا اور اسے لگ بھگ صرف دربار کے امراء ہی پہنتے تھے۔ بہر حال کشمیر کی شال کی صنعت کافی جمی ہوئی تھی۔ محمد بن تغلق نے چین کے شہنشاہ کو کشمیری شالیں تحفے میں بھیجی تھیں۔ سلطانوں کی سرپرستی میں قالین بننے کے کام نے بھی ترقی کی اور ان میں بہت سے ایرانی اور وسط ایشیائی ڈیزائن اپنائے گئے۔

رنگائی کی صنعت کا ذکر بھی ضروری ہے۔ نیل (انڈیگو) اور دوسری سبزیاں وہ رنگ فراہم کرتی تھیں جن رنگے ہوئے چمکتے رنگین کپڑے اور عورتیں اور مرد دونوں بڑے شوق سے پہنتے تھے۔ رنگائی کی صنعت اور چھینٹ کی چھپائی میں بھی گہرا تعلق ہے 'ٹائی اینڈ ڈائی' (بندھن) رنگائی کی کاری گری راجستھان کی پرانی صنعت ہے۔ بہر حال اس بات کا علم نہیں ہے کہ لکڑی کے بوٹوں (پلاک) کے ذریعے چھپائی کا کام کب شروع ہوا۔

کپڑے کی صنعت جو بڑی تعداد میں روزگار فراہم کرتی تھی اس کی تعظیم کیسی تھی اس کی معلومات موجود نہیں ہیں۔اور پھر جیسا کہ بعد میں نظر آتا ہے، کاتنا عورتوں کا کام تصور کیا جاتا تھا اور عام طور پر گھروں میں ہوتا تھا۔اس کام کے لیے کنیزوں سے بھی کام لیا جاتا تھا۔ بنائی بھی ایک گھریلو صنعت تھی جو عام طور پر قصبوں اور شہروں میں چلتی تھی اور گاؤں میں بھی کہیں کہیں کپڑا بنا جاتا تھا۔ بنائی کا مال (دھاگا وغیرہ) جلاہے کو خود خریدنا ہوتا تھا یا بیوپاری اُسے جلاہوں کو پہنچاتے تھے۔ نفیس قسم کے یا عیش و آرام والے کپڑے سرکاری کارگاہوں یا 'کارخانوں' میں تقسیم ہوتے تھے۔اس طرح ہمیں پتہ چلتا ہے کہ محمد بن تغلق کے کارخانوں میں 4000 کاریگر تھے جو مختلف قسم کی چادریں اور کپڑے تیار کرتے تھے۔ فیروز تغلق نے اپنے کارخانوں اور پرگنوں میں کام کرنے کے لیے بہت سے غلاموں کو بھرتی کر کے ان کی تربیت کی تھی۔

14.2.5 دھات کا کام

ہندوستان میں دھات کے کام کی روایت بھی قدیم زمانے سے چلی آرہی ہے۔اس کی تصدیق مہرولی (دہلی) میں موجود لاٹ سے ہوتی ہے جو صدیوں سے موسم کے گرم و سرد کی زیادتی جھیلتی چلی آرہی ہے۔ ہندوستان کے دھات کے دستکاروں کی کاریگری اور چابک دستی کی تصدیق تانبے اور ملی جلی دھاتوں کی ان گنت مورتیوں سے بھی ہوتی ہے۔ دھات میں دوسری دھاتوں کے نقش و نگار یا پچی کاری والی تلواریں، خنجر وغیرہ پوری دنیا میں مشہور تھے۔ کانسے اور تانبے کے منقش اور پچی کاری والے برتن جو دکن میں تیار کیے جاتے تھے ان کی مغربی ایشیا میں متواتر مانگ رہتی تھی۔ سلطنت دور کے اعلیٰ معیار بھی ہندوستان میں دھات کے کام کی نفاست اور بہترین کاری گری کا ثبوت ہیں۔ چاندی۔ سونے کا کام کرنے والے سنار اپنے نازک زیورات کی وجہ سے چاروں طرف جانے جاتے تھے اور زیورات کی مانگ مرد عورتوں دونوں طرف سے برابر بنی رہتی تھی۔

14.2.6 عمارتی صنعت

عمارتی صنعت یعنی تعمیر کا کام بھی لوگوں کے لیے روزگار کا اہم ذریعہ تھا۔ دسویں صدی سے شمالی ہندوستان میں مندروں کی تعمیر کا سلسلہ کافی تیزی سے چل رہا تھا جیسا کہ بندیلکھنڈ میں کھجوراہو، راجستھان میں دلواڑا اور اڑیسہ اور گجرات میں بنے دوسرے مندروں سے ظاہر ہوتا ہے۔ ترکی سلطان بھی عمارتیں بنوانے کے زبردست شوقین تھے۔انہوں نے محراب کے نئے طرز، گنبد اور محرابی یا قوسی چھتیں بنوانی شروع کیں اور ایک نئے مسالے سے روشناس کرایا۔ یہ پلاسٹر میں استعمال کیا جانے والا چونے کا مسالہ تھا۔انہوں نے شہر، قلعے، مسجدیں، محلات، تعمیر کرائے جن میں سے کچھ کے باقیات یا کھنڈرات بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس زمانے میں اینٹیں بنانے کے کام میں زبردست تیزی آئی اور زیادہ سے زیادہ لوگوں نے اینٹوں اور پتھر سے بنے پکے مکانوں میں رہنا شروع کر دیا لیکن غریب لوگ بہر حال کچے ، چھپر والے مکانوں میں ہی زندگی بسر کرتے رہے۔ سنگ تراشی میں ہندوستان کے کاریگروں کا یوں بھی کوئی مقابلہ نہیں تھا۔امیر خسرو کا دعوی تھا کہ دہلی کے سنگ تراش اور راج پوری مسلم دنیا میں سب سے اچھے کاریگر ہوتے تھے۔ تاریخی اعتبار سے یہ بات بھی پوری طرح مانی جاتی ہے کہ تیمور اپنے ساتھ اپنے پایۂ تخت سمرقند کی تعمیر کے لیے دہلی سے سنگتراش اور راج لے گیا تھا۔اس بات کا بہر حال کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ عمارت کی صنعت میں کتنے لوگ لگے ہوئے تھے۔ برنی کا بیان ہے کہ علاءالدین خلجی نے 70,000 کاریگروں کو اپنی عمارات کی تعمیر میں

لگایا تھا۔ محمد بن تغلق اور فیروز دونوں بہت بڑے معمار سلطان تھے۔ فیروز نے صرف کچھ نئے شہر ہی نہیں بسائے بلکہ بہت سی پرانی عمارتوں اور مقبروں وغیرہ کی مرمت کا کام بھی کروایا۔ اسی دور میں چینی کاری کے ٹائلوں کا رواج بھی شروع ہوا۔ ہندو راجاؤں اور سرداروں نے بھی تعمیری کام کی سرپرستی کی اور بہت سے نئے شہر۔ جیسے راجستھان میں جودھپور، اس زمانے میں تعمیر ہوئے۔ بہترین قسم کا لکڑی کا کام بھی پورے ملک میں ہوتا تھا اور دروازے نشستیں (کرسیاں)، مسہریاں اور گھریلو استعمال کی بہت سی چیزیں تیار ہوتی تھیں۔

14.2.7 دوسرے حرفے

ایک اور حرفہ جو ہندوستان میں کافی وسیع پیمانے پر پھیلا ہوا تھا وہ کپڑے کا کام تھا جس کی بنیاد ملک میں موجود مویشیوں کی بہت بڑی تعداد کی موجودگی تھی۔ یہ کام ذات کی بنیاد پر منظم تھا۔ اصطبلوں میں بہت بڑی تعداد میں گھوڑے موجود تھے جن کے لیے اعلیٰ درجے کی زینیں بنتی تھیں جو امراء کو تحفے میں بھی دی جاتی تھیں۔ گجرات میں بہت نفیس چمڑے کی لال۔ نیلی چٹائیاں یا فرش بنتے تھے جنہیں چڑیوں یا جنگلی جانوروں کی تصویروں سے یا میناکاری وغیرہ سے سجایا جاتا تھا۔ اس دور میں جو ایک نئی صنعت اُبھری وہ کاغذ سازی کی تھی۔ حالانکہ چین میں اس کی واقفیت پہلی صدی عیسوی میں ہی پیدا ہو چکی تھی لیکن سمرقند اور بغداد میں یہ جانکاری آٹھویں صدی تک پہنچی۔ عربوں نے اس میں شہتوت اور کچھ دوسرے پیڑوں کی چھال کی بجائے کپڑے کی دھجیوں اور رسی استعمال کر کے اسے ایک نئی ٹکنالوجی بخشی۔ بہر حال ہندوستان میں تیرھویں صدی سے پہلے اس کے استعمال کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے اور کاغذ پر لکھا پہلا مخطوطہ اس وقت 1223-24 کا گجرات کا موجود ہے۔ کاغذ کی صنعت نے کتابوں کی موجودگی میں یقیناً بہت اضافہ کیا ہو گا۔ ان کے علاوہ کچھ صنعتیں نمک سازی، سنگِ مرمر اور دوسرے پتھروں کی کھدائی اور لوہے اور تانبے کی کان کنی سے متعلق تھیں۔ پنا اور جنوبی ہندوستان میں ہیرے کی کھدائی اور سمندر میں موتیوں کے لیے غوطے کے کام بھی ہوتا تھا۔ ہاتھی دانت کا کام ایک اہم دستکاری تھی۔

14.3 تجارت اور کاروبار (Trade and Commerce)

14.3.1 اندرونی تجارت

سلطنت عہد میں، جیسا کہ پہلے بھی تھا، ہندوستان پورے ایشیائی علاقے اور مشرقی افریقہ کے قریبی علاقوں کے لیے ایک صنعتی کارگاہ (ورکشاپ) کی حیثیت رکھتا تھا جہاں بہت تیز اور پوری طرح مستحکم گھریلو تجارت بھی ہوتی تھی۔ ہندوستان کو یہ حیثیت اس کی بے حد اچھی پیداوار دینے والی زراعت، تربیت یافتہ دستکاروں اور حرفہ نگاروں اور بہت اعلیٰ درجے کے تربیت یافتہ اور تجربہ کار تاجروں اور سرمایہ کاروں سے حاصل ہوئی تھی۔ ترک سلطنت نے جو مرکزیت پیدا کی تھی اور جس سے ایک اچھا خبر رسانی کا ذریعہ، چاندی کے ٹنکے اور تانبے کے ورہم کی بنیاد پر ایک مضبوط اور مستحکم کرنسی کا نظام اور ہندوستانی تجارت کی نئی تنظیم اور تحریک پیدا ہوئی تھی۔ ان سب کی وجہ سے شمالی ہندوستان میں نئے شہروں کی آبادکاری اور زر (روپے پیسے) کی بنیاد پر کاروبار میں اضافے کو ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں۔

داخلی یا ملک کے اندر تجارت کو دو حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ پہلے دیہاتوں کے درمیان آپسی، اور ضلعوں میں شہروں کی منڈیوں

سے تجارت اور دوسرے بڑے بڑے ملی جلی آبادی والے (میٹروپالیٹن) شہروں اور علاقوں کے درمیان جو تجارت ہوتی تھی وہ ان دونوں کے درمیان رکھی جاسکتی ہے۔ علاقائی تجارت یا چھوٹے علاقہ کی تجارت محصول کی ادائیگی کے لیے اور ان شہروں کی غذائی ضرورتیں پورا کرنے کے لیے ہوتی تھی جو علاقے کی وسعت اور تعداد، دونوں طرح متواتر پھیل رہی تھی۔ فصلوں کی بیچنے کی بنیادی ذمے داری گاؤں کے لیے کی ہوتی تھی اور یہی کسانوں کی ضرورت کا سامان نمک مصالے اور گاؤوں کے لوہار کے لیے کچالوہا بھی بیچتا تھا۔ کبھی کبھی رئیس اور بڑے کسان خود اپنی زائد پیداوار کو منڈی میں بیچنے لے جاتے تھے جس کی علاءالدین خلجی نے گاؤوں میں ذخیرہ اندوزی روکنے کی غرض سے ترغیب بھی دی تھی۔ منڈیوں کے کام میں علاقائی میلے بھی مدد پہنچاتے تھے جن میں جانوروں کی خرید فروخت بھی ہوتی تھی۔ جانوروں کی ضرورت زراعت کے کاموں، اندرونی آمدورفت اور دودھ وغیرہ کی ضرورتیں پوری کرنے میں بہت اہم تھی۔ بہر حال، اس علاقائی تجارت کی مقدار کا اندازہ کرنے کا کوئی ذریعہ ہمارے پاس موجود نہیں ہے لیکن یہ تجارت ملک کی معاشی زندگی میں بہت بنیادی کردار ادا کرتی تھی لیکن اس علاقائی تجارت میں مصروف بیوپاریوں کے لیے اس سے اتنی وافر آمدنی نہیں ہو پاتی تھی کہ یہ کوئی آسان یا افراط کی زندگی گزار سکیں جس کا مطلب یہ ہے کہ بدنام زمانہ بنیا غائبا ایک رئیس کسان سے بہتر یا علی معیار زندگی نہیں رکھ پاتا تھا۔

اس منظر کے دوسرے سرے پر دولت مند تاجر اور سرمایہ کار۔ 'ساہا'، 'مودی' اور صرآف ہوتے تھے۔ تجارت سے متعلق ان کے کام ملک کے اندر بڑی مقدار میں اشیاء کی نقل وحمل سے بھی تعلق رکھتے تھے اور بڑے شہروں میں رہنے والے امراء اور رؤسا کے لیے آرام و آسائش کا سامان پہنچانے سے بھی۔ بڑی مقدار میں اشیاء کی نقل وحمل (آمدورفت) میں غلہ تیل، گھی، مسالے وغیرہ شامل تھے۔ چنانچہ چاول اور شکر جو بنگال اور بہار میں ضرورت سے زیادہ ہوتے تھے وہ پانی کے جہازوں سے مالابار اور گجرات لے جائے جاتے تھے۔ گیہوں، جو آج کی اصطلاح میں مشرقی اتر پردیش، اودھ کڑال (یعنی الہ آباد) میں فاضل ہوتا تھا وہاں سے دہلی کے علاقے میں لایا جاتا تھا لیکن زمین پر بڑی مقدار میں اشیاء کی نقل وحمل کافی مشکل کام تھا اور اسی لیے وہ زیادہ تر بنجارے ہی انجام دیتے تھے جو اپنے خاندانوں سمیت ہزاروں بیلوں کے ساتھ ملتے تھے۔ غالباً بنجاروں کے کام میں بڑے یا رئیس تاجر۔ 'ساہا' اور 'مودی' سرمایہ لگاتے تھے، بہر حال اس سلسلے میں کافی معلومات موجود نہیں ہیں۔ قیمتی لیکن بھاری اور بڑی اشیاء جیسے نفیس کپڑا، گھوڑوں یا بیل گاڑیوں پر لے جایا جاتا تھا۔ ان اشیاء کی نقل وحمل کاروانوں یا ٹانڈاؤں کے ساتھ ہوتی تھی جن کی حفاظت سپاہی کرتے تھے کیونکہ سڑکیں جنگلی جانوروں اور ڈاکوؤں دونوں قسم کے خطروں سے غیر محفوظ تھیں۔

دہلی سے دیوگیر تک محمد بن تغلق کی بنوائی سڑک سے اندازہ ہوتا ہے کہ سڑکوں سے آمدورفت میں بہتری پیدا کرنے کی کتنی ضرورت تھی۔ سڑک کے دونوں طرف پیڑ لگائے گئے اور ہر دو میل (کروہ) پر سرائیں تعمیر کرائی گئیں جن میں کھانے پینے کا سامان موجود رہتا تھا، بنگال میں ایک پشتہ (کنارہ) تیار کیا گیا تاکہ لکھنوتی جانے والی سڑک کا جو حصہ پر سات میں زیر آب رہتا تھا اس پر سفر آسان ہو جائے۔ دور دراز کے علاقوں کی تجارت میں بڑی مقدار میں اشیاء کی نقل وحمل میں کپڑا سب سے اہم شے ہوتی تھی۔ ہم بنگال اور دیوگیر سے آنے والی ململ یا تنزیب اور گجرات سے آنے والے نفیس کپڑے کا ذکر پہلے ہی کر چکے ہیں۔ گھوڑے۔ غیر ملکی اور ملکی۔ دونوں، درآمد والی اشیاء میں کافی اہمیت کے حامل تھے۔ نیل (انڈیگو)، مسالے، مرہم، دوائیں، چمڑے کی مصنوعات دوسری اہم اشیاء تھیں۔ کشمیر کی شالوں اور قالین کی مانگ دہلی

میں تھی۔اسی طرح خشک میوے بھی آتے تھے۔ شراب دوسرے ملکوں سے درآمد ہوتی تھی اور دوآب کے علاقے میرٹھ اور علی گڑھ میں بھی تیار ہوتی تھی۔

جہاں تک دور دراز کی تجارت میں سرمایہ کاری کا سوال ہے ہنڈی کا طریقہ کار ہی جاری رہا ہوگا۔ مودی اور صراف ہی ہنڈی طریقہ کار میں بنیادی طور پر سرمایہ محصول ے والے ذرائع تھے چونکہ آج جیسا بینک کاری نظام موجود نہیں تھا۔ گاؤں کے درجے پر بنیے اور ملکی یا قوی پیمانے پر مودی اور صراف زرعی کاموں اور اس کی تجارت میں سرمایہ کاری کے ذرائع تھے۔ موجودہ دور کے ایک ممتاز مورخ، کے۔ایم۔ اشرف کے مطابق بڑے قرضوں کے لیے 10 فی صد اور چھوٹے قرضوں یا معمولی رقموں کے لیے 20 فی صد سالانہ سود لیا جاتا تھا۔

14.3.2 غیر ملکی تجارت

غیر ملکی تجارت کے سلسلے میں مغربی اشیا کے علاقے سے، جو بحر روم کی ساحلی دنیا تک پھیلا ہوا تھا اور وسطی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا اور چین سے زمینی اور بحری راستوں سے تجارت کی روایت قدیم زمانے سے چلی آرہی تھی، زمینی راستہ درّۂ بولان سے گزر کر ہرات اور درّۂ خیبر سے گزر کر سمرقند اور بخارا تک اور کشمیر کے راستے یارقند اور خوطان ہوتا ہوا آگے چین تک پہنچ جاتا تھا۔ یہ تجارتی سلسلے وسط ایشیا کے خانہ بدوش گروہوں۔ جیسے چمٹی اور ساتویں صدی میں ہن گروہوں کے یلغار، اور تیرھویں صدی میں منگول لہر، وغیرہ کی وجہ سے کبھی کبھی درہم برہم بھی ہو جاتے تھے۔ شاہی خاندانوں کے عروج وزوال سے بھی ان تجارتی راستوں کی حفاظت پر اثر پڑتا تھا۔ بہر حال، تاجر طبقہ بھی ان رکاوٹوں کا عادی ہو کر ان سے کامیابی سے نپٹنے کے لیے پختہ کار ہو گیا تھا۔ دوسری طرف خانہ بدوش گروہوں نے بھی اس تجارت کو جاری رکھنے کی قدر کو سمجھتے ہوئے اس سے محصول حاصل کرنے کو زیادہ سود مند سمجھا۔ اس طرح منگولوں نے صرف تجارت کو ہی کھلا نہ رکھا بلکہ جنگ نہ ہونے کی صورت میں اونٹ، گھوڑے، ہتھیار، باز (شاہین)، سمور اور مشک وغیرہ کی تجارت میں شامل ہونا شروع کر دیا۔ حالانکہ بلبن کو وسط ایشیا سے گھوڑے حاصل کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن یہ رکاوٹ عارضی یا وقتی ہی ہو گی کیونکہ علاء الدین خلجی کو ایسی کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ منگولوں کی اپنی حکومتیں قایم ہو جانے، اور راستوں کے محفوظ ہو جانے کے بعد چین اور مغربی ایشیا سے تجارت اتنی آسان ہو گئی جیسی اس سے پہلے کبھی نہیں تھی۔ اس لیے منگولوں کے ہاتھوں سمرقند و بخارہ جیسے خوشحال شہروں کی بربادی کے اثرات کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی جانی چاہیئے۔ منگولوں کے بتدریج اسلام قبول کر لینے اور اس سے قریب ہو جانے کی وجہ سے چودھویں صدی میں تجارت کے مواقع اور بہتر ہو گئے۔ بہر حال زمینی تجارت عام طور پر انہی چیزوں تک محدود رہی جو قیمت میں زیادہ اور وزن یا حجم میں کم ہوتی تھیں جس کی وجہ نقل وحمل پر آنے والی لاگت تھی۔ زمینی تجارت میں گھوڑوں کی درآمد سب سے اہم تھی۔ ہندوستان میں فوج کے لیے عربی، عراقی اور وسط ایشیائی گھوڑوں کی متواتر مانگ موجود تھی کیونکہ سوار فوج جنگ میں بنیادی ہتھیار تھی۔ گھوڑے نام ونمود اور اعلیٰ معیار زندگی کا بھی اظہار کرتے تھے اس لیے ان کی قدر کی جاتی تھی۔ اس طرح گھوڑوں کی خرید وفروخت کا باقاعدہ انتظام حکومت کا ایک اہم یا ترجیحی کام تھا۔ جن دوسری اشیاء کی ہندوستان میں درآمد ہوتی تھی ان میں اونٹ، سمور، گورے غلام، مخمل، خشک میوے اور شراب شامل تھیں۔ چائے اور ریشم چین سے درآمد کیے جاتے تھے، جبکہ ریشم ایران سے بھی درآمد کیا جاتا تھا کیونکہ شہتوت اور ریشم کے کیڑے وہاں منگولوں نے تیرھویں اور چودھویں صدی میں

پہنچادیے تھے۔ ہندوستان سے برآمد کی جانے والی اشیاء میں سوتی کپڑا، غذائی سامان، جیسے چاول، شکر اور مسالے شامل تھے۔ ہندوستان سے غلاموں کی برآمد بھی ایک متواتر سلسلہ تھی جن کی مانگ اسلامی ملکوں میں کافی زیادہ تھی۔

ہندوستان سے زمینی تجارت کا مرکز ملتان تھا۔ 1241 میں منگولوں کے ہاتھوں لاہور ایسا تباہ ہوا تھا کہ اُسے محمد بن تغلق کے عہد تک دوبارہ مضبوطی حاصل نہیں ہوئی۔ ملتان تمام غیر ملکیوں کی آمد کا بھی مرکز تھا جن میں وہ تاجر بھی شامل تھے جنہیں خراسانی کہا جاتا تھا۔ ان 'خراسانیوں' کی تعداد کا اندازہ کرنا تو مشکل ہے مگر یہ لوگ دولت کے معاملے میں ملتانیوں سے بہر حال کم تھے۔ غیر ملکی تاجر، خصوصاً عرب سمندری تجارت میں گجرات اور مالا بار میں زیادہ متحرک نظر آتے تھے۔ ہندوستانی تاجر جن میں ہندو (اگروال، اور مہیشوری) اور جین اور بوہرے شامل تھے، یہ بھی سمندری تجارت میں کافی مشغول تھے اور یہ مغربی اور جنوبی ایشیا میں ہندوستانی تاجروں کی کالونیوں سے تجارت کرتے تھے۔ بنگال، چین اور جنوب مشرقی ملکوں سے تجارت کرتا تھا، جس میں کپڑے کی برآمد اور ریشم اور مسالوں کی درآمد شامل تھیں۔ ماہون نے، جو پندرھویں صدی کی ابتدا میں بنگال آیا تھا، لکھا کہ ''ایسے دولت مند افراد کافی بڑی تعداد میں موجود تھے جو جہاز بناتے تھے اور تجارت کرنے دوسرے ملک جاتے تھے۔''

14.3.3 تاجر اور سرمایہ کار طبقہ

ہندوستان میں تجارت کی بڑی پرانی روایت موجود تھی اور یہاں تاجروں اور سرمایہ کاروں کا ایک طبقہ قدیم زمانے سے موجود تھا۔ چنانچہ دھرم شاستروں میں ٹھیکے یا معاہدے، قرض کے لین دین اور خرید و فروخت سب کے لیے قوانین اور ضابلے متعین تھے۔ دیش ذات کے ایک باقاعدہ تاجر طبقے کی شکل میں ابھرنے اور ان کے دوج (دوبار پیدا ہوئے یا حقوق یافتہ) طبقے میں شمار کیے جانے سے ملک کی سماجی اور معاشی زندگی میں ان کی اعلیٰ حیثیت کا اظہار بخوبی ہوتا ہے۔ بہر حال بڑے تاجروں (نگر استریشٹن) اور معمولی دکانداروں (بنک) اور بنجاروں کے درمیان واضح طور پر امتیاز کر لینا بہت ضروری ہے۔ پانچویں صدی میں تصنیف ہوئی کہانیوں (پنچ تنتر) کے مطابق اوّل الذکر زمرہ سماجی اعتبار سے حکمرانوں سے قریب سمجھا جاتا تھا اور شاہی خاندان کے ساتھ یہ لوگ آزادانہ طور پر گھلے ملے رہتے تھے۔ یہ بڑے تاجر صرف بڑے پانے یا تھوک کے بیوپاری اور دور دراز علاقوں سے تجارت میں ہی حصہ نہیں لیتے تھے، جس میں غیر ملکوں سے تجارت بھی شامل تھی بلکہ یہ لوگ سرمایہ کاری اور روپے پیسے کی تبدیلی یا لین دین کا کاروبار بھی کرتے تھے۔ یہ تاجر دور دراز کی تجارت کے لیے سرمایہ فراہم کرتے تھے، خطرات اور خدشات کے لیے تحفظ (بیمہ) دیتے تھے اور ہنڈی نظام کے تحت ایک جگہ سے دوسری جگہ نقد رقمیں منتقل کرتے تھے۔

شمالی ہندوستان میں ایک مضبوط اور مستحکم مرکزیت پر مبنی حکومت، بنیادی طور پر چاندی کے ٹنکے پر مبنی کرنسی کا نظام و سڑکوں پر بہتر تحفظ اور امن، شہروں کی نشو و نما اور اسلامی دنیا سے ہندوستان کا متعارف ہونا، یہ تمام امور مغربی اور وسطی ایشیا سے ہندوستان کی بری اور بحری تجارت کے لیے ذمہ دار تھے۔ بحری تجارت زیادہ تر گجرات کے راستے ہوتی تھی۔ اس کی تصدیق ان متعدد بیانات سے ہوتی ہے جن میں تاجروں اور سرمایہ کاروں کو ملتانی کہا گیا ہے۔ عام طور پر یہ مانا جاتا ہے کہ پورے عہد وسطیٰ میں ملتان بہت اہم تجارتی مرکز تھا، چونکہ درّہِ بولان

کو پار کر کے یہ براہ راست ہرات اور بخارا سے جڑا ہوا تھا جو ''ریشمی سڑک'' کا ایسا چوراہا تھا جو مشرق کی طرف سے وسط ایشیا اور چین سے اور مغرب کی طرف سے ایران اور قسطنطنیہ اور لبنان سے جڑا ہوا تھا۔ دریائے سندھ کے ذریعے ملتان مغربی بندرگاہوں سے بھی تعلق رکھتا تھا، ظاہر ہے کہ ملتانیوں کا بڑا حصہ ہندوؤں پر ہی مشتمل تھا۔

ہم برنی کے اس بیان کا ذکر کر چکے ہیں جس میں اس نے اظہار کیا تھا کہ ملتانی اور دہلی کے ساہا امراء کو روپیہ ادھار دینے کے سلسلے میں اتنے رئیس ہو چکے تھے کہ سونا چاندی صرف انہیں کے گھروں میں دیکھا جا سکتا تھا۔ برنی نے ملتانیوں اور ساہاؤں کی خوشحالی کو دوسرے انداز سے بھی بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جلال الدین خلجی نے ہندوؤں کے خلاف کوئی اقدام کرنے سے بالکل صاف انکار کر دیا جو دار السلطنت دہلی میں بھی پوری مذہبی آزادی رکھتے تھے اور اُن میں سے خوشحال لوگ ظاہر ہے ملتانی، بڑے سکون اور عیش کی زندگی گزار رہے تھے اور انہیں اپنے جان و مال کے تحفظ کی کوئی فکر نہیں تھی۔

بیوپاریوں کے ایک اور زمرے کا بھی برنی نے حوالہ دیا ہے۔ یہ تھے دلال۔ یہ دلال اصل میں کمیشن ایجنٹ تھے جو خریداروں اور بیچنے والوں کو ایک دوسرے سے قریب لا کر اس کی فیس لیتے تھے۔ ان کا وجود دہلی میں تجارت میں اضافے کو ظاہر کرتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ مختلف چیزوں کے خریدار، خصوصاً کپڑے کے خریدار، بازاروں پر علاء الدین کی گرفت کے بعد دہلی کی طرف دوڑے چلے آتے تھے۔ برنی ان دلالوں کا ذکر خاص طور پر گھوڑوں کی فروخت پر علاء الدین کی گرفت کے سلسلے میں کرتا ہے۔ اُس نے ان دلالوں کے لیے بڑے سخت لفظ استعمال کیے ہیں، جن میں سے خاصی بڑی تعداد خصوصاً گھوڑوں کے تاجر، مسلمانوں کی ہی تھی۔ انہوں نے خود اپنا ایک مضبوط حلقہ بنا لیا تھا جو بہت پیسے والا تھا جو بعض موقعوں پر سلطان تک کی حکم عدولی کر لیتا تھا اور اس کے احکام کو نظر انداز کر دیتا تھا۔

دہلی میں مسلمان تاجر عام طور پر غیر ملکی عراقی، ایرانی، خراسانی وغیرہ تھے لیکن ان کے ساتھ کچھ مسلمان ملتانیوں کا ذکر بھی مل جاتا ہے۔ چنانچہ حسام الدین اور اس کا باپ اور دادا، جنہیں علاء الدین نے قاضی مقرر کیا تھا وہ ملتان کے ہی بیوپاری تھے۔ ابن بطوطہ کے قول کے مطابق ہندوستان میں تمام غیر ملکی تاجر خراسانی کہلاتے تھے۔ مسلمان تاجروں کا ایک حلقہ افغانیوں کا تھا۔ ان کی خصوصیت کاروان تجارت اور گھوڑوں کی تجارت تھی۔ ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں تاجر فرقوں کی معلومات بہت کم ہیں۔ گجرات میں تجارت کی روایت بہت پختہ اور جمی ہوئی تھی جس میں مقامی اور غیر ملکی تاجر، دونوں فرقے موجود تھے۔ ہم ایک مصری، شہاب الدین قزرونی کا ذکر کر چکے ہیں جو کئی جہازوں کا مالک تھا اور کھمبایت میں رہتا تھا۔ جین، مارواڑی، گجراتی بنیے اور بوہرے بھی تجارتی کام میں مصروف تھے جن کا ذکر روایتی اور مقامی تحریروں میں نظر آتا ہے۔ انہی تاجروں میں سے علاء الدین کے لیے ملک کافور کو حاصل کیا گیا تھا۔

14.4 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

ہندوستان کی معاشی تاریخ میں دہلی سلطنت کا قیام ایک واضح تبدیلی اور ارتقا کا دور تھا، جس نے پرانے معاشی جمود کو توڑ کر ایک نئی اور بہتر معاشی تنظیم کو جنم دیا۔ اس دور میں زرعی پیداوار اور فصلوں کی ترتیب میں نمایاں بہتری آئی، اور مانسون پر مبنی روایتی زراعت کے ساتھ

ساتھ کپاس اور گنے جیسی تجارتی فصلوں نے دیہی صنعتوں کو زبردست فروغ دیا۔ ریاستی سطح پر، خصوصاً تغلق دور میں، زرعی قرضوں (سوندھر یا تقاوی) کا اجرا اور فیروز شاہ تغلق کے دور میں نہری آبپاشی کے بڑے منصوبے متعارف کرائے گئے۔ نظامِ محصول میں ہونے والی تبدیلیوں جیسے کسانوں سے براہِ راست خراج کی وصولی اور محصول کی شرح میں اضافے نے مرکز تک خطیر زرعی فواضل پہنچائے، جس نے پروفیسر محمد حبیب کے الفاظ میں ایک 'شہری انقلاب' کی راہیں ہموار کیں۔ دستکاری کے میدان میں چرخے، دھنیے کی کمان اور کاغذ سازی جیسی نئی ایجادات نے کپڑے اور دیگر صنعتوں میں نمایاں اضافہ کیا۔ ایک مستحکم مرکزیت، بہتر خبر رسانی کے ذرائع، اور ٹنکہ و جیتل پر مبنی مستحکم کرنسی کی بدولت، ملکی اور بین الاقوامی تجارت عروج پر پہنچی، جس میں ملتانی، ساہا اور دلالوں جیسے تاجر طبقوں نے کلیدی کردار ادا کیا۔

14.5 کلیدی الفاظ (Keywords)

دیوانِ امیر کوہی : محمد بن تغلق کی جانب سے محصولات کو بڑھانے اور قابلِ کاشت رقبے میں اضافے کے لیے قائم کیا گیا زراعت کا ایک نیا اور الگ محکمہ۔

سوندھر یا تقاوی : ریاست (حکومت) کی طرف سے کسانوں کو بیج خریدنے، کنویں کھودنے اور کاشت بڑھانے کے لیے بڑے پیمانے پر فراہم کیے جانے والے زرعی قرضے۔

خالصہ : وہ زرعی علاقہ جو براہ راست حکومت کے زیرِ انتظام ہوتا تھا اور جس کا محصول سیدھا شاہی خزانے میں جمع کیا جاتا تھا۔

خوط اور مقدم : دیہات کے متمول، رئیس اور ترجیح یافتہ طبقات (جن میں گاؤں کے مکھیا بھی شامل تھے) جو روایتی طور پر دیہی سماج میں معاشی اور سماجی اقتدار رکھتے تھے۔

ہنڈی : دورِ سلطنت میں دور دراز کی تجارت میں سرمایہ کاری اور رقم کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بحفاظت منتقل کرنے کا ایک روایتی مالیاتی طریقہ کار۔

14.6 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

14.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. جدید دور کے معروف تاریخ داں پروفیسر محمد حبیب نے دہلی سلطنت کے دور میں شہروں کے پھیلاؤ کو کیا نام دیا ہے؟

(a) تجارتی انقلاب (b) صنعتی انقلاب (c) شہری انقلاب (d) دیہی انقلاب

2. محمد بن تغلق نے محصولات کو بڑھانے اور قابلِ کاشت رقبے میں اضافے کے لیے زراعت کا کون سا الگ محکمہ قائم کیا تھا؟

(a) دیوانِ عرض (b) دیوانِ امیر کوہی (c) دیوانِ رسالت (d) دیوانِ انشا

3. عہدِ وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ کا سب سے بڑا نہری منصوبہ کس سلطان نے شروع کیا، جس میں 'الغ خانی' اور 'رجب واہ' نہریں شامل تھیں؟

(a)علاءالدین خلجی (b)غیاث الدین تغلق (c)محمد بن تغلق (d)فیروز شاہ تغلق

4. دہلی سلطنت کے دور میں ریاست کی جانب سے کسانوں کو بیج خریدنے اور کنویں کھودنے کے لیے جو زرعی قرضے فراہم کیے جاتے تھے، انہیں کیا کہا جاتا تھا؟

(a)سوندھر یا تقاوی (b)خراج یا جزیہ (c)حقِ شرب (d)ہنڈی

5. ہندوستان میں غیر ملکی زمینی تجارت کا سب سے اہم تجارتی مرکز کون سا شہر تھا، جو براہِ راست ہرات اور بخارا سے جڑا ہوا تھا؟

(a)دہلی (b)دیوگیری (c)ملتان (d)کھمبایت

14.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. علاءالدین خلجی نے اپنی زرعی پالیسی کے تحت محصول کے نظام میں کیا نمایاں تبدیلیاں کیں؟
2. سلطنت کے دور میں کپڑے کی صنعت میں کون سی دو نئی ٹیکنالوجیز یا آلات کا استعمال شروع ہوا جس سے پیداواری صلاحیت میں زبردست اضافہ ہوا؟
3. اس دور میں دور دراز کی تجارت میں سرمایہ کاری اور رقم کی منتقلی کے لیے کون سا طریقہ کار اپنایا جاتا تھا؟

14.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. سلطنت دور میں ہندوستان کی داخلی اور غیر ملکی تجارت کے خدوخال بیان کیجیے۔
2. تیرھویں اور چودھویں صدی میں دہلی سلطنت کے 'نظامِ محصول (Taxation System) 'کے ارتقا پر بحث کیجیے۔

اکائی 15۔ بھکتی تحریک

(Bhakti Movement)

اکائی کے اجزا

15.0 تمہید

15.1 مقاصد

15.2 بھکتی کے تصور کا پس منظر

15.3 نجات حاصل کرنے کے تین ذرائع

15.4 تمل خطے میں بھکتی تحریک

15.5 آدی شنکر اچاریہ

15.6 اصلاحی تحریک کے طور پر بھکتی کے ابھرنے کے ذمہ دار عوامل

15.6.1 ہندو مذہب میں ذات پات کے نظام کی سختی

15.6.2 بھکتی تحریک پر اسلام کے اثرات

15.7 اصل حقیقت سے فرار کے طور پر بھکتی تحریک

15.8 بھکتی مصلحین کی اہم تعلیمات

15.9 ممتاز بھکتی مصلحین

15.10 مہاراشٹر کے بھکتی سنت

15.11 بھکتی تحریک کا اثر

15.12 اکتسابی نتائج

15.13 کلیدی الفاظ

15.14 نمونہ امتحانی سوالات

15.0 تمہید (Introduction)

بھکتی تحریک ایک اہم ترین سماجی، مذہبی اور ثقافتی تحریک تھی جس نے عہد وسطیٰ کے ہندوستانی سماج میں مثبت تبدیلیوں کی راہ ہموار کی جس کے دوررس نتائج برآمد ہوئے۔ بھکتی تحریک کے ضمن میں کئی بھکتی مصلحین ابھرے جنہوں نے اس بات کا پرچار کیا کہ ''خدا ایک ہے، تمام انسان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔''انہوں نے بت پرستی کو رد کیا اور ذات پات کے غیر انسانی نظام اور اچھوت ہونے کے تصور کی مذمت کی۔ رفتہ رفتہ بھکتی تحریک پورے ہندوستان میں پھیل گئی اور میرا بائی جیسی خواتین بھی اس تحریک میں شامل ہو گئی تھیں۔ اس تحریک نے سماجی اور روحانی جمہوریت کے لیے مہم چلائی اور اعلان کیا کہ خدا کو مذہبی پیشواؤں اور پجاریوں کے طبقے کے چنگل سے آزاد کر کے عام لوگوں کے قریب لایا جانا چاہیے۔ اس تحریک نے یہ بھی ثابت کیا کہ ہندوستانی سماج کسی بیرونی اثر ورسوخ کے بغیر خود کو اندر سے بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

15.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ

- بھکتی کے تصور اور بھکتی تحریک کے ابھرنے کے اسباب کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- بھکتی مصلحین کی مختلف تعلیمات سے اپنے آپ کو واقف کر سکیں گے۔
- سماج میں بھکتی مصلحین کے کام اور پیغام کا جائزہ لے سکیں گے۔
- ہندوستانی ثقافت میں بھکتی مصلحین کے تعاون کو جان سکیں گے۔
- ہندوستانی سماج اور ثقافت پر بھکتی تحریک کے اثرات کا جائزہ لے سکیں گے۔
- اس بات کو ثابت کر سکیں گے کہ ہندوستانی سماج کسی بیرونی محرک کے بغیر اپنے اندر سے سماجی تبدیلی کی اہلیت رکھتا ہے۔

15.2 بھکتی کے تصور کا پس منظر

موکش یا نجات حاصل کرنے کے حتمی مقصد کے ساتھ وقف ہو کر خدا کی عبادت کو بھکتی کہا جاتا ہے۔ بھکتی کا تصور اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ ہندوستانی مذہبی روایت جو کہ وادی سندھ کی تہذیب سے جا کر ملتی ہے۔ وادی سندھ کی تہذیب میں، ہمیں پشوپتی شیو کی پوجا کے ابتدائی شواہد ملتے ہیں جو جانوروں سے گھرے مراقبے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہمیں ویدوں، اپنشدوں، رزمیہ داستانوں اور پرانوں میں بھکتی کا ذکر واضح طور پر ملتا ہے۔ ویدانت یا ویدک مذہبی فلسفہ بنیادی طور پر اپنشدوں پر مبنی ہے، جو رسمی اور سطحی شکلوں سے اوپر اٹھ کر ہند آریائیوں کے مذہبی عقائد واعمال کے فلسفیانہ پہلو سے بحث کرتا ہے۔ یہ تخلیق کے اسرار کو حل کرنے اور انسانی زندگی کے معنی اور مقصد کو مابعد الطبیعاتی اندازوں کے ذریعے تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ویدانت کے فلسفے کا اصل محور خالق اور مخلوق، خدا (برہمن یا پرماتما) اور روح (آتما) کا تصور ہے۔ یہ دو بنیادی اصولوں کے گرد گھومتا ہے۔ ا۔ روح کی دوبارہ پیدائش یا منتقلی کا نظریہ۔ ۲۔ کرم کا نظریہ یا ''مکافات عمل کا قانون''۔ روح اور خدا

کے درمیان تعلق ایسا ہی ہے جیسے کامل اور جزو کے درمیان تعلق؛ پانی کے قطرے اور سمندر کے درمیان تعلق۔ انسان فانی ہے لیکن روح لافانی ہے۔ خدا کا ایک حصہ اور جز ہونے کے ناطے، اس کا حتمی مقصد خدا کے ساتھ دوبارہ ملاپ کی تلاش اور خدا کے ساتھ ایک ہو جانا ہے۔ یہی نجات (جسے مکتی، موکش یا نروان بھی کہا جاتا ہے) یا پنر جنم کے چکر سے آزادی ہے۔

15.3 نجات حاصل کرنے کے تین ذرائع

ویدانت، نجات کے حصول کے لیے تین طریقے بتاتا ہے۔ وہ ہیں گیان مارگ، کرم مارگ اور بھکتی مارگ۔ گیان مارگ، نجات کے حصول کے لیے حقیقی علم کی تحصیل یا عرفان پر زور دیتا ہے۔ کپل کا سانکھیہ درشن اس طریقے کی سفارش کرتا ہے۔ کرم مارگ، نجات کے حصول کے لیے خالص عمل پر زور دیتا ہے۔ بھگوت گیتا میں کرشن نے اپنے شاگرد ارجن کو اسی کی تعلیم دی۔ بھکتی مارگ، خدا کی دل لگا کر عبادت، بندے کی خدا کے سامنے مکمل سپردگی اور پاک نیت، اچھے الفاظ اور عمل کے ساتھ خدا سے لو محصول ے پر زور دیتا ہے۔ یہ خدا اور بندے کے درمیان ذاتی تعلق قائم کرتا ہے، ایک ایسا تعلق جو آقا اور غلام، شوہر اور بیوی یا محبوب اور عاشق کے درمیان پایا جاتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس قسم کی عقیدت کے ذریعے مکتی حاصل کی جاسکتی ہے۔ گیان مارگ کو اپنانا سب سے مشکل ہے۔ غیر معمولی خدائی اوصاف کے حامل بہت کم سادھو اور مادی دنیا کی خواہشات سے عاری، پاک ذہن و قلب کے حامل سنیاسی، حقیقی علم یا عرفان کے حصول میں کامیاب ہوئے ہیں۔

15.4 تمل خطے میں بھکتی تحریک

بدھ مذہب اور جین مذہب کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کے خلاف رد عمل کے طور پر چھٹی صدی کے آس پاس تامل خطے میں بھکتی کے فرقے نے ایک تحریک کی شکل میں جنم لیا۔ یہ جنوبی ہندوستان میں تقریباً تین صدیوں تک شیومت اور وشنومت کے ذریعے پروان چڑھا۔ شیو کی پوجا کرنے والوں کو نینار کہا جاتا تھا اور وشنو کی پوجا کرنے والوں کو الوار کہا جاتا تھا۔

15.5 آدی شنکراچاریہ (788-820ء)

شنکراچاریہ مالابار، کیرالہ سے تعلق رکھنے والے نمبودری برہمن تھے۔ وہ بنیادی طور پر شیو کے بھکت تھے۔ انہوں نے قدیم ہندوستانی صحیفوں بالخصوص اپنشدوں کی از سر نو تشریح کے ذریعے ایک ٹھوس فلسفیانہ بنیاد فراہم کر کے ہندو احیا کی تحریک کو بالکل نیا موڑ دیا۔ انہوں نے ویدک مذہبی اور روحانی فکر کے پورے سلسلے کی ایک شاندار تشریح کرتے ہوئے ادویت (Advaita) کے فلسفے یعنی 'ویدانت کی توحید' کی وکالت کی۔ انہوں نے بچپن ہی میں اپنے والد کو کھو دیا تھا۔ نو عمری میں وہ سنیاسی بن گئے اور حقیقی علم اور حکمت کی تلاش میں نکل گئے۔ وہ پیدائشی طور پر ایک اولوالعزم فرد تھے اور اپنے رہن سہن اور سماجی حیثیت کے لحاظ سے کٹر مذہبی تھے۔ انہوں نے کاشی میں مذہبی صحیفوں اور فلسفیانہ خیالات کی تعلیم حاصل کی۔ ان کے ایک استاد گووندا یوگی بتائے جاتے ہیں۔

شنکراچاریہ نے ہندومت کے احیا کے لیے ایک بھرپور مہم شروع کی۔ بدھ مذہب اور جین مذہب کا مقابلہ کرنے کے لیے، انہوں

نے بدھ سنگھ کی طرز پر، ہندو سنیاسیوں کو ان کی پرہیز گاری کے لحاظ سے نئے سرے سے منظم کیا اور ہندو مذہب کی تبلیغ اور قبولیت کے لیے ایک زبردست مہم چلائی۔ انہوں نے ہندوستان کی ثقافتی وحدت کو اجاگر کرنے کے لیے ملک کے مختلف حصوں میں متعدد مٹھوں کی بنیاد رکھی۔ مشرق میں جگناتھ پوری، جنوب میں سری نگری، مغرب میں دوارکا اور شمال میں بدری ناتھ میں مٹھ قائم کیے گئے۔

شنکراچاریہ کا انتقال 32 سال کی عمر میں کیدار ناتھ میں ہوا لیکن، اس سے پہلے ان کا نام پورے ملک میں بہت مشہور ہو گیا تھا۔ ان کی جانب سے شروع کی گئی بھرپور اور منظم مہم کے نتیجے میں، ہندو مذہب کو چھوڑنے والے لاکھوں لوگ واپس ہندو مذہب کی طرف لوٹ گئے۔ شنکراچاریہ کو بجا طور پر جدید ہندو مذہب کا نجات دہندہ کہا جاتا ہے اور وہ بھکتی تحریک کے پیشرو بھی تھے۔ تاہم انہوں نے نجات کے حصول کے لیے ایک ذریعے کے طور پر گیان یعنی حقیقی علم پر زور دیا۔ یہ مثالی طور پر تو مناسب تھا لیکن عام آدمی کے لیے اس پر عمل کرنا مشکل تھا۔ لہذا، ویدانت فلسفے کے بعد آنے والے مبلغین نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور ہندو مذہب کو ایک متحرک قوت بنانے کے لیے بھکتی مارگ یا بھکتی کے راستے کی وکالت کی۔

15.6 اصلاحی تحریک کے طور پر بھکتی کے ابھرنے کے ذمہ دار عوامل

15.6.1 ہندو مذہب میں ذات پات کے نظام کی سختی

بھکتی نے عہد وسطیٰ کے دور میں اس وقت ایک اصلاحی تحریک کی شکل اختیار کی جب متعدد سادھو اور سنتوں نے ملک کے مختلف حصوں میں لوگوں کے درمیان سماجی اور مذہبی اصلاحات کا کام شروع کیا۔ بھکتی تحریک کے تیزی سے پھیلنے کی مختلف وجوہات ہیں۔ ہندو مذہب اور سماجی ڈھانچہ کا زوال اس کی بنیادی وجوہات تھیں۔ شنکراچاریہ اور دیگر کی کوششوں سے بدھ مذہب اور جین مذہب کو دھکہ پہنچا اور برہمنی عقیدے کی بالادستی بحال ہوئی۔ اس کا مطلب ہندوؤں کی پورے مذہبی نظم پر برہمن پجاری طبقے کا غلبہ تھا۔ چونکہ مذہب نے ان کی زندگی کے تمام شعبوں میں ایک اہم کردار ادا کیا، سماجی، ثقافتی، سیاسی اور یہاں تک کہ معاشی زندگی میں بھی مکمل طور پر برہمنوں کی بالادستی تھی۔ راجپوت دور میں ہندو سماج پر ان کی گرفت مزید مضبوط ہوئی۔ بہت سے راجپوت سرداروں کو برہمن پجاریوں نے شتریہ کا درجہ دیا تھا۔ نویں اور دسویں صدی میں، برہمن بڑے پیمانے پر ذات پات میں تقسیم کرنے والوں کے طور پر آگے آئے جب انہوں نے ہندوستان میں آنے والے غیر ملکی سرداروں کو اعلی ذات کا درجہ دینا شروع کیا۔ اس سے سماجی و ثقافتی رہنماؤں کے طور پر لوگوں پر ان کی گرفت مزید مضبوط ہوئی۔ بعد ازاں، ترکوں کے ہاتھوں راجپوتوں کی شکست اور بارہویں اور تیرہویں صدی میں ان کی طاقت کے زوال نے برہمنوں کو ہندو مذہب کا واحد نجات دہندہ بنا دیا۔ انہوں نے اس سلسلے میں ہندو مذہب کی بڑی خدمت کی، لیکن ساتھ ہی ساتھ دیگر دو اعلیٰ ذاتوں شتریہ اور ویشیوں کے ساتھ کافی برا سلوک کیا۔ البیرونی بتاتے ہیں کہ گیارہویں صدی کے شروع میں ویشیوں کے ساتھ شودروں جیسا سلوک کیا جاتا تھا۔ آرسی دت کے مطابق جب تک ہندوستان ایک آزاد ملک تھا شتریوں نے اپنا قبضہ برقرار رکھا، لیکن بارہویں صدی کے بعد وہ اپنی شان اور آزادی کھو بیٹھے۔ اس من گھڑت تصور کو بھی پھیلایا گیا کہ ویشیوں کی طرح، شتریوں کا بھی ایک ذات کے طور پر وجود ختم ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ برہمنوں نے

جان بوجھ کر ہندو عوام کو خوفزدہ کرنے کے لیے اس طرح کی خرافات پھیلائیں تاکہ وہ ان سے جتنی زیادہ ہو سکے اپنی خدمت کروا سکیں۔ ذات پات کے نظام کو مزید سخت بنا دیا گیا اور انتقامی انداز میں ذات پات کی تفریق پر عمل ہونے لگا۔ شودر سماج کا ایک بڑا حصہ تھے۔ البیرونی نے شودروں کے نیچے آٹھ نچلی ذاتوں کا ذکر کیا ہے جو کہ یہ تھیں: جولاہا، چمار، کرتب باز، ٹوکری بننے والا، ملاح، مچھیرا، شکاری اور لوہار۔ وہ تمام لوگ جو مندرجہ بالا ذاتوں میں سے کسی میں بھی نہیں آتے تھے ان کو صرف ذات باہر یا چنڈال قرار دے دیا گیا۔ اونچی ذات کے لوگوں نے نچلی ذاتوں کا استحصال کیا اور ان پر طرح طرح کی توہین کا انبار لگا دیا۔ یہاں تک کہ ریاستوں نے بھی ذات پات کی بنیاد پر اپنی رعایا کے درمیان امتیاز برتا۔ البیرونی نے بتایا کہ ایک برہمن کی سزا جس نے کسی دوسری ذات کے آدمی کو قتل کیا ہو، کفارہ دینا ہے، اور یہ کفارہ روزہ، عبادت اور صدقہ دینے پر مشتمل تھا۔ اگر اس نے کسی اور برہمن کو قتل کیا تو اس کی سزا ملک بدری اور جائیداد کی ضبطی تھی۔ کسی بھی صورت میں برہمن مجرم کو موت کی سزا نہیں دی جا سکتی تھی جو کہ چوری جیسے چھوٹے معاملات میں بھی شودروں اور چنڈالوں پر عام طور پر دی جاتی تھی۔ جرائم کی سزا کی طرح محصول کے معاملات میں بھی برہمنوں کو مراعات حاصل تھیں۔ وہ تمام محصول ادا کرنے سے آزاد تھے۔

مذکورہ بالا مراعات کے بدلے برہمن پجاریوں کی جانب سے دی جانے والی خدمات زیادہ تر منفی نوعیت کی تھیں۔ البیرونی کو جس نے ہندو مذہبی فلسفے اور اداروں کا بغور مطالعہ کیا تھا، ہندو تثلیث کے تین دیوتاؤں اور اس کے پیچھے موجود اپنشدوں کے حقیقی توحیدی فلسفے کو سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی۔ البتہ البیرونی یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ 'یہ عظیم عقیدہ' چند 'تعلیم یافتہ لوگوں کی خصوصی ملکیت' بن کر رہ گیا ہے اور 'عام عوام' کو بتوں اور مندروں، بے معنی رسومات اور غیر ضروری پابندیوں میں مشغول کر دیا گیا ہے۔ مایوسی کے عالم میں انہوں نے سوال اٹھایا کہ ''ایسی سرزمین پر لوگوں کو زہر کیوں پلایا جا رہا ہے جہاں ایک قدیم اور حیات بخش مذہب کا امرت دھارا بہتا ہے؟'' کسی وقت سادہ اور راست گو رہنے والے ویدک مذہب نے دقیانوسی عقائد، پیچیدہ رواج و رسومات، توہمات اور دھوکہ دہی کو جگہ دے دی جس کی بنیادی وجہ شدید غفلت اور برہمن پجاریوں کی خود غرضی تھی۔ انہوں نے زوال پذیر مذہبی رسومات کا خاموشی سے مطالعہ کیا اور جان بوجھ کر پرانے مذہبی صحیفوں کی تحریف یا غلط تشریح کی جس کا مقصد عقیدت مندوں کو اس سے دور کرنا اور غریب اور معصوم لوگوں کو بے وقوف بنانا تھا۔ ایک مشاہدے کے مطابق، پندرہویں صدی کے آغاز تک ''بے معنی رسومات، توہمات، پجاریوں کی خود غرضی اور لوگوں کی بے حسی کے جھاڑ جھنکاڑ نے مذہب کی بہار کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ ظاہر داری نے حقیقت کی جگہ لے لی تھی، اور ہندو مذہب کا اعلیٰ روحانی کردار فرقوں کے ظاہری اسباب کے نیچے دب گیا تھا۔' ہندوستانی معاشرہ مجموعی طور پر بیمار تھا۔ سماجی ماحول اتنا بیمار تھا کہ اس نے سب سے ذہین اور اچھے گھر والوں کو بھی افسردہ اور مایوس کر دیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے پورا سماج خود غرض اور جنونی پجاریوں کے ہاتھوں اغوا ہو چکا تھا۔ اس طرح کی افسوسناک حالت زیادہ دیر تک غیر چیلنج شدہ نہیں رہ سکتی۔ آہستہ آہستہ، نچلی ذاتوں میں اعلیٰ ذاتوں کے استحصالی رجحانات کے خلاف عدم اطمینان کے آثار دکھائی دینے لگے۔ اس نے سماج کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے تعلیم یافتہ افراد، مذہبی سادھوؤں اور ناقدین کی آنکھیں کھول دیں اور سب میدان میں کود پڑے تاکہ مزید تاخیر سے قبل اس سڑاند کو ختم کیا جا سکے۔ ان میں سے زیادہ تر یا تو بغیر کسی دنیاوی لالچ کے سنیاسی تھے یا پھر انہیں سماجی و مذہبی اصلاحات لانے کے لیے کچھ عرصہ کے لیے راہب بننا پڑا تھا۔ انہوں نے ہندو مذہب کے نام پر پھیلے ہوئے جھوٹ کے

خلاف احتجاج کی آواز بلند کی، ذات پات کے نظام کی مذمت کی، اور برہمن پجاریوں کو موردِ الزام ٹھہرایا جو بنیادی طور پر اس تمام گڑبڑ کے ذمہ دار تھے۔ جیسا کہ تمام سماجی اور مذہبی برائیوں کی جڑیں، مذہبی نظام میں پیوست ہوتی ہیں، اس لیے اصلاحات کا کام بھی مذہبی سطح پر ہی موثر طریقے سے کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ان تمام دانشمند افراد، جو ہندو سماج کی بحالی کے خواہشمند تھے، کو اپنے مشن کی کامیابی کے لیے مذہبی مبلغین اور سنیاسیوں کا روپ اپنانا پڑا۔ انہوں نے سرعام سماج میں اصلاحات کا مطالبہ کیا اور ساتھ ہی اپنے اعلیٰ اخلاقی کردار کے ذریعہ ایک مثال قائم کی تاکہ ان کے پیروکار ان کی تقلید کر سکیں۔ ان سنیاسی اور علمی سنتوں نے اپنی زندگی اپنے ساتھ والوں کی خدمت کے لیے وقف کر دی، اور ہر ایک کی اپنے مشن میں کامیابی براہ راست اس احترام کے تناسب سے تھی جو ان کے پیروکار بطور گروان کے تئیں رکھتے تھے۔ ان کی انتھک کوششوں سے، بھکتی فرقہ ایک زبردست تحریک میں تبدیل ہو گیا جس نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

15.6.2 اسلام کا اثر

دوسرا بڑا عنصر جس نے بھکتی تحریک کو مہمیز دی وہ اسلام کی آمد اور ہندوستان میں ترک حکومت کا قیام تھا۔ اسلام کے مساوات کے عقیدہ نے ذات پات کے شکار ہندوازم کے لیے ایک سنگین چیلنج کھڑا کر دیا۔ اسلام اپنے مذہبی فلسفے اور سماجی تنظیم کے حوالے سے اپنے بنیادی اصولوں کی وجہ سے پہلے ہی دنیا بھر میں شہرت حاصل کر چکا تھا۔ ایک خدا کا تصور، بت پرستی کی مخالفت اور سب کی برابری کی بنا پر مظلوم اور پسے ہوئے ہندو عوام کو اس کی جانب راغب ہونا ہی تھا۔ لہذا، بھکتی مصلحین کے مقاصد میں سے ایک یہ تھا کہ وہ خود اپنے گھر کو درست کر کے لوگوں کو اسلام قبول کرنے سے روکیں۔ اس طرح، انہوں نے بھکتی تحریک کو اسلام کی بڑھتی ہوئی لہر کے خلاف ایک دفاعی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔

15.7 اصل حقیقت سے فرار کے طور پر بھکتی

کچھ ناقدین کے مطابق، بھکتی تحریک زندگی کی تلخ حقیقتوں سے فرار کے رویے پر مبنی تھی۔ ان کا خیال ہے کہ نام نہاد مسلم حکمرانی کے قیام کے ساتھ ہی ہندو نہ صرف اپنی سیاسی آزادی کھو بیٹھے بلکہ متعدد سیاسی، مذہبی اور معاشی بے اختیاری کا شکار بھی ہوئے۔ انہیں ذِمی قرار دیا گیا اور ریاست کی مکمل شہریت سے محروم کر دیا گیا۔ چونکہ وہ عہد وسطیٰ کے سلطانوں کی گھٹن اور عدم برداشت پر مبنی اجنبی حکمرانی کے تحت مادی، سیاسی اور ثقافتی ترقی کو آگے نہیں بڑھا سکتے تھے، اس لیے انہوں نے بھکتی میں پناہ تلاش کی۔ 'جس چیز کا علاج نہیں کیا جا سکتا اسے برداشت کرنا چاہیے' اصول پر عمل کرتے ہوئے انہیں ان کے پیشواؤں نے مشورہ دیا کہ جو کچھ ان کے پاس ہے وہ اس پر قانع ہو جائیں۔ تاہم ناقدین کے ایسے دلائل ٹھوس تاریخی اعداد و شمار پر مبنی نہیں ہیں۔ وہ عہد وسطیٰ کی تاریخی سماجی حقیقت کے خلاف ہیں۔

15.8 بھکتی مصلحین کی اہم تعلیمات

بھکتی مصلحین میں سے ہر ایک نے اپنے تبلیغی (مشنری) کام کو اپنے اصلی یا انفرادی انداز میں جاری رکھا۔ اکثر ان کا میدانِ عمل یا

عقیدت مندوں کا حلقہ بھی ملک کے مخصوص علاقوں یا کچھ حصوں تک محدود رہتا۔ لہٰذا، یہ امر کوئی تعجب خیز نہیں کہ بھکتی مصلحین کی تعلیمات میں بعض اوقات سماجی و مذہبی برائیوں کے خاتمے کے لیے اختیار کردہ مواد اور طریقہ کار میں فرق نظر آتا ہے۔ اس کے باوجود ان کی عمومی تعلیمات کی کوئی جامع فہرست تیار کرنا مشکل نہیں ہے۔ وہ قادر مطلق، ہر وقت اور ہر جگہ موجود اور ہر چیز کا علم رکھنے والے واحد خدا پر اٹل یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے نجات کے حصول کے لیے خدا کی خالص عبادت کی۔ تمام بھکتی مصلحین نے ایسے 'گرو' یا روحانی رہنما کی اہمیت پر زور دیا جو عقیدت مندوں کو ان کے اہداف کے حصول میں مدد دے سکے۔ صرف ایک سچا استاد جو ذاتی برائیوں اور دنیاوی لالچوں سے پرے ہو اور جس نے بھکتی مارگ کی راہ میں آسمانی علم (علم الٰہی) کا مزہ چکھا ہو وہی اپنے پیروکاروں کو روحانی تعلیم دے سکتا ہے اور انہیں اندھیرے سے روشنی کی طرف لے جا سکتا ہے۔ چنانچہ گوشت و خون سے بنے ایک جاندار گرو کو اختیار کرنا، نجات کے حصول کا ایک ناگزیر ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ بہت سے ممتاز مبلغین نے خود گرو کا کردار اختیار کیا اور ان کے عقیدت مندوں نے انہیں اپنا گرو تسلیم کیا۔ اخلاقی تعلیم بھکتی مصلحین کی تعلیمات کا ایک لازمی حصہ تھی۔ جو لوگ گرو سے بپتسمہ لینا چاہتے تھے ان کے لیے اعلیٰ اخلاقی کردار اور نیک زندگی گزارنا شرط تھی۔ خدا کے آگے مکمل خود سپردگی یا خدا کے لیے خود کو مکمل طور پر وقف کر دینا روحانی علم اور خدائی نعمتوں کے حصول کے لیے ناگزیر سمجھا جاتا تھا۔ ہر عقیدت مند سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ اپنی انا، ذاتی خواہشات، نفسانی لذتوں اور دیگر دنیاوی لالچوں کو دبا کر فکر، قول اور عمل کے لحاظ سے خود کو خدا کی عبادت کے لیے وقف کر دے۔ بھکتی مصلحین تمام انسانوں کی برابری پر یقین رکھتے تھے اور انہوں نے لوگوں میں دیگر انسانوں کو آگے بڑھانے کے جذبات کو فروغ دینے کی وکالت کی۔ مثلاً تمام انسان ایک ہی خدا کی اولاد ہیں، اس لیے تمام انسانوں کو کسی دوسرے شخص کی ذات، رنگ اور نسل سے قطع نظر ایک دوسرے سے محبت کرنی چاہیے۔ بنی نوع انسان سے محبت خدا سے حقیقی عقیدت تھی۔

انقلابی مصلح ہونے کے ناطے، زیادہ تر بھکتی سنتوں نے جڑ پکڑی ہوئی سماجی اور مذہبی برائیوں کے خلاف بھرپور مہم چلائی۔ انہوں نے برہمن پجاریوں کی بالادستی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا جو اپنے آپ کو تمام مذہبی علم اور اداروں کے ٹھیکیدار سمجھتے تھے اور جو بنیادی طور پر ہندو سماج کے زوال اور انحطاط کے ذمہ دار تھے۔ کچھ بھکتی سنتوں نے ہندو صحیفوں اور سنسکرت زبان کے تقدس کو چیلنج کیا جو عوام کے لیے ناقابل فہم ہو چکی تھی۔ ان سب نے لوگوں کی مقامی بولیوں میں پرچار کیا جسے وہ آسانی سے سمجھ سکتے تھے۔ اس سے ملک کے طول و عرض میں بھکتی تحریک کے تیزی سے پھیلنے میں مدد ملی۔ بھکتی مصلحین نے بت پرستی، توہم پرستانہ عقائد اور رسومات اور یگنوں کے انعقاد اور مقدس مقامات کی زیارت سمیت بے معنی رسومات کی مذمت کی۔ انہوں نے خود غرض اور مکار پجاریوں جانب سے غریب اور ناواقف عوام کے ساتھ کی جانے والی تانترک رسومات اور دھوکہ دہی پر ایک زوردار حملہ کیا۔ بھکتی مصلحین نے نہ تو مابعد الطبیعاتی تصورات پر اختلاف کیا اور نہ ہی فلسفیانہ معاملات کی گہرائی کے چکر میں جانے کی کوشش کی۔ اس کے بجائے، وہ اپنے خیالات اور نقطہ نظر میں بنیادی طور پر چنندہ اور وسیع النظر تھے۔ وہ تمام انسانوں کی برابری پر یقین رکھتے تھے اور 'اچھوتوں' کے تئیں اپنائیت کے جذبات کو فروغ دیتے تھے۔ بھکتی مصلحین میں سے بہت سے خود نچلی ذات سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی تعلیمات اونچی ذات اور نچلے، امیر اور غریب، تعلیم یافتہ اور ان پڑھ دونوں کے لیے

تھیں۔ان کے پیغام میں ایک مقبول اپیل تھی۔

15.9 ممتاز بھکتی مصلحین

15.9.1 رامانج (1017-1137)

شنکراچاریہ کے بعد بھکتی تحریک کے عظیم شارح رامانج چاریہ تھے۔ان کا تعلق جدید آندھراپردیش سے تھا۔چند دانشوروں نے انہیں بھکتی تحریک کے بانیوں میں سے ایک کے طور پر پہلے درجہ پر رکھا ہے ہے کیونکہ صحیح کہا جائے تو وہی تھے جنہوں نے حصول نجات کے اصل ذریعہ کے طور پر بھکتی کو گیان پر ترجیح دی۔عقیدہ کے لحاظ سے وہ ایک وشنو تھے۔انہوں نے ویدانت کی تربیت اپنے استاد کانچی پورم کے پرکاش یادو سے حاصل کی جو شنکراچاریہ مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔رامانج نے شنکر کے نظریہ کے کچھ فلسفیانہ پہلوؤں جیسے کائنات محض ایک نظروں کا دھوکا (مایا) ہے اور مطلق توحید وغیرہ سے اختلاف کیا۔رامانج نے ایک ذاتی خدام جو اعلیٰ ترین حقیقت کی تشکیل کرتا ہے، کی عبادت پر زیادہ زور دے کر ویدانت کے فلسفے کی نئی تعریف کی۔انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ خدا کائنات کا سب سے بڑا خالق، فنا کرنے والا اور محافظ ہے اور روح اگرچہ اسی ربانی قوت کا ایک حصہ ہے، پھر بھی اس سے الگ ہے۔رامانج نے کہا کہ ویدانت کے توحیدی فلسفے کے اندر ثنویت موجود ہے۔ایک عظیم اسکالر اور بڑے پیمانے پر سفر کرنے والے رامانج نے بھکتی فرقے پر متعدد کتابیں اور مقالے تصنیف کیں، جن میں بھگوت گیتا بھی شامل ہے۔ شنکراچاریہ کے برعکس، رامانج اپنے سماجی نقطہ نظر میں بہت آزاد خیال تھے اور انہوں نے اپنی تعلیمات میں ذات پات کی رکاوٹوں کو توڑ دیا۔انہوں نے اپنی زندگی میں بھکتی مصلح کے طور پر قومی شہرت حاصل کی اور 120 سال کی عمر میں اپنی موت سے قبل اپنے ذاتی روابط کی بنیاد پر ان کے 10,000 سے زیادہ عقیدت مند موجود تھے۔

15.9.2 نمبکار

جنوبی ہند سے تعلق رکھنے والے رامانج کے ایک نوجوان ہمعصر، نمبکار نے متھرا کے قریب بَرجا میں اپنا آشرم قائم کیا، اور کرشن اور رادھا کی شکل اختیار کر کے خدا کے خود سپردگی کا پرچار کیا۔ان کا فرقہ وادی گنگا میں عام لوگوں میں بہت مقبول ثابت ہوا۔

15.9.3 مادھواچاریہ

مادھواچاریہ، تیرہویں صدی میں پروان چڑھنے والے وشنومت کے ماننے والے تھے جن کا تعلق جنوبی ہندوستان سے تھا۔انہوں نے وشنومت سینتیس کتابیں تصنیف کیں، جن میں بالخصوص شنکراچاریہ کی جانب سے توحیدی فلسفے سے ہٹ کر ثنویت کے فلسفہ کو اپنانے پر بحث کی گئی۔مادھواچاریہ کے مطابق، کائنات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔سواتنتر یعنی 'آزاد' اور اسواتنتر معنی 'منحصر'۔سواتنتر میں قادر مطلق، ہر وقت اور ہر جگہ موجود اور ہر چیز کا علم رکھنے والے واحد خدا شامل ہے۔جبکہ اسواتنتر، مادے اور روحوں پر مشتمل ہے۔تاہم، فلسفیانہ قیاس آرائیوں کے یہ گنجلک معاملات ان کے ماننے والوں کی فکر کا محور نہیں تھے جو ان کی سرپرستی میں خدا کی گہری عبادت کے ذریعے نجات حاصل کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔

15.9.4 رامانند

بھکتی تحریک کے پہلے ممتاز مبلغ، جن کی پیدائش اور پرورش شمالی ہند میں ہوئی، رامانند تھے۔ان کی آمد کے ساتھ ہی بھکتی تحریک جنوب سے وادیٔ گنگا میں منتقل ہو گئی۔پریاگ کے کنیا کبج برہمن والدین کی اولاد، رامانند نے بنارس میں ہندو مذہبی فلسفے میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور رامانج مکتب فکر کے مبلغ بن گئے۔اس کے فوراً بعد، انہوں نے رام اور سیتا کی عقیدت مندی کے نظریے کی بنیاد پر ایک آزاد فرقہ قائم کیا۔ انہوں نے ہندو مذہب کے واحد ٹھیکیدار کی حیثیت سے، برہمنوں کی بالادستی کی سختی سے مخالفت کی اور شودروں اور نچلی ذاتوں میں سے اپنے عقیدت مند بنائے حالانکہ وہ ذات پات کے تعصبات کو یکسر ختم نہیں کر سکے۔یہ رامانند ہی تھے جنہوں نے درج ذیل مشہور قول تصنیف کیا:

''ذات پات پوچھے ناہی کوئی، ہری کو بھجے سو ہری کا ہووے''ترجمہ۔کوئی آدمی کسی سے اس کی ذات نہ پوچھے۔اگر وہ خدا کی پرستش کرتا ہے تو وہ خدا کی ملکیت ہے اور خدا اس کے ساتھ ایک ہو جاتا ہے۔

رامانند نے بھکتی تحریک کے پرچار کے لیے ہندی کو اپنایا، جو اس وقت وادیٔ گنگا میں عام لوگوں کے بولی جانے والی زبان تھی، اور اس طرح اس زبان کے فروغ کے لیے ایک عظیم الشان خدمت انجام دی۔وہ پہلے بھکتی مصلح تھا جنہوں نے خواتین کے لیے خدا کی عبادت کے دروازے کھولے اور خواتین مرید بنائے۔ان کے مرنے کے بعد اس کے بارہ مرید مشہور ہوئے اور جنہوں نے ان کا پیغام گھر گھر پہنچایا۔ان میں، دیگر کے علاوہ، دھنا(ایک جاٹ)، سینا(ایک حجام)، رائے داس(ایک موچی)اور پدماوتی اور سورساری نامی دو خواتین شامل تھیں۔

15.9.5 کبیر (1440-1510ء)

کبیر رامانند کے تمام مریدوں میں سب سے زیادہ مقبول تھے۔وہ ہندوستان میں بھکتی تحریک کی تاریخ میں ایک قابل فخر مقام رکھتے ہیں۔کہا جاتا ہے کہ وہ ایک ہندو بیوہ کے بیٹے تھے جنہوں نے شرمندگی سے بچنے کے لیے انہیں پیدائش کے بعد بنارس میں پانی کے حوض کے پاس چھوڑ دیا۔انہیں نیرو نامی ایک مسلمان جلاہے نے اٹھا کر اپنے بیٹے کی طرح پال۔کبیر نے شادی کی اور اپنے سرپرست باپ کے پیشے کو اپنایا لیکن ایک کم گو اور سنجیدہ مزاج آدمی ہونے کی وجہ سے انہوں نے اپنا زیادہ تر وقت تنہائی اور مراقبہ میں گزارا۔رامانند نے انہیں بھکتی فرقے میں لانے کی کوشش شروع کی۔بھکتی تحریک کے دائرے میں کبیر کا داخلہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان صلح کل کروانے میں سب سے زیادہ کارآمد ثابت ہوا۔کبیر دونوں مذہبی برادریوں کے ساتھ اپنی مکمل وابستگی کے ساتھ، دونوں میں سے کسی ایک کے خلاف مذہبی تعصب سے پاک تھے۔اس نے بھکتی مصلحین کے ساتھ ساتھ صوفی سنتوں کے ساتھ بھی کندھا ملایا۔اگرچہ وہ اپنے نقطہ نظر میں شدید مذہبی تھے لیکن وہ ہندو مذہب یا اسلام، ان میں سے کسی ایک کے پیروکار نہیں تھے۔وہ بالکل آزاد خیال فرد تھے اور انہوں نے دونوں مذاہب کی برائیوں پر برملا کھلی تنقید کی۔کبیر نے ہندوؤں اور مسلمانوں پر مشتمل مخلوط اجتماعات سے خطاب کیا اور دونوں فرقوں سے اپنے مرید بنائے۔انہوں نے برہمنوں اور ملاؤں کی یکساں طور پر ان کے مذہبی احکامات کے واحد ٹھیکیدار ہونے کی مذمت کی اور ان کو ان کے راسخ العقیدہ اور استحصالی رویہ کے لیے آڑے ہاتھوں لیا۔انہوں نے ویدوں کے ساتھ ساتھ قرآن کو نازل شدہ صحیفے ماننے سے انکار کر دیا۔

کبیر خدا کی وحدانیت پر یقین رکھتے تھے، قطع نظر اس کے کہ اسے کس ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ کبیر نے ہندوؤں میں موجود بت پرستی، ذات پات کے نظام اور اچھوت پرستی کی شدید مخالفت کی اور ساتھ ہی مسلمانوں کی دقیانوسی اور بے معنی رسومات کی مذمت کی۔ انہوں نے پاکیزگی قلب اور خلوصِ خدا کے بغیر مسجد میں پانچ نمازیں ادا کرنے کو فضول قرار دیا۔ کبیر نے مذہبی رواداری پر زور دیا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو بھائی چارے کا سبق سکھایا۔ وہ ان نمایاں بھکتی اصلاح کاروں میں سے ایک تھے جنہوں نے زندگی کے تمام شعبوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی پوری کوشش کی۔ کبیر نے ستی اور بچپن کی شادی کے رواج کے خلاف آواز اٹھائی، یہ دو برائیاں مکمل طور پر سماجی تھیں۔ کبیر دنیا کو ترک کرنے اور حقیقی علم یا نجات کی تلاش میں جنگلوں یا پہاڑیوں پر جانے کے حق میں نہیں تھے۔ اس کے بجائے، انہوں نے اپنے پیروکاروں کو نصیحت کی کہ وہ محنت کر کے اپنی روزی کمائیں اور ایک دیانتدار، شریف اور وقف زندگی گزارتے ہوئے گھر کے تمام فرائض انجام دیں۔ کبیر کی تعلیمات وقت کے سماجی اور مذہبی تقاضوں سے کامل ہم آہنگ تھیں۔ انہوں نے خود کو ایک مربوط ہندوستانی سماج کے تصور سے پوری طرح ہم آہنگ کیا اور لاکھوں لوگوں کے دل جیت لیے۔ ان کے دوہا اور مشہور انقلابی اقوال بڑے پیمانے پر مشہور ہیں اور قرونِ وسطیٰ کے ہندوستانی ثقافتی ورثے کا ایک اٹوٹ حصہ بن چکے ہیں۔ ان کی موت کے بعد، ان کے ہندو اور مسلمان دونوں پیروکار، کبیر پنتھی کے نام سے مشہور ہوئے۔ کبیر پنتھ کے عقیدت مند اور پجاری کا عہدہ آج تک اپنی الگ شناخت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

15.9.6 گرونانک (1469-1538ء)

گرو نانکِ کبیر کے ہمعصر نوجوان تھے۔ انہوں نے پنجاب میں سماجی اور مذہبی اصلاحات کا بیڑا اٹھایا اور قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان کے تمام بھکتی اصلاح کاروں میں سب سے زیادہ مقبول ثابت ہوئے۔ ان کی تعلیمات کبیر کی تعلیمات سے ملتی جلتی تھیں حالانکہ نانک اپنے نقطہ نظر کے لحاظ سے کبیر سے زیادہ انقلابی تھے، اور طویل مدتی لحاظ سے ان کی کوششیں تمام بھکتی مصلحین کی بہ نسبت بہت زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہوئیں۔ نانک 1469 میں تلونڈی، جدید ننکانہ صاحب میں (موجودہ پاکستان میں) پیدا ہوئے۔ ان کے والدین کالورام اور ترپتا دیوی کا تعلق مہتا کھتری ذات سے تھا۔ نانک تمام دنیاوی لالچوں اور اپنی عمر کی عام برائیوں سے پاک، ایک غور و فکر کرنے والے انسان کے طور پر پلے بڑھے۔ ان کی شادی سُلا کھانی سے ہوئی اور ان کے دو بیٹے تھے۔ انہیں عرفان 1594ء میں اس وقت حاصل ہوا جب وہ سلطان پور لودھی میں سرکاری گودام میں ملازم تھے۔ نانک ایک سنیاسی بن گئے، گو کہ یہ عارضی طور تھا، اور انہوں نے شمال مغربی ہندوستان میں بھکتی تحریک شروع کی۔ سفر کے پانچ دوروں میں، جسے اداسی کہا جاتا ہے، اور جو تیس سال سے زائد عرصے پر محیط ہے، گرونانک نے سیلون اور مکہ اور مدینہ کی مسلمانوں کی زیارت گاہوں کے علاوہ ملک کے ہر کونے تک ربانی عبادت کا پیغام پہنچایا۔ ان کی تعلیمات بھکتی تحریک کے تمام مذکورہ بالا اصولوں کے مطابق تھیں، اس میں کبیر کی طرح صرف اضافہ یہ تھا کہ انہوں نے بھی اپنے پیروؤں کے لیے گھریلو زندگی گزارنے کی وکالت کی۔ اس انقلابی تصور کو انہوں نے اس وقت منطقی انجام تک پہنچایا جب انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ خدا کے بندوں کے لیے نجات کے حصول کے راستے پر، ایک ایماندار روٹی کمانے والے اور گھر والے کی زندگی اسی طرح گزارنا ممکن ہے جس طرح کنول کا پھول گدلے پانی کے درمیان بے داغ کردار کے ساتھ زندہ رہتا ہے۔

اپنی زندگی کے آخری ایام میں نانک نے راوی کے کنارے کرتارپور میں (ہندو مٹھوں یا صوفی سنتوں کی خانقاہوں کی طرح) اپنا ڈیرہ قائم کیا اور اپنے خاندان کو اپنے ساتھ دوبارہ شامل ہونے کی اجازت دی۔ انہوں نے ایک آئیڈیل گھریلو فرد کی مثال قائم کرنے کے لیے ہل چلانا شروع کیا۔ گرو نانک نے 'عالمگیر بھائی چارہ' کو اپنا نعرہ بنایا، جو کہ صوفی سنتوں کا ایک تصور ہے، اور ہندو مسلم اتحاد کی حمایت کی۔ انہوں نے اپنے پیروکاروں میں سے ذات پات کے امتیاز اور ذات پات کی تفریق کی برائیوں کو ختم کرنے کے لیے ایک عملی قدم کے طور پر اپنے ڈیرہ میں اجتماعی بعام (لنگر) متعارف کروایا۔ گرو نانک کے مشن کی ایک عظیم کامیابی گرو کے ادارہ کا قیام تھا جو انہوں نے اپنی تعلیمات کے مسلسل پرچار کے لیے قائم کیا۔ اپنی زندگی کے دوران، انہوں نے روحانی قابلیت کی بنیاد پر، اپنے بیٹوں کے مقابلے اپنے ایک مرید 'بھائی لہنا' (انگد) کو فوقیت دی اور انہیں اپنا جانشین مقرر کیا۔ 1538ء سے 1708ء عیسوی تک نو گروؤں نے گرو نانک کے روحانی تخت کو سجایا۔ اس انقلابی قدم نے سکھ مت کو ایک الگ مذہب کے طور پر جنم دیا۔

15.9.7 ولبھ چاریہ

پندرہویں اور سولہویں صدی میں بھکتی تحریک اپنے پورے آب و تاب پر رہی اور اس کی بازگشت سترھویں صدی کے وسط تک سنی گئی۔ دیگر بھکتی مصلحین میں ولبھچاریہ کا تذکرہ ضروری ہے۔ وہ 1479ء میں جنوبی ہندوستان کے ایک تلگو برہمن خاندان میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے بنارس میں اپنا آشرم قائم کیا اور وادی گنگا کرشنا فرقہ کو پھیلایا۔

15.9.8 میرابائی (1498-1546)

میرابائی خواتین میں سے تمام بھکتی مصلحین میں سب سے مشہور تھیں۔ وہ ایک راجپوت شہزادی تھیں۔ ان کی شادی رانا سانگا کے سب سے بڑے بیٹے اور مجوزہ تخت کے وارث، شہزادہ بھوج راج سے 1516ء میں ہوئی۔ بھوج راج اپنے والد کی زندگی ہی میں قبل از وقت انتقال کر گئے اور میرابائی بیوہ ہو گئیں۔ ان کے غم میں اس وقت مزید اضافہ ہوا جب ان کے والد 1527ء میں خانوا کی تاریخی جنگ میں رانا کی طرف سے لڑتے ہوئے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور اس کے فوری بعد ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ رانا سانگا نے بھی اپنی زندگی کی آخری سانس لی۔ میرابائی اس تکلیف دہ دنیاوی زندگی کے دباؤ کو برداشت نہ کر سکیں، اور وہ ایک سنیاسی بن گئیں اور انہوں نے بھکتی فرقہ کو اپنایا۔ انہوں نے کرشنا کے نام پر خدا کی عبادت کا پرچار کیا۔ وہ ہندی اور سنسکرت کی عالم تھیں اور پیدائشی طور پر ایک شاعرہ تھیں جن کے بھکتی گیت اور نغمے سولہویں صدی کے ہندوستان کا ایک بھرپور ثقافتی ورثہ ہیں۔ ان کی زندگی کے آخری سال دوارکا میں گزرے۔ بھکتی تحریک میں ان کے داخلے نے تقریباً ہر ہندو گھرانے تک خدا کی عبادت کا پیغام پہنچایا۔

15.9.9 چیتنیہ مہاپربھو (1486-1533)

چیتنیہ مہاپربھو، نادیہ کے ایک برہمن گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ بنگال کے سب سے مشہور بھکتی مصلح تھے۔ پچیس سال کی عمر میں وہ سنیاسی بن گئے اور انہوں کرشنا فرقے کو اپنایا۔ وہ متھرا اور ورنداون میں کئی سالوں تک رہے اور لاکھوں بھکتوں کو اپنی جانب متوجہ

کیا۔ وہ ذات پات کے نظام اور بھید بھاؤ کے سخت مخالف تھے۔ وہ محبت کی وہ تصویر بن گئے جس کا دل غریبوں اور پسے ہوئے لوگوں کے دکھوں کو دیکھ کر ترس سے پگھل جاتا ہے۔ وہ بنگال میں اتنے زیادہ مقبول تھے کہ ان کے عقیدت مندوں نے انہیں وشنو یا خود کرشنا کا اوتار قرار دیا۔

15.10 مہاراشٹر کے بھکتی سنت

15.10.1 نام دیو (1270-1350)

مہاراشٹر میں سماجی اور مذہبی انقلاب لانے کا سہرا بھکتی تحریک کو جاتا ہے جس کی قیادت نام دیو، تکارام اور رام داس کر رہے تھے۔ نام دیو جو پیشے کے لحاظ سے ایک درزی تھے، مہاراشٹر کے پہلا ممتاز بھکتی مصلح بن گئے۔ انہوں نے ہندو مذہب پر برہمن پجاریوں کی بالادستی کو دلیری سے چیلنج کیا، بت پرستی اور ذات پات کے نظام کی مخالفت کی اور مراٹھوں کے درمیان باہمی محبت اور ہمدردی کا ماحول پیدا کیا۔ نام دیو نے تمام ذاتوں اور طبقات سے اپنے پیرو بنائے۔ ان کی تعلیمات، مذکورہ بالا بھکتی تحریک کی تعلیمات کے مطابق تھیں۔ انہوں نے ہری کے نام سے خدا کے آگے سپردگی کا پرچار کیا۔

15.10.2 تکارام (1601-1649)

تکارام، سترھویں صدی کے پہلے نصف میں مہاراشٹر میں پروان چڑھے۔ وہ پیدائشی طور پر شودر تھے۔ انہوں نے نوعمری میں ہی رہبانیت اختیار کی اور خدا ترسی کی زندگی گزاری اور لوگوں کی خدمت کی۔ انہوں نے ذات پات کے ڈھانچہ کو شدید دھکا پہنچایا اور مہاراشٹر میں ایک مساویانہ سماج کی تعمیر میں لوگوں کی مدد کی۔ تکارام نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے بھی کام کیا اور مراٹھا حکمران شیواجی سے داد و تحسین حاصل کی۔

15.10.3 سوامی رام داس (1608-1681)

یہ شیواجی کے ایک معزز استاد تھے، جنہوں نے سترھویں صدی میں مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو اخلاقی اور روحانی پس منظر فراہم کیا۔ شیواجی اور ان کی ماں جیجا بائی دونوں ہی پر مارتھ طبقہ سے تعلق رکھنے والے رام داس کے مرید تھے اور جن زندگی کے عمومی فلسفہ کا ذکر ان کی یادگار تصنیف داسابودھ میں ملتا ہے۔

15.11 بھکتی تحریک کا اثر

بھکتی فرقے نے چودھویں صدی کے اختتام پر ایک وسیع پیمانے پر عوامی تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ یہ بنیادی طور پر ایک مقامی تحریک تھی جس میں ہندوؤں کے تمام طبقات اور ذاتیں شامل تھیں۔ اس کی بنیادیں یا مقبولیت اسلام کی مرہون منت نہیں تھی حالانکہ یہ کسی حد تک صوفیوں کے تصوف کے فلسفے سے متاثر تھی۔ بھکتی تحریک نے اپنے معلنہ مقاصد کو کافی حد تک حاصل کر لیا۔ اس نے سماج میں برہمن پجاریوں کے غلبہ پر شدید ضرب لگا کر ہندو مت کا احیا کیا۔ اس نے عوام کا ان کے مذہبی اور سماجی ثقافتی ورثے پر اعتماد بحال کیا اور بڑے پیمانے

پر جاری قبولیت اسلام کی لہر پر پابندی لگائی۔ ذات پات کے قلعے کو توڑا نہیں جا سکا تاہم اس کے برے اثرات کو اونچی ذات اور نچلی ذات کے ہندوؤں کے درمیان ہم آہنگی کے رشتوں اور آزادانہ سماجی میل جول کے ماحول کو فروغ دیتے ہوئے کم سے کم کیا گیا۔ ہندوؤں کو جن بے شمار سماجی برائیوں کا سامنا تھا ان کا مکمل خاتمہ نہیں کیا جا سکا۔ تاہم، جب ان برائیوں کو پوری طرح سے بے نقاب کیا گیا اور ان پر لعن طعن شروع ہوئی، تب ان برائیوں میں کمی آئی اور لوگوں کے شعور سے نکلنا شروع ہوئیں۔ بھکتی تحریک نے زندگی کی عمدہ اقدار پر زور دیا اور اس طرح مجموعی طور پر سماج کے عمومی اخلاقی رویہ کو بہتر بنایا۔ بھکتی مصلحین اور صوفی سنتوں نے انفرادی طور پر اور اجتماعی طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بھائی چارے اور ہم آہنگی کی فضا پیدا کرنے میں مدد دی۔ بھکتی تحریک نے نام نہاد ہندو اور مسلم ثقافتوں یا مقامی اور غیر ملکی ثقافتی روایات کے درمیان قومی یکجہتی و اتحاد کی قوتوں کو ایک مہمیز دی۔

بھکتی تحریک کے کچھ ضمنی یا مابعد اثرات بھی قابل ذکر ہیں۔ تمل، تلگو، ہندی، پنجابی، بنگالی اور مراٹھی سمیت مقامی زبانوں کی ترقی کا زیادہ تر سہرا بھکتی مصلحین کو جاتا ہے جنہوں نے لوگوں کی مقامی بولیوں اور زبانوں میں اپنی مہم کو آگے بڑھایا۔ بھکتی کے موضوع نے ان زبانوں کے ادبی ذخیرے کو بھی تقویت بخشی کیونکہ اس نے ان ہندوستانی علما کو فکر اور اظہار کا ایک نیا زاویہ فراہم کیا جو بصورت دیگر مبلغین کے طور پر تحریک میں شامل نہیں تھے۔ مثال کے طور پر، دو قابل ذکر اسکالر سنتوں، سور داس اور تلسی داس نے سولہویں صدی کے دوسرے نصف اور سترہویں صدی کی پہلی سہ ماہی میں ہندی ادب کو ثروت مند بنانے میں گراں قدر تعاون کیا۔ اور بعد ازاں، پنجاب میں سکھ مت کی پیدائش، اس بھکتی تحریک کا براہ راست نتیجہ تھا جو پنجاب میں گرو نانک نے 1594 عیسوی میں شروع کی تھی، اس طرح، بھکتی تحریک نے عہد وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ، معاشرہ اور ثقافت میں کثیر جہتی تعاون کیا۔

15.12 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد، آپ نے بھکتی کے تصور اور عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں بھکتی تحریک کے ابھرنے کے اسباب کو سمجھا۔ آپ بھکتی مصلحین کی مختلف تعلیمات سے بھی واقف ہوئے۔ آپ نے سمجھ لیا کہ بھکتی مصلحین نے ذات پات کے نظام، چھوا چھوت اور بت پرستی کی مذمت کی اور تمام انسانوں کے بھائی چارے کی وکالت کی۔ آپ نے ان بہت سے بھکتی سنتوں کے بارے میں بھی پڑھا جنہوں نے ملک کے مختلف حصوں میں اپنا کام انجام دیا۔ آپ نے عہد وسطیٰ کے ہندوستانی سماج، تاریخ اور ثقافت پر بھکتی تحریک کے اثرات کو بھی جانا۔ آپ پر یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ بھکتی سنتوں نے سماجی اور روحانی جمہوریت (مساوات) کی وکالت کی اور ایک استحصال سے پاک مساوات پر مبنی سماج کا تصور کیا۔ وہ خدا اور مذہب کے توسط سے عام لوگوں پر ظلم و ستم کا خاتمہ چاہتے تھے۔ آپ پر یہ بات بھی بالکل واضح ہو گئی ہے کہ ہندوستانی معاشرہ کسی بیرونی عامل کی ضرورت کے بغیر خود کو اندر سے بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

15.13 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

15.13.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. ''ذات پات نہ کوئی، ہری کو بھجے سو ہری کا ہووے'' کس نے کہا؟

(a) کبیر (b) گرونانک (c) سنت رَیداس (d) چیتنیہ مہاپربھو

2. گرونانک (Guru Nanak) کہاں پیدا ہوئے تھے؟

(a) امرتسر (b) لاہور (c) ننکانہ صاحب (d) دہلی

3. میرابائی (Meera Bai) کس کی پوجا کرتی تھی؟

(a) رام (b) کرشن (c) شیو (d) وشنو

4. ''داس بودھ (Dasbodh) '' کس نے تصنیف کی؟

(a) رام داس (b) تکارام (c) نام دیو (d) ایک ناتھ

5. چیتنیہ مہاپربھو (Chaitanya Mahaprabhu) کہاں کے رہنے والے تھے؟

(a) بنارس (b) نودیپ، بنگال (c) متھرا (d) اجمیر

15.13.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. بھکتی تحریک میں کبیر کے تعاون و خدمات پر نوٹ لکھیے۔
2. شنکراچاریہ پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. میرابائی پر نوٹ لکھیے۔

15.13.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. عہد وسطیٰ کے ہندوستانی سماج اور ثقافت پر بھکتی تحریک کے اثرات کا تجزیہ کریں۔
2. 'بھکتی تحریک ثابت کرتی ہے کہ ہندوستانی سماج بیرونی عوامل کے بغیر خود کو اندر سے بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔' بحث کریں۔

Answer Key:
1. (c) | 2. (c) | 3. (b) | 4. (a) | 5. (b)

اکائی 16۔ تصوف

(Sufism)

اکائی کے اجزا

16.0 تمہید

16.1 مقاصد

16.2 تصوف کی تعریف

16.3 ہندوستان میں تصوف

16.4 صوفیا کی اہم تعلیمات

16.5 ہندوستانی صوفیوں پر بھکتی تحریک کا اثر

16.6 ہندوستان کے مشہور صوفیاء

16.7 چشتی سلسلہ

16.7.1 خواجہ معین الدین چشتی

16.7.2 قطب الدین بختیار کاکی

16.7.3 شیخ فرید گنج شکر

16.7.4 شیخ نظام الدین اولیاء

16.7.5 شیخ نصیر الدین محمود

16.7.6 بنگال میں چشتی سلسلہ

16.7.7 دکن میں چشتی سلسلہ

16.8 چشتی صابری سلسلہ

16.9 شیخ سلیم چشتی

16.10 سہروردی سلسلہ

16.11 قادری سلسلہ

16.12 نقشبندی سلسلہ
16.13 شطاری سلسلہ
16.14 تصوف کے اثرات
16.15 اکتسابی نتائج
16.16 کلیدی الفاظ
16.17 نمونہ امتحانی سوالات

16.0 تمہید (Introduction)

تصوف دنیا کے ہر مذہب کا ایک ناگزیر حصہ ہے۔ اسلامی تصوف، جسے تصوف یا صوفی مت کے نام سے جانا جاتا ہے، اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود اسلام۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اسلام کے بطن سے پیدا ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں کچھ نیک طینت اور شرمیلے لوگ تھے جنہوں نے اسلام کو بخوشی قبول کیا لیکن اس پر عمل پیرا ہونے میں سستی کا مظاہرہ کیا۔ ایسے آزاد منش بندگانِ خدا قرآنی تعلیمات اور حیات نبویؐ سے متاثر ہوئے۔ انہوں نے دیر پا روحانی خوشی حاصل کرنے کے لیے اپنے باطن کی تطہیر پر زیادہ زور دیا۔ اسلام میں قادرِ مطلق، اللہ تعالیٰ جیسی اعلیٰ ترین ہستی کے وجود کے بارے میں شعور ہی نیک لوگوں کے ذہنوں کو مسحور کرنے کے لیے کافی تھا کہ وہ خود سپردگی، مراقبہ اور خدمت خلق کے ذریعہ معرفتِ خداوندی حاصل کر سکیں۔ تصوف کا اسلام کے علاوہ کوئی علاحدہ مقصد یا عقیدہ نہیں تھا اور ایک طویل عرصے تک اس کی کوئی تنظیم یا خانقاہی نظام نہیں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے نویں صدی میں اسلام کی سخت گیر رسمیت (شعائر) کے خلاف رد عمل کے طور پر ایران میں ایک باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کی۔ بغداد کے عباسی خلفا کے زمانے میں اسے ایک نظریاتی بنیاد حاصل ہوئی اور صوفی بزرگوں نے عیسائیت، ہندومت، بدھ مذہب اور جین مذہب سمیت دیگر مذاہب اور لوگوں سے تصوف کے نظریات کو فراخ دلانہ طور پر اخذ کرنا شروع کیا۔ تاراچند نے تصوف کو ایک پیچیدہ رجحان کے طور پر بیان کیا ہے، جس کا موازنہ ایک دریا سے کیا جاسکتا ہے جو کئی سرزمینوں سے آنے والی معاون دریاؤں کے پانی کو اکٹھا کر کے اپنی جسامت بڑھاتا ہے۔ تصوف کو مسلم قدامت پرستوں، سنی اور شیعہ دونوں نے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ اس کے نتیجے میں بعض اوقات صوفیوں کو ستایا گیا اور ان میں سے بعض کا اسلام سے ارتداد کے الزام میں درحقیقت سر قلم کر دیا گیا۔ قدامت پسندوں یا سخت گیر اسلام اور تصوف کے درمیان مفاہمت کا سہرا الغزالی (1057-1112 عیسوی) کے سر جاتا ہے، جو ایک عرب فلسفی تھے۔ انہوں نے تصوف کو اسلامی الہیات کے ایک اٹوٹ جز کے طور پر ایک مابعد الطبیعیاتی بنیاد فراہم کی۔

16.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- تصوف کے تصور کو سمجھ سکیں گے۔
- تصوف کی ابتدا اور ہندوستان میں اس کی آمد کو جان سکیں گے۔
- ہندوستان میں پروان چڑھنے والے مختلف صوفی سلسلوں سے واقف ہو سکیں گے۔
- ہندوستان میں تصوف کے فروغ اور صوفیا کی تعلیمات کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- عہد وسطیٰ کے ہندوستانی سماج اور ثقافت پر تصوف کے اثرات کا مطالعہ کر سکیں گے۔
- فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے فروغ میں صوفیائے کرام کے کردار کا اندازہ لگا سکیں گے۔

16.2 تصوف کی تعریف

اصطلاح ''صوفی'' کی تعریف متعین کرنے کی مختلف کاوشیں کی گئی ہیں۔ یہ اصطلاح نویں صدی کے آس پاس خدا ترس اور زاہد مسلمانوں کے لیے استعمال کی گئی تھی جنہوں نے مادہ پرست دنیا کی رسم و رواج اور سماجی ممنوعات سے بے پرواہ ہو کر سب سے بڑھ کر خدا کو پسند کیا اور جو خدا کے عشق میں اس درجہ ڈوبے ہوئے تھے کہ قادرِ مطلق کے خیال سے ایک لمحہ کی دوری یا انحراف بھی انہیں گوارا نہ تھا۔ بعض کے نزدیک صوفی کی اصطلاح ان کے دلوں کی پاکیزگی، ان کے خیالات کی پاکیزگی اور ان کے اعمال کی شرافت کی بنا پر لفظ 'صفا' (پاکی) سے نکلی ہے۔ دیگر افراد یہ اصطلاح صف (لائن، قطار) سے اخذ کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انہیں صوفیا اس لیے کہا گیا کہ وہ اپنی خواہشات کو خدا کی راہ میں قربان کرنے اور خدا کے آگے سر جھکانے والوں کی صف میں سب سے آگے تھے۔ تیسری تعریف کے مطابق، صوفی کی اصطلاح لفظ 'صُفہ' سے ماخوذ ہے کیونکہ ان اولیا کی صفات اصحاب صفہ یا ''چبوترے پر بیٹھنے والوں'' کے مشابہ تھیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستہ تھے جنہیں صحابی کہا جاتا ہے اور جنہوں نے خالص پاکیزہ زندگی گزاری۔ صوفی کی اصطلاح لفظ صوف یا موٹے اون سے بھی مشابہت رکھتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صوفیا کو اونی کمبل یا کپڑے کی ڈھیلی چادر پہننے کی عادت کی وجہ سے ایسا کہا گیا ہوگا۔ ان تمام مشتقات کو شیخ الاسلام، زکریا انصاری نے ایک تعریف میں خوبصورتی سے اس طرح جمع کیا ہے:

''تصوف سکھاتا ہے کہ کس طرح اپنے نفس کو پاک کیا جائے، اخلاق کو بہتر بنایا جائے اور دائمی خوشی حاصل کرنے کے لیے اپنی باطنی و ظاہری زندگی کی تعمیر کی جائے۔ اس کا موضوع روح کی تطہیر ہے اور اس کا انجام یا مقصد ابدی سعادت اور برکت کا حصول ہے۔''

اب عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ صوفیا اپنے آغاز سے ہی مسلم سماج کا ایک اہم حصہ بن گئے۔ وہ دیندار مسلمان تھے جو شرع کی حدود میں رہتے تھے اور اسے نجات کا حقیقی راستہ مانتے تھے۔ ایک مشاہدے کے مطابق راسخ العقیدہ مسلمان ظاہری طرز عمل پر انحصار کرتے ہیں جبکہ صوفی باطنی پاکیزگی کے خواہاں ہیں۔ راسخ العقیدہ مسلمان، مذہبی رسومات کی اندھی اطاعت یا ان کی پابندی پر یقین رکھتے ہیں جبکہ

صوفیوں کے خیال میں خدا تک پہنچنے کا واحد ذریعہ محبت ہے۔ صوفی اسلام کے پر امن سفیر تھے۔ انہوں نے اپنی زندگیاں انسانیت کی خدمت اور اسلام کے پھیلاؤ کے لیے وقف کر دیں۔ اسلام کی تبلیغ ان کے نزدیک، لوگوں کی سب سے بڑی خدمت تھی جس کے ذریعہ وہ ان کی اندھیروں سے روشنی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ صوفیا نے دور دراز ممالک میں ہجرت کی اور غیر مسلموں کے درمیان رہ کر پر امن ذرائع سے اپنا کام جاری رکھا۔

16.3 ہندوستان میں تصوف

صوفیا کی ہندوستان میں آمد ہندوستان میں اسلام کی آمد کے ساتھ ہی شروع ہو گئی۔ ابتدائی عرب تاجروں کے ہمراہ متعدد تارک الدنیا لوگ ہندوستان میں مالابار، کیرل اور سندھ میں وارد ہوئے۔ سندھ میں شیخ عثمان علی ہجویری جو داتا گنج بخش کے نام سے مشہور ہیں، ابتدائی دور میں ہندوستان آنے والے اہم صوفیوں میں سے ایک ہیں۔ شمالی ہندوستان میں ترک حکومت کے قیام کے بعد وسطی ایشیا سے صوفیوں نے بڑی تعداد میں ہندوستان کی جانب ہجرت شروع کی۔ وہ ہندوستانی سادھوؤں کے لباس اور انداز میں گھومتے پھرتے تھے اور انہوں نے کئی جگہوں پر اپنے آستانے قائم کر لیے۔ انہوں نے ہندوستانی قصبوں کے آس پاس نچلی ذاتوں کے بستیوں یا گھروں کے قریب اپنا ٹھکانہ بنالیا۔ ان کا پہلا مقصد اپنے اطراف بسنے والے ان افراد کی محبت اور اعتماد حاصل کرنا تھا۔ صوفیا نے اپنے آپ کو پورے ملک میں پھیلایا اور اسلام کی پر امن تبلیغ کی۔

16.4 صوفیا کی اہم تعلیمات

تصوف کی بنیاد توحیدی فلسفے پر تھی جو اسلام کا پہلا بنیادی اصول ہے۔ تاہم اس کے باوجود، صوفیا نے، بھکتی فرقے کے شارحین کی طرح، مطلق حقیقت یا خالق اعلیٰ کو جاننے اور خدا اور اس کے عقیدت مندوں کے درمیان تعلق کے معلوم کرنے کے لیے اپنی فکر اور فلسفیانہ قیاس آرائیوں کو بنیاد بنایا۔ اس سلسلے میں، انہوں نے بعض اوقات مسلم علما کے ساتھ کافی اختلاف کیا۔ بھکتی مصلحین کی طرح صوفیا بھی اپنے طریقہ تدریس کے حوالے سے کئی معاملات میں ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تصوف اپنے فروغ کے آخری مرحلے میں کئی سلسلوں میں منقسم ہو گیا، جن میں سے ہر ایک کے بانی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے کوئی نہ کوئی خاص تعاون کیا ہے یا صوفیانہ فلسفے یا اپنے شاگردوں کی تنظیمی ترتیب کو انفرادیت بخشی ہے۔ بے شک، ہندوستانی صوفیا کی بنیادی تعلیمات کے خصوصی حوالے سے تصوف کے نمایاں اصولوں کو تفصیلی طور پر بیان کرنا قابل قدر ہو گا۔

توحیدی فلسفہ نظریہ وحدت الوجود پر مبنی تھا۔ اس کے مطابق خالق (حق) اور مخلوق (خلق) مشابہ تھے۔ بالفاظ دیگر، خدا تمام کثرت کے پیچھے وحدت اور تمام غیر معمولی ظہور کے پیچھے حقیقت تھا۔ اس نظریہ کے خالق، شیخ محی الدین ابن العربی (1248-1165ء) اس کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں "خدا کے سوا کچھ نہیں، اس کے علاوہ کسی چیز کا وجود نہیں ہے۔ کوئی ایک 'کوئی اور' بھی نہیں ہے؛ جہاں تمام چیزوں کا جوہر ایک ہے۔"

یہ نظریہ مطلق توحید کے ویدانت فلسفے کے مطابق تھا جس کے مطابق خالق اور مخلوق (انسان) یا خدا اور روح ایک مطلق حقیقت ہیں۔ صوفی خدا اور روح کے درمیان ہم آہنگی کے رشتے کے قیام کے لیے کھڑے تھے، اس لیے ان کی خدا کے ساتھ براہ راست رابطہ کی آرزو تھی جو اس فانی زندگی (خاکی جامہ) میں حاکم مطلق کے لیے شدید محبت اور اس کے روبرو مکمل خود سپردگی اور اخلاص کے ذریعے ہی حاصل کی جاسکتی ہے۔ صوفی سنتوں نے اپنی حیثیت میں پیروں، موجود اساتذہ یا روحانی رہنماوں (جیسے بھکتی فرقے کے گرو) کو راستہ دکھایا اور اپنے پیروکاروں کو، جنہیں مرید کہا جاتا ہے، اس دائمی خوشی کے حصول کے لیے اسباب تجویز کیے، جس کو انہوں نے معرفت یا وصل کا نام دیا۔ راسخ العقیدہ مسلمان، وحدت الوجود یا معرفت کے عقائد کے مخالف تھے۔ ان کے نزدیک، خدا بطور حاکم مطلق اپنے ابدی وجود میں ناقابل تقسیم اور بے مثال ہے، اور یہ کہ خدا اور انسان کے درمیان تعلق وہی ہے جو خالق اور مخلوق یا آقا اور بندے کے درمیان ہے۔ دوسری طرف صوفیا نے اس رشتے کا موازنہ اس رشتہ سے کیا جو عاشق اور معشوق یا شوہر اور بیوی کے درمیان ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک خدا کی موجودگی ہر وہ شخص محسوس کر سکتا ہے جو اس کی پکار پر محبت بھرے دل سے حاضر ہوتا ہے۔ صوفیا کا خیال ہے کہ خدا ایک غیر مرئی مطلق حقیقت اور ایک ابدی حسن ہے جسے انہوں نے جمال کا نام دیا ہے اور یہ کائنات محض ایک سراب نہیں ہے۔ یہ خدا کا ظاہری یا خارجی مظہر ہے، اور اسے حسن (قابل محبت خوبصورتی) کا نام دیا گیا ہے۔ انہوں نے استدلال کیا کہ خود نمائی اور محبت کیے جانے کی خواہش ابدی خوبصورتی کی ایک لازمی صفت ہے۔ لہذا، صوفی فلسفہ، محبت کے اصول پر مبنی تھا جو تمام مذاہب کا خلاصہ اور تمام مخلوقات کا سبب تھا۔

صوفیا نے سادگی کو اپنایا اور رضائے الٰہی کے سامنے مکمل خود سپردگی پر زور دیا۔ انہوں نے تزکیہ نفس اور اپنے محبوب خدا کی ذات میں مکمل جذب ہونے کا تصور پیش کیا جس کا حصول ذاتی جدوجہد سے ممکن نہیں ہے۔ ان کا احساس تھا کہ دل کی پاکیزگی، رسوم و روایات سے کہیں زیادہ عظیم ہے اور یہ واحد راستہ ہے جس سے سچائی کا ادراک کیا جاسکتا ہے۔ ایک قول کے مطابق، ایک صوفی کو قرب الٰہی کے حصول سے پہلے خدا کے روبرو خود سپردگی کے دس مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ یہ تھے: توبہ، ورع (پرہیز)، زہد (تقوی)، فقر (فاقہ)، صبر (تحمل)، شکر، خوف (خشیت)، رجا (امید)، توکل (قناعت) اور رضا (رضائے الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کرنا)۔

بھکتی مصلحین کی طرح، زیادہ تر صوفیاء نے دنیاداری کو یا چھوڑ دیا اور انہیں تارک دنیا کہا جاتا تھا۔ اس کی وضاحت خلیق احمد نظامی نے اس طرح کی ہے: ''عام تاثر یہ ہے کہ ترک دنیا کا مطلب زندگی سے قطع تعلق کر لینا اور تمام دنیاوی رشتوں سے منقطع ہو جانا ہے، حالانکہ عصری صوفیانہ مآخذ سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ درحقیقت صوفیاء نے جسے رد کیا وہ یہ دنیا نہیں تھی بلکہ زندگی اور اس کے مسائل کے بارے میں مادیت پسندانہ روش تھی جس سے وہ نفرت کرتے اور حقیر سمجھتے تھے۔ انسان جتنا زیادہ مادیت پسندی میں مشغول ہوتا جاتا ہے، اتنا ہی وہ اپنے روحانی مقاصد سے دور ہوتا جاتا ہے۔''

کچھ صوفیاء نے تجرد اختیار کیا جبکہ بعض نے شادی کی اور عام گھریلو افراد کی طرح زندگی گزاری۔ ان کا زیادہ تر انحصار 'فتوح' (تحائف اور ہدایا) پر تھا حالانکہ ان میں سے بعض نے اپنے ذریعہ معاش کے لیے بنجر زمین کی کھیتی باڑی کو اپنا لیا۔ سماج میں طفیلیوں کا طبقہ پیدا کرنا ان کا ہرگز ارادہ نہیں تھا۔ صوفی خانقاہوں یا جماعت خانہ یعنی جائے مجلس میں رہتے تھے۔ عام طور پر صوفیوں نے سرکاری ملازمت کے ساتھ ساتھ

ریاستی سرپرستی سے بھی گریز کیا حالانکہ ان میں سے چندنے اراضی اور رقم کی شکل میں سرکاری عطایا قبول کیے اور خوشحال زندگی گزاری۔

16.5 ہندوستانی صوفیاء پر بھکتی تحریک کے اثرات

اب یہ عالمی سطح پر تسلیم شدہ ہے کہ بھکتی تحریک کے پھیلاؤ نے ہندوستانی تصوف پر گہرا اثر ڈالا اور اس کے برعکس یہی معاملہ رہا۔ صوفی عقائد ویدانت کے ساتھ زبردست مماثلت رکھتے ہیں لیکن یہ عہد وسطیٰ کے زمانے میں صوفیا پر ہندوستانی فکر کے فوری اثرات کی وجہ سے نہیں تھا۔ صوفی فلسفہ فارسی سرزمین پر پروان چڑھا جہاں اسلام کے ظہور سے بہت پہلے بدھ مذہب اور ویدک فلسفے کا نفوذ ہو چکا تھا۔ اس طرح یہ صوفی مت کا دور دراز کا ہندوستانی ثقافتی ورثہ تھا جس نے اسے بدھ مذہب اور ویدانت کی طرح مذہبی جوش اور اظہار کے طریقے فراہم کیے تھے۔ بہر حال، ہندوستانی صوفیا نے خود ایک طبقہ تشکیل دیا جو دوسرے مسلم ممالک میں اپنے ہم منصبوں سے بالکل الگ تھا۔

ہندوستانی سرزمین پر تصوف کی یہ بعد کی ترقی ہندوستانی فکر اور سماجی ماحول کی مرہون منت ہے۔ تنگ نظری اور تعصبات سے آزاد، صوفیا نے اس کہاوت کی پیروی کی، 'کبوتر با کبوتر باز با باز'۔ انہوں نے ہندوستانی سنیاسیوں کی صحبت میں گھر کا ماحول محسوس کیا اور ان جیسا نظر آنے کی کوشش کی۔ انہوں نے ان جیسا لباس، طرز عمل اور ظاہری روش اختیار کی تاکہ ہندوں کے نچلے طبقات کو شکوک وشبہات سے دور رکھا جا سکے جن کے درمیان وہ اسلام کی تبلیغ کے لیے کام کرتے تھے۔ انہوں نے ہندوستانی سادھوں اور سنتوں کے سنیاسی طریقوں، بالخصوص اپنے جسموں کو اذیت رسانی اور عوام الناس کی تفریح طبع کے لیے کرتب بازی، کی کھل کر نقل کی۔ ان کے خانقاہوں کو بدھ خانقاہوں اور ہندو مٹھوں کے انداز میں بنایا گیا تھا جہاں ہندوستانی رسم ورواج کو فراخدلانہ اختیار کیا جاتا تھا۔ ہندو سنیاسیوں کی طرح، صوفیوں نے بھی نئے آنے والوں کے سر منڈوائے اور بعض رسومات کی پابندی کی جو دوسرے مسلم ممالک میں ان کے ہم منصبوں کے لیے بالکل اجنبی تھے۔ انہوں نے اپنے مقامی رسم ورواج کے مطابق مقامی زائرین، ان کے متوقع پیروکاروں سے سلامی وصول کی اور ان طریقوں کو اپنے تنظیمی ڈھانچے کا لازمی حصہ بنایا۔ اس طرح تصوف کو پوری طرح سے ہندوستانی بنایا گیا تھا اور صوفی سنتوں کو لوگوں میں، ہندوں اور مسلمانوں میں یکساں طور پر بہت احترام حاصل تھا۔

16.6 ہندوستان کے مشہور صوفیاء

صوفیاء کئی طبقات میں تقسیم تھے جنہیں سلسلہ کہا جاتا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق عالم اسلام میں اس طرح کے زائد از 175 سلسلے وجود میں آئے۔ ابوالفضل نے صوفیاء کے 14 سلسلوں کا تذکرہ کیا ہے جو ہندوستان میں نفوذ پذیر پائے گئے اگرچہ کہ ان میں سے صرف دو ہی سلسلوں کی جڑیں ہندوستانی سرزمین میں گہری ہوئیں جو چشتی اور سہروردی ہیں۔ سہروردی سلسلہ کا مشاہدہ بالعموم سندھ اور شمال مغربی ہندوستان میں جب کہ چشتی سلسلہ تمام ہی ملک میں بہت زیادہ غالب ہوا۔

16.7 چشتی سلسلہ

شہرت اور روحانی دبدبے کے اعتبار سے چشتی صوفیوں کا ہندوستان میں کوئی مقابل نہیں تھا۔ ہندوستان میں فروکش ہونے والے پہلے صوفی سلطان سخی سرور تھے۔ انہوں نے طویل عمر نہیں پائی کہ اپنے پیچھے نقوش چھوڑ سکیں۔ اسے زیادہ منظم انداز میں قائم کرنے کا سہرا، چشتی سلسلے کے ایک اور مہاجر صوفی خواجہ معین الدین چشتی کے سر رہا۔

16.7.1 خواجہ معین الدین چشتی

سیار العارفین کا متن جو معین الدین چشتی کی وفات کے تقریباً تین سو سال بعد مرتب کیا گیا تھا، معین الدین کے سلسلہ نسب کی تفصیلات فراہم کرتا ہے۔ اس کے مطابق، سمجھا جاتا ہے کہ وہ وسطی ایشیا میں سجستان کے متوطن تھے۔ نوجوانی میں ہی اُن کی ملاقات ایک صوفی ابراہیم قندوزی سے ہوئی جن کا ان کی زندگی پر گہرا اثر مرتب ہوا۔ اپنی آبائی جائیداد کی فروخت سے غریبوں اور ضرورت مندوں میں خیرات تقسیم کر کے سخاوت کے جذبے کا مظاہرہ کرتے ہوئے معین الدین نے علم کی تلاش میں بخارا اور سمرقند کا سفر کیا۔ فارس کے سفر کے دوران جب معین الدین کا رابطہ شیخ عثمان ہروانی سے ہوا تو انہیں چشتی سلسلے میں شامل کر لیا گیا۔ ان کی عمر تقریباً 52 سال تھی جب ان کے روحانی مربی نے اپنے خلیفہ جانشین کے طور پر ان کا انتخاب کیا تھا۔ ہندوستان آنے سے پہلے انہوں نے فارس اور وسطی ایشیا کا دورہ کیا، جہاں کہا جاتا ہے کہ وہ اجمیر میں مقیم ہو گئے۔ معین الدین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ایک صوفی کی سادہ زندگی گزاری، اپنے پیروکاروں کو اچھا انسان بنانے کی کوششوں اور لوگوں کی اخلاقی بہتری کے لیے کام کرنے پر توجہ مرکوز کیا۔ معین الدین چشتی کا انتقال 1236 عیسوی میں 95 سال کی عمر میں اجمیر میں ہوا۔ معین الدین کے افکار کے بارے میں ہمیں عہد وسطیٰ کے ہندوستانی تذکرہ نگاروں کی تحریروں سے واضح تصور ملتا ہے۔ انہوں نے اپنے پیروکاروں کو مذہبی رسوم و رواج کی پابندی کرنے اور حرام سے سختی سے گریز کرنے کی ہدایت دی۔ وہ نماز اور دل کی سخاوت کو ایک مسلمان کے لیے بنیادی اہمیت کا حامل سمجھتے تھے۔ انہوں نے بلند نظریات کی زندگی بسر کی اور انسانیت کی خیر خواہی کے پابند عہد رہے۔

16.7.2 خواجہ قطب الدین بختیار کاکی

معین الدین کے سرکردہ پیروکار قطب الدین بختیار کاکی تھے۔ وہ فرغانہ کے آش علاقہ میں پیدا ہوئے تھے۔ معین الدین نے جب آش کا دورہ کیا تب قطب الدین ان کے صوفی حلقے میں شامل ہو گئے۔ قطب الدین کی 1221 عیسوی میں دہلی آمد ہوئی جہاں ان کا گرمجوشانہ استقبال کیا گیا اور انہیں اُس وقت کے حکمران سلطان التمش نے سرپرستی حاصل ہوئی۔ قطب الدین نے دہلی میں ایک سادہ گھریلو زندگی گزاری۔ ان کی وفات پر ان کے فرزندان کے سجادہ نشین یعنی روحانی جانشین بنے۔ قطب الدین نے تقویٰ و پرہیزگاری کی زندگی بسر کی اور سلطنت دہلی کے سیاسی معاملات میں حصہ لینے میں کبھی دلچسپی نہیں دکھائی۔ کہا جاتا ہے کہ التمش نے جب انہیں شیخ الاسلام (مشیر برائے مذہبی امور) بنانا چاہا تو انہوں نے سلطان کی اس پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ کاکی (روٹی کا آدمی) کی عرفیت سے اس لیے مشہور ہوئے کیونکہ وہ اور ان کا خاندان غربت کی زندگی بسر کرتے تھے حتیٰ کہ ان کے پاس پیٹ بھرنے کے وسائل بھی نہیں تھے لیکن خدا پر ان کا توکل کچھ

ایسا تھا کہ ان کے گھر والوں کو جب بھی ضرورت درپیش ہوتی، کرشماتی طور پر روٹی میسر ہو جاتی تھی۔ قطب الدین کی وفات 1235 عیسوی میں ہوئی اور مہرولی میں اس جگہ تدفین عمل میں آئی جو انہوں نے خود منتخب کی تھی اور خرید رکھی تھی۔ ان کے فرزند شیخ احمد، ان کی درگاہ کے متولی بنے لیکن قطب الدین بختیار کاکی کے روحانی جانشین بننے کا اعزاز پنجاب سے تعلق رکھنے والے ان کے پیروکار فرید الدین مسعود کو حاصل ہوا۔

16.7.3 شیخ فرید الدین گنج شکر

بابا فرید گنج شکر (مٹھائیوں کا شیدائی) کی عرفیت سے مشہور فرید الدین مسعود پنجاب میں ملتان کے ایک گاؤں کھوتوال کے رہنے والے تھے۔ ملتان میں تعلیم کے دوران ان کی ملاقات قطب الدین سے ہوئی اور وہ ان سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کے پیروکار بن گئے۔ اپنے مرشد کی خواہش کے مطابق فرید الدین نے پانچ سال کے عرصے میں رسمی تعلیم مکمل کی اور پھر دہلی میں قطب الدین کے حلقے میں شامل ہو گئے۔ فرید الدین ریاضت کی زندگی گزارتے تھے اور اپنی للّٰہیت کی وجہ سے بہت جلد مشہور ہو گئے۔ اس کے نتیجے میں، پیروکاروں کی بڑی تعداد ان سے فیض حاصل کرنے کے لیے ان کے قریب ہو گئی۔ ان کی شہرت غیر ضروری پریشانی کا باعث بن گئی کیونکہ زائرین کی بہ کثرت اور مسلسل آمد کے سبب ان کے چین و سکون میں خلل پڑنے لگا۔ نتیجہ میں انہوں نے ہریانہ کے مقام ہانسی منتقل ہونے کا فیصلہ کیا لیکن اپنے مرشد سے ملاقات کے لیے وقتاً فوقتاً دہلی آتے رہے۔ قطب الدین کی وفات پر انہیں چشتی سلسلے کی باگ ڈور سنبھالنے کے لیے مجبور کیا گیا لیکن وہ دوبارہ ہانسی منتقل ہو گئے اور وہاں کھوتوال گئے اور بالآخر پنجاب کے چھوٹے سے قصبے اجودھن میں مستقل سکونت اختیار کی۔ اجودھن میں انہوں نے شہر کی جامع مسجد کے قریب ایک خانقاہ قائم کی۔

بابا فرید نے اپنی ذات کے لیے نفس کشی کے معیارات مقرر کیے تھے، سادہ لباس پہنچے، لکڑی کی عام چارپائی پر سوتے، اور بقاء کے لیے بیری اور باجرے کی روٹی کھاتے تھے۔ انہیں ہدیے کے طور پر اراضی کے وسیع پٹوں کی پیشکش کی گئی لیکن انہیں مادی فوائد میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور اپنے پیروکاروں کو بھی بادشاہوں اور ان کے درباروں سے دور رہنے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔ ان کی خانقاہ تمام طبقات کے عام لوگوں کی آماجگاہ بن گئی تھی جہاں مستشرقین، راہبوں، یوگیوں اور صوفیوں سبھی کی آؤ بھگت کی جاتی تھی۔ انہوں نے ان زائرین کی زندگیوں میں شخصی دلچسپی لی اور ہمیشہ مدد کے خواہاں رہتے تھے۔ بابا فرید کا جب 1271 عیسوی میں انتقال ہوا تو ان کی خانقاہ میں ہی ان کی تدفین عمل میں آئی۔

16.7.4 شیخ نظام الدین اولیاء

بابا فرید کے جانشین دہلی سے تعلق رکھنے والے ایک نوجوان پیروکار بنے۔ وہ شیخ نظام الدین تھے جن کے خاندان کا اصل تعلق بخارا سے تھے، لیکن تیرھویں صدی کے اوائل میں بدایوں میں سکونت اختیار کی۔ نظام الدین 1264 عیسوی میں اپنے خاندان کے ساتھ دہلی منتقل ہو گئے۔ نظام الدین کو بابا فرید سے ملاقات کا بڑا اشتیاق تھا چنانچہ انہوں نے اس صوفی سے ملاقات کے لیے اجودھن کا سفر کیا۔ کہا جاتا ہے کہ پہلی ہی ملاقات میں وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ اسی دن وہ چشتی سلسلے میں شامل ہو گئے۔ خانقاہ میں بہت کم مدت میں تمام پیروکاروں نے نظام الدین کو روحانی مربی کی حیثیت سے قبول کر لیا۔ اس سلسلے کے سربراہ بننے کے بعد انہوں نے دہلی میں ان کی اپنی خانقاہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔

صرف ہدایا پر اپنی اور اپنے ساتھیوں کی گزر بسر کی وجہ سے زندگی عسرت میں گزرتی تھی اور کئی مرتبہ بھوکے پیٹ ہی دن گزر جاتا۔ تکالیف کے کئی سال گزرنے کے بعد، خلجی حکمران جلال الدین خلجی نے انہیں باضابطہ طور پر تسلیم کیا اور ان کی خانقاہ کے اخراجات کی تکمیل کے لیے ایک مخصوص گاہوں کی خاطر خواہ آمدنی کی پیشکش کی۔ خانقاہ میں رہنے والوں کی شدید خواہش تھی کہ شیخ اس پیشکش کو قبول کر لیں لیکن انہوں نے کوئی التفات نہیں کیا اور فقر و زہد کی زندگی برقرار رکھی۔

نظام الدین کی خانقاہ کی ایک خصوصیت سماع کی محافل کا مسلسل انعقاد تھا۔ سمجھا جاتا ہے کہ اس طرح کی چھ سماع محافل میں شیخ نے خود شرکت کی۔ سماع کے بارے میں نظام الدین کا تصور سادہ سا تھا جبکہ وہ اسے شریعت کے خلاف نہیں سمجھتے تھے اور اپنے خیالات کی تائید میں احادیث کا حوالہ دیا کرتے تھے۔ انہوں نے ان محافل کے انعقاد کا خاص طریقہ مقرر کیا تھا، جہاں قوال کا عاقل و بالغ مرد ہونا اور اس کی قوالیوں پر موسیقی کی دھن کا شہوت انگیز نہ ہونا لازم تھا۔ سامعین کا بھی خدا سے خالص تعلق ضروری تھا جب کہ موسیقی کے آلات ستار، بربط اور سارنگی (وایلن) ہوا کرتے تھے۔ نظام الدین کی باوصف خصوصیات میں سے ایک کسی بندھے ٹکے اصول کا پابند رہنے کے بجائے وقت اور موقع کی مناسب سے بہتر عالمانہ فیصلے کرنے کی صلاحیت تھی۔ ان کے بنیادی فلسفے کی اساس خدا کی وحدانیت پر یقین تھا جس کی وجہ سے تمام شعبہ ہائے زندگی کے افراد ان کی خانقاہ میں جمع ہوتے تھے۔ وہ تمام مذاہب کی رسوم و رواج کا بہت احترام کرتے تھے اور جبری قبولیت اسلام پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ در حقیقت، مکمل صوفی تصنیف 'فوائد الفواد' میں صرف ایک جگہ تبدیلی مذہب کا حوالہ ملتا ہے۔ نظام الدین کی وفات 1325 میں ہوئی، اور ان کے بھتیجے کے فرزند خواجہ رفیع الدین ہارون سجادہ نشین کی حیثیت سے ان کے جانشین بنے۔

16.7.5 شیخ نصیر الدین محمود

شیخ نظام الدین کے روحانی جانشین شیخ نصیر الدین محمد تھے جو چراغ دہلوی کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ ان کی پیدائش اودھ میں ہوئی اور 25 سال کی عمر میں نصیر الدین عملاً صوفی بن گئے۔ دہلی میں چشتی سلسلے کے نظام کو سنبھالنے کے باوجود انہوں نے اپنے مرشد کی طرح کفایت شعاری کی زندگی کو اپنایا اور انہیں حصول روزی کی جدوجہد کرنی پڑتی تھی۔ اس کے باوجود نصیر الدین اپنے مرشد سے بعض امور میں اختلاف کیا۔ نظام الدین نے پیر یا روحانی مربی کی سختی سے تابعداری کی تعلیم دی تھی لیکن نصیر الدین کا ماننا تھا کہ کسی کو اپنے سے برتر کی آنکھ بند کر کے پیروی نہیں کرنی چاہئے، حتیٰ کہ وہ اپنے پیروکاروں کو ایسے افعال کے بارے میں سوال کی ترغیب دیتے جو شریعت کے خلاف ہوں۔ مثال کے طور پر، اسلام میں سجدہ صرف خدا کے آگے جائز ہے، لیکن قبل ازیں صوفی سنتوں نے کچھ تامل کے ساتھ ہی سہی اپنے پیروکاروں کو اپنے آگے ماتھا ٹیکنے کی اجازت دی تھی۔ نصیر الدین نے اس عمل کی اجازت نہیں دی۔ انہوں نے اپنے مریدوں کو ذریعہ معاش کی خاطر سرکاری نوکری کرنے پر بھی اعتراض نہیں کیا۔ 1356 عیسوی میں ان کی وفات کے بعد، نصیف الدین کی ان کی خواہش کے مطابق ان کے اپنے گھر میں تدفین کی گئی۔ یہ علاقہ 'چراغ دہلی' کی حیثیت سے مشہور ہوا۔ کئی برسوں بعد، فیروز تغلق نے ان کے مزار پر گنبد تعمیر کی اور اس کے انتظامات صوفی کے بھتیجے مولانا زین الدین علی کو سونپے گئے۔

16.7.6 بنگال میں چشتی سلسلہ

بنگال میں چشتی سلسلہ کا آغاز سراج الدین اخی سراج نے کیا جو گوڑ میں رہتے تھے اور 1357 عیسوی میں ان کی وفات ہوئی۔ان کے جانشین نور قطب عالم نے پنڈوا میں اپنی خانقاہ قائم کی۔

16.7.7 دکن میں چشتی سلسلہ

سید محمد حسین بندہ نواز گیسو دراز

نصیر الدین نے اپنے روحانی جانشینوں کی حیثیت سے چند مریدوں کا انتخاب کیا تھا جس کا معیار علم تھا۔ سید محمد گیسو دراز دہلی میں 1321 عیسوی میں ایک صوفی خاندان میں پیدا ہوئے۔ وہ شیخ نصیر الدین کے مرید کامل تھے۔ان کی ابتدائی تعلیم دولت آباد میں ہوئی، کیونکہ سلطان محمد بن تغلق نے اپنا دارالحکومت تبدیل کیا اور مکمل شہر دہلی کا تخلیہ کرتے ہوئے اسے وہاں منتقل کرنے کا حکم صادر کیا تھا۔ گیسو دراز کا خاندان بھی ان میں شامل تھا جو وہاں منتقل ہو گئے۔ دارالحکومت جب دہلی کو واپس منتقل ہوا تو گیسو دراز شمالی ہند کو واپس لوٹے۔ بہت جلد، انہوں نے نصیر الدین کے چشتی سلسلے میں شمولیت اختیار کی اور 20 سال بعد نصیر الدین نے انہیں اپنا روحانی جانشین بنانے کا اعلان کیا۔ تیمور نے جب 1398 عیسوی میں دہلی پر حملہ کیا تو گیسو دراز نے کئی دیگر لوگوں کی طرح ایک بار پھر دکن کو ہجرت کی۔ مالوا اور گجرات کے راستے سفر کرتے ہوئے وہ 1399 عیسوی میں بہمنی دارالحکومت گلبرگہ پہنچے۔

گیسو دراز (1422-1321 عیسوی) کی گلبرگہ آمد نے دکنی زبان و ادب کو فروغ دیا۔ بعد میں دکنی اردو کی حیثیت سے مشہور اس لہجے نے ایک آزاد اور اہم بولی جانے والی زبان کی شکل اختیار کی۔ یہ شمالی ہند کی ہندی، فارسی، گجراتی اور مراٹھی کا امتزاج تھی، وہ زبانیں جو مختلف علاقوں سے آئے ہوئے سپاہی اور گھومتے پھرنے والے درویش اور صوفی فقیر بولا کرتے تھے۔ گیسو دراز اگرچہ فارسی پر دسترس رکھتے تھے اور اس زبان میں لکھ بھی سکتے تھے لیکن انہوں نے اپنی تعلیم کا ذریعہ دکنی کو اختیار کیا۔ان کی بیشتر ابتدائی تصانیف دکنی زبان میں ہیں۔ فارسی اگرچہ کہ بہمنی سلطنت کی درباری زبان برقرار تھی، تاہم گیسو دراز عوام الناس تک جن میں خاطر خواہ تعداد غیر مسلم پیروکاروں کی تھی، صرف دکنی کے ذریعہ ہی پہنچ سکتے تھے۔ گلبرگہ میں ان کی درگاہ پر منعقد ہونے والی سالانہ تقریب یا عرس میں آج بھی تمام مذاہب کے لوگ شرکت کرتے ہیں۔

فیروز شاہ بہمنی کے دور میں شیخ گیسو دراز کا سلطان کے ساتھ کچھ اختلاف ہو گیا جس کی وجہ سے سلطان نے انہیں محل چھوڑنے اور شہر بدر ہونے کا حکم دیا۔ فیروز کے شیخ کے ساتھ کبھی بھی اچھے تعلقات نہیں رہے اور نہ ہی اس نے اپنے بھائی احمد شاہ سے اتفاق کیا جو شیخ کی تائید کرتے تھے۔ فیروز کے بیٹے حسن خان کو جب شہزادہ ولی عہد مقرر کیا گیا تو یہ اختلافات اور گہرے ہو گئے۔ شیخ نے ولی عہد کے ساتھ نیک تمنائیں وابستہ کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ ان کا ماننا تھا کہ خدا تعالیٰ نے پہلے ہی احمد شاہ کو فیروز کا جانشین مقرر کر دیا ہے چنانچہ اب حسن خان کے لیے کسی دعا کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس نے فیروز کو بہت زیادہ برہم کر دیا اور اس نے شیخ کو یہ پیام بھیجا کہ چونکہ ان کی خانقاہ محل کے قریب واقع ہے

اور وہاں روزانہ بڑی تعداد میں زائرین آتے ہیں جس سے سلطان کے ذہنی سکون میں خلل پڑ رہا ہے اس لیے وہ اپنی خانقاہ فصیل شہر کے باہر منتقل کر دیں۔ اس شاہی فرمان کے سننے کے بعد شیخ نئے مقام پر منتقل ہو گئے اور 1422 میں سلطان کی وفات تک وہیں مقیم رہے۔ لیکن فیروز کی وفات کے بعد اس کے بھائی احمد شاہ بہمنی (36-1422) نے دکن کے عوام پر گیسو دراز کے روحانی اور اخلاقی دبدبے کا اعتراف کیا اور اپنے فائدے کے لیے اسے استعمال کیا۔ صوفی کے قریبی ساتھیوں اور پیروکاروں پر عنایت کے علاوہ اکثر و بیشتر وہ صوفی کی خانقاہ پر حاضری دیا کرتا تھا۔ سلطان نے صوفی کے وارثین کو فراخدلی سے زمینیں عطیہ کیں جسے غالباً انہوں نے قبول کر لیا۔

گلبرگہ میں گیسو دراز کی موجودگی کے سبب دکن میں چشتی سلسلے کی جڑیں گہری ہو گئیں۔ ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ان کے پوتے اور روحانی جانشین سید یداللہ اور مرید شیخ پیارا ہنوز گلبرگہ میں مقیم رہے۔ ان کے مرید جمال الدین مغربی اور ان کے جانشین کمال الدین بیابانی کے ذریعہ علاقہ میں چشتی سلسلے کا اثر و نفوذ جاری رہا۔ کمال الدین کے مرید میران جی شمس العشاق نے بیجاپور میں بھی اس سلسلے کو مقبول بنایا۔ فصیح الدین بابا اور سنج الخاکسار اور برہان الدین جانم اس سلسلے کے دیگر صوفی ہیں جنہوں نے دکن میں اس سلسلے کو فروغ بخشا۔

چشتی سلسلے کے صوفیا کو شمالی ہند میں علمائے آخرت اور دکن میں علمائے دنیا کہا جاتا تھا۔ چودھویں صدی کے اختتام پر شمالی ہند میں چشتی سلسلے کا زوال دیکھا گیا جس کی بنیادی وجہ گیسو دراز کی دکن کو ہجرت کے بعد دہلی میں اس کی قیادت کرنے والے کوئی قابل مریدوں کا نہ ہونا تھا۔ مالوا، گجرات، بنگال اور دکن چشتی سلسلے کے نئے مراکز کے طور پر ابھرے اور اس دور میں دہلی سے توجہ ہٹ گئی۔ علاوہ ازیں، شمالی ہند میں تغلقوں کے زوال کے ساتھ ساتھ شمالی ہند کا سیاسی عدم استحکام، درباری سازشوں اور دہلی کے طبقہ اشراف کے درمیان جھگڑوں نے روحانیت کو زوال سے دوچار کیا۔

16.8 صابری سلسلہ

سولہویں صدی میں شمالی ہند میں چشتی سلسلے کو اس وقت کسی حد تک راحت ملی جب بابا فرید کے قریبی رشتے دار مخدوم علاء الدین علی احمد صابر نے اس سلسلے میں کچھ حد تک جان پھونکی۔ اسے صابری شاخ کی حیثیت سے شہرت ملی اور ان کے بارے میں معلومات اقتباس الانوار میں مل سکتی ہیں جو سترھویں صدی کی ایک چشتی تصنیف ہے۔ اس تصنیف میں صابر کے حق میں بابا فرید کی عزت و تکریم کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس سلسلے کے بہت ہی مشہور صوفیوں میں سے ایک عبدالقدوس گنگوہی تھے، جنہوں نے دیگر صوفیوں کے ساتھ شمال میں ماضی کی چشتی عظمت کو بحال کیا۔ عبدالقدوس نے صوفی مت پر کافی تحریر کیا اور ان کی 18 تصانیف کے منجملہ صرف 10 باقی رہ گئیں۔ اس صوفی کو یوگا میں خاص دلچسپی تھی اور بتایا جاتا ہے کہ اپنے مرید سلیمان مانڈوی کو انہوں نے تجوید قرآن کے اسباق کے عوض اسے سکھایا تھا۔ رشد نامہ میں بھی یوگا کے فلسفے کے تئیں ان کے خاص لگاؤ کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔ اس سلسلے کے ایک اور عظیم صوفی شیخ محب اللہ الٰہ آبادی کو باطنی علوم میں ان کے علم و مہارت کے سبب 'شیخ کبیر' (عظیم شیخ) کا لقب ملا۔ انہوں نے وحدت الوجود کے تصور کی وکالت کی اور عربی و فارسی میں اس پر تشریحات لکھے۔ ان کے فلسفے کو دیکھتے ہوئے کئی علماء نے ان پر بدعت کا الزام لگایا اور ان کی سزائے موت کا فتویٰ جاری کیا جسے بڑی کوششوں

سے منسوخ کیا گیا۔

16.9 شیخ سلیم چشتی

ایسا نام جس سے دور حاضر کے اکثر عوام روشناس ہیں وہ سلیم چشتی کا ہے جو اکبر بادشاہ کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ سیکری میں پروان چڑھے، جہاں ان کے خاندان نے پنجاب سے ہجرت کی تھی۔ وہ بابا فرید کی اولاد میں سے تھے۔ وہ پاک پٹن درگاہ کے صوفی حلقے میں شامل ہوئے اور مشرق وسطیٰ کا کئی مرتبہ سفر کیا اور متعدد بار حج کی سعادت حاصل کی۔ 1538 عیسوی میں وہ سیکری واپس لوٹے اور وہاں خانقاہ بنائی۔ انہیں 'سور' خاندان کے حکمرانوں کی سرپرستی حاصل تھی اور ان کے زوال کے بعد، سلیم ایک بار پھر بیرون ملک مذہبی سفر کے لیے نکل پڑے۔ جیسا کہ تاریخی حوالوں میں کہا گیا ہے کہ مغل شہزادہ سلیم کی پیدائش، جو بعد میں جہانگیر کے نام سے مشہور ہوا، اکبر بادشاہ کو اس صوفی کی خصوصی دعا کا نتیجہ تھی۔ شکرانے کے طور پر اکبر نے سیکری میں شاندار شہر بسایا اور اپنے دارالحکومت کو وہاں منتقل کیا۔ نئے شہر کو عظیم خانقاہ اور ایک مسجد سے آراستہ کرتے ہوئے اکبر نے شیخ کے باوقار مقام تک بلند کیا۔ شیخ کی وفات پر، مسجد کے ایک گوشے میں ان کی تدفین کی گئی جس پر ایک گنبد بنایا گیا۔

16.10 سہروردی سلسلہ

فارس کے مقام سہرورد کے رہنے والے شیخ ابو نجیب سہروردی اس سلسلے کے بانی تھے۔ ہندوستان میں ان کے بھتیجے اور جانشین شیخ شہاب الدین سہروردی کے خلفاء نے اس سلسلے کو متعارف کیا۔ تاہم ہندوستان میں تبلیغ کرنے والے سہروردی سلسلے کے پہلے صوفی بہاء الدین زکریا تھے جو ملتان کے رہنے والے تھے۔ سہروردی صوفیاء نے اپنی تحریکی سرگرمیوں کے مرکز کے طور پر شمال مغربی صوبوں کا انتخاب کیا کیونکہ وہ منگول حملوں کی وجہ سے بکھرے ہوئے تھے۔ چنانچہ ملتان اور سندھ، اس سلسلے کی سرگرمیوں کے اہم مراکز بنے۔ شیخ نے سیاسی امور میں گہری دلچسپی لی اور ان کی خانقاہ آنے والے ہر شخص کی پذیرائی نہیں کرتے تھے، بلکہ ان کے پاس آنے والے اشراف سے زیادہ تعلق خاطر کا اظہار کرتے تھے۔ ان کی وفات 1262 میں 81 سال کی عمر میں ہوئی اور ملتان میں تدفین کی گئی جہاں ان کے مزار پر ایک گنبد تعمیر کیا گیا۔ ان کے فرزند صدرالدین عارف کی جانب سے جو اپنے والد سے بہت زیادہ مختلف تھے، بہاء الدین کو جانشین بنایا گیا۔ ایک سچے صوفی کی طرح، انہوں نے دولت کی آرزو نہیں کی اور اپنا سب کچھ خیرات کر دیا۔ صدرالدین کے مشہور مرید احمد معشوق طویل وقفے تک حالت وجد میں رہنے کی صلاحیت سے معروف تھے۔ صدرالدین کے جانشین ان کے فرزند رکن الدین ملتانی بنے جنہوں نے اپنے دادا کے نقش قدم کی پیروی کی، اور خانقاہ کو ایک بار پھر سیاسی اشراف سے جوڑ دیا۔ انہوں نے حکمران سلطانوں سے ملنے کے لیے کئی مرتبہ دہلی کے دورے کیے ساتھ ہی شیخ نظام الدین چشتی سے بھی ملاقات کی۔

رکن الدین کے مریدوں کی کوششوں سے یہ سلسلہ بتدریج ہندوستان میں کئی دیگر مقامات میں پھیل گیا۔ رکن الدین کے مشہور مریدوں میں سے ایک حسینی سادات تھے، جن کی صوفی علم باطن پر نظموں میں دوسروں کے تئیں تحمل اور رواداری کی روح کو ظاہر کیا گیا۔

رکن الدین کے ایک اور مرید صدر الدین ظفر آبادی جو حاجی چراغ ہند سے زیادہ شہرت رکھتے تھے، جون پور میں یہ سلسلہ قائم کیا۔ رکن الدین کی وفات کے بعد ملتان میں سہر وردی سلسلے کے جوش و خروش میں کمی آگئی۔ سہر وردی سلسلے کے ایک اور صوفی شیخ جلال الدین تبریزی نے لکھنوتی میں ایک خانقاہ اور ایک لنگر قائم کیا جس کا اعادہ بنگال کے دیوتلا میں کیا گیا۔

سید جلال الدین جہانیان جہانگشت نے موجودہ سندھ میں اوچھ کے مقام پر اس سلسلے میں نئی روح پھونکی، جہاں سہر وردی خانقاہ قائم کی تھی۔ اس صوفی نے کافی سفر کیے اور مملکت کے ساتھ بہتر تعلقات میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی۔ محمد بن تغلق نے انہیں شیخ اسلام مقرر کیا اور سہوان میں 40 مواضعات کی جاگیر عطا کی۔ فیروز تغلق کی نگاہوں میں بھی شیخ کی کافی قدر و منزلت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ صوفی کی سفارش پر سلطان نے اسلام کے ذریعہ عائد کردہ کئی محاصل منسوخ کر دیے۔ صوفی ادب میں ان کا تعاون بھی گراں قدر ہے جب کہ انہوں نے متعدد صوفی متون پر تشریحات لکھیں اور قطب الدین دمشقی کی تصنیف الرسالۃ المکیہ کا فارسی میں ترجمہ کیا۔

سہر وردی سلسلے کے ایک اور اہم صوفی شیخ حامد بن فضل اللہ عرف جمالی کنبوہ گزرے ہیں۔ کئی اسلامی ممالک کے لیے ان کے متعدد اسفار سے انہیں وسیع تجربہ حاصل ہوا۔ پندرھویں صدی کی آخری دہائی میں ہندوستان واپسی کے بعد انہوں نے اپنی تحریکی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ جمالی نے سکندر لودھی، بابر اور ہمایوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم کیے۔ انہوں نے بابر کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا اور گجرات مہم پر ہمایوں کے ساتھ گئے جہاں ان کا انتقال ہو گیا۔ جمالی کی شاعرانہ ذکاوت کا اظہار ان کی مثنوی مہر و ماہ میں ہوتا ہے لیکن ان کی ادبی مہارت کا نچوڑ سیر العارفین ہے جو 13 چشتی و سہر وردی صوفیوں کی سوانح حیات پر مشتمل ہے۔ جمالی کے فرزند اکبر شیخ گدائی نے اکبر کے دور میں مؤثر کردار ادا کیا اور اس کے محکمہ مذہبی امور میں 'صدر' کے اہم مقام پر فائز ہوا۔

اُچ کے سہر وردی صوفیا کو بڑی حد تک گجرات کے سلاطین کی سرپرستی حاصل تھی۔ مرأۃ سکندری میں گجرات کی مسلم مملکت کے بانی ظفر خان کے بارے میں تفصیلات ملتی ہیں، جو مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی دعاؤں سے تخت نشین ہوا تھا۔ سلطان احمد، مخدوم کے پوتے شیخ نور قطب عالم کے صوفی حلقے میں شامل ہوا۔ شیخ کے روحانی جانشین شاہ مانجھاں تھے۔ کئی سہر وردی صوفیاء کی طرح انہوں نے اپنے دور کے سیاسی امور میں گہری دلچسپی لی اور مالوہ کے خلاف مقابلے میں گجراتی سلاطین کی مدد کی۔ ان کا مزار احمد آباد میں واقع ہے جو آج بھی مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔ سولہویں صدی تک، سہر وردی سلسلے کا زوال ہو گیا اور وہ کشمیر اور پنجاب تک محدود رہ گیا۔ اُس دور میں ہندوستان کے واحد سہر وردی صوفی حاجی عبدالوہاب بخاری تھے جو سکندر لودھی کے دور حکمرانی میں دہلی میں مقیم تھے۔

سہر وردی سلسلے کو کشمیر میں مخدوم حمزہ کشمیری نے قبولیت عام دی۔ وہ کشمیر میں شیعہ غلبہ کے حق میں نہیں تھے چنانچہ انہوں نے اسے کمزور کرنے کی مسلسل کوششیں کیں۔ ان کی وفات کے بعد، ان کے مریدوں نے ان کے نقش قدم کی پیروی جاری رکھی۔ ہمزہ کے نہایت اہم مریدوں میں بابا داؤد خاکی سہر وردی تھے۔ شاعری میں مخدوم ہمزہ کی سوانح حیات پر مشہور تصنیف 'ورد الموارد ین' مرتب کرنے کا سہرا حاصل کرنے والے داؤد بھی اپنے مرشد کی طرح کشمیر میں شیعہ غلبے کے مخالف تھے اور اکثر و بیشتر سنیوں کی ایذا رسانی پر اظہار خیال

کرتے تھے۔ان کے جانشین میر نازک تھے جنہوں نے سماع کے تصور کی مخالفت کی اور اس میں شرکت سے صوفیوں کو باز رہنے کی تلقین کی۔

سہروردی سلسلے کے ایک اور مشہور صوفی، شیخ حسن تھے، جو سولہویں۔ سترھویں صدی میں پنجاب کے لاہور میں مقیم تھے۔ سہروردی سلسلے سے نسبت قائم کرنے سے قبل وہ مشہور یوگی گورکھ ناتھ کی صحبت میں رہے۔ عبدالرحیم خان خاناں اور نواب مرتضیٰ خان جیسے مشہور نواب ان کے مریدوں میں شامل تھے۔ان کی مزار لاہور میں واقع ہے اور اب ایک زیارت گاہ بنی ہوئی ہے۔ سہروردی شاخ سے نکلنے والے فردوسی صوفی بہار تک محدود تھے۔اس سلسلے کو نظام الدین فردوسی کے ایک مرید شیخ حرف الدین یحیٰ نے مقبول بنایا، جنہوں نے شریعت اور وحدت الوجود کے تصور کے مابین اعتدال لانے کی کوشش کی۔انہوں نے انسانیت کی خدمت پر بہت زیادہ زور دیا جو ان کے فلسفے کا اہم جزو تھا۔

16.11 قادری سلسلہ

پندرھویں صدی کے وسط میں شیخ عبدالقادر جیلانی کی جانب سے قائم کردہ سلسلہ ہے۔ابتدائی قادری صوفیاء نے بہمنی سلطان احمد شاہ کی سرپرستی میں، جو فارسی اور عربی ثقافتی روایات کا بڑا سرپرست تھا، دکن میں خانقاہیں قائم کیں۔اس پالیسی کے حصہ کے بطور، احمد شاہ نے فارس کے کئی صوفیاء کو دکن میں اپنے نئے دارالحکومت بیدر آنے کی دعوت دی۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان چاہتا تھا کہ دکن، عالم اسلام کے دیگر حصوں کی روحانی معلومات سے سیراب ہو۔ فرشتہ میں لکھا ہے کہ سلطان نے فارس کے مشہور قادری صوفی شاہ نعمت اللہ ولی کو ان کے پوتے شاہ نوراللہ کو اس کے دربار میں بھیجنے کی ترغیب دی۔احمد شاہ نے نہ صرف اپنی دختر کا نوراللہ سے نکاح کیا بلکہ صوفی کے دادا کے اعزاز میں نعمت آباد کے نام سے ایک نیا شہر بسایا۔ بعد ازاں، نوراللہ کے مکمل قریبی خاندان نے بیدر کو ہجرت کی۔ان کے بھائیوں حبیب الہ اور محب اللہ نے بیدر میں قادری خانقاہ قائم کی، جو وقت کے گزرتے ہندوستان میں ایک اہم قادری مرکز کے طور پر ابھری۔ بیدر کے دیگر مشہور قادری شیخ ابراہیم ملتانی اور ان کے فرزند اور جانشین ابراہیم مخدوم جی تھے۔

قادریوں کی ایک اور شاخ پندرھویں صدی کے وسط میں پنجاب میں قائم کی گئی۔اسے شیخ عبدالقادر جیلانی کی اولاد میں سے ایک سید محمد حلبی اوچی نے قائم کیا۔ سید نے اُس وقت ہندوستان کا دورہ کیا جب وہ کم عمر تھے۔انہوں نے اپنے آبائی مقام حلب (شام کا شہر) واپسی سے قبل لاہور اور ناگور میں کچھ عرصہ قیام کیا۔1428 عیسوی میں جب وہ دوبارہ ہندوستان آئے تو اوچ میں رہائش اختیار کی، جہاں سلطان حسین مرزا ان کے حلقہ مریدی میں شامل ہوئے۔ سید محمد کے فرزند عبدالقادر دوم ان کے جانشین بنے۔ابتداء میں عبدالقادر نے سماع کی حمایت کی اور مادّی مسرتوں کے خواہاں تھے جو پُرآسائش زندگی کی ضامن ہو لیکن اُچ میں قادری خانقاہ کی قیادت سنبھالنے کے بعد ان میں نمایاں تبدیلی آئی۔ وہ صوفی بن گئے، خانقاہ سے جڑے تمام عطائے نوازشات کے ساتھ سرکاری عہدے سے دست کشی اختیار کی۔ صوفی کے تقویٰ و روحانی کارناموں کو عبدالحق محدث دہلوی نے ان کے متعدد کرشموں کی شکل میں پیش کیا ہے۔ سولہویں صدی میں آگرہ اور دہلی میں بھی قادریوں کی سرگرم تحریکی سرگرمیاں دیکھی گئیں۔مکہ کے متوطن ابوالفتح بن جمال الدین مکی نے سکندر لودھی کی دعوت پر آگرہ میں قادری سلسلے کو

متعارف کیا۔ بتایا جاتا ہے کہ پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی کے ساتھ صوفی بھی ہم رکاب تھے جہاں ابراہیم لودھی کی بابر کے ساتھ تاریخی جنگ ہوئی۔ دہلی کے دیگر نمایاں قادری صوفیاء میں امان اللہ پانی پتی اور میر سید عبدالعلیٰ تھے۔ مؤخرالذکر زبردست عالم تھے جنہوں نے ابن عربی کی فتوحات مکیہ کی شرح لکھی۔

سولہویں صدی میں سری نگر قادریوں کا ایک اور مرکز تھا۔ شیخ احمد قادری کو جب باباداؤد خاکی کی جانب سے کشمیر مدعو کیا گیا، تو وہ وہیں مقیم ہوگئے، جہاں کشمیر کے سلطان ان کے مرید بن گئے۔ انہوں نے اپنے دوست داؤد خاکی کے بشمول بے شمار مسلمانوں کو سلسلے میں شامل کیا۔ داؤد کے جانشین میر نازک بنے اور ان کے پوتے میر محمد علی نے سری نگر میں قادری روایات کو مقبول عام بنایا۔ مشرق وسطیٰ کے کئی مہاجر صوفیاء نے دکن میں بھی قادری سلسلے کی تبلیغ کی۔ سید عبدالقادر یوسف، بدرالدین حبیب اللہ اور شاہ عبدالحسن قادری بیدر اور بیجاپور کے چند قابل ذکر قادری صوفیوں میں سے تھے۔ شاہ عبدالحسن قادری کو بیجاپور کے سلطان ابراہیم عادل شاہ دوم کی قربت حاصل تھی جسے انہوں نے صوفی مت کی پیچیدگیوں سے واقف کروایا۔ وہ ایسے صوفیوں کے حق میں نہیں تھے جو حالت نشہ میں ہوں۔ انہوں نے 'سکھ انجام' لکھی جو دکنی زبان کی مشہور تصنیف ہے۔ شہرت پانے والے ایک اور دکنی صوفی شاہ عبداللطیف لااوبالی ہیں' جو بغداد سے ہجرت کرکے دکن میں آئے اور کرنول کے قریب ایک گاؤں میں رہائش اختیار کی۔ قادری سلسلہ کا سب سے زیادہ اثر صرف پنجاب اور دکن ہی میں دیکھا گیا۔ چشتی صوفیوں کے برخلاف قادریوں نے مریدی اور وابستگی کی بنیاد پر پیروکاروں کا جال پورے برصغیر میں نہیں پھیلایا۔

16.12 نقشبندی سلسلہ

نقشبندی سلسلے کی بنیاد درحقیقت بہاءالدین نقشبندی نے وسطی ایشیاء میں ڈالی۔ ہندوستان میں سولہویں صدی میں یہ سلسلہ مقبول ہوا۔ اگرچہ یہ سلسلہ پندرھویں صدی میں کشمیر میں قائم ہوچکا تھا، لیکن اکبر کے دور میں ہی اس کی سرگرمیوں نے زور پکڑا۔ نقشبندیوں کو مغل خاندان کی بڑی حد تک سرپرستی حاصل تھی۔ بابر کے والد عمر شیخ مرزا نقشبندی صوفی خواجہ نشیرالدین عبیداللہ احرار کے مرید تھے۔ بابر خود بھی صوفی کے فرزندوں سے کافی قریب تھا۔ بعد میں، اکبر کے دور میں جب صوفی کی اولاد ہندوستان آئی، بادشاہ نے ان کے اخراجات کی تکمیل کے لیے لاہور کے سرکار باری دوب میں پرگنہ جماری یا چمیاری عطا کی۔ سمرقند واپسی سے قبل 16 سال اپنے قیام کے دوران انہوں نے بڑی تعداد کو اپنا تابع کیا۔

کابل کے متوطن خواجہ باقی باللہ تھے جنہوں نے ہندوستان میں نقشبندی سلسلے کو شہرت دی۔ اپنے پیر خواجگی الکنگی کی ہدایت پر یہ صوفی ہندوستان آئے اور دہلی میں سکونت اختیار کی اور مختصر لیکن روحانی سرگرم زندگی گزاری۔ خواجہ پوری طرح وحدت الوجود کے نظریے کے قائل تھے اور انہوں نے اس نظریے کی مدح سرائی میں کافی شاعری کی۔ ان کا خیال تھا کہ صوفیاء سماع کے ذریعہ روحانی سکون حاصل کرسکتے ہیں اور مغل زیر تسلط علاقوں میں اسلامی تعلیمات کی تشہیر کرتے اور مغل نوابوں کو اپنی روزمرہ زندگی میں تقویٰ کی روش اختیار کرنے کے لیے مسلسل مکتوبات روانہ کرتے تھے۔

خواجہ باقی باللہ کے جانشین شیخ احمد سرہندی بنے۔ خلیفہ کی حیثیت سے مقرر کیے جانے کے بعد شیخ کو سرہند واپس جانے کی اجازت ملی، جہاں سے انہوں نے اپنے مریدوں کو برصغیر کے تمام حصوں میں روانہ کیا۔ نتیجتاً ہندوستان کے تمام علاقوں میں پیروکاروں کی بڑی تعداد بنانے میں مدد ملی۔ وہ اسلام میں مذہبی اختراعات یا بدعات کے خلاف تھے اور ہندوستانی اسلام میں اصلاحات کی سنجیدہ کوششیں کیں۔ اس سعی و جہد کے اعتراف میں وہ مجدد الف ثانی کے لقب سے پہچانے جانے لگے۔ وہ وحدت الوجود کے نظریے کے حامی نہیں تھے، جو ان کے خیال میں بہت زیادہ مشکل اور پیچیدہ تھا۔ مجموعی طور پر، شیخ نے راسخ العقیدہ اسلام کی بحالی کا بیڑا اٹھایا اور مذہبی عقاد اور ہندوؤں کے سیاسی تقررات کے اس حد تک ناقد تھے کہ جزیہ کو دوبارہ نافذ کرنا چاہتے تھے۔ وہ شیعہ عقائد پر بھی یکساں تنقید کرتے تھے اور اسلام کے پہلے تین خلفاء کی تنقیص پر شیعوں کی مذمت کرتے تھے۔ کسی حد تک شیخ کو بالخصوص پیغمبر محمد کی نیابت کے دعویٰ پر شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے اس تنقید کے نتیجے میں بادشاہ جہانگیر نے انہیں گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا تھا۔ بعد میں انہیں رہا کیا گیا اور وہ سرہند واپس لوٹے جہاں بالآخر ان کی وفات ہو گئی۔ تاہم ان کے آدم بنوری اور شاہ عبدالرحیم جیسے مخلص مرید تھے، جنہوں نے مغل سلطنت کے مختلف حصوں میں اس سلسلے کی ترویج کے لیے جدوجہد کی۔

شیخ احمد سرہندی کے بعد ان کے فرزند محمد معصوم ان کے جانشین بنے، جو قرآن کی مضبوط تلاوت پر زور دیتے تھے اور اپنے والد کی طرح بڑی تعداد میں شاگردوں کی تربیت کی۔ اس صوفی نے امراء کی صحبت سے گریز کیا، بھلے ہی انہوں نے مغل شہنشاہ اورنگ زیب سے خط وکتابت کی، لیکن شہنشاہ کا مصاحب بننے سے انکار کر دیا۔ ان کے فرزند سیف الدین کو شہنشاہ کی روحانی تربیت کے لیے مقرر کیا گیا۔ خواجہ معصوم کے چھ فرزند تھے۔ انہوں نے اپنے پیچھے بے شمار پیروکار چھوڑے جو تمام کے تمام مایہ ناز صوفی تھے جن کے ذریعہ پورے برصغیر ہند میں نقشبندی تعلیمات کی تبلیغ عمل میں آئی۔ حجۃ اللہ محمد نقشبندی سرہند میں واقع ان کی خانقاہ کے جانشین بنے۔ ہندوستانی نقشبندیوں میں خواجہ خواند محمد واحد ہیں جو مجددی سلسلے سے وابستہ نہیں ہوئے۔ وہ کشمیر سکونت پذیر تھے اور کہا جاتا ہے کہ مغل شہنشاہوں اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں ساتھ ہی ساتھ مغل حرم کی خواتین بھی ان سے دعاؤں کی طالب تھیں لیکن کشمیر میں ان کی مخالف شیعہ مہم ان کے لاہور جلاوطنی کا سبب بنی، جہاں ان کی وفات ہوئی اور وہیں تدفین کی گئی۔ نقشبندی سلسلے کو بعد میں ان کے فرزندان خواند احمد اور معین الدین نے جاری رکھا۔

16.13 شطاری سلسلہ

ہندوستان میں شطاری سلسلے کا تعارف لودھی دور حکمرانی میں ہوا۔ گوالیار کے سید محمد غوث اس سلسلے کے سب سے زیادہ مشہور صوفی گزرے ہیں۔ انہوں نے دو مشہور کتابیں ''جواہر الخمسہ'' اور ''کلید مخازن'' تصنیف کی جس میں صوفی اصولوں اور افعال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بادشاہ ہمایوں اور مشہور ہندوستانی موسیقار تان سین اس سلسلے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ شطاری صوفیوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے افکار و اعمال میں کئی ایک مماثلتوں کو دریافت کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے کے افراد پُرآسائش دنیاوی نعمتوں میں رہتے ہوئے، روحانی زندگی گزارتے تھے۔

16.14 صوفی تحریک کے اثرات

جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ ہندوستان میں آمد سے قبل تصوف کی اپنی تاریخ تھی۔ سادہ فلسفے، غیر پیچیدہ اعمال اور تحمل و رواداری کی روح کے ساتھ صوفیوں نے عوام الناس کے دل جیت لیے، جو جوق در جوق خانقاہوں کا رخ کرتے۔ صوفیوں میں بیشتر چشتی صوفیوں کو، ان کے کرشموں اور سیاسی امور سے ان کی عدم دلچسپی کے سبب زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ انہوں نے سرکاری عہدے قبول کرنے سے گریز کیا، حکومت میں نفع بخش عہدوں کے لیے اپنے پیروکاروں کی حوصلہ شکنی اور مملکت کے ساتھ تمام تعلقات پر سرد مہری کا رویہ اپنایا۔ اس کے برخلاف سہروردی صوفیاء نے سیاسی تائید، نفع بخش تقررات اور مادّی آسائشیں حاصل کیں۔ وہ سیاسی مہروں کی قربت کو بھی ترجیح دیتے تھے۔

کئی چشتی صوفیوں نے مقامی زبانوں کو اپنے پیغام کی ترسیل کا ذریعہ بنایا۔ خانقاہوں میں ہزاروں لوگوں کو چین و سکون میسر ہوتا جب کہ خانقاہوں اور درگاہوں پر منعقد کیے جانے والے عرس اور دیگر تقاریب کو اس قدر پرکشش ثقافتی رنگ دیا گیا کہ غریب و امیر سبھی اس کا بے چینی سے انتظار کرتے تھے۔ امن، ہم آہنگی، عالمی بھائی چارگی اور بقائے باہم کے صوفیوں کے پیام کے ساتھ ساتھ ان کے بھکتی ہم منصبوں کی کوششوں نے مذہبی، طبقاتی اور فرقہ وارانہ کشیدگی سے پاک سماج بنانے میں مدد دی۔ ذات پات میں بٹے ہندوستانی سماج کو قابل رشک ہندو مسلم افکار و اعمال کو یکجا کرنے کے لیے بھکتی۔ صوفی تحریک کی ضرورت تھی۔ عہد وسطیٰ کے صوفی مت نے، خواہ وہ بھکتی شکل میں ہو یا صوفی نظریات ہوں، ہندوستان کی سماجی۔ مذہبی سوچ پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ خدائے بزرگ و برتر کی تلاش میں محبت عالم کے بارے میں اظہار خیال کے ذریعے، صوفی فلسفے نے مذہبی رواداری کے ماحول کو پروان چڑھایا، روحانیت کو فروغ دیا اور اسلام میں موجود تہذیبی اقدار کو جلا بخشی۔

16.15 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کا مطالعہ کرتے ہوئے آپ صوفی مت کی تعریف اور تصور سے واقف ہوئے۔ آپ نے اس کے تاریخی دوار اور ہندوستان میں اس کی آمد سے آگہی حاصل کی۔ اپ کو نہ صرف صوفی افکار پر بھکتی تحریک کے اثرات کو سمجھنے میں مدد ملی بلکہ صوفی سنتوں کی اصل تعلیمات سے بھی روشناس ہوئے۔ آپ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں ابھرنے والے متعدد صوفی سلسلوں سے تفصیلی طور پر آشنا ہوئے، جس میں عوام الناس میں صوفیت کے پیغام کی تبلیغ کی گئی۔ آپ اس بات سے واقف ہوئے کہ صوفی مت نے عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں محبت و اخوت کو پروان چڑھایا اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی قائم کی۔

16.16 کلیدی الفاظ (Keywords)

صفا	پاکی	صف	لائن، قطار
صفہ	چبوترہ	صوف	موٹا اون
تطہیر	پاکی حاصل کرنا	راسخ العقیدہ	کٹر، اصول پسند

16.17 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

16.17.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. ابوالفضل نے کتنے صوفی سلسلوں (Sufi Orders) کا تذکرہ کیا ہے؟

4 (a) 6 (b) 8 (c) 12 (d)

2. خواجہ معین الدین چشتی کی تفصیلات کس متن (Text) میں ملتی ہیں؟

(a) سیر الاولیاء (b) فوائد الفواد (c) طبقاتِ ناصری (d) سیر العارفین

3. ''چراغ دہلی (Chiragh-i-Delhi) '' کی حیثیت سے کون معروف تھے؟

(a) شیخ نظام الدین اولیاء (b) شیخ نصیر الدین محمود (c) خواجہ قطب الدین بختیار (d) شیخ فرید الدین گنج شکر

4. شیخ کبیر (Shaikh Kabir) کس کا لقب تھا؟

(a) کبیر داس (b) شیخ عبد القادر جیلانی (c) شیخ نظام الدین اولیاء (d) شیخ نصیر الدین محمود

5. ''سیر العارفین (Siyar-ul-Arifin) '' کے مصنف کا کیا نام تھا؟

(a) امیر حسن سجزی (b) حامد قلبی (c) جمالی دہلوی (d) فرید الدین عطار

16.17.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. صوفیت کے تصور پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. چشتی صوفیوں کی صابری شاخ پر نوٹ تحریر کیجیے۔
3. سلیم چشتی کے بارے میں نوٹ لکھیے۔

16.17.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. سہروردی صوفیوں پر مضمون تحریر کیجیے۔
2. بھکتی اور صوفی سنتوں کی تعلیمات میں مماثلتوں کا تجزیہ کیجیے۔

Answer Key:
1. (c) | 2. (a) | 3. (b) | 4. (d) | 5. (b)

اکائی 17۔ معاشرہ اور ثقافت

(Society and Culture)

اکائی کے اجزا

17.0 تمہید

17.1 مقاصد

17.2 دہلی سلطنت کے عہد کا معاشرتی ڈھانچہ

17.2.1 شہری اور دیہی زندگی

17.2.2 خواتین کی سماجی حیثیت

17.2.3 غلامی کا نظام

17.3 دہلی سلطنت کے عہد کی ثقافت

17.3.1 تعلیم اور علمی سرگرمیاں

17.3.2 دہلی سلطنت کے عہد میں ہندی زبان و ادب کی ترقی

17.3.3 فنِ تعمیر

17.3.4 مصوری

17.3.5 موسیقی

17.4 اکتسابی نتائج

17.5 کلیدی الفاظ

17.6 نمونہ امتحانی سوالات

17.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

17.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

17.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

17.0 تمہید (Introduction)

ہندوستان کی قرونِ وسطیٰ کی تاریخ میں دہلی سلطنت (1206-1526) کا عہد ایک نمایاں اور اہم مقام رکھتا ہے۔ اس دور میں نہ صرف سیاسی سطح پر نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں بلکہ معاشرتی اور ثقافتی زندگی کے مختلف پہلو بھی گہرے اثرات سے دوچار ہوئے۔ ترک حکومت کی آمد کے بعد نئی انتظامی روایات، تعلیمی اداروں کی تنظیم، فنِ تعمیر کی نئی طرزوں اور شہری زندگی کے فروغ نے ہندوستانی معاشرے کو ایک نئی سمت عطا کی۔ اس کے ساتھ ہی مقامی روایات اور بیرونی ثقافتی عناصر کے باہمی تعامل سے معاشرتی زندگی میں کئی نئی خصوصیات پیدا ہوئیں۔ دہلی سلطنت کے عہد کا معاشرہ مذہبی، لسانی اور سماجی تنوع کا حامل تھا۔ دیہی اور شہری زندگی کے اپنے الگ خدوخال تھے، جبکہ مختلف پیشہ ور طبقات، دستکاروں، تاجروں، علما اور عام لوگوں نے معاشرے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ خواتین کی سماجی حیثیت، خاندانی نظام، رسم و رواج، تعلیم، رہن سہن، لباس، خوراک اور تفریح کے انداز بھی اس دور کی سماجی زندگی کے اہم اجزا تھے۔ ثقافتی اعتبار سے یہ دور تعلیمی اداروں کی توسیع، فنِ تعمیر میں نئی تبدیلیاں، فنونِ لطیفہ اور دستکاریوں کی ترقی، نیز شہری تہذیب کے ارتقا کے لیے نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ اس زمانے میں تعمیر ہونے والی مساجد، مقابر، قلعے اور دیگر عمارتیں فنِ تعمیر کے ارتقا کی اہم مثالیں ہیں، جبکہ مختلف فنون اور ہنر بھی مسلسل فروغ پاتے رہے۔

اس باب میں دہلی سلطنت کے دور کے معاشرے اور ثقافت کے انہی پہلوؤں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ بالخصوص سماجی ڈھانچے، سماجی زندگی، خواتین کی حیثیت، غلامی، تعلیم، فنِ تعمیر، فنونِ لطیفہ، دستکاریوں اور ثقافتی ارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ البتہ تصوف، بھکتی تحریک، معیشت، فارسی ادب اور حکمران طبقے جیسے موضوعات اس کتاب کے دیگر ابواب میں تفصیل سے زیرِ بحث آئے ہیں۔ اس لیے اس باب کا بنیادی مقصد طلبہ کو دہلی سلطنت کے معاشرتی اور ثقافتی نظام کی نمایاں خصوصیات سے روشناس کرانا اور اس عہد کی تاریخی اہمیت کو سمجھنے میں معاونت فراہم کرنا ہے۔

17.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- دہلی سلطنت کے سماجی ڈھانچے کو سمجھ سکیں گے۔
- اس دور کی تعلیمی سرگرمیوں سے واقف ہو سکیں گے۔
- ہندی زبان و ادب کی ترقی کا جائزہ لے سکیں گے۔
- ہند۔اسلامی فنِ تعمیر کی خصوصیات بیان کر سکیں گے۔
- دہلی سلطنت کے دور کی مصوری اور موسیقی کی اہمیت کو سمجھ سکیں گے۔
- اس دور کی تہذیبی و ثقافتی خصوصیات کا تجزیہ کر سکیں گے۔

17.2 دہلی سلطنت کے عہد کا معاشرتی ڈھانچہ

دہلی سلطنت کے قیام (1206-1526) کے بعد ہندوستان کے سیاسی نظام کے ساتھ ساتھ معاشرتی زندگی میں بھی نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اگرچہ ترک حکمرانوں کی آمد نے معاشرے میں بعض نئے عناصر کو متعارف کرایا، لیکن ہندوستان کا بنیادی سماجی ڈھانچہ مکمل طور پر تبدیل نہیں ہوا۔ اس دور میں قدیم ہندوستانی روایات اور نئی اسلامی سماجی اقدار ایک دوسرے کے ساتھ موجود رہیں، جس کے نتیجے میں ایک متنوع اور پیچیدہ معاشرتی نظام وجود میں آیا۔ اس دور کا معاشرہ مذہب، ذات، پیشے، رہائش اور معاشی حیثیت کے اعتبار سے مختلف طبقات میں تقسیم تھا۔

دہلی سلطنت کے زمانے میں معاشرے کو عمومی طور پر شہری اور دیہی معاشرے میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ دیہی علاقوں میں آبادی کی اکثریت رہتی تھی اور ان کی زندگی کا انحصار زراعت پر تھا، جبکہ شہروں میں تجارت، صنعت، دستکاری اور انتظامی سرگرمیوں کی وجہ سے نسبتاً متنوع سماجی زندگی پائی جاتی تھی۔ دونوں معاشروں کے رسم و رواج، رہن سہن اور معاشرتی ضروریات میں فرق ہونے کے باوجود ان کے درمیان باہمی تعلقات بھی موجود تھے۔ اس دور کے معاشرے میں مختلف پیشہ ور طبقات اپنی اپنی ذمہ داریاں انجام دیتے تھے۔ کاشت کار، دستکار، لوہار، بڑھئی، جولاہے، کمہار، سنار، تاجر اور دیگر پیشہ ور افراد معاشرے کے اہم اجزا تھے۔ شہروں میں مختلف صنعتوں اور تجارت کے فروغ نے دستکاروں اور تاجروں کی اہمیت میں اضافہ کیا، جبکہ دیہی علاقوں میں زرعی پیداوار سماجی اور معاشی زندگی کی بنیاد بنی رہی۔ پیشوں کی بنیاد پر مختلف گروہوں کی اپنی الگ شناخت اور سماجی حیثیت بھی قائم تھی۔ ہندوستانی معاشرے میں ذات پات کا نظام اپنی سابقہ شکل میں موجود رہا، اگرچہ مسلم معاشرے میں اس نوعیت کا کوئی مذہبی تصور نہیں تھا۔ اس کے باوجود وقت گزرنے کے ساتھ پیشہ، نسب، علاقائی وابستگی اور سماجی حیثیت کی بنیاد پر مسلمانوں کے اندر بھی بعض سماجی امتیازات پیدا ہوئے۔ یوں دہلی سلطنت کا معاشرہ ایک ایسا معاشرہ تھا جس میں مختلف مذہبی اور سماجی روایات ایک دوسرے کے ساتھ موجود رہیں اور روزمرہ زندگی پر اثر انداز ہوتی رہیں۔ دہلی سلطنت کے دور میں شہری مراکز کی ترقی نے معاشرتی زندگی کو نئی جہت عطا کی۔ دہلی، لاہور، ملتان، بدایوں، اجمیر، جونپور اور دولت آباد جیسے شہر نہ صرف انتظامی مراکز تھے بلکہ تجارت، صنعت، تعلیم اور ثقافتی سرگرمیوں کے بھی اہم مراکز بن گئے۔ ان شہروں میں مختلف علاقوں اور قومیتوں سے تعلق رکھنے والے لوگ آباد تھے، جس سے شہری معاشرے میں تنوع پیدا ہوا اور مختلف تہذیبی روایات کو فروغ ملا۔

اگرچہ دہلی سلطنت کے زمانے میں سماجی زندگی میں متعدد تبدیلیاں رونما ہوئیں، لیکن بہت سی قدیم روایات بدستور برقرار رہیں۔ خاندانی نظام، مذہبی رسوم، سماجی اقدار اور مقامی رسم و رواج معاشرتی زندگی کا اہم حصہ تھے۔ دوسری طرف شہری مراکز کے فروغ، مختلف پیشوں کی ترقی اور مختلف علاقوں کے لوگوں کے باہمی روابط نے معاشرے کو پہلے کی نسبت زیادہ متنوع اور متحرک بنا دیا۔ اسی امتزاج نے دہلی سلطنت کے معاشرتی ڈھانچے کو ایک منفرد شکل عطا کی، جس کے اثرات بعد کے ادوار میں بھی نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

17.2.1 شہری اور دیہی زندگی

دہلی سلطنت کے عہد میں ہندوستان کی سماجی زندگی کو سمجھنے کے لیے شہری اور دیہی معاشرے کا مطالعہ نہایت اہم ہے۔ اس دور میں اگرچہ آبادی کی اکثریت دیہات میں رہتی تھی، تاہم سیاسی استحکام، تجارتی سرگرمیوں اور انتظامی مراکز کے قیام کے باعث متعدد شہروں نے بھی نمایاں ترقی کی۔ شہروں اور دیہات کی معاشرتی زندگی میں واضح فرق تھا، لیکن دونوں ایک دوسرے سے گہرے طور پر وابستہ تھے۔ دیہات زرعی پیداوار کے مراکز تھے، جبکہ شہر تجارت، صنعت، انتظامیہ اور ثقافتی سرگرمیوں کے مراکز کی حیثیت رکھتے تھے۔ سلطنت دور میں دہلی، لاہور، ملتان، بدایوں، اجمیر، جونپور، دولت آباد اور لکھنوتی جیسے شہر سیاسی اور تجارتی اعتبار سے اہم مراکز بن گئے۔ ان شہروں میں مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے تاجر، دستکار، علما، سرکاری ملازمین اور عام لوگ آباد تھے، جس کی وجہ سے شہری زندگی متنوع اور متحرک نظر آتی ہے۔ شہروں میں بازاروں کی باقاعدہ تنظیم، مختلف پیشوں سے وابستہ محلّے اور مخصوص تجارتی مراکز موجود تھے، جہاں مقامی اور بیرونی اشیا کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ اس تجارتی سرگرمی نے نہ صرف شہروں کی خوشحالی میں اضافہ کیا بلکہ مختلف ثقافتوں اور رسم و رواج کے باہمی تبادلے کو بھی فروغ دیا۔

شہری زندگی میں مختلف پیشہ ور افراد کا اہم کردار تھا۔ جولاہے، کمہار، لوہار، بڑھئی، سنار، رنگریز، سنگ تراش، چمڑے کا کام کرنے والے، معمار اور دیگر دستکار اپنی مہارت کے ذریعے شہری معیشت اور سماجی زندگی کو مضبوط بناتے تھے۔ مختلف صنعتوں اور دستکاریوں کے فروغ سے نہ صرف روزگار کے مواقع پیدا ہوئے بلکہ ہندوستانی مصنوعات کی شہرت بیرونی ممالک تک پہنچی۔ اگرچہ اس کتاب میں معیشت پر الگ باب موجود ہے، تاہم یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ شہری زندگی کی ترقی میں دستکاروں اور ہنر مندوں کا کردار بنیادی حیثیت رکھتا تھا۔
دیہی معاشرہ دہلی سلطنت کی سماجی زندگی کی بنیاد تھا۔ دیہات کی اکثریت زراعت سے وابستہ تھی اور لوگوں کی روزمرہ زندگی کا انحصار زمین اور موسمی حالات پر تھا۔ دیہات میں خاندانی اور برادری کے تعلقات مضبوط تھے اور سماجی زندگی مقامی رسم و رواج کے مطابق چلتی تھی۔ دیہاتی آبادی سادہ طرزِ زندگی اختیار کرتی تھی، جبکہ رہائش، لباس اور خوراک میں بھی سادگی نمایاں تھی۔ اگرچہ مختلف علاقوں میں رسم و رواج میں فرق پایا جاتا تھا، لیکن مجموعی طور پر دیہی معاشرہ اپنی روایتی اقدار سے وابستہ رہا۔

رہن سہن کے اعتبار سے شہری اور دیہی زندگی میں نمایاں فرق پایا جاتا تھا۔ امراء، بڑے تاجروں اور اعلیٰ طبقے کے افراد نسبتاً کشادہ اور پختہ مکانات میں رہتے تھے، جن میں سہولتوں کا بہتر انتظام موجود ہوتا تھا، جبکہ عام لوگ اور دیہی آبادی نسبتاً سادہ مکانات میں رہائش اختیار کرتی تھی۔ لباس میں بھی معاشی حیثیت اور سماجی مرتبے کا اثر نمایاں تھا۔ اعلیٰ طبقہ عمدہ اور قیمتی کپڑوں کا استعمال کرتا تھا، جبکہ عام لوگ سادہ اور مقامی کپڑوں سے تیار کردہ لباس پہنتے تھے۔ خوراک کے معاملے میں بھی معاشرتی حیثیت اور علاقائی حالات کے مطابق تنوع پایا جاتا تھا۔ عام لوگوں کی غذا میں اناج، دالیں، سبزیاں، دودھ اور دیگر مقامی غذائیں شامل تھیں، جبکہ خوش حال طبقے کے دسترخوان پر گوشت، مختلف اقسام کے چاول، خشک میوہ جات اور متنوع پکوان پیش کیے جاتے تھے۔ مختلف تہذیبوں کے باہمی رابطے کے نتیجے میں کھانوں کے انداز اور ذائقوں میں بھی تنوع پیدا ہوا، جس نے ہندوستانی غذائی ثقافت کو مزید وسعت بخشی۔ تفریح بھی معاشرتی زندگی کا ایک اہم حصہ تھی۔ شاہی خاندان

اور امراء شکار، چوگان، گھڑ سواری اور مختلف درباری تقریبات میں حصہ لیتے تھے، جبکہ عام لوگ میلوں، تہواروں، کشتی، کھیلوں اور عوامی اجتماعات کے ذریعے تفریح حاصل کرتے تھے۔ موسیقی اور دیگر عوامی سرگرمیاں بھی شہری زندگی کا حصہ تھیں، اگرچہ ان کی نوعیت مختلف سماجی طبقات میں یکساں نہیں تھی۔

اس طرح دہلی سلطنت کے دور میں شہری اور دیہی زندگی اپنی اپنی خصوصیات کی حامل تھی۔ اگرچہ دونوں معاشروں کے معاشرتی حالات، رہن سہن اور طرزِ زندگی میں فرق موجود تھا، لیکن ایک دوسرے پر ان کا گہرا اثر بھی تھا۔ دیہات زرعی پیداوار کے ذریعے شہروں کی ضروریات پوری کرتے تھے، جبکہ شہر تجارت، صنعت اور ثقافتی سرگرمیوں کے ذریعے پورے معاشرے کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتے تھے۔ یہی باہمی تعلق دہلی سلطنت کے معاشرتی نظام کی ایک نمایاں خصوصیت تھا۔

17.2.2 خواتین کی سماجی حیثیت

دہلی سلطنت کے عہد میں خواتین کی سماجی حیثیت یکساں نہیں تھی بلکہ اس کا انحصار طبقاتی، مذہبی اور معاشی حالات پر تھا۔ اعلیٰ طبقے، شاہی خاندانوں اور امیر گھرانوں کی خواتین کی زندگی عام خواتین سے مختلف تھی، جبکہ دیہی اور نچلے طبقات کی خواتین اپنی روزمرہ ضروریات اور معاشی سرگرمیوں میں زیادہ فعال کردار ادا کرتی تھیں۔ اس طرح خواتین خاندانی نظام کا اہم جزو تھیں اور گھر کے انتظام، بچوں کی پرورش اور سماجی روایات کے تحفظ میں ان کا کردار نمایاں تھا۔ خاندانی نظام اس دور کے معاشرے کی بنیادی اکائی تھا اور خواتین اس نظام کا مرکز سمجھی جاتی تھیں۔ شادی کو ایک اہم سماجی اور مذہبی ادارے کی حیثیت حاصل تھی۔ خاندان کی عزت اور سماجی وقار کو برقرار رکھنے میں خواتین کے کردار کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ بیشتر خواتین کی زندگی گھر اور خاندان تک محدود رہتی تھی، اگرچہ مختلف علاقوں اور طبقات میں ان کی سرگرمیوں کی نوعیت مختلف ہو سکتی تھی۔

تعلیم کے میدان میں خواتین کے مواقع محدود تھے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تمام خواتین تعلیم سے محروم تھیں۔ شاہی خاندانوں اور خوش حال گھرانوں کی بعض خواتین مذہبی تعلیم، ادب اور گھریلو انتظام سے متعلق علوم حاصل کرتی تھیں۔ تاہم عام طور پر خواتین کی تعلیم کا مقصد عملی اور گھریلو زندگی سے متعلق ضروری معلومات فراہم کرنا تھا۔ اس دور میں خواتین کی تعلیمی صورت حال طبقاتی فرق سے گہرا تعلق رکھتی تھی؛ اس لیے اعلیٰ طبقے کی خواتین کو نسبتاً زیادہ مواقع حاصل تھے جبکہ عام خواتین کی تعلیم محدود دائرے تک رہتی تھی۔

پردہ اس دور کی سماجی زندگی کی ایک اہم خصوصیت تھا۔ اگرچہ پردے کی مختلف شکلیں بعض علاقوں میں پہلے سے موجود تھیں، لیکن سلطنتی دور میں اس کا رواج زیادہ نمایاں ہو گیا، خصوصاً اعلیٰ اور خوش حال طبقات میں۔ پردے کو عزت، وقار اور سماجی مرتبے کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ تاہم اس کا اطلاق تمام خواتین اور تمام علاقوں میں یکساں نہیں تھا۔ دیہی اور محنت کش طبقے کی خواتین اپنی معاشی اور عملی ضروریات کے باعث گھریلو حدود سے باہر بھی کام کرتی تھیں، اس لیے ان کی زندگی نسبتاً مختلف تھی۔ دہلی سلطنت کے دور میں ستی کی رسم بھی بعض ہندو طبقات میں رائج تھی۔ اس رسم کے تحت بعض بیوائیں اپنے شوہر کی وفات کے بعد اس کی چتا کے ساتھ جل جانا باعثِ فخر اور وفاداری کی

علامت سمجھتی تھیں۔ تاہم یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ستی کی رسم تمام ہندو خواتین یا تمام علاقوں میں یکساں طور پر رائج نہیں تھی۔ اس کا تعلق زیادہ تر بعض اعلیٰ اور جنگجو طبقات، خصوصاً راجپوت خاندانوں سے تھا۔ بہت سی بیوائیں ستی نہیں ہوتی تھیں بلکہ عام سماجی زندگی گزارتی تھیں۔ اس لیے ستی کو پورے ہندوستانی معاشرے کی عمومی روایت کے طور پر نہیں دیکھا جا سکتا بلکہ یہ ایک مخصوص سماجی عمل تھا جو بعض طبقات تک محدود تھا۔ بیوہ خواتین کی حالت بھی سماجی روایات سے متاثر تھی۔ بعض طبقات میں بیوہ کی زندگی پر مختلف پابندیاں عائد کی جاتی تھیں، جبکہ بعض صورتوں میں خاندان ان کی کفالت کی ذمہ داری اٹھاتا تھا۔ مسلم معاشرے میں بیوہ خواتین کو دوبارہ شادی کا حق حاصل تھا، جبکہ ہندو معاشرے میں مختلف علاقوں اور طبقات کے مطابق صورت حال میں فرق پایا جاتا تھا۔

شاہی خاندانوں اور امیر گھرانوں کی بعض خواتین نے سیاسی اور سماجی میدانوں میں بھی اپنی صلاحیتوں کا اظہار کیا۔ اگرچہ مجموعی طور پر معاشرہ مردانہ غلبے کا حامل تھا، لیکن بعض خواتین نے اپنی ذہانت، انتظامی صلاحیت اور اثر و رسوخ کے ذریعے نمایاں مقام حاصل کیا۔ اس ضمن میں سلطانہ رضیہ نے دہلی سلطنت کی حکمران کی حیثیت سے اپنی غیر معمولی سیاسی اور انتظامی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا، جبکہ شاہ ترکان نے بھی درباری سیاست اور جانشینی کے معاملات میں اہم کردار ادا کیا۔ اسی طرح مختلف راجپوت ریاستوں میں رانی ہنسا بائی اور رانی کرناوتی جیسی خواتین نے ریاستی انتظام، جانشینی اور سیاسی استحکام میں قابلِ ذکر خدمات انجام دیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خواتین کی حیثیت کو صرف گھریلو دائرے تک محدود سمجھنا درست نہیں ہوگا۔ چنانچہ دہلی سلطنت کے دور میں خواتین کی سماجی حیثیت مختلف عوامل سے متاثر تھی۔ طبقاتی فرق، مذہبی روایات، خاندانی اقدار اور معاشی حالات نے ان کے حقوق اور فرائض کا تعین کیا۔ اگرچہ خواتین کو متعدد سماجی پابندیوں کا سامنا تھا، تاہم وہ معاشرتی اور خاندانی زندگی کا ایک لازمی اور مؤثر حصہ تھیں اور ان کے کردار کے بغیر اس دور کے معاشرے کی مکمل تصویر پیش نہیں کی جا سکتی۔

17.2.3 غلامی کا نظام

دہلی سلطنت کے معاشرتی نظام میں غلامی ایک اہم ادارے کی حیثیت رکھتی تھی۔ اگرچہ غلامی کا رواج ہندوستان میں قدیم زمانے سے موجود تھا، لیکن ترک حکمرانوں کی آمد کے بعد اس ادارے کو ایک نئی وسعت اور منظم شکل ملی۔ سلطنت دور میں غلام صرف گھریلو خدمت تک محدود نہیں تھے بلکہ انتظامی، فوجی اور شاہی امور میں بھی ان سے خدمات لی جاتی تھیں۔ بعض غلام اپنی صلاحیت، وفاداری اور تربیت کی بدولت اعلیٰ عہدوں تک بھی پہنچ جاتے تھے، جس سے اس دور کے غلامی کے نظام کی ایک منفرد خصوصیت سامنے آتی ہے۔

غلام مختلف ذرائع سے حاصل کیے جاتے تھے۔ جنگی قیدیوں کو غلام بنایا جاتا تھا، جبکہ بعض غلام خرید و فروخت کے ذریعے حاصل کیے جاتے تھے۔ بعض افراد قرض یا معاشی مجبوریوں کے باعث بھی غلامی اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ اس زمانے میں غلاموں کی خرید و فروخت ایک باقاعدہ تجارتی سرگرمی تھی اور مختلف شہروں میں غلاموں کی منڈیاں بھی موجود تھیں۔ ترک، وسط ایشیائی، ہندوستانی اور دیگر علاقوں سے تعلق رکھنے والے غلام سلطنت کے مختلف حصوں میں خدمات انجام دیتے تھے۔ سلطنت دہلی میں غلاموں کی کئی اقسام تھیں۔

بعض غلام شاہی محل سے وابستہ ہوتے تھے اور شاہی خاندان کی خدمت انجام دیتے تھے، جبکہ بعض فوج میں شامل ہو کر عسکری خدمات سرانجام دیتے تھے۔ اسی طرح بعض غلام انتظامی امور، شاہی کارخانوں، اصطبلوں، باغات اور دیگر سرکاری محکموں میں بھی کام کرتے تھے۔ ان کی ذمہ داریاں ان کی صلاحیت، تربیت اور آقا کی ضرورت کے مطابق مختلف ہوتی تھیں۔

غلاموں کی تربیت پر بھی خاص توجہ دی جاتی تھی۔ شاہی خدمت کے لیے منتخب غلاموں کو عسکری، انتظامی اور عملی مہارتیں سکھائی جاتی تھیں تاکہ وہ مختلف ذمہ داریاں مؤثر انداز میں انجام دے سکیں۔ بعض باصلاحیت غلام اپنے آقاؤں کا اعتماد حاصل کر کے اہم عہدوں تک پہنچ گئے، یہاں تک کہ سلطان بن بیٹھے۔ دہلی سلطنت کی تاریخ میں ایسے کئی غلاموں کی مثالیں ملتی ہیں جنہوں نے اپنی قابلیت اور وفاداری کی بدولت نمایاں مقام حاصل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں غلامی صرف خدمت کا ذریعہ نہیں تھی بلکہ بعض اوقات سماجی ترقی کا ایک وسیلہ بھی بن جاتی تھی۔ فیروز شاہ تغلق (88-1351) کے دور میں غلامی کے نظام کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔ مؤرخین کے مطابق اس کے زیرِ انتظام غلاموں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور ان کی تربیت لیے ایک شعبہ دیوان بندگان بھی قائم کیا تھا۔ ان غلاموں کو مختلف شعبوں میں تعینات کیا گیا تھا، جن میں شاہی محل، فوج، کارخانے، باغات اور تعمیراتی کام شامل تھے۔ فیروز شاہ نے ان کی تربیت اور دیکھ بھال کے لیے بھی انتظامات کیے تھے، تاکہ وہ ریاستی خدمات کو مؤثر انداز میں انجام دے سکیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے دور میں غلامی صرف ذاتی خدمت تک محدود نہیں رہی بلکہ ریاستی انتظام کا ایک منظم حصہ بن گئی۔ اگرچہ غلام معاشرے کے نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے، لیکن ان کی حالت تمام صورتوں میں یکساں نہیں تھی۔ بعض غلاموں کو بہتر رہائش، خوراک اور تربیت حاصل تھی، جبکہ عام گھریلو غلاموں کی زندگی نسبتاً زیادہ مشکلات پر مشتمل تھی۔ ان کی حیثیت کا انحصار زیادہ تر ان کے آقا، ذمہ داریوں اور سماجی حالات پر ہوتا تھا۔ اس لیے دہلی سلطنت کے غلامی کے نظام کو یک رخی انداز میں نہیں دیکھا جاسکتا، بلکہ اس میں مختلف صورتیں اور درجات موجود تھے۔

اس طرح دہلی سلطنت کے دور میں غلامی معاشرتی اور انتظامی نظام کا ایک اہم حصہ تھی۔ غلام نہ صرف گھریلو اور ذاتی خدمات انجام دیتے تھے بلکہ فوج، انتظامیہ، تعمیرات اور شاہی اداروں میں بھی ان کا نمایاں کردار تھا۔ اگرچہ موجودہ دور کے تناظر میں غلامی ایک غیر انسانی نظام تصور کیا جاتا ہے، لیکن قرونِ وسطیٰ کے معاشرتی اور سیاسی حالات میں یہ ایک تسلیم شدہ ادارہ تھا، جس نے دہلی سلطنت کے انتظامی ڈھانچے اور سماجی زندگی کو نمایاں طور پر متاثر کیا۔

17.3 دہلی سلطنت کے عہد کی ثقافت

17.3.1 تعلیم اور علمی سرگرمیاں

دہلی سلطنت کے دور میں تعلیم کو معاشرے اور ثقافت کی ترقی کا ایک اہم ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ اسلامی حکومت کے قیام کے بعد تعلیمی نظام کو منظم کرنے پر خصوصی توجہ دی گئی اور مختلف شہروں میں مکتب، مدرسے اور خانقاہیں علمی سرگرمیوں کے مراکز کے طور پر قائم کی گئیں۔ ان اداروں کا بنیادی مقصد دینی تعلیم کی اشاعت تھا، تاہم اس کے ساتھ مختلف عقلی اور عملی علوم کی تدریس بھی کی جاتی تھی۔ تعلیم نے نہ

صرف مذہبی شعور کو فروغ دیا بلکہ علمی اور تہذیبی روایات کے استحکام میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ ابتدائی تعلیم مکاتب میں دی جاتی تھی، جہاں بچوں کو قرآنِ مجید کی تعلیم، عربی و فارسی زبان کی ابتدائی معلومات، لکھنا پڑھنا اور حساب سکھایا جاتا تھا۔ مسلم خاندانوں میں بچے کی تعلیم کا آغاز عموماً **بسم اللہ** کی تقریب سے ہوتا تھا، جس کے بعد اسے مکتب بھیجا جاتا تھا۔ اس مرحلے پر طلبہ کو بنیادی مذہبی تعلیم کے ساتھ اخلاقی تربیت پر بھی توجہ دی جاتی تھی۔ ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد طلبہ اعلیٰ تعلیم کے لیے مدارس کا رخ کرتے تھے۔ مدرسے سلطنتی دور کے اعلیٰ تعلیمی مراکز تھے۔ ان میں فقہ، حدیث، تفسیر، منطق، فلسفہ، ریاضی، طب، ہیئت اور دیگر علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ متعدد مدارس کو سلاطین اور امرا کی سرپرستی حاصل تھی، جس کی وجہ سے ان کی مالی ضروریات ریاست یا اوقاف کے ذریعے پوری کی جاتی تھیں۔ دہلی، اجمیر، بدایوں، ملتان، بیدر، اور جونپور اس زمانے کے اہم تعلیمی مراکز تھے، جہاں ہندوستان کے علاوہ بیرونی علاقوں سے بھی طلبہ اور علما آتے تھے۔ تعلیم کے فروغ میں خانقاہوں کا کردار بھی قابلِ ذکر تھا۔ اگرچہ خانقاہوں کا بنیادی مقصد روحانی تربیت تھا، لیکن وہاں دینی تعلیم، اخلاقی اصلاح اور علمی مباحث کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ بہت سے طلبہ اور اہلِ علم خانقاہوں سے وابستہ رہ کر علمی و اخلاقی تربیت حاصل کرتے تھے۔ اس طرح مکتب، مدرسہ اور خانقاہ، تینوں مل کر دورِ دہلی سلطنت کے تعلیمی نظام کی بنیاد تشکیل دیتے تھے۔

مسلم تعلیمی اداروں کے ساتھ ساتھ ہندو معاشرے کے روایتی تعلیمی مراکز بھی اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔ مندروں، مٹھوں اور آشرموں میں سنسکرت، وید، فلسفہ، ادب، ریاضی، نجوم اور دیگر روایتی علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اگرچہ ترک فتوحات کے دوران بعض قدیم تعلیمی مراکز کو نقصان پہنچا، تاہم بعد میں متعدد مقامات پر ہندو تعلیمی روایت دوبارہ فعال ہو گئی۔ بنارس، متھرا، نادیہ اور دیگر مراکز اپنی علمی حیثیت برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔

دہلی سلطنت کے حکمرانوں نے تعلیم کے فروغ میں مختلف انداز سے حصہ لیا۔ بعض سلاطین نے مدارس قائم کیے، اہلِ علم کی سرپرستی کی اور اساتذہ و طلبہ کے لیے وظائف کا انتظام کیا۔ اس کے نتیجے میں ہندوستان میں ایک ایسا تعلیمی ماحول پیدا ہوا جس میں مختلف علوم کی تدریس اور علمی تبادلہ ممکن ہوا۔ اس دور کے تعلیمی اداروں نے بعد کے ادوار میں بھی ہندوستان کی علمی روایت پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ دہلی سلطنت کا تعلیمی نظام مذہبی اور دنیاوی علوم کے امتزاج پر مبنی تھا۔ مکتب، مدرسہ، خانقاہ اور روایتی ہندو تعلیمی مراکز نے اپنے اپنے دائرۂ کار میں علم کی اشاعت، اخلاقی تربیت اور فکری نشوونما میں اہم کردار ادا کیا۔ یہی تعلیمی روایت بعد کے ہندوستانی معاشرے اور ثقافت کی تشکیل میں بھی مؤثر ثابت ہوئی۔

17.3.2 دہلی سلطنت کے عہد میں ہندی زبان و ادب کی ترقی

اس کتاب کے ایک الگ باب میں فارسی زبان و ادب اور فارسی تاریخی مآخذ پر تفصیل سے بحث کی جا چکی ہے۔ اس لیے اس مقام پر فارسی ادب کی تکرار سے گریز کرتے ہوئے صرف دہلی سلطنت کے دور میں ہندی زبان اور ادب کی ترقی کا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے، تاکہ اس عہد کی ثقافتی زندگی کا ایک اہم پہلو واضح ہو سکے۔ دہلی سلطنت کا دور ہندوستان کی لسانی اور ادبی تاریخ میں ایک اہم مرحلہ ہے۔ اس عہد میں جہاں

ایک طرف فارسی کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی، وہیں دوسری طرف عوامی سطح پر بولی جانے والی مقامی زبانیں بھی مسلسل ترقی کر رہی تھیں۔ مختلف علاقوں کی بولیوں اور اپبھرمش روایت کے امتزاج سے ہندی زبان کی ابتدائی صورتیں زیادہ واضح ہوئیں۔ سلطنت دور کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی حالات نے ہندی زبان کو وسیع تر عوامی اظہار کا ذریعہ بنایا اور اس کی ادبی روایت کو نئی جہت عطا کی۔

ہندی زبان کی ترقی ایک تدریجی عمل تھا۔ اس کی جڑیں سنسکرت، پراکرت اور اپبھرمش کی قدیم لسانی روایت میں پیوست تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ مختلف علاقائی بولیوں، جیسے برج، اودھی، راجستھانی، کھڑی بولی اور دیگر مقامی زبانوں نے ہندی کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ دہلی سلطنت کے دوران مختلف علاقوں کے درمیان سیاسی روابط، تجارت، نقل و حرکت اور شہری مراکز کی ترقی نے ان زبانوں کے باہمی اختلاط کو مزید فروغ دیا، جس کے نتیجے میں ہندی زبان زیادہ منظم صورت اختیار کرنے لگی۔ سلطنتی دور کے سماجی حالات نے بھی ہندی ادب کی ترقی پر گہرا اثر ڈالا۔ اس زمانے میں عوامی زندگی، مذہبی رجحانات، سماجی تبدیلیاں اور علاقائی روایات ادبی اظہار کا حصہ بنیں۔ ہندی ادب درباری حلقوں تک محدود نہ رہا بلکہ عام لوگوں کے جذبات، عقائد، معاشرتی اقدار اور روزمرہ زندگی کی عکاسی کرنے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کا ادب صرف ادبی تخلیق نہیں بلکہ اس زمانے کے معاشرتی اور ثقافتی حالات کا آئینہ بھی ہے۔

دہلی سلطنت کے ابتدائی دور میں ویر گاتھا (رزمی) روایت نمایاں تھی۔ اس روایت میں مقامی حکمرانوں، جنگوں، بہادری، وفاداری اور قربانی کے واقعات کو شعری انداز میں پیش کیا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں پرتھوی راج راسو اور الہا کھنڈ جیسی تصانیف نمایاں حیثیت رکھتی ہیں، جن میں راجپوت سورماؤں کی شجاعت اور جنگی کارناموں کو ادبی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ان تخلیقات کا مقصد صرف تفریح فراہم کرنا نہیں تھا بلکہ سماجی اقدار، شجاعت اور قومی احساس کو بھی مضبوط بنانا تھا۔ اگرچہ ان میں تاریخی عناصر موجود ہیں، لیکن ان کا اصل مقصد ادبی اور اخلاقی اقدار کی ترویج تھا۔ دہلی سلطنت کے آخری ادوار میں ہندی ادب کے موضوعات میں مزید وسعت پیدا ہوئی۔ عوامی زندگی، اخلاقی تعلیم، انسانی اقدار اور مذہبی افکار کو زیادہ اہمیت دی جانے لگی۔ اس دور میں ادبی زبان نسبتاً سادہ اور عوام کے قریب ہوتی گئی، جس سے ہندی ادب کا دائرۂ اثر وسیع ہوا۔ مختلف علاقوں کے شعرا اور ادیبوں نے اپنی مقامی بولیوں میں تخلیق کر کے ہندی ادب کو زیادہ متنوع اور ہمہ گیر بنایا۔ اگرچہ بھکتی تحریک کا تفصیلی مطالعہ اس کتاب کے ایک الگ باب میں کیا گیا ہے، تاہم یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ سلطنت دور کے اواخر میں بھکتی روایت نے ہندی زبان و ادب کو نئی توانائی بخشی۔ مقامی زبانوں میں مذہبی اور اخلاقی تعلیمات کی پیشکش سے ہندی ادب عوام کے زیادہ قریب ہوا اور اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ اس عمل نے ہندی کو صرف ادبی زبان ہی نہیں بلکہ عوامی ابلاغ اور سماجی اصلاح کا مؤثر ذریعہ بھی بنا دیا۔ دہلی سلطنت کے دور میں مختلف ثقافتوں اور زبانوں کے باہمی روابط نے بھی ہندی ادب کے ارتقا میں اہم کردار ادا کیا۔ مختلف علاقوں کے لوگوں کے درمیان روابط، شہروں کی ترقی، تجارتی سرگرمیوں اور ثقافتی تبادلوں کے نتیجے میں زبان و ادب کے نئے رجحانات سامنے آئے۔ اگرچہ اس زمانے میں فارسی سرکاری زبان تھی، لیکن عوامی زندگی میں ہندی اور اس کی مختلف بولیاں اظہارِ خیال کا مؤثر ذریعہ بنی رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سلطنت دور میں ہندی ادب نے اپنی الگ شناخت قائم کی اور بعد کے ادوار میں اس کی ترقی کی مضبوط بنیاد فراہم ہوئی۔

اس بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ دہلی سلطنت کا دور ہندی زبان وادب کی ترقی میں ایک اہم سنگِ میل ثابت ہوا۔ اس عہد میں ہندی زبان نے اپنی قدیم لسانی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے نئے سماجی، ثقافتی اور فکری عناصر کو بھی اپنے اندر جذب کیا۔ عوامی زندگی سے اس کی وابستگی، علاقائی بولیوں کی شمولیت اور مختلف ادبی رجحانات کے فروغ نے ہندی ادب کو ایک نئی سمت عطا کی۔ یہی بنیاد بعد میں ہندی ادب کے مزید ارتقا اور اس کی ہمہ گیر مقبولیت کا سبب بنی۔

17.3.3 فنِ تعمیر

دہلی سلطنت کا دور ہندوستانی فنِ تعمیر کی تاریخ میں ایک نئے مرحلے کی نمائندگی کرتا ہے۔ ترک حکمران اپنے ساتھ وسطی ایشیا اور ایران کی تعمیراتی روایات ہندوستان لائے، لیکن انہوں نے انہیں جوں کا توں اختیار نہیں کیا بلکہ مقامی تعمیراتی فن، دستی مہارت اور دستیاب تعمیراتی وسائل کے ساتھ ہم آہنگ کیا۔ اس امتزاج کے نتیجے میں ایک ایسا منفرد **ہند۔اسلامی طرزِ تعمیر** وجود میں آیا جس نے بعد کے مغلیہ فنِ تعمیر کے لیے مضبوط بنیاد فراہم کی۔ اس دور میں مساجد، مقابر، قلعے، مدارس، دروازے، حوض اور دیگر عوامی عمارتیں تعمیر کی گئیں، جن میں مذہبی، سیاسی اور ثقافتی مقاصد نمایاں تھے۔

فنِ تعمیر کی نمایاں خصوصیات

- دہلی سلطنت کے فنِ تعمیر میں متعدد ایسی خصوصیات نمایاں ہیں جنہوں نے اسے سابقہ ہندوستانی تعمیراتی روایت سے ممتاز کیا۔ سب سے اہم خصوصیت **محراب (Arch)** اور **گنبد (Dome)** کا استعمال تھا۔ قدیم ہندوستانی عمارتوں میں شہتیری نظام رائج تھا، لیکن ترک معماروں نے محرابی نظام کو فروغ دیا، جس سے وسیع اور مضبوط عمارتوں کی تعمیر ممکن ہوئی۔ اسی طرح گنبدوں نے نہ صرف عمارتوں کی خوبصورتی میں اضافہ کیا بلکہ ان کی مضبوطی اور وسعت کو بھی ممکن بنایا۔
- اس دور کی عمارتوں میں **میناروں** کا استعمال بھی نمایاں تھا، جن کا مذہبی اور علامتی دونوں اعتبار سے اہم مقام تھا۔ قطب مینار اس طرزِ تعمیر کی بہترین مثال ہے۔ آرائش کے لیے قرآنی آیات کی خطاطی، ہندسی نقوش، بیل بوٹے اور نباتاتی ڈیزائن استعمال کیے گئے۔ اگرچہ اسلامی روایت میں جاندار اشکال کے استعمال سے گریز کیا جاتا تھا، لیکن ہندوستانی کاریگروں نے مقامی آرائشی عناصر کو بھی مہارت کے ساتھ شامل کیا، جس سے تعمیرات میں ایک منفرد حسن پیدا ہوا۔
- دہلی سلطنت کے فنِ تعمیر کی ایک اہم خصوصیت **ہندوستانی اور اسلامی تعمیراتی روایات کا امتزاج** تھا۔ ابتدائی دور میں بعض مساجد اور دیگر عمارتوں کی تعمیر میں قدیم مندروں کے ستون اور دیگر تعمیراتی اجزا استعمال کیے گئے، لیکن بعد میں ہندوستانی معماروں نے اسلامی تعمیراتی اصولوں کو بخوبی سمجھ لیا اور ایک ایسا نیا اسلوب پیدا کیا جسے ہند۔اسلامی فنِ تعمیر کہا جاتا ہے۔ یہی امتزاج بعد کے ادوار میں مزید ترقی یافتہ صورت اختیار کرتا گیا۔

دہلی سلطنت میں فن تعمیر کی ارتقاء

غلام خاندان کے دور میں دہلی سلطنت کے فنِ تعمیر کی بنیاد رکھی گئی۔ قطب الدین ایبک نے دہلی میں **قوت الاسلام مسجد** کی تعمیر کا آغاز

1197ء میں کیا، جو ہندوستان کی اولین جامع مساجد میں شمار ہوتی ہے۔اس مسجد کی تعمیر میں قدیم ہندواور جین مندروں کے ستون استعمال کیے گئے، جس سے ابتدائی دور کے ہند۔اسلامی امتزاج کی جھلک نمایاں ہوتی ہے۔اسی دور میں 1199ء میں **قطب مینار** کی تعمیر بھی شروع ہوئی، جسے بعد میں شمس الدین التمش نے 1232ء میں مکمل کرایا، بعد میں محمد بن تغلق، فیروز شاہ تغلق اور سکندر لودی نے اس کی مرمت کروائی۔ سرخ پتھر سے تعمیر شدہ یہ مینار اپنے تناسب، خطاطی، نقش و نگار اور تعمیراتی مہارت کے باعث دنیا کی ممتاز تاریخی عمارتوں میں شمار ہوتی ہے۔ شمس الدین التمش نے بھی فنِ تعمیر کی سرپرستی کی۔ سلطان گڑھی میں اس کے بیٹے کا مقبرہ اور مہرولی میں اس کا مقبرہ ہندوستان میں اسلامی مقبرہ سازی کی ابتدائی اور اہم مثالوں میں شمار کیا جاتا ہے۔اس کی دیواروں پر قرآنی آیات، خوبصورت خطاطی اور نفیس نقاشی اس دور کے اعلیٰ فنی معیار کی عکاسی کرتی ہیں۔ غلام خاندان کے دور کی تعمیرات میں سادگی، مضبوطی اور عملی ضرورت کو خاص اہمیت دی گئی، تاہم یہی دور بعد کی ترقی یافتہ سلطنتی تعمیرات کی بنیاد بھی ثابت ہوا۔

خلجی خاندان کے زمانے میں فنِ تعمیر نے مزید ترقی کی۔ سلطنت کی معاشی خوش حالی اور سیاسی استحکام نے عظیم الشان عمارتوں کی تعمیر کو فروغ دیا۔اس دور میں حقیقی محراب، متوازن گنبد اور بہتر تعمیراتی منصوبہ بندی نمایاں طور پر سامنے آئی۔اس عہد کی سب سے اہم تعمیر **علائی دروازہ** ہے، جسے ہندوستانی اسلامی فنِ تعمیر کا ایک شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ سرخ پتھر اور سفید سنگِ مرمر کا حسین امتزاج، نفیس خطاطی، باریک نقش و نگار اور متناسب محرابیں اس کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ متعدد ماہرین کے نزدیک ہندوستان میں پہلی مرتبہ اسلامی تعمیراتی اصولوں کا مکمل اظہار اسی عمارت میں نظر آتا ہے۔ علاؤالدین خلجی نے **قوت الاسلام مسجد** کی توسیع بھی کرائی اور **علائی مینار** کی تعمیر کا آغاز کیا، جس کا مقصد قطب مینار سے بھی بلند مینار تعمیر کرنا تھا، لیکن اس کی وفات کے باعث یہ منصوبہ مکمل نہ ہو سکا۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خلجی حکمران اپنی سیاسی طاقت اور سلطنت کی عظمت کو عظیم الشان تعمیرات کے ذریعے بھی ظاہر کرنا چاہتے تھے۔اس دور کی تعمیرات میں مضبوطی کے ساتھ آرائش اور فنی نفاست کا ایسا امتزاج ملتا ہے جس نے بعد کے تغلق اور مغلیہ ادوار کے فنِ تعمیر پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

تغلق خاندان کے دور میں فنِ تعمیر نے ایک نئی سمت اختیار کی۔ خلجی عہد کی نسبت اس دور کی عمارتوں میں سادگی، مضبوطی اور دفاعی ضروریات کو زیادہ اہمیت دی گئی۔اس زمانے میں سلطنت کو سیاسی اور معاشی مشکلات کا سامنا تھا، جس کا اثر تعمیراتی سرگرمیوں پر بھی پڑا۔اسی لیے تغلق دور کی عمارتوں میں غیر ضروری آرائش کے بجائے مضبوط دیواریں، سادہ بیرونی شکل اور عملی افادیت نمایاں نظر آتی ہے۔ اگرچہ ان تعمیرات میں تزئین و آرائش نسبتاً کم ہے، لیکن انجینئرنگ، منصوبہ بندی اور پائیداری کے اعتبار سے یہ عمارتیں نہایت اہم مقام رکھتی ہیں۔ **غیاث الدین تغلق** نے دہلی کے قریب **تغلق آباد** کے عظیم قلعے کی تعمیر کرائی، جو سلطنتی دور کی سب سے مضبوط دفاعی تعمیرات میں شمار ہوتا ہے۔اس قلعے کی بلند اور ڈھلوان دیواریں، مضبوط برج اور وسیع رقبہ اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اس کی تعمیر میں دفاعی حکمتِ عملی کو بنیادی اہمیت دی گئی تھی۔ اگرچہ اس میں آرائش کم ہے، لیکن اس کی مضبوطی اور تعمیراتی منصوبہ بندی اسے دہلی سلطنت کے نمایاں قلعوں میں شامل کرتی ہے۔اسی مقام پر واقع **غیاث الدین تغلق کا مقبرہ** بھی سلطنتی فنِ تعمیر کا ایک اہم نمونہ ہے، جس میں سرخ پتھر اور سفید سنگِ مرمر کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔اس کی ڈھلوان دیواریں اور متناسب گنبد بعد کے تعمیراتی رجحانات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ **محمد بن تغلق** نے

بھی متعدد تعمیراتی منصوبے شروع کیے۔اس نے دہلی کے قریب **جہان پناہ** شہر کی بنیاد رکھی، جس کا مقصد پرانی بستیوں کو ایک مضبوط فصیل کے اندر جمع کرنا تھا۔اس کے علاوہ اس نے **عادل آباد قلعہ** بھی تعمیر کرایا، جو دفاعی نقطۂ نظر سے اہم تھا۔اگرچہ اس کے بہت سے منصوبے مکمل نہ ہو سکے، لیکن ان سے اس کے وسیع تعمیراتی وژن اور منصوبہ بندی کا اندازہ ہوتا ہے۔

فیروز شاہ تغلق کو سلطنتی دور کے اہم ترین معمار حکمرانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔اس نے نئی عمارتوں کی تعمیر کے ساتھ ساتھ قدیم عمارتوں کی مرمت اور حفاظت پر بھی خصوصی توجہ دی۔اس نے **فیروز شاہ کوٹلہ** تعمیر کروایا، جو قلعے، محل، مسجد اور عوامی عمارتوں پر مشتمل ایک منظم تعمیراتی مجموعہ تھا۔اسی نے قطب مینار کے زلزلے سے متاثرہ حصوں کی مرمت کرائی اور متعدد مساجد، مدارس، سرائیں، پل، نہریں اور باغات تعمیر کروائے۔ فیروز شاہ نے **اشوک کے ستون** بھی مختلف مقامات سے دہلی منتقل کروا کر اپنی تعمیرات میں نصب کیے، جو اس کے تاریخی شعور اور تعمیراتی ذوق کی علامت ہیں۔ تغلق دور کی عمارتوں میں ملبے کے پتھر (Rubble Masonry) کا استعمال زیادہ نظر آتا ہے، جبکہ بیرونی دیواروں پر ضرورت کے مطابق تراشے ہوئے پتھر لگائے جاتے تھے۔اس سے تعمیراتی لاگت کم ہوتی تھی اور عمارتیں زیادہ مضبوط بھی رہتی تھیں۔یہی وجہ ہے کہ اس دور کی متعدد عمارتیں آج بھی اپنی اصل ساخت کے ساتھ موجود ہیں۔اس دور کا فنِ تعمیر سادگی، مضبوطی اور عملی افادیت کا بہترین نمونہ تصور کیا جاتا ہے۔

سید خاندان کا دور نسبتاً مختصر اور سیاسی اعتبار سے کمزور تھا، اس لیے اس زمانے میں عظیم الشان تعمیراتی منصوبے کم نظر آتے ہیں۔تاہم مقبرہ سازی کی روایت اس دور میں جاری رہی۔سید حکمرانوں کے مقابر نسبتاً سادہ مگر متناسب تعمیرات کی مثال ہیں۔اگرچہ ان میں آرائش محدود ہے، لیکن ان کی منصوبہ بندی اور گنبدوں کی ساخت سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطنتی تعمیراتی روایت کا تسلسل برقرار رہا۔ **لودھی خاندان** کے دور میں فنِ تعمیر کو ایک مرتبہ پھر فروغ حاصل ہوا، خصوصاً مقبرہ سازی کے میدان میں۔اس عہد کی تعمیرات میں سادگی اور خوبصورتی کے درمیان متوازن امتزاج نظر آتا ہے۔لودھی معماروں نے آٹھ پہلو (Octagonal) اور مربع منصوبے والے مقبروں کی تعمیر کو فروغ دیا، جن کے گرد باغات اور کھلے میدان بھی بنائے جاتے تھے۔یہی روایت بعد میں مغل دور کے چار باغ منصوبے کی بنیاد بنی۔دہلی میں موجود **بڑا گنبد، شیش گنبد، محمد شاہ کا مقبرہ اور سکندر لودھی کا مقبرہ** اس دور کی نمایاں یادگاریں ہیں۔ان عمارتوں میں متناسب گنبد، نفیس خطاطی، رنگین ٹائلوں کی آرائش، خوبصورت محرابیں اور متوازن نقشہ بندی نمایاں خصوصیات ہیں۔لودھی دور میں باغات اور مقابر کے باہمی تعلق کو بھی اہمیت دی گئی، جس کا اثر بعد میں مغلیہ تعمیرات پر واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

چنانچہ دہلی سلطنت کا فنِ تعمیر ہندوستانی تاریخ کا ایک اہم بنیادی ستون ہے۔اس دور میں ہندوستانی اور اسلامی تعمیراتی روایات کے امتزاج سے ایک منفرد طرزِ تعمیر وجود میں آیا، جس نے نہ صرف سلطنتی عہد کی سیاسی اور مذہبی ضروریات کو پورا کیا بلکہ ہندوستان کی ثقافتی شناخت کو بھی نئی جہت عطا کی۔ غلام دور کی ابتدائی کوششوں سے لے کر لودھی دور کی ترقی یافتہ مقبرہ سازی تک، سلطنتی فنِ تعمیر مسلسل ارتقا پذیر رہا۔یہی ارتقائی عمل بعد میں مغل دور کے عظیم الشان فنِ تعمیر کی بنیاد ثابت ہوا، جس کی جھلک ہمایوں کے مقبرے، فتح پور سیکری اور تاج

محل جیسی تعمیرات میں واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔

دہلی سلطنت کے زیرِاثر جہاں دہلی میں تعمیراتی سرگرمیاں فروغ پارہی تھیں، وہیں مختلف علاقوں میں بھی مقامی روایات اور اسلامی فنِ تعمیر کے امتزاج سے ایک منفرد علاقائی طرزِ تعمیر وجود میں آیا۔ ان علاقائی ریاستوں نے دہلی کے بنیادی تعمیراتی اصولوں کو اختیار کیا، لیکن انہیں مقامی آب وہوا، دستیاب تعمیراتی مواد اور مقامی فنی روایات کے مطابق ڈھال لیا۔ اسی وجہ سے اگرچہ ان عمارتوں میں اسلامی فنِ تعمیر کی بنیادی خصوصیات مثلاً محراب، گنبد اور مینار موجود ہیں، لیکن ان کے نقشے، آرائش اور تعمیراتی انداز میں نمایاں علاقائی خصوصیات بھی دکھائی دیتی ہیں۔ بنگال، گجرات، مالوہ، جونپور اور دکن کے علاقوں میں اس علاقائی فنِ تعمیر کی بہترین مثالیں ملتی ہیں۔ بنگال میں پتھر کی کمی کے باعث زیادہ تر اینٹوں سے عمارتیں تعمیر کی گئیں اور ان کی چھتوں کو مقامی جھونپڑیوں کی طرز پر خم دار (Curved Cornice) بنایا گیا۔ گجرات میں ہندو اور جین معماروں کی مہارت کے اثر سے باریک سنگ تراشی، نفیس جالیوں، خوبصورت ستونوں اور آرائشی نقاشی کو نمایاں مقام ملا۔ مالوہ اور جونپور کی عمارتوں میں مضبوط داخلی دروازے، بلند محرابیں اور وسیع صحن نمایاں خصوصیات ہیں، جبکہ دکن میں بہمنی حکمرانوں نے مقامی اور ایرانی روایات کے امتزاج سے ایک الگ تعمیراتی اسلوب کو فروغ دیا۔

اس طرح دہلی سلطنت کے عہد میں علاقائی فنِ تعمیر نے ہندوستان کے مختلف حصوں میں متنوع تعمیراتی روایات کو جنم دیا۔ اگرچہ ان تمام علاقوں میں اسلامی فنِ تعمیر کے بنیادی عناصر مشترک تھے، لیکن ہر خطے نے اپنی مقامی تہذیب، فن اور تعمیراتی روایت کو بھی برقرار رکھا۔ یہی تنوع ہندوستانی فنِ تعمیر کی ایک اہم خصوصیت بن گیا اور بعد میں مغلیہ دور کے فنِ تعمیر کی تشکیل میں بھی ان علاقائی اسالیب نے نمایاں کردار ادا کیا۔

17.3.4 مصوری

دہلی سلطنت کے عہد میں فنِ تعمیر کے مقابلے میں مصوری کو نسبتاً کم سرکاری سرپرستی حاصل ہوئی، تاہم اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا کہ اس دور میں مصوری کا فن معدوم تھا۔ اگرچہ بعض مذہبی حلقوں میں جاندار اشخاص کی تصاویر بنانے کے بارے میں تحفظات پائے جاتے تھے، لیکن عملی طور پر شاہی محلات، امراء کی رہائش گاہوں، مخطوطات اور علاقائی درباروں میں مصوری کی روایت مختلف صورتوں میں موجود رہی۔ سلطنت دور میں ہندوستانی اور ایرانی فنون کے باہمی امتزاج نے مصوری کو ایک نئی سمت عطا کی، جس کے اثرات بعد میں مغلیہ مصوری میں نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس دور کی مصوری کے بارے میں مؤرخین کی آرا مختلف ہیں۔ ابتدائی محققین کا خیال تھا کہ اس دور میں مذہبی پابندیوں کی وجہ سے مصوری کو فروغ نہیں ملا، لیکن بعد کی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ اگرچہ یہ فن شاہی سرپرستی میں وسیع پیمانے پر ترقی نہیں کر سکا، تاہم اس کی مختلف شکلیں معاشرے میں موجود تھیں۔ متعدد تاریخی حوالوں، ادبی تصانیف اور محفوظ مخطوطات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دہلی سلطنت میں مصوری کا فن مکمل طور پر ختم نہیں ہوا تھا بلکہ محدود پیمانے پر مسلسل ارتقا پذیر رہا۔

شاہی محلات اور اہم عمارتوں کی دیواروں کو مختلف رنگوں اور آرائشی نقش و نگار سے مزین کرنے کا رواج بھی اس دور میں موجود تھا۔

محلات کی اندرونی دیواروں، درباری ہالوں اور آرام گاہوں میں پھولوں، بیل بوٹوں، ہندسی اشکال اور بعض مواقع پر انسانی و درباری مناظر بھی بنائے جاتے تھے۔ اگرچہ وقت کے ساتھ ان میں سے اکثر دیواری تصویریں محفوظ نہ رہ سکیں، لیکن معاصر مؤرخین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آرائش شاہی شان و شوکت اور جمالیاتی ذوق کی نمائندگی کرتی تھی۔ اس طرح دیواری مصوری سلطنتی ثقافت کا ایک اہم جز تھی۔ دہلی سلطنت کے دور میں **مخطوطات کی مصوری (Illustrated Manuscripts)** نے بھی نمایاں ترقی کی۔ اس زمانے میں مذہبی، تاریخی، ادبی اور اخلاقی موضوعات پر مشتمل کتابوں کو نہ صرف خوبصورت خطاطی سے آراستہ کیا جاتا تھا بلکہ ان میں رنگین تصویریں اور آرائشی حاشیے بھی شامل کیے جاتے تھے۔ مصور متن کے اہم واقعات، درباری مناظر، جنگی واقعات، شکار، باغات اور روزمرہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو نہایت باریک بینی سے پیش کرتے تھے۔ اس روایت نے کتاب آرائی (Book Illustration) کو ایک مستقل فنی حیثیت عطا کی اور بعد میں مغلیہ عہد میں اسی روایت کو مزید وسعت ملی۔

سلطنتی دور کے آخری زمانے میں بعض اہم تصویری مخطوطات بھی سامنے آئے جن میں **"لورچندا (Laur-Chanda)"** اور **"چورپنچاشیکا (Chaur Panchashika)"** سے وابستہ مصوری کا خاص ذکر ملتا ہے۔ ان مخطوطات میں روشن رنگوں، متحرک انسانی اشکال، قدرتی مناظر اور مقامی طرزِ لباس کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ ان تصویروں میں ہندوستانی فنی روایت زیادہ نمایاں نظر آتی ہے، اگرچہ بعض مقامات پر ایرانی اسلوب کا اثر بھی دکھائی دیتا ہے۔ یہ مخطوطات اس بات کا ثبوت ہیں کہ سلطنتی دور میں مصوری مسلسل ترقی کر رہی تھی اور صرف مذہبی موضوعات تک محدود نہیں تھی۔

علاقائی ریاستوں کے قیام کے بعد مصوری کے فن کو مزید فروغ حاصل ہوا۔ **مالوہ** میں تیار ہونے والا مشہور مخطوطہ **نعمت نامہ (Nimatnama)** اس دور کی بہترین تصویری روایات میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس میں شاہی زندگی، کھانے پکانے، شکار، تفریح اور روزمرہ کے مختلف مناظر نہایت دلکش انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ اسی طرح **گجرات** میں جین مخطوطات کی مصوری نے غیر معمولی ترقی کی۔ ان مخطوطات میں شوخ رنگوں، باریک لکیروں، متناسب اشکال اور نفیس آرائش کا استعمال نمایاں ہے۔ **جونپور** اور **دکن** کے علاقوں میں بھی مقامی فنی روایات اور ایرانی اثرات کے امتزاج سے مصوری کے منفرد اسالیب وجود میں آئے، جنہوں نے ہندوستانی مصوری کے تنوع میں اضافہ کیا۔ سلطنتی دور کی مصوری میں ایرانی اثرات نمایاں تھے، خصوصاً رنگوں کے استعمال، لباس، چہروں کی بناوٹ، نباتاتی آرائش اور تصویری ترتیب میں۔ تاہم ہندوستانی مصوروں نے ان اثرات کو مقامی ماحول، قدرتی مناظر، نباتات، جانوروں اور معاشرتی زندگی کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ کیا کہ ایک منفرد ہند۔ایرانی طرزِ مصوری وجود میں آیا۔ یہی امتزاج اس دور کی مصوری کی سب سے اہم خصوصیت قرار دیا جاتا ہے۔ دہلی سلطنت کی مصوری کی سب سے بڑی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ اس نے مغلیہ مصوری کی ترقی کے لیے مضبوط بنیاد فراہم کی۔ جب ہمایوں اپنے ساتھ ایرانی مصوروں کو ہندوستان لایا اور بعد میں اکبر نے شاہی مصوری کے ادارے کو منظم کیا تو انہیں پہلے سے موجود ہندوستانی فنی روایت، تربیت یافتہ مصوروں اور تصویری مخطوطات سے بھرپور فائدہ حاصل ہوا۔ اسی وجہ سے مغلیہ مصوری اچانک وجود میں نہیں آئی بلکہ اس کی بنیاد دہلی سلطنت کے عہد میں ہونے والے تدریجی فنی ارتقا پر قائم تھی۔

اس طرح اگرچہ دہلی سلطنت کے دور میں مصوری کو فنِ تعمیر جیسی وسیع سرپرستی حاصل نہیں تھی، لیکن اس فن نے شاہی محلات، دیواری نقاشی، مخطوطات کی آرائش اور علاقائی ریاستوں کے ذریعے اپنی بقا برقرار رکھی۔ ہندوستانی اور ایرانی فنی روایات کے امتزاج نے اس فن کو نئی جہت عطا کی اور یہی روایت بعد میں مغلیہ دور میں اپنے عروج کو پہنچی۔ اس اعتبار سے سلطنتی دور کی مصوری ہندوستانی فنونِ لطیفہ کی تاریخ میں ایک اہم اور ارتقائی مرحلے کی حیثیت رکھتی ہے۔

17.3.5 موسیقی

دہلی سلطنت کے دور میں موسیقی ہندوستان کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کا ایک اہم جز تھی۔ اگرچہ بعض مذہبی علما موسیقی کے بارے میں مختلف آرا رکھتے تھے، لیکن عملی طور پر شاہی دربار، صوفی خانقاہوں اور عوامی زندگی میں موسیقی کو نمایاں مقام حاصل تھا۔ ترک حکمران اپنے ساتھ ایران اور وسط ایشیا کی موسیقی کی روایات بھی ہندوستان لائے، جن کا یہاں کی قدیم ہندوستانی موسیقی سے امتزاج ہوا۔ اس باہمی اثر و قبول کے نتیجے میں ایک نئی موسیقی روایت وجود میں آئی، جس نے بعد کے مغلیہ دور کی موسیقی کو بھی گہرے طور پر متاثر کیا۔ دہلی سلطنت کے حکمرانوں کا موسیقی کے بارے میں یکساں رویہ نہیں تھا۔ بعض سلاطین مذہبی رجحانات کے باعث موسیقی کی سرپرستی سے گریز کرتے تھے، جبکہ بعض حکمران خود موسیقی سے دلچسپی رکھتے تھے اور درباری موسیقاروں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ شاہی درباروں میں گائیکی اور سازوں کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں، جن میں درباری گلوکار، سازندے اور فنکار اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اس سرپرستی نے موسیقی کو ایک باقاعدہ درباری فن کی حیثیت عطا کی اور موسیقاروں کو نئے تجربات کا موقع فراہم کیا۔

دہلی سلطنت کے دور میں **صوفی خانقاہوں** نے موسیقی کے فروغ میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ خصوصاً **چشتی سلسلے** کے صوفیہ سماع کو روحانی تربیت اور خدا کی یاد کا ایک مؤثر ذریعہ سمجھتے تھے۔ خانقاہوں میں منعقد ہونے والی سماع کی محفلوں میں حمد، نعت، منقبت اور صوفیانہ کلام خوش الحانی کے ساتھ پیش کیا جاتا تھا۔ ان محفلوں میں مختلف طبقات کے لوگ شریک ہوتے تھے، جس کے نتیجے میں موسیقی صرف دربار تک محدود نہ رہی بلکہ عوامی زندگی کا بھی اہم حصہ بن گئی۔ سماع کی ان مجالس نے روحانی اور ثقافتی ہم آہنگی کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ دہلی سلطنت کے عہد کی موسیقی کا ذکر **امیر خسرو** کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ وہ نہ صرف ایک عظیم شاعر تھے بلکہ موسیقی کے بھی ممتاز ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ انہوں نے ہندوستانی اور ایرانی موسیقی کے عناصر کو یکجا کرنے کی کوشش کی اور موسیقی میں کئی نئے تجربات کیے۔ روایات کے مطابق بعض نئے راگوں اور گائیکی کے اسالیب کی تشکیل میں ان کا اہم کردار رہا، اگرچہ ان میں سے بعض روایات کی تاریخی صحت پر اہلِ علم کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ امیر خسرو نے صوفیانہ موسیقی کو فروغ دینے، فارسی اور ہندوستانی موسیقی کے درمیان ربط پیدا کرنے اور موسیقی کی نئی جہتیں متعارف کرانے میں نمایاں خدمات انجام دیں۔

اس دور میں مختلف **آلاتِ موسیقی** بھی رائج تھے، جن میں رباب، بین، طنبور، پکھاوج، نقارہ، شہنائی، بانسری اور ڈھول قابلِ ذکر ہیں۔ یہ آلات مذہبی تقریبات، درباری محفلوں، جنگی مواقع اور عوامی تہواروں میں استعمال کیے جاتے تھے۔ ایرانی اثرات کے نتیجے میں بعض

نئے ساز ہندوستان پہنچے، جبکہ مقامی ہندوستانی آلات بھی اپنی قدیم روایت کے مطابق استعمال ہوتے رہے۔ اس طرح سلطنتی دور کی موسیقی میں سازوں کے استعمال کے اعتبار سے بھی تنوع پیدا ہوا۔ درباری موسیقی کے ساتھ ساتھ عوامی موسیقی بھی معاشرتی زندگی کا ایک لازمی حصہ تھی۔ شادی بیاہ، عید، میلوں، مذہبی تہواروں، موسمی تقریبات اور دیگر سماجی مواقع پر گیت اور لوک دھنیں پیش کی جاتی تھیں۔ مختلف علاقوں کی مقامی موسیقی نے سلطنتی دور کی ثقافتی زندگی کو مزید رنگا رنگ بنایا۔ اس طرح موسیقی صرف اشرافیہ یا دربار تک محدود نہ رہی بلکہ دیہی اور شہری دونوں معاشروں میں اپنی الگ شناخت رکھتی تھی۔ سلطنتی دور میں موسیقی کے فروغ میں ہندوستانی اور ایرانی روایات کے امتزاج کی خاص اہمیت تھی۔ ہندوستانی راگوں، مقامی دھنوں اور روایتی گائیکی نے ایرانی لے، آہنگ اور اندازِ پیشکش کے ساتھ مل کر ایک نئی موسیقی روایت کو جنم دیا۔ یہی امتزاج بعد میں مغلیہ دور میں مزید ترقی یافتہ ہوا، جہاں موسیقی نے اپنے عروج کی منزلیں طے کیں۔ اس اعتبار سے دہلی سلطنت کا زمانہ ہندوستانی موسیقی کی ارتقائی تاریخ کا ایک اہم مرحلہ تصور کیا جاتا ہے۔

ان نکات سے واضح ہوتا ہے کہ دور دہلی سلطنت کی موسیقی مختلف تہذیبی روایات کے باہمی اشتراک کی بہترین مثال پیش کرتی ہے۔ شاہی سرپرستی، صوفی خانقاہوں کی سماع کی محفلیں، امیر خسرو کی خدمات، مختلف آلاتِ موسیقی کا استعمال اور عوامی موسیقی کی مضبوط روایت نے اس فن کو نئی وسعت عطا کی۔ انہی عوامل نے بعد میں مغلیہ عہد کی موسیقی کے ارتقا کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کی اور ہندوستانی موسیقی کو ایک ہمہ گیر اور جامع شناخت عطا کی۔

17.4 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

دہلی سلطنت کا دور ہندوستان کی سماجی اور ثقافتی تاریخ میں ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس عہد میں نہ صرف ایک مضبوط سیاسی نظام قائم ہوا بلکہ معاشرت، تعلیم، ادب، فنونِ لطیفہ اور ثقافت کے مختلف شعبوں میں بھی نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ترک حکمرانوں کے ہندوستان آنے سے مقامی اور اسلامی تہذیبی روایات کے درمیان باہمی تعامل پیدا ہوا، جس کے نتیجے میں ایک نئی **ہند۔اسلامی تہذیب** وجود میں آئی۔ اس تہذیبی امتزاج نے ہندوستان کے سماجی اور ثقافتی ارتقا کو نئی سمت عطا کی۔ سماجی زندگی میں مختلف طبقات، شہری اور دیہی معاشرہ، خواتین کی حیثیت اور غلامی جیسے ادارے اہم خصوصیات کے طور پر سامنے آئے۔ اگرچہ معاشرے میں سماجی تفاوت موجود تھا، لیکن مختلف مذہبی اور ثقافتی گروہوں کے درمیان روابط اور باہمی اثرات میں بھی اضافہ ہوا۔ صوفیہ اور بھکتی تحریک کے اثرات نے سماجی ہم آہنگی، مذہبی رواداری اور اخلاقی اقدار کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔

تعلیم کے میدان میں مکاتب، مدارس اور خانقاہیں علم و دانش کے اہم مراکز بن کر ابھریں۔ ان اداروں نے دینی علوم کے ساتھ ساتھ مختلف علمی سرگرمیوں کو بھی فروغ دیا۔ اسی دور میں ہندی زبان و ادب نے نمایاں ترقی کی اور مقامی بولیوں میں ادبی تخلیقات سامنے آئیں، جنہوں نے ہندوستانی ادبی روایت کو مزید مضبوط بنایا۔ فنونِ لطیفہ میں دہلی سلطنت کا سب سے نمایاں کارنامہ ہند۔اسلامی فنِ تعمیر کی تشکیل تھا۔ محراب، گنبد، مینار، خطاطی اور مقامی تعمیراتی عناصر کے امتزاج نے ایک منفرد تعمیراتی اسلوب کو جنم دیا، جس کی بہترین مثالیں

قوت الاسلام مسجد، قطب مینار، علائی دروازہ، تغلق آباد اور لودھی مقابر میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ اسی طرح مختلف علاقوں میں علاقائی فنِ تعمیر بھی فروغ پایا، جس نے ہندوستانی تعمیراتی روایت کو مزید متنوع بنایا۔ اگرچہ مصوری کو فنِ تعمیر جیسی وسیع سرپرستی حاصل نہیں تھی، لیکن دیواری نقاشی، مخطوطات کی آرائش اور علاقائی مصوری کی روایت اس دور میں مسلسل جاری رہی۔ ایرانی اور ہندوستانی اسالیب کے امتزاج نے مصوری کے ارتقا میں اہم کردار ادا کیا، جس نے بعد میں مغلیہ مصوری کی ترقی کی بنیاد فراہم کی۔ موسیقی کے میدان میں بھی شاہی دربار، صوفی خانقاہیں اور عوامی ثقافت نے اہم کردار ادا کیا۔ امیر خسرو کی خدمات، سماع کی روایت اور ہندوستانی و ایرانی موسیقی کے امتزاج نے ہندوستانی موسیقی کو نئی جہت عطا کی۔

اس پس منظر میں دہلی سلطنت ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی تشکیل اور ارتقا میں نہایت اہم ثابت ہوا۔ اس زمانے میں مختلف تہذیبوں، زبانوں، فنون اور سماجی روایات کے باہمی امتزاج نے ایک ایسی مشترکہ ثقافتی روایت کو جنم دیا، جس کے اثرات بعد کے ادوار، خصوصاً مغلیہ عہد، میں مزید نمایاں ہوئے۔ اس اعتبار سے دہلی سلطنت کی سماجی اور ثقافتی تاریخ ہندوستان کے تہذیبی ورثے کا ایک نہایت اہم باب ہے۔

17.5 کلیدی الفاظ (Keywords)

ہند۔اسلامی تہذیب: ہندوستانی اور اسلامی تہذیبی روایات کے باہمی امتزاج سے وجود میں آنے والی مشترکہ ثقافت۔
خانقاہ: صوفیہ کا روحانی مرکز، جہاں عبادت، تعلیم، سماجی خدمت اور سماع کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔
گنبد: عمارت کی گول یا نیم کروی چھت، جو مضبوطی اور خوبصورتی دونوں کا اظہار کرتی ہے۔
مخطوطہ: ہاتھ سے لکھی ہوئی کتاب یا دستاویز، جسے اکثر خطاطی اور مصوری سے آراستہ کیا جاتا تھا۔
سماع: صوفیہ کی روحانی محفل، جس میں مذہبی کلام موسیقی کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔
علائی دروازہ: علاؤالدین خلجی کے دور میں تعمیر ہونے والی ایک شاہکار عمارت، جو سلطنتی فنِ تعمیر کے ارتقا کی بہترین مثال سمجھی جاتی ہے۔

17.6 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

17.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. دہلی سلطنت کے دور میں پردہ کی روایت کس طبقے میں زیادہ رائج تھی؟

(الف) کسان طبقہ (ب) اشرافیہ طبقہ (ج) تاجر طبقہ (د) کاریگر طبقہ

2. قطب مینار کی تعمیر کا آغاز کس نے کیا؟

(الف) شمس الدین التمش (ب) قطب الدین ایبک (ج) علاؤالدین خلجی (د) فیروز شاہ تغلق

3. علائی دروازہ کس سلطان کے دور میں تعمیر کیا گیا؟

(الف) غیاث الدین تغلق (ب) علاؤالدین خلجی (ج) سکندر لودھی (د) محمد بن تغلق

4. صوفیہ کی روحانی موسیقی کی محفل کو کیا کہا جاتا ہے؟

(الف) قوالی (ب) سماع (ج) محفلِ شعر (د) جشن

5. نعمت نامہ (Nimatnama) کی تصویری روایت کا تعلق کس علاقائی سلطنت سے تھا؟

(الف) بنگال (ب) مالوہ (ج) گجرات (د) جونپور

17.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. دہلی سلطنت کے سماجی ڈھانچے کی نمایاں خصوصیات بیان کیجیے۔
2. دہلی سلطنت کے دور میں مدارس کی اہمیت بیان کیجیے۔
3. ہند۔اسلامی فنِ تعمیر سے کیا مراد ہے؟ مختصر میں سمجھائیں۔
4. دہلی سلطنت کے دور میں مصوری کی اہم خصوصیات بیان کیجیے۔
5. امیر خسرو کی موسیقی میں خدمات بیان کیجیے۔

17.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. دہلی سلطنت کے دور کے سماجی ڈھانچے اور سماجی زندگی کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
2. دہلی سلطنت کے فنِ تعمیر کے ارتقا اور اس کی نمایاں خصوصیات پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔
3. دہلی سلطنت کے دور میں تعلیم اور علمی سرگرمیوں کے فروغ کا جائزہ لیجیے۔

جوابی کلید

1۔(ب) اشرافیہ طبقہ 2۔(ب) قطب الدین ایبک 3۔(ب) علاؤالدین خلجی

4۔(ب) سماع 5۔(ب) مالوہ

اکائی 18۔چولا خاندان

(The Cholas)

اکائی کے اجزا

18.0 تمہید

18.1 مقاصد

18.2 چولا سلطنت کا قیام

18.2.1 آدتیہ چولا

18.2.2 پرانتکا چولا

18.2.3 پرانتکا چولا اول کے جانشیں

18.3 توسیع اور استحکام

18.3.1 راجاراجا چولا

18.3.2 راجیندر چولا

18.3.3 راجیندر چولا اول

18.3.4 کلوتنگا چولا

18.4 ریاست کی نوعیت

18.5 چولا نظم ونسق

18.5.1 بادشاہ اور افسر شاہی

18.5.2 انتظامی تقسیم

18.5.3 محصول کا نظم ونسق

18.5.4 فوجی نظم ونسق

18.5.5 مقامی نظم ونسق

18.6 اکتسابی نتائج

18.7 نمونہ امتحانی سوالات

18.0 تمہید (Introduction)

ابتدائی عہدِ وسطیٰ میں جنوبی ہندوستان میں ایک عظیم سیاسی قوت وجود میں آئی جو کہ چولا خاندان کی حکومت تھی جس کی راجدھانی تنجاور(Tanjavur) تھی جسے بعد میں راجا راجیندر نے تقریباً1025 میں گنگئی کونڈاچولا پورم میں منتقل کر دیا۔ چولا خاندان کی ابتدائی تاریخ کا آغاز موریہ حکمرانوں کے دور سے ہی مانا جاتا ہے۔ چولوں کا ذکر اشوک کے ستونی کتبوں میں چولاپُترا(Cholaputra) کے طور پر ملتا ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ چیرا پُترا(Cheraputra)(ابتدائی چیرا)،اور پانڈیا پُترا(Pandyaputras)(ابتدائی پانڈو) کا بھی نام لیا گیا ہے جو موریا سلطنت کے جنوبی سرحد پر واقع تھے۔ چھٹی صدی عیسوی میں پلووں نے چولوں کو بے دخل کر کے کانچی کو اپنا دارالحکومت بنایا اور نویں صدی عیسوی کے وسط تک جنوبی ہندوستان کی سیاست پر قابض رہے۔ نویں صدی عیسوی کے وسط ہی میں چولوں نے پلووں کے ہاتھوں سے اپنا کھویا ہوا اقتدار پر دوبارہ حاصل کیا اور دریائے تنگ بھدرا کے جنوبی علاقوں پر اپنی عظیم الشان حکومت قائم کی جو دو صدیوں سے زائد عرصے تک برقرار رہی۔ اس عہد کے دوران وہ دکن کی ریاستوں، خاص طور پر راشٹر کوٹوں سے مستقل برسرِپیکار رہے اور بعد میں کلیانی کے چالوکیوں یا مغربی چالوکیوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس دور میں کئی بار چیرا، پانڈیا، اور سیلون کی حکومتوں کو طاقت ور چولوں کی فوجی طاقت کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر مدورائی کے پانڈیوں نے ان کے سیاسی اقتدار کا مکمل خاتمہ کر دیا۔ پانڈیوں نے تیرہویں صدی کے دوسرے نصف حصے میں چولوں کو شکست دے کر جنوب بعید میں اپنی عظیم ریاست قائم کی۔

18.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ

- جنوبی ہندوستان کی چولا سلطنت کے آغاز وارتقا کو جان سکیں گے۔
- چولا حکمرانوں کے انتظام حکومت کا جائزہ لے سکیں گے۔
- چولوں کی سیاسی اور انتظامی حالات پر روشنی ڈال سکیں گے۔
- چول دور کی زراعتی اور تجارتی سرگرمیوں کی شناخت کر سکیں گے۔
- چولا حکمرانوں کے عہد کے مذہبی رجحانات کا جائزہ لے سکیں گے۔

18.2 چولا سلطنت کا قیام (Foundation of Chola Empire)

چولا حکمراں جو کورومنڈل کے ساحلی علاقوں میں حکومت کرتے تھے، نویں صدی عیسوی کے نصفِ اول تک کانچی کے پلووں کے جاگیردار تھے۔ 850ء میں انہوں نے تنجاور پر قبضہ کیا۔ چولا اقتدار کو وجیالیہ (Vijalaya) کے ذریعے مُتاریار (Muttaryar) سے

عروج حاصل ہوا جس نے پلووں کو پانڈیوں سے ہاتھ ملانے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ بعد ازاں پانڈیا حکمراں ورگنادوم (Varaguna II) پلوّ بادشاہ نندی ورمن سوم کا ماتحت اور اتحادی بن گیا اور وجیالیہ بھی اس عرصے میں بہت بااثر شخصیت بن گیا تھا۔ 869ء میں نندی ورمن سوم کی موت کے بعد اس کا بیٹا نرپتنگاورمن (Nripatungavarman) پلوّ حکومت کی راج گدی پر بیٹھا۔ دھیرے دھیرے نرپتنگا اور اس کے سوتیلے بھائی اپراجتا (Aparajita) کے درمیان اختلافات بڑھنے لگے کیوں کہ وہ بھی تخت حکومت کا دعوے دار تھا۔ اس درمیان ورگُنادوم (Varaguna II) نے نرپتنگا کی حمایت کی، اور اپراجتا کو گنگا حکمراں پرتھوی پتی اول (Prithvipati I) اور وجیالیہ چولا کے بیٹے اور اس کے جانشیں آدتیہ اول کی حمایت حاصل ہوئی۔ 885ء میں کُمبا کونم (Kombakonam) کے قریب تھری پورم بیم (Thirupurambiyam) کے مقام پر دونوں بھائیوں کے درمیان ایک فیصلہ کن جنگ لڑی گئی جس میں اپراجتا کو فتح حاصل ہوئی۔ حالانکہ اس کا مضبوط اتحادی پرتھوی پتی مارا گیا۔

18.2.1 آدتیہ اول (Aditya I)

اس جنگ کے بعد اپراجتا ورمن پلووں کا حقیقی حکمراں بن گیا۔ آدتیہ اول (907-71/870ء) کو اپراجتا ورمن کی فتح سے بہت فائدہ ہوا۔ تنجاور کے علاوہ جسے اس کے والد نے مُتّاریار سے حاصل کیا تھا، آدتیہ اول کو بھی پلووں سے کافی سارے علاقے تحفتاً حاصل ہوئے۔ تاہم، آدتیہ اول اپنی ماتحتی سے مطمئن نہیں تھا۔ وہ پلووں کو اقتدار سے بے دخل کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا اس نے 897ء کے قریب تونڈئی منڈلم (Tondaimandalam) پر حملہ کر دیا۔ اس جنگ میں پلوّ حکمراں اپراجتا ورمن مارا گیا۔ اسی کے ساتھ پلوّ حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور پلووں کی ریاست کا پورا حصہ چولا سلطنت کا حصہ بن گیا۔ نرپتنگا (م 899ء) جس نے پلوّر یاست کے مغربی حصے شمالی ارکاٹ میں جاگیر دار کی حیثیت سے غیر معروف زندگی گزاری تھی، چولا اقتدار کو کوئی سنگین خطرہ پیدا کر سکے اور نا ہی اس کا بھائی کمپاورمن چولا حکمراں کے مدمقابل ہونے کی ہمت دکھا سکا۔ اگرچہ بطور خود مختار حکمراں آدتیہ چولا کا دورِ حکمرانی ایک دہائی سے زیادہ نہیں تھا، اس کے باوجود وہ چولا خاندان کی حکومت کو مضبوط اور مستحکم کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ اس سے پہلے کسی اور چولا حکمراں کو ایسی کامیابی نہیں ملی تھی۔ اس کے عہد میں گنگا حکمراں پرتھوی پتی اول کے پوتے پرتھوی پتی دوم نے بھی اس کی بالادستی تسلیم کی۔ آدتیہ چولا نے ورگنادوم کے بھائی پانڈیا حکمراں پرانتکِا ویرنارائن (Prantaka Viranarayana) سے گنگوں کا علاقہ بھی حاصل کر لیا اور اپنے ہم عصر چیرا حکمراں استھانوراوی (Sthanuravi) سے دوستانہ تعلقات استوار کیے۔ 907ء میں آدتیہ چولا نے اپنی آخری سانس لی۔ اس کی موت کے بعد اس کا بیٹا پرانتکا اول (Prantaka-I) اس کا جانشیں بنا، جس نے چولا راج گدی پر تقریباً پانچ دہائیوں تک حکومت کی تھی۔

18.2.2 پرانتکا اول (Prantaka I)

جنوبی ہند میں چولا سلطنت کو سب سے مضبوط، مستحکم اور طاقتور بنانے کا سہرا پرانتکا اول (907-955ء) کے سر باندھا جاتا ہے۔ اس نے تونڈئی منڈلم اور تامرپنی (Tamrapani) اور ویگئی (Vaigai) ندی کی وادیوں پر فوجی کاروائیوں میں زبردست کامیابی حاصل کی۔ 910ء میں پانڈیوں کے دارالحکومت مدورائی کو راجا سمہادوم (Rajasimha-II) سے چھین لیا تھا۔ بلاشبہ یہ فتح پرانتکا کی اہم ترین

کامیابیوں میں سے ایک ہے۔اس فتح کے بعد اس نے مدورائی کونڈا (مدورائی کا فاتح) کا خطاب اختیار کیا۔ راجاسمہادوم نے سیلون کے حکمراں کسپّا پنجم (Kasappa-V) کی مدد سے پرانتکا چولا پر جوابی کاروائی کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ ویلور (Vellur) کی لڑائی میں دونوں کی متحدہ فوجوں کو پرانتکا کے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ کچھ ہی دنوں بعد چولوں نے پانڈیوں کے علاقوں کو بھی فتح کر لیا۔ان تمام فوجی کاروائیوں نے دکن میں چولوں کو راشٹر کوٹوں کا مخالف بنادیا۔ چنانچہ چولا اور راشٹر کوٹ دسویں صدی عیسوی کے اواخر تک ایک دوسرے کے انتہائی مخالف رہے۔ بعد ازآں حالات جب کچھ بہتر ہوئے تو ان دونوں خاندانوں میں رفتہ رفتہ ازدواجی تعلقات بھی استوار ہوئے تھے۔

راشٹر کوٹ خاندان کے حکمراں کرشنادوم کے دورِ حکمرانی میں، چولا حکمراں آدتیہ اول نے راشٹر کوٹا خاندان کی ایک لڑکی سے شادی کرلی۔اس سے ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام کنّارادیو (Kannaradeva) تھا۔آدتیہ چولا کا انتقال کے بعد پرانتکا اول اس کا جانشیں بنا تھا لہٰذا کرشنادوم اس سے خوش نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ چولوں کا اقتدار اس کے پوتے کو ملے اور وہ اس کی باگ ڈور سنبھالے۔ چنانچہ اس نے بانوں (Banas) اور ویدمبوں (Vaidumbas) کی مدد سے چولا سلطنت پر حملہ کر دیا۔ شمالی ارکاٹ ضلع کے ولالا (Vallala) کے مقام پر ایک فیصلہ کن جنگ ہوئی، جس میں پرانتکا اول نے گنگا کے حکمراں پرتھوی پتی دوم کی مدد سے راشٹر کوٹا حکمراں کرشنا اور اس کے اتحادیوں کو شکست دی اور بانوں (Bana) کے علاقے پر قبضہ کر لیا اور اسے اپنے اتحادی پرتھوی پتی دوم کو سونپ دیا۔ تاہم، 940ء سے پرانتکا کے لیے حالات تبدیل ہونے لگے۔اس وقت تک اس کے انتہائی وفادار جاگیردار گنگا حکمراں پرتھوی پتی دوم کا انتقال ہو گیا تھا اور اس کے جانشیں بُتوگادوم (Butuga-II) نے راشٹر کوٹا حکمراں کرشنا سوم کی بہن سے شادی کر کے راشٹر کوٹوں سے نزدیکی اختیار کرلی۔اس کے علاوہ بانا اور ویدامبا جو کہ پہلے ہی چولوں سے اپنی پچھلی شکست کا بدلہ لینے کا موقع ڈھونڈ رہے تھے، کرشنا سوم کے ساتھ ہو گئے۔ دوسری جانب پرانتکا نے اپنے بڑے لڑکے راجادتیہ کو شمال سے کسی بھی ممکنہ بڑے خطرے کا سامنا کرنے کے لیے ایک بڑی فوج کے ساتھ متعین کیا۔ جب راشٹر کوٹوں کے نااہل حکمراں گووندا چہارم، جس نے چول حکمراں پرانتکا کی بیٹی وکرمادیوی سے شادی کی تھی، نے باغیوں سے بچنے کے لیے اپنے سسر کے گھر پناہ لی، جس کی وجہ سے راشٹر کوٹوں کا نیا حکمراں کرشنا سوم چولا حکمراں کو گووندا چہارم کو پناہ دینے کے صلہ میں سزا دینا چاہتا تھا۔ بالآخر کرشنا سوم نے بانا، ویدمبا اور نئے گنگا حکمراں بُتوگادوم کی مدد سے چولا سلطنت پر حملہ کر دیا۔ 949ء میں ارکونم (Arkonam) کے قریب تاکّولم (Takkolam) کے مقام پر ان تینوں کی مشترکہ افواج نے اس لڑائی میں پرانتکا اول پر زبردست فتح حاصل کی۔ نتیجتاً وہ تونڈئی منڈلم کے خاصے علاقوں پر قبضہ کرنے میں کامیاب رہا اور 955ء میں پرانتکا کی موت کے بعد کم از کم تین دہائیوں تک چولوں کی حیثیت مزید کمزور ہوئی۔

18.2.3 پرانتکا اول کے جانشیں (Successors of Prantaka I)

پرانتکا اول کی وفات کے بعد سے 985ء میں راجاراجا اول کے تخت نشین ہونے تک تقریباً تیس سال کا عرصہ سیاسی فتوحات اور فوجی کامیابیوں کے لحاظ سے کوئی خاص اہم نہیں تھا۔ پرانتکا اول کے بیٹے اور اس کے جانشیں گنڈرآدتیہ (Gandraditya) کا دور بہت مختصر رہا۔اسے سیاست سے زیادہ مذہبی معاملات میں دلچسپی تھی۔ حالانکہ تونڈئی منڈلم کے علاقے میں کرشنا سوم مسلسل فتوحات حاصل کر رہا

تھا۔ 957ء میں پرانتکادوم (Prantaka-II) کے چولا حکومت کے تخت پر بیٹھنے سے پہلے گندرآدتیہ کا بھائی ارنجیا (Arinjaya) بھی مختصر مدت کے لیے چولا سلطنت کا حکمراں بنا۔ پرانتکادوم (957-73) جو کہ سندر چولا کے نام سے تاریخ میں مشہور ہوا، کا اہم کارنامہ یہ تھا کہ اس نے اپنے ماتحت پانڈیا حکمراں ویراپانڈیا (Vira Pandya) کو اس کی سرکشی کی سزا دی جس نے گندرادتیہ کے عہد حکومت میں خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ پرانتکادوم نے سیلون کے مہیندا چہارم (Mahenida-IV) کو پانڈیا حکمراں کی مدد کرنے کی سزا دینے کے لیے سیلون پر چڑھائی کی۔ 973ء میں پرانتکادوم کی موت کے بعد اس کے بیٹے ارومولی (معروف بہ راجاراجا اول) کے بجائے گندرآدتیہ کا بیٹا اُتم چولا (Uttama Chola) نیا حکمراں بنا۔ اس دوران، مغربی چالوکیوں نے راشٹر کوٹوں کو شکست دے کر ان کی جگہ اپنی حکومت قائم کی۔ اس خاندان کے پہلے راجا تیلپ دوم (Tailap II) نے کلیانی کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ اس سے بھی پہلے تونڈئی منڈلم کا بیشتر علاقہ جسے پرانتکا اول اور اس کے فوری جانشینوں نے کرشناسوم کے ہاتھوں گنوادیا تھا، چولوں نے راشٹر کوٹوں سے دوبارہ حاصل کر لیا۔

18.3 توسیع واستحکام (Consolidation and Expansion)

18.3.1 راجاراجا اول (Rajaraja I)

چولا سلطنت کو اصل عظمت 985ء میں راجاراجا اول (985-1014) کی تخت نشینی کے بعد حاصل ہوئی۔ اس کے عہد حکومت میں چولا ریاست بہترین نظم ونسق اور طاقتور بری وبحری افواج کے ساتھ ایک عظیم سلطنت میں تبدیل ہو گئی۔ اسے پانڈیہ فوجوں، کیرالہ کے چیروں اور سیلون کی حکومت سے جنگیں لڑنا پڑیں۔ ان جنگوں میں اس نے چیروں پر فتح پائی اور پانڈیہ علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ ان علاقوں کے نظم و نسق کے لیے مدرائی میں ایک چولا گورنر متعین کیا گیا جسے 'چولا-پانڈیا' کہا جاتا تھا۔ سیلون کے راجا مہیندر چہارم کے خلاف بھیجی گئی ایک بحری مہم میں راجاراجا اول نے انوراد ھاپورا (Anuradhapura) کو تباہ کر دیا اور سیلون کے شمالی علاقے کو ایک چولا صوبے میں تبدیل کرتے ہوئے پولونّاروا (Polonnaruva) کو اس کی راجدھانی بنا دیا۔ اس کے علاوہ میسور خطے میں گنگاپڑی (Gangapadi)، نولمباپڑی (Nolambapadi) اور تادیگئی پڑی (Tadigaipadi) کو فتح کر لیا۔ ان علاقوں پر قابض ہونے کے بعد نہ صرف جنوبی ہندوستان میں چولوں کی حالت مستحکم ہوئی بلکہ شمالی علاقے میں نئی قائم شدہ مغربی چالوکیہ ریاست کے ساتھ تنازعات میں شدت پیدا ہوئی۔ وینگی (vengi) کے مشرقی چالوکیوں کی جانشینی کی لڑائی میں چولا حکمراں کی مداخلت سے ان کے تعلقات میں مزید بگاڑ پیدا ہوا جس کا نتیجہ اکثر دونوں میں باہم جنگوں کی شکل میں سامنے آیا۔ راجاراجا اول نے اپنے عہد حکومت کے آخری ایام میں مالدیپ کو فتح کر کے چولا سلطنت میں شامل کر لیا۔ مفتوحہ علاقوں اور جن پر اس نے تسلط قائم کیا تھا ان پر اپنی گرفت برقرار رکھنے کے لیے اس نے 1012ء میں اپنے بیٹے اور جانشیں راجیندر کو یوراج (Yuvaraja) کے طور پر تقرر کیا۔

راجاراجا اول ایک عظیم حکمراں کے علاوہ، فنِ تعمیرات کا شوقین تھا۔ یہی وہ راجاراجا اول تھا جس نے 1010ء میں تنجاور کے مقام پر عظیم الشان برہدیشور (Brihadeswara) مندر جو راجاراجا مندر کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے، تعمیر کروایا تھا۔ فن تعمیر کا یہ

حیرت انگیز نمونہ بلاشبہ چولا عہد کے ماہرینِ فنِ تعمیر کی عمدہ مہارتوں کا شاہکار نمونہ پیش کرتا ہے۔ راجاراج اول نے موجودہ انڈونیشیا کے علاقے میں واقع ایک اہم بحری سلطنت سری وجیا (Sri Vijaya) کے سیلندر (Sailendra) خاندان کے حکمراں سری مارا اوجیو تنگ ورمن (Sri Mara Vijayottungavarman) کو ناگاپٹنم میں ایک بدھ خانقاہ تعمیر کرنے کی اجازت اور سرپرستی فراہم کی۔ یہ وہار چُڑامنی وہار (Chudamani Vihara) کے نام سے معروف ہوا، جو سری مارا اوجیو تنگ ورمن کے والد چُڑامنی ورمن کے نام پر رکھا گیا تھا۔ راجاراجا چولا نے اس وہار کی دیکھ بھال کے لیے انائی منگلم (Anaimangalam) نامی گاؤں بھی عطیہ کیا تھا۔ راجاراج اول نے سری لنکا کے شمالی علاقوں اور مالدیپ پر اپنا اقتدار قائم کیا۔ اس کی بحری فتوحات اور بحرِ ہند میں چولا طاقت کے پھیلاؤ سے اس کی بحری قوت کا اندازہ ہوتا ہے۔ تاہم سری وجیا کے سیلندر حکمرانوں پر اس کے اثر و رسوخ کا دعویٰ محتاط انداز میں کرنا چاہیے، کیونکہ راجاراجا کے عہد میں سری وجیا اور چولا سلطنت کے درمیان بنیادی طور پر دوستانہ اور تجارتی تعلقات تھے۔ سری وجیا پر باقاعدہ بحری حملہ بعد میں اس کے بیٹے راجندر چولا اول نے کیا۔ آخر کار 1014ء میں راجاراجا اول کی وفات کے ساتھ اس کا دورِ حکومت ختم ہوا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا راجیندر اول تخت نشین ہوا جو چولا حکمرانوں میں کافی مشہور ہے۔

18.3.2 راجیندر اول (Rajendra I)

راجیندر اول (1014-1044ء) کو چولا تاریخ کا سب سے کامیاب حکمراں تصور کیا جاتا ہے۔ وہ 1014ء اپنے والد راجاراجا اول کی میں وفات کے بعد تخت نشین ہوا اور تین دہائیوں تک اپنی موروثی ریاست پر حکمرانی کرتا رہا۔ اس نے اپنے والد سے جارحانہ مزاج ورثے میں ملا تھا چنانچہ اس نے اپنے والد کے ذریعہ شروع کی گئی جارحانہ کاروائیوں کو مزید آگے بڑھایا اور سری لنکا کی فتح کر لیا۔ اس نے سری لنکا کے راجا مہیندا پنجم کو قیدی بنالیا اور اسے چولا سلطنت میں محبوس کر دیا گیا۔ مزید برآں اس نے کامیابی کے ساتھ چیرا اور پانڈیا کے حکمرانوں کو شکست دی اور اپنے ایک بیٹے کو 'چولا - پانڈیا' خطاب عطا کیا اور ساتھ ہی مدورائی کو دونوں حکومتوں کا مرکز بنا کر اپنے بیٹے کو اس کا وائسرائے مقرر کیا۔ اس عہد کے دوران چولا سیاست میں ایک نمایاں پیش رفت اور ہوئی۔ وہ یہ کہ چولا حکمرانوں کی دکن کی ایک اہم مضبوط طاقت کلیانی کے مغربی چلوکیہ کے ساتھ مستقل دشمنی تھی۔ مغربی چالکیوں کو دشمنی کا یہ رویہ اپنے اسلاف کی جانب سے ورثہ میں ملا تھا۔ ایک طرف چولا ان کے مخالف تھے تو دوسری طرف وینگی کے مشرقی چالوکیہ بھی ان کے خلاف تھے۔ چولوں نے نہ صرف وینگی کے مشرقی چالوکیوں سے دوستانہ تعلقات برقرار رکھے بلکہ شادی بیاہ کے رشتوں کے ذریعہ انہیں استحکام بھی بخشا تھا۔ اس سے چولا حکومت اور مغربی چالوکیہ کی دشمنی میں مزید شدت پیدا ہوئی اور دونوں ایک دوسرے سے کافی عرصہ تک برسرِ پیکار رہے۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ گیارہویں صدی میں فوجی کاروئیوں میں نشیب و فراز کے باوجود ان میں سے کوئی بھی طاقت اپنے مخالفین کے علاقوں کو طویل عرصہ تک اپنے قبضہ میں نہیں رکھ سکی۔ وہ جزیرہ نما ہند میں اعلیٰ سیاسی طاقت کا مقام حاصل کیے بغیر اپنے اپنے علاقوں پر ہی جمے رہے۔ تاہم راجیندر اول نے راشٹر کوٹوں اور بعد میں مغربی چالوکیوں کے دارالحکومت مانیہ کھیت (Manyakheta) شہر کو جو نقصان پہنچایا اس سے کلیانی میں مغربی چالوکیہ کے نئے دارالحکومت کا قیام عمل میں آیا جس کی وجہ سے وہ کلیانی چالوکیہ یا کلیانی کے چالوکیوں کے نام سے معروف ہوئے۔

وینگی پر مسلسل جنگوں کے دوران، مغربی چالوکیہ کے حکمراں جے سمہادوم نے وجے آدتیہ کی مدد کی جبکہ راجیندر اچولا نے راجاراجا کے معاملے میں اپنا تعاون پیش کیا۔ چولا طاقتوں نے وجے آدتیہ کو کئی موقعوں پر شکست دی اور راجاراجا کے لیے وینگی پر قبضہ کیا۔ مزید اس نے کلنگ کے مغربی گنگا حکمراں کی جانب بھی پیش قدمی کی جس کی وجہ سے ان جنگوں نے جے سمہا کو اس سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ راجیندر چولا اب بھی اپنی فوجی طاقت کے مظاہرے کے لیے گنگا کی وادی کی جانب پیش قدمی کرنے کے لیے پر عزم تھا لیکن پیش قدمی کے دوران راستہ میں اسے کئی خطرات اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ جنوب کی جانب واپسی کے بعد، 1022ء میں اس نے اپنے بھتیجے راجاراج کی جشن تاج پوشی کا اہتمام کیا۔ تقریباً دو سال کے بعد راجیندر اول نے چول راجدھانی کو تنجاور سے نئے شہر گنگئی کونڈاچولا پورام (Gangaikonda cholapuram) کو منتقل کر دیا جو 250 سالوں تک چولا حکومت کی راجدھانی کے طور پر برقرار رہا۔

راجیندر چولا کے دور سے ہی چولوں کو ہندوستانی بحریہ پر بالادستی حاصل تھی یہ بالادستی کافی طویل عرصہ تک قائم تھی۔ چولوں کی یہ بالادستی راجیندر دوم کے دورِ حکمرانی میں اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ اس نے چولوں کی ان مہم جوئیوں کو جو اس کے والد نے سری لنکا کے بادشاہ کے خلاف شروع کی تھی انہیں پایۂ تکمیل تک پہونچایا اور سری لنکا کو مکمل طور پر چولا حکومت میں شامل کر لیا۔ تاہم چولوں کی سب سے جرأت مندانہ بحری مہم جنوب مشرق کے حکمراں سری وجیا کے خلاف انجام دی گئی تھی۔ یہ مہم 1025-1026ء کے دوران راجیندر اچولا نے سر کی تھی۔ اس مہم میں چولا کے بحری بیڑے نے جنوب مشرق کے ایک بہت بڑے علاقے پر فتح حاصل کی تھی۔ اگرچہ یہ مفتوحہ علاقہ چولا سلطنت میں ضم نہیں کیا گیا اس کے باوجود یہ مہم گیارہویں صدی میں چولوں کی بحری بالادستی کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ اس مہم کا اختتام مفتوح حکومت کی بحالی پر اس شرط کے ساتھ ہوا کہ مفتوحہ ریاست کے حکمراں چولا حکومت کی بالادستی کو تسلیم کریں گے۔ اس مہم کے پیچھے چولا راجا کے کیا مقاصد تھے مورخین آج تک کشمکش اور الجھن کا شکار ہیں۔ ایسا سمجھا جاتا ہے کہ یا تو یہ مہمات سری وجیا کے ذریعہ چولوں اور چین کے مابین تعلقات میں رکاوٹ پیدا کرنے کی وجہ سے شروع ہوئی تھی یا پھر چولا حکومت کا دور دراز ممالک پر اپنا اثر و رسوخ جمانے کی خاطر راجیندر چولا کے عزائم کا نتیجہ تھیں۔ گیارہویں صدی میں چولا حکمرانوں کے ذریعہ چین کے دربار میں سیاسی اور معاشی سفیروں کو بھیجے جانے کے تین شواہد ملتے ہیں۔ یہ سفر بالترتیب 1016ء، 1033ء اور 1077ء میں چین بھیجے گئے تھے۔ راجیندر اچولا کی موت کے بعد بھی چولا حکومت کی بیرون ممالک مہمات کا سلسلہ جاری رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کلوتنگا اول (Kulottunga-I, 1070-1120) چولا گھرانے کا آخری بڑا حکمراں تھا جس نے بحری مہمات بھیجنے میں اہم رول ادا کیا تھا۔

18.3.3 راجادھیراجا اول (Rajadhiraja I)

مغربی چالوکیہ خاندان میں جے سمہادوم (Jaisimha II) کے بعد سومیسوار اول (Someswara-I) اس کا جانشیں بنا جس نے اپنا دارالحکومت مانیاکھیت سے کلیانی منتقل کیا تھا۔ ایک مرتبہ پھر وینگی کے شاہی دربار میں نئی پیش رفت چولوں اور مغربی چالوکیوں کے درمیان دشمنی کا سبب بنی۔ اسی سیاسی رنجش اور کھینچ تان کے دوران 1044ء میں راجیندر اول کی موت واقع ہو گئی اور اس کا بیٹا راجادھیراجا اول (1044-1052ء) اس کا جانشیں بنا۔ اس نے بھی مغربی چالوکیہ حکمراں سومیسوار اول کے خلاف کئی جنگیں لڑیں اور ان

میں اسے کامیابی ملی۔ راجادھیراجااول کا سب سے نمایاں کارنامہ مغربی چالوکیوں کے دارالحکومت کلیانی کو تاخت وتاراج کرنا تھا۔ اپنی فتح کی یاد میں وہ کلیانی میں ویرابھیشیک (Virabhisheka) یعنی فتح کا جشن مناتا ہے اور وجیاراجیندرا (Vijayarajendra) کا لقب اختیار کرتا ہے۔ اگرچہ سومیسوراول چولوں کو چالوکیہ علاقوں سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن وہ راجادھیراجا کے عہد میں چولوں کو کبھی بھی شکست نہیں دے سکا۔ راجادھیراجا کے بعد راجیندرادوم اور وجیندرا بالترتیب چولا حکمراں بنے۔

18.3.4 کلوتنگا (Kulottunga)

وجیندرا کی وفات کے بعد 1070ء میں کلوتنگااول (1120-1070ء) چولا سلطنت کا نیا حکمراں بنااور 1170ء میں اس کی موت تک اس نے چولا علاقوں پر تقریباً 50 سال تک حکومت کی۔ دیگر چولا حکمرانوں کے برعکس کلوتنگااول ایک مختلف پس منظر سے تعلق رکھتا تھا۔ بنیادی طور پر یہ راجیندرادوم نام سے مشرقی چالوکیہ بادشاہ تھا۔ 1170ء میں وہ چولا خاندان میں ازدواجی رشتے کی بنیاد پر وہ کلوتنگا کے نئے نام سے چولا خاندان کا حکمراں بنا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ چولا حکومت کا آخری اہم حکمراں تھا۔ جیم گوندار (Jayamgondar) کی کلینگاتُّپرنی (Kalingattuparani) جنگی گیت کی شکل میں تمل ادب کا اہم شاہکار ہے جس میں چولا-کلنگ جنگ میں کلوتنگااول کی گنگا حکمراں اننت ورمن چودآگنگا (Anantavarman Chodaganga) کے خلاف فتح کا ذکر ہے۔ وجیندرا کی موت نے کلوتنگا کو وینگی اور چولا دونوں خاندانوں کا حکمراں بننے کا سنہرا موقع فراہم کیا۔ اس نے وینگی سے وجے آدتیہ کو معزول کرتے ہوئے اسے چول سلطنت میں شامل کر دیا۔ مختصر مدت کے لیے ہی صحیح اس کے اقتدار کے نتیجے میں وینگی چولا سلطنت کا حصہ بن گیا۔۔ کلوتنگا کی موت کے فوراً بعد مغربی چالوکیہ خاندان پر 1076ء سے 1126ء تک تقریباً پانچ دہائیوں تک حکومت کرنے والے چالوکیوں کے عظیم ترین حکمراں وکرمآدتیہ ششم نے وینگی پر حملہ کر دیا اور اس پر قبضہ جما لیا۔

راجا بننے کے بعد، کلوتنگا نے سیلون کے چولا علاقوں میں جو بغاوت اٹھی تھی اسے کچلنے کے لیے اقدامات بھی کیے، اور چولا حکمرانوں کی بالادستی منوانے کے لیے پانڈیا اور چیرا کے صوبوں کے امراء کے خلاف کامیاب کارروائیوں کا بھی اہتمام کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ 1077 کے قریب چولا سفارت کاروں کے کئی تاجر چین پہنچنے کے ثبوت ملتے ہیں، جو چین سے دوستانہ تعلقات کے کلوتنگا کی خواہش کو ظاہر کرتے ہیں، یہ چھ دہائی پہلے راجیندر چولا کی آغاز کردہ پالیسی کا تسلسل تھا۔ سری وجے کے ساتھ بھی کلوتنگا نے دوستانہ تعلقات کو بنائے رکھا تھا جس کا ثبوت 1090ء میں سری وجیا نے کلوتنگا کے دربار میں سفیر کو بھیجا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک قابل حکمراں تھا اور اپنی عوام کی فلاح و بہبود پر اس کے تحفظات تھے جو اکثر اسے 'سنگمتاویرتا' (Sangamtavirtta) (وہ جس نے محصول کو ختم کیا) کا لقب دیا۔ اگرچہ ہمیں اس کا علم نہیں ہے کہ واقعی اس نے ایسا کیا بھی تھا یا نہیں۔ کلوتنگا اول کے جانشیں کمزور تھے اور وہ چولا کی تابناک تاریخ میں سوائے چند معمولی فوجی کامیابیوں اور چند مندروں کی تعمیر کے علاوہ کچھ اضافہ نہیں کر سکے۔ یہاں تک کہ کلوتنگا کی وفات کے بعد بھی، چولا بادشاہت 150 سال سے زائد عرصے تک جاری رہی لیکن بہت کم اہمیت کی حامل رہی۔ آخر کار چولا حکومت کا آخری بادشاہ راجیندرا چولا سوم کو سندر پانڈیہ کے ہاتھوں شکست ہوئی اور اسے پانڈیوں کی بالادستی تسلیم کرنی پڑی۔ اسی کے ساتھ 1279ء میں جنوبی ہندوستان میں چولا اقتدار کا خاتمہ ہوا۔

18.4 ریاست کی نوعیت (Nature of State)

چولا حکومت کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ نویں صدی عیسوی کی ایک چھوٹی سی ریاست بعد کی دو صدیوں یا اس سے زائد عرصہ میں ایک بہت بڑی اور عظیم الشان سلطنت میں تبدیل ہوئی۔ اس طرح نوبُرو کاراشیما (Noburu Karashima) اور وائے سُبّارایالو (Y. Subbarayalu) جیسے دانشوروں نے چولا دورِ حکومت کے بے ہنگم چار سو سالوں کو جوان کے لطف اندوز سیاسی کنٹرول پر مبنی تھے، تین مرحلوں میں تقسیم کیا ہے:

- پہلا مرحلہ (850-985ء): نظامِ حکومت سے پہلے کا دور ہے جو کاویری ڈیلٹا پر چولا سلطنت کی بنیاد اور اس کے قیام سے منسلک ہے۔
- دوسرا مرحلہ (986-1000ء): اس کی شناخت، شہنشاہیت کے دور کے طور پر ہوتی ہے جو طاقتور چولا حکمرانوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ راجاراجا چولا سے شروع ہو کر کلوتنگا اول کے دور حکومت پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور کو بے شمار سرکاری نمائندوں اور فوج کے تعاون سے اقتدار کو مرکزی نوعیت کا بنانے کی کوششوں کے لیے بھی جانا جاتا ہے۔
- آخری مرحلہ: اس کو شہنشاہیت کے بعد کے دور سے منسوب کیا جاتا ہے جو مرکزی سیاسی نظام کے فقدان سے جانا جاتا ہے۔ اس دور میں متعدد مقامی حکمرانوں، سرداروں اور سیاسی طاقتوں کے ابھرنے کے ساتھ سیاسی مرکزیت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر میں بکھر گئی۔

'دی چولاز' (The Cholas) نامی کتاب کے مصنف کے۔اے۔ نیلکنٹھ شاستری (K.A. Nilkanta Shastri) چولا سلطنت کے بارے میں کہتے ہیں کہ چولا ایک ایسی ریاست تھی جو مرکزی اور طاقت ور حکومت کے ذریعے چلائی جاتی تھی اور اس کے پاس بہت ہی منظم اور ماہر افسر شاہی موجود تھی۔ تاہم مقامی نظم ونسق میں بادشاہ کا عمل دخل بہت ہی کم رہتا تھا۔ شاستری کی اس رائے پر برٹن اسٹین (Burton Stein) نے اپنی کتاب Peasant, State and the Society in Medieval South India میں زبردست تنقید کی ہے۔ اس کتاب میں وہ 'منقسم ریاست' (Segmentary State) کے تصور کو پیش کرتے ہیں جس کے بارے میں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ چولا سلطنت اسی نوعیت پر مبنی تھی۔ اس تصور کو مشرقی افریقہ کے الور (Alur) سماج پر کی گئی ایڈن ساؤتھ ہال کی تحقیق سے موازنہ کرتے ہوئے، اسٹین نے ساؤتھ ہال کے کچھ مشاہدات کو چولا سلطنت پر عائد کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے نزدیک دوہری حاکمیت، منقسم ریاست کی ایک اہم خصوصیت ہے، جو حقیقی سیاسی حاکمیت اور رسمی حاکمیت دونوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ چولا سلطنت کے اطراف میں بے شمار ناڈو (nadus) مساوی طور پر منقسم تھے اور یہ ناڈوز مزید تین علاقوں میں تقسیم کیے گئے تھے: بنیادی/مرکزی، درمیانی اور بیرونی۔ چنانچہ، چولا حکمرانوں نے صوبائی حاکمیت کو خاص کر بنیادی علاقوں کی حاکمیت کو محدود طور پر برتا تھا۔ بیرونی علاقوں کا نظم ونسق مرکزی نظم ونسق کے ڈھانچہ میں مخروطی تکرار کے ذریعہ انجام دیا جاتا۔ لہٰذا ایک منظم افسر شاہی کی عدم موجودگی نے چولا حکمرانوں کو محض رسمی خود مختاریوں تک محدود رکھا، جس میں حکمراں کے عہدے کو برہمن پجاریوں کے ذریعہ جواز فراہم کیا جاتا تھا۔ اس خیال پر جدید دانشوروں نے بھی تنقید کی ہے اور کہا ہے کہ افریقہ میں الور سماج کی تحقیق کے لیے استعمال کیے گئے طریقہ کار کا اطلاق چولا حکومت کے معاملے

میں روا نہیں رکھا جاسکتا۔ اگرچہ ماہرین نے چولا سلطنت کو کیتھ لین گف (Kathleen Gough) کے ذریعے 'قدیم زمانے کی ریاست' (Archaic State) اور ہنری جے۔ایم ۔ کلاسین (Henry J.M. Classen) اور پیٹر اسکالنک (Peter Skalnik) کے ذریعے 'ابتدائی ریاست' (Early State) کے نام سے موسوم کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن پھر بھی ان دونوں کو الگ تھلگ رکھتے ہوئے چولوں کی سیاسی حکمت عملیوں کو کماحقہ سمجھنا ذرا مشکل ہے۔

18.5 چولا نظم ونسق (Chola Administration)

18.5.1 بادشاہ اور افسر شاہی (King & Beaurocracy)

چولا عہد کے کتبوں کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نویں صدی میں چولا بادشاہ کا منصب آہستہ آہستہ ایک عام سربراہ سے بڑھ کر گیارہویں صدی میں ایک شہنشاہ کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ اس بات کو ان کے ابتدائی دور میں پیرومنور (Perumanor) پیرو من ادیگن (Peruman Adigan) سے اُدے یار (Udaiyar) کے القابات اور بعد میں چکرورتی اور تری بھونواچکرورتی (Tribhunava Chakravarti) تک بڑھ گیا تھا۔ اسے گیارہویں صدی کے بڑے القابات کے استعمال اور ان میں تبدیلی سے سمجھا جاسکتا ہے۔ بلاشبہ چولا انتظامیہ میں بادشاہ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اور وہ موروثی راج شاہی طرز کی حکومت کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ وزیروں کا ایک حلقہ چولا راجاؤں اور مہاراجاؤں کا معاون ہوتا تھا جو انتظامیہ کے اہم محکموں کی نمائندگی کرتا تھا اور مختلف امور میں راجا کو مشورہ دیتا تھا۔ جہاں تک افسر شاہی کا تعلق ہے مختلف ذمے داریوں اور فرائض کو بہتر انداز میں چلانے کے لیے چولا دربار میں متعدد افسروں کا تقرر کیا گیا تھا جنہیں مختلف عہدوں پر فائز کے عہدیداروں میں درجہ بند کیا گیا تھا۔ عام طور پر ان عہدیداروں کے دو درجے تھے۔

1. پیروندنم (Perundanam) (اعلیٰ عہدیدار)
2. 'سیرودنم' (Sirudanam) (ادنیٰ عہدیدار)۔

حیرت انگیز طور پر دونوں عہدیداروں کی ملازمت کی نوعیت تقریباً موروثی تھی۔ یہاں تک کہ دیوانی اور فوجی ملازمتوں میں کوئی واضح امتیاز نہیں تھا۔ ان کی تقرریوں کا عمل، طریقہ کار اور عہدوں پر ترقی کے اصولوں کے بارے میں بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ اکثر ان عہدیداروں کو ان کے مقامات کے لیے موزوں زمین کی تفویض کے ذریعہ معاوضہ دیا جاتا تھا اور کبھی کبھار انہیں، مالِ غنیمت اور اعزازات والقابات کے ذریعہ بھی نوازا جاتا تھا۔ بارہویں صدی کا جے گووندار کے مشہور تمل ادبی شاہکار کلنگا تپرنی (Kalingattupparani) میں کلوتنگ چولا کے خوبصورت شاہی محل کا تذکرہ کیا ہے جس میں کئی رانیاں، لونڈیاں، موسیقار، محافظ، افسران مملکت، راجا کے معاونین اور دیگر اہلکار موجود رہتے تھے۔ ان میں ہمیں 'اولینایگم (Olainayagam)' (سرکاری منشی) اور 'نادُویروکتی (Naduvirukkati)، سری کریام (Srikaryam) کے حوالے ملتے ہیں۔ تیرہویں صدی کے چینی دانشور چَوجوگُوآ (Chau Ju-kua) نے بھی چولا دربار کی شان وشوکت اور جاہ وجلال کا تذکرہ کیا ہے۔

18.5.2 انتظامی تقسیم (Administrative Division)

انتظامی سہولت کے لیے چولا حکومت منڈلوں (Mandalas)، ولاناڈوؤں (Valanadus) ناڈوؤں (Nadus) اور کوٹموں (Kuttams) جیسی مختلف اکائیوں میں منقسم تھی۔ راجاراجاچولا کے دورِ حکومت میں چولامنڈلم (چولا-ناڈو) یعنی مرکز کے ساتھ ساتھ منڈلم کا وجود عمل میں آیا۔ ہمیں اس طرح کے کئی منڈل جیسے راجاراجامنڈلم (پنڈی-ناڈو)، جینگونڈاچولا منڈلم (Jayangonda cholammandalam) (تونڈئی-ناڈو)، اور مُمّوڈی چولا منڈلم (Mummudicholamandalam) (سری لنکا) وغیرہ کی شہادتیں ملتی ہیں۔ چولا سلطنت کے تحت کئی اہم علاقے ولاناڈو میں تبدیل ہو گئے تھے اور ہر منڈلم اس طرح کے بہت سارے ولانڈوؤں پر مشتمل تھا۔ لیکن چولا سلطنت کے وسیع و عریض علاقے پر ولاناڈو انتظامی امور کی بنیادی اکائی تھا۔ اگرچہ ناڈو کی اصطلاح کا استعمال وسیع و عریض خطہ کو ظاہر کرنے کے لیے عمومی معنوں میں استعمال کی جاتی تھی لیکن یہ خاص طور پر الگ الگ چھوٹے زرعی علاقوں کو ظاہر کرنے کے لیے اس کا استعمال کیا جاتا تھا۔ وائے۔ سُبّارایالو (Y. Subbarayalu) کے مطابق چولا-منڈلم اور تونڈئی-منڈلم تقریباً 350 ناڈوؤں پر مشتمل تھے اور بیشتر ناڈو کا حصہ عام طور پر 20 تا 200 مربع کلو میٹر تک ہوتا تھا۔ ناڈو کی علاقائی سالمیت بعض اوقات، والانڈو اکائی کے اجزا کی بالادستی سے متاثر ہو جاتی تھی۔ تونڈئی منڈلم علاقوں میں، کوٹّم واس (Kottamwas) کی مزید ایک اور علاقائی تقسیم ناڈوؤں پر رکھی گئی تھی۔ جس وقت کلوتنگا اول نے تونڈئی منڈلم میں انتظامی تقسیم کے ولناڈو علاقوں کو متعارف کروایا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے ابتدائی دور کے کوٹّموں کا ہی نام بدل کر ولناڈو رکھ دیا ہو۔ رہائشی علاقوں اور آس پاس کی زرعی زمینوں کے ساتھ ساتھ جنگلات اور چراگاہ کی زمین پر مشتمل بنیادی بستی کو 'اُر' (Ur) کہا جاتا تھا۔ چولا سلطنت میں مختلف قسم کے اُر پائے جاتے تھے.

- **ویلّن واگئی (Vellanvagai)** (زرعی دیہات)
- **برہم دیا (Brahmadeya)** (برہمنوں کو عطیہ کیے گئے گاؤں)
- **دیوَدیا (Devadeya)** (مندر گاؤں)
- **نگرم (Nagaram)** (تجارتی بستی)
- **تنی یار Taniyar** (علیحدہ گاؤں) بعض برہم دیہ دیہاتوں کو تنی یار کی حیثیت حاصل تھی۔

18.5.3 محصولاتی نظم و نسق (Revenue Administration)

چونکہ عوام کی مالی ضروریات پوری کرنا ریاست کا بنیادی سہارا ہوتا تھا، اس لیے محصولات کے ریکارڈوں کی دیکھ بھال پر بہت احتیاط اور توجہ برتی جاتی تھی۔ ریاست کی تمام زمینوں اور جائیدادوں کا باقاعدہ سروے کیا جاتا تھا اور ان کی قابلِ محصول اور ناقابلِ محصول اراضی کے طور پر درجہ بندی کی جاتی تھی۔ ہر گاؤں اور ہر شہر میں کچھ علاقے جیسے رہائشی علاقے، مندر، تالاب، گاؤں سے گزرنے والی نہریں، گاریگروں کی قیام گاہیں اور آگ جلانے کا میدان وغیرہ محصول کی ادائیگی سے مستثناء تھے۔ ایک علیحدہ محکمہ جسے پوراوُواراٹینا ایکالمواس (Puravuvari-tinaikkalamwas) کہا جاتا تھا محصول کے ریکارڈز کی دیکھ بھال کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ ہمیں موگاوٹی

(Mugavetti)(شاہی مہر)اور 'پُٹولائی(Pottolai)(محرر جو تاڑ کے پتوں پر ریکارڈز درج کرتا ہے)اور دیگر دفتروں کی اصطلاحات کے علاوہ محصول کے رجسٹروں کے حوالے بھی ملے ہیں جنہیں واریپ پُٹگا کانکّو(Varippottaga-kankku)کہا جاتا تھا انہیں بھی رکھا گیا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں کدامائی(Kadamai)ابتدائی محصول تھا جسے زمینداروں سے وصول کیا جاتا تھا۔اس طرح، گاؤں مکمل طور پر راجاؤں کے عہدیداروں کی وجہ سے سارے محصول کی ادائیگی کے لیے ذمہ دار تھا۔ محصول اشیاء یا نقد دونوں شکلوں میں سہولت کی مطابق جمع کیا جاتا تھا۔اس کے علاوہ کچھ متفرق ٹیکس بشمول تحائف، چنگی، لوگوں سے وصول ہونے والی ادائیگی اور جرمانے بھی تھے۔ زمین کی پیمائش کے لیے استعمال کی جانے والی مختلف اکائیوں کی تفصیلات بھی تمل زبان میں کندہ کی ہوئی ملی ہیں ؛مثلاً کُلی(Kuli)، ما(Ma)، ویلی(veli)، پٹّی(Patti)اور پٹکم(Patakam)۔کُتبوں پر مبنی حالیہ مطالعہ بھی محصولِ اراضی کے حساب کے لیے زمین کی درجہ بندی کی دلچسپ معلومات فراہم کرتا ہے۔ اس طرح ہمیں چولا دور میں زمین کی مختلف اقسام کے لیے ترم(Taram)، مدکّو(Madakku)، پرپّو(Parappu)،اور وِرِیُو(Virivu)جیسی اصطلاحات کے حوالے ملتے ہیں۔

18.5.4 فوجی نظم ونسق (Military Administration)

بری اور بحری افواج پر مشتمل چولا حکومت کا عسکری نظام بہت مضبوط تھا۔ ہندوستانی جزیرہ نما، سری لنکا، مالدیپ اور انڈونیشیا (سری وجیا) جیسے ممالک میں ان کی حکومت کی سیاسی توسیع مضبوط افواج کے بغیر ممکن نہیں تھی۔اس میں مخصوص فوجی دستے 'کئی کولار ' (Kaikkolar) ،حسبِ ضرورت بھرتی کی گئی فوج ویلائیکار(Velaikkara) اور شاہی محل کے محافظ پری ورم (Parivaram)وغیرہ جیسے مختلف فوجی دستے تھے۔ جہاں تک بحری فوج کا تعلق ہے ایسا مانا جاتا ہے کہ ہر دستے کا ایک کپتان ہوتا تھا جسے 'نیاگم'(Nayagam) کہا جاتا تھا، بعد ازاں اس اصطلاح کو 'پدائی مدالی'(Padai-mudali)سے تبدیل کر دیا ہے۔ان نیاگموں کو 'ڈنڈانیاکم'(Dandanayakams) کے ماتحت رکھا گیا تھا دوسری جانب یہ دنڈا نیاکم ، فوج کے اعلیٰ ترین عہدیدار 'سیناپتی' (Commander-in-chief)کے ماتحت ہوتے تھے۔ عصری ذرائع فوجی چھاؤنیوں یہاں تک کہ فوجی تربیتی مراکز یا کے بارے میں بھی بات کرتے ہیں یہ 'کدا گم'(Kadagams)کے نام سے چولا سلطنت میں بھی موجود تھے۔

18.5.5 مقامی نظم ونسق (Local Administration)

چولا نظم ونسق کی سب سے اہم خصوصیت خود کار مقامی حکومت کا نظم وانصرام تھا۔ان بلدیاتی اداروں کی خود مختاری کے نمایاں درجہ اور ان دیہاتوں پر ان حکمرانوں کی براہ راست گرفت پانے کی حد پر علماؤ فضلا کے درمیان بحث ومباحثہ جاری ہے۔ان دیہاتوں کی دو جداگانہ مجلسیں (Assemblies)'اُر'(Ur)اور 'مہاسبھا'(Mahasabha)ہوا کرتی تھیں ۔اُر دیہات کی عمومی اسمبلی تھی جبکہ برہمن دیہاتوں 'اگرہاروں '(Agraharas)میں بزرگوں کی مجلس 'سبھا' یا 'مہاسبھا' ہوا کرتی تھی۔اگرہاروں کی بیشتر زمین کو حکام نے کسی بھی

قسم کے محصول سے مستثنیٰ رکھا تھا۔ پرانتکا چولا کے 'اتّرامیرور' (Uttaramerur) کتبے، مہاسبھا کے کاموں کے بارے میں اہم معلومات فراہم کرتے ہیں۔ دیہاتوں کا نظم ونسق مجلسِ عاملہ کے ذریعہ انجام پاتا تھا جس کے ممبران یا تو جمہوری طرز پر منتخب ہوتے تھے یا ان کا انتخاب قرعہ اندازی جو 'کداؤلائی' (Kudavolai) کے نام سے معروف تھی کے ذریعے ہوتا تھا۔ اس مجلس کے ممبر بننے کے لیے زمین کا مالک ہونا، ویدوں کا علم اور جرائم سے پاک ہونا جیسے بعض معیار متعین کیے گئے تھے۔ اس مجلس کے ممبران کی مدتِ کارکردگی تین سال ہوتی تھی۔ متعدد کمیٹیاں جسے 'وری یمس' (Variyams) کہا جاتا تھا نظم ونسق کے مختلف معاملات کی دیکھ بھال کے لیے تشکیل دی گئی تھیں۔ ہمیں 'ایری' (Eri) (آبپاشی)، 'ٹوٹا' (Totta) (باغ) اور 'پون' (Pon) (سونا) جیسی کمیٹیاں (Variyama) جو اس دور میں موجود تھیں، کے دستاویزی ثبوت ملے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کمیٹی چھ سے بارہ ممبروں پر مشتمل ہوتی تھی جنہیں عمومی طور پر 'وریا پیرومکّل' (Variya Perumakkal) کہا جاتا تھا۔ سبھا اور چولا دربار کے درمیان گہرے رشتوں کا ثبوت ملتا ہے۔ 'اتّرامیرور' (Uttaramerur) میں پائے جانے والے دو کتبوں کے مطابق، یہ واضح ہو جاتا ہے کہ سبھا کی قرارداد 'اوف' (Aof) کی منظوری ان کمیٹیوں کے ذریعے خود مختاری کے ساتھ کی گئی تھی جس کے نتیجے میں چولوں کے تحت ریاست کی نوعیت کے لیے مختلف نمونوں کا اطلاق ہوا۔

18.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس حقیقت کے باوجود کہ چولوں نے نویں صدی کے وسط اوائل میں پلووں کو شکست دینے کے بعد جنوبی ہند میں خود کو استحکام بخشا، اور اس نے صرف دسویں صدی کے آخری تہائی میں شاہی خصوصیت حاصل کرلی۔ چولوں کی عظمت کا انحصار نہ صرف جنوبی ہند اور دکن کے کچھ حصوں پر ان کے زیر استعمال سیاسی کنٹرول میں تھا، بلکہ سری وجیا (انڈونیشیاء)، سری لنکا اور مالدیپ وغیرہ جیسے دور دراز ممالک میں بحری بالادستی کو بروئے کار لاتے ہوئے انہوں نے اقتدار پر کنٹرال رکھا۔ چولا خاندان کے طاقتور حکمراں، مثلاً، راجاراجا چولا، راجیندرا چولا، راجا دھیراج چولا اور کلوتنگا چولا نے چولا سلطنت کی توسیع واستحکام میں بنیادی رول ادا کیا۔ بلاشبہ انہوں نے فنونِ لطیفہ، اور فن تعمیر کی شاندار روایت چھوڑی ہے جسے ان کے تعمیر کیے گئے عظیم الشان مندروں اور شہروں سے سمجھا جاسکتا ہے۔ چولوں کے متعلق دستیاب معلومات جو زیادہ تر کتبوں پر کندہ ہیں ان سے راجیندرا چولا کے دور سے ایک صدی سے زائد عرصہ تک ان کی سلطنت کے بیشتر حصہ پر حکمرانوں کا مرکزی کنٹرول رہا۔ تاہم، بلدیاتی اداروں کی خود مختاری سے پوری طرح انکار نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ حکمراں کے نمائندوں کو بلدیاتی اداروں کی مجلسِ عاملہ کی میٹنگوں میں دیکھا گیا ہے، جس کا ثبوت 'اتّرامیرور' (Uttaramerur) کے کُتبوں سے ملتا ہے۔ اگرچہ چولا حکومت کی عظمت کا خاتمہ 1120ء میں کلوتنگا کی موت کے بعد ہو گیا تھا لیکن ان کی حکومت تیرہویں صدی کے آخری دہائیوں تک عمومی طور پر اس وقت تک جاری رہی جب انہیں پانڈیا حکمرانوں نے آخری شکست دے دی اور خود حکمراں بن گئے۔

18.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

کدامائی (Kadamai) : چولا دورِ حکومت میں زمینداروں سے وصول کیا جانے والا ٹیکس۔

کداگام(Kadagam) : فوجی تربیت گاہیں یا چھاؤنیاں

کالنگاتوپرانی(Kalingattupparani) : بارہویں صدی کا کلوتنگا چولا کے دور کا جیا گوندار(Jayagonder)کا مشہور تمل ادبی شاہکار۔

مہاسبھا یا سبھا(Mahasabha or Sabha) : برہمن گاؤں یا اگراہا(Agraha)میں عمائدین کی مجلس۔

منڈلم(Mandalam) : چولا حکومت کے ماتحت سب سے بڑی صوبائی اکائی۔

ناڈو(Nadu) : چولا حکومت کے تحت بنیادی صوبائی اکائی۔

پوراوُواراٹینا ایکالم(Puravuvari-tinaikkalam)

: چولا حکومت میں محصول کے ریکارڈز کی دیکھ بھال کا محکمہ۔

ولناڈو(Valanadu) : چھوٹے اہم صوبے جنہیں چولا حکمرانوں نے فتح کیا اور وہاں ناڈوؤں کو متعین کیا۔

ویلن واگئی(Vellan-vagai) : زرعی دیہات

اُر(Ur) : چولا کے دور میں رہائش گاہ اور اس کے آس پاس کی زرعی زمین اور جنگل اور پہاڑی اور چراگاہوں پر مشتمل بنیادی بستی۔ اسے گاؤں کی جنرل اسمبلی بھی کہا جاتا تھا۔

18.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

18.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. سیلون(Ceylon) یعنی سری لنکا پر سب سے پہلے کس چولا حکمراں نے حملہ کیا تھا؟

(a)راجاراجا چولا اول(Rajaraja Chola I) (b)راجندر چولا اول(Rajendra Chola I)

(c)راج ادھراج چولا(Rajadhiraja Chola) (d)کلوتنگ چولا اول(Kulottunga Chola I)

2. کس چولا حکمراں نے سب سے مضبوط بحری بیڑا (Naval Fleet) بنایا تھا؟

(a)وجیالیا چولا(Vijayalaya Chola) (b)راجاراجا چولا اول(Rajaraja Chola I)

(c)راجندر چولا اول(Rajendra Chola I) (d)کلوتنگ چولا اول(Kulottunga Chola I)

3. Peasant, State and Society in Medieval South India کتاب کے مصنف کون ہیں؟

(a)کے۔اے۔نیلا کنٹھ شاستری (b)برٹن اسٹین (c)آر۔ستیاناتھ ایئر (d)ڈی۔ڈی۔کوسامبی

4. چولا دربار (Chola Court) کی شان وشوکت کا ذکر کرنے والے چینی دانشور کون تھے؟

(a)ژاؤرو گوا(Zhao Rugua) (b)پینگ چِنگ(Peng Cheng)

(c)ژوچُوفی(Zhou Qufei) (d)وانگ تاؤ(Wang Tao)

5. چولاسلطنت (Chola Empire) میں شاہی/سرکاری منشی (Royal Scribe) کو کیا کہا جاتا تھا؟

(a)اَدِکاری (b)تِرومندراولائی (c)سیناپتی (d)سری کاریَم

18.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. چولاسلطنت کے قیام پر مختصراً اظہارِ خیال کیجیے۔
2. چولوں کی تاریخ میں راجیندراول کے کردار کا جائزہ لیجیے۔
3. چولوں کے تحت ریاست کی نوعیت کیا تھی؟ وضاحت کیجیے۔
4. ''مدرائی کونڈا'' کا خطاب حاصل کرنے والے چولا حکمراں پر ایک مضمون لکھیے۔
5. چولا حکومت کے تحت بلدیاتی حکومت کے کام کے بارے میں مختصر طور پر تبادلہ خیال کیجیے۔

18.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. چولاسلطنت کے قیام اور استحکام میں چولا خاندان کے اہم حکمرانوں کے کردار کا جائزہ لیجیے۔
2. چولاسلطنت کی نوعیت پر تفصیل سے اظہارِ خیال کیجیے۔
3. چولا حکمرانوں کے انتظامی نظم ونسق پر روشنی ڈالیے۔

Key

1۔ (a)راجاراجاچولااول 2۔ (c)راجندرچولااول 3۔(b) برٹن اسٹین 4۔ (c) ژوچُوفی(Zhou Qufei)

5۔ (b) تِرومندراولائی

اکائی 19۔کاکتیہ خاندان

(The Kakatiyas)

اکائی کے اجزا

19.0		تمہید
19.1		مقاصد
19.2		سیاسی پس منظر
	19.2.1	ابتدائی حکمران
	19.2.2	رودردیوا
	19.2.3	مہادیوا
	19.2.4	گنپتی دیوا
	19.2.5	رودرمادیوی
	19.2.6	پرتاپردردیوا
19.3		فن و فنِ تعمیر
19.4		مذہب
	19.4.1	بدھ مت
	19.4.2	جین مت
	19.4.3	شیوازم
	19.4.4	وشنوازم
19.5		ادب کا نشوونما
	19.5.1	سنسکرت ادب
	19.5.2	تیلگوادب
	19.5.3	رقص

19.6 اقتصادی شرائط
19.7 تدریسی نتائج
19.8 اکتسابی نتائج
19.9 کلیدی الفاظ
19.10 نمونہ امتحانی سوالات

19.0 تمہید (Introduction)

گیارہویں صدی کے آغاز سے چودہویں صدی کے اوائل تک کے عرصے میں اس کا ظہور ہوا۔ کاکتیہ خاندان جس نے عہد وسطیٰ کے جنوبی ہندوستان کیتاریخ میں ایک نئے باب کاآغاز کیا۔ کاکتیہ نے پوری تیلگو قوم کوایک چھت کے تحت جمع کیا۔انہیں ایک چھت کے تحت رکھااور تیلگوزمین پر تین سو سال سے زیادہ وقت تک قیام کیا۔ کاکتیہ نے اپنے ابتدائی کیریئر کاآغاز راشٹر کوٹوں کے تحت فوجی جرنیلوں کے طور پر کیااور بعد میں چلوکیہ چول کے تحت۔ بعد میں انھوں نے آزادی کااعلان کیااور خود مختاروں کے طور پر حکومت کرنے لگے۔ دھیرے دھیرے انہوں نے اپنی سلطنت کو موجودہ تلنگانہ، ساحلی آندھرا، رائلسیما، اوڑیساکے کچھ حصوں، کرناٹک اور تمل ناڈو تک بڑھایا۔ کاکتیہ تقریباً1000 سے 1323 عیسوی تک حکومت کرتے رہے۔

19.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- بارویں صدی کی ابتداء میں آندھرا میں کاکتیوں کے اقتدار میں آنے سے متعلق جان سکیں گے۔
- کاکتیہ تواریخ کے معاشرتی، ثقافتی اور معاشی پہلوؤں کے مختلف پہلوؤں کو سمجھ سکیں گے۔
- کاکتیہ فنِ تعمیر کی خصوصیات سمجھ سکیں گے۔
- تلگو زبان اور ادب کی تشکیل سمجھنے کی صلاحیت پیدا کر سکیں گے۔

19.2 سیاسی پس منظر (The Political Background)

ورنگل کے کاکتیوں (Kakatiyas of Warangal) کی تاریخ دکن اور بالخصوص تلگو بولنے والے علاقوں کی عہد وسطیٰ کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ کاکتیہ خاندان نے بارہویں اور تیرہویں صدی میں اپنی سیاسی طاقت کو وسعت دی اور موجودہ تلنگانہ اور آندھرا پردیش کے وسیع علاقوں سمیت مشرقی دکن کے ایک بڑے حصے پر اقتدار قائم کیا۔ ان کا دارالحکومت ابتدا میں ہنمکنڈہ

(Hanamkonda)تھا، جبکہ بعد میں ورنگل(Warangal)، جسے قدیم متون میں اورو گلو(Orugallu)بھی کہا جاتا ہے، سلطنت کا اہم دارالحکومت بن گیا۔ کاکتیہ اقتدار کا خاتمہ 1323ء میں دہلی سلطنت کے حملے کے نتیجے میں ہوا۔ کاکتیوں کے ابتدائی حکمران مغربی چالوکیوں کے ماتحت جاگیر دار یا سامنت تھے۔ خاندان کی سیاسی طاقت بتدریج بڑھی اور رودر دیو اول (Rudradeva I) نے 1160ء کی دہائی میں چالوکیائی بالادستی سے آزادی کا اعلان کر کے ایک خود مختار کاکتیہ ریاست کی بنیاد مضبوط کی۔ اس کے بعد کاکتیوں نے تلگو بولنے والے علاقوں میں اپنی سیاسی طاقت کو وسیع کیا۔ گنپتی دیو (Ganapatideva) کے دور میں یہ توسیع اپنے عروج پر پہنچی اور تقریباً پورا تلگو بولنے والا خطہ کاکتیہ اقتدار کے زیرِ اثر آ گیا۔

کاکتیوں کے اصل نسب کے بارے میں مورخین میں مکمل اتفاق نہیں ہے۔ کاکتیہ دور کے مختلف کتبوں میں ان کے نسب کے متعلق مختلف روایات ملتی ہیں۔ بیّارم ٹینک(Bayyaram Tank)کتبہ اور دیگر کتبوں کی بنیاد پر بعض مورخین نے کاکتیوں کے ابتدائی خاندان کو راشٹر کوٹوں سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ مورخ پی۔ وی۔ پی۔ شاستری (P. V. P. Sastry) نے اس سلسلے میں وِرشنی (Vrishni)نسب اور راشٹر کوٹوں کے ساتھ ممکنہ تعلق کی وضاحت کی ہے، لیکن یہ نظریہ قطعی طور پر ثابت شدہ تاریخی حقیقت نہیں سمجھا جاتا۔ اس لیے کاکتیوں کو براہِ راست راشٹر کوٹ خاندان کی شاخ قرار دینا محتاط تاریخی تحقیق کے مطابق مناسب نہیں۔ کاکتیہ حکمرانوں نے وقت کے ساتھ اپنے نسب کو معروف شاہی اور کشتریہ روایات سے جوڑنے کی کوشش کی۔ بیّارم کتبہ میں خاندان کے نسب سے متعلق ایسی روایات ملتی ہیں جن میں اسے اعلیٰ شاہی نسب سے وابستہ کیا گیا ہے۔ تاہم مختلف کتبوں میں نسب کے بیانات یکساں نہیں ہیں؛ اس لیے کاکتیوں کے اصل نسلی ماخذ کے بارے میں قطعی دعویٰ کرنا مشکل ہے۔

کاکتیہ خاندان کے نام کاکتیہ(Kakatiya)کی اصل بھی تاریخی بحث کا موضوع رہی ہے۔ ایک قدیم روایت میں اس نام کو کاکتی (Kakati) نامی دیوی سے منسوب کیا گیا ہے۔ بعد کے ادبی ماخذ، خصوصاً ودیاناتھ (Vidyanatha) کی پرتاپ رودریہ (Prataparudriya)، اس روایت کو بیان کرتے ہیں۔ تاہم کتبہ جاتی شواہد کی روشنی میں اس نسبت کو قطعی تاریخی حقیقت نہیں سمجھا جا سکتا۔ ایک دوسری اہم روایت کاکتیہ نام کو کاکتی پورا(Kakati-pura)نامی مقام سے جوڑتی ہے۔ گنپتی دیو کے بعض کتبوں میں کاکتیہ حکمرانوں کے ساتھ کاکتی پورا کا تعلق ظاہر ہوتا ہے۔ اسی بنیاد پر بعض محققین کا خیال ہے کہ ”کاکتیہ“ نام ممکنہ طور پر کسی جغرافیائی مقام سے مشتق ہوا ہو گا۔ تاہم کاکتی پورا کا درست محلِ وقوع بھی یقینی طور پر متعین نہیں کیا جا سکا ہے۔ لہٰذا کاکتیہ نام کی اصل کے بارے میں دو اہم امکانات سامنے آتے ہیں: ایک اسے کاکتی دیوی سے جوڑتا ہے، جبکہ دوسرا اسے کاکتی پورا نامی مقام سے منسوب کرتا ہے۔ موجودہ تاریخی شواہد کی بنیاد پر کسی ایک نظریے کو قطعی طور پر ثابت کرنا مشکل ہے۔

کاکتیہ خاندان کا ابتدائی شاہی نشان گروڑ (Garuda) تھا۔ بیّارم ٹینک کتبہ میں کاکتیہ حکمراں بیٹا اول (Beta I) کے لیے گروڑانک (Garudanka) جیسی تعبیر ملتی ہے، جبکہ گنپتی دیو کے زمانے کے دیگر کتبے بھی کاکتیوں کے گروڑ سے تعلق کی تائید کرتے

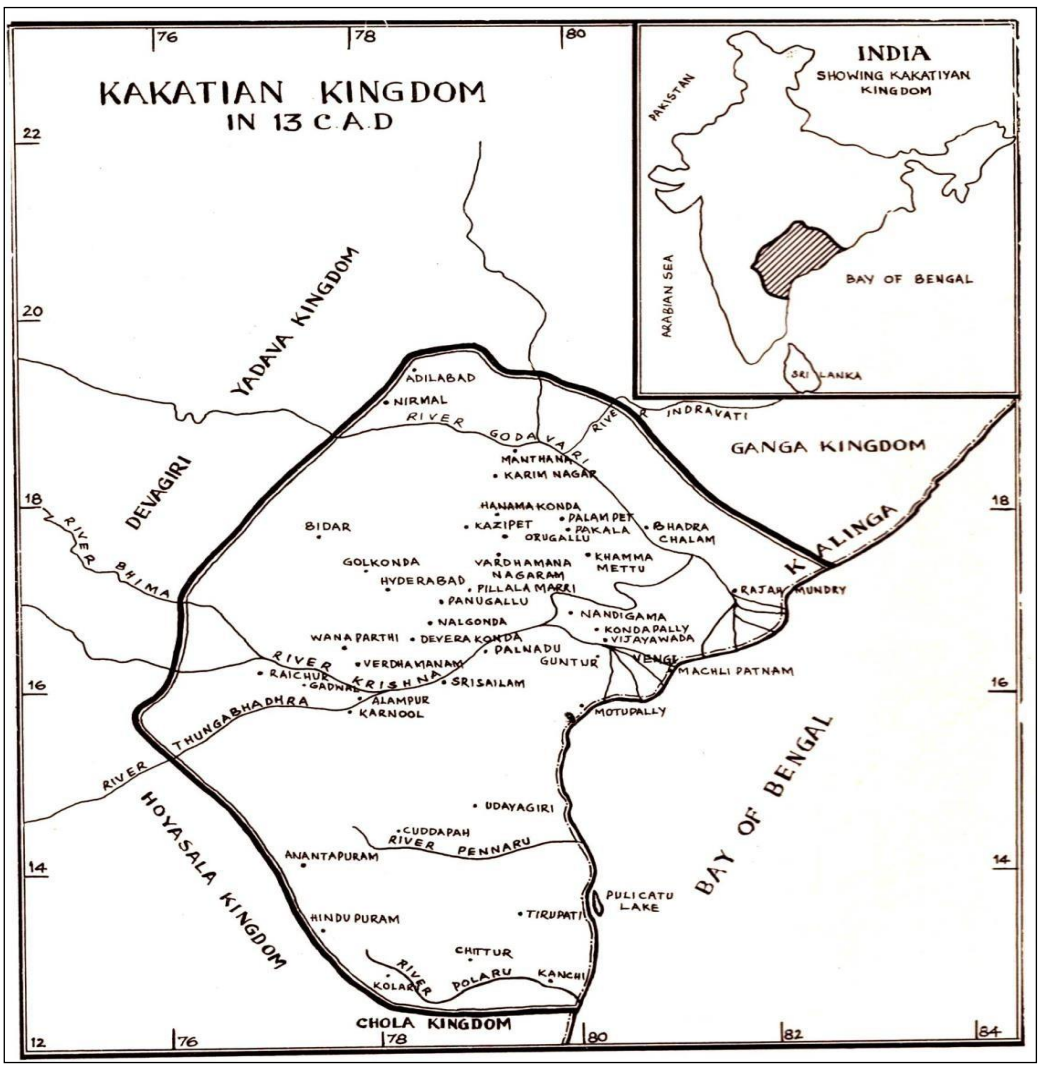
ہیں۔ بعد میں، جب کاکتیہ حکمران کلیانی کے چالوکیوں کے ماتحت آئے، توانہوں نے چالوکیوں کے معروف شاہی نشان وراہ (Varaha) کو بھی اختیار کیا۔ اس لیے یہ کہنا زیادہ درست ہے کہ کاکتیہ شاہی علامت کے سلسلے میں مختلف ادوار میں گروڑ اور وراہ دونوں کا استعمال ملتا ہے۔ کاکتیوں کی سب سے بڑی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ انہوں نے تلگو بولنے والے وسیع علاقوں کو ایک مضبوط سیاسی اقتدار کے تحت متحد کیا۔ گنپتی دیو نے ریاست کو وسیع کیا، آبپاشی اور زرعی معیشت کی ترقی پر توجہ دی اور ساحلی تجارت کو فروغ دیا۔ رودرمادیوی (Rudramadevi) نے ایک خاتون حکمران کی حیثیت سے کامیابی سے سلطنت کی باگ ڈور سنبھالی اور یادو اور دیگر حریف طاقتوں کا مقابلہ کیا۔ اس کے بعد پرتاپ رودر دوم (Prataparudra II) کے دور میں کاکتیہ ریاست کو دہلی سلطنت کے حملوں کا سامنا کرنا پڑا، اور بالآخر 1323ء میں ورنگل کے سقوط کے ساتھ کاکتیہ سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس طرح کاکتیہ دور، دکن کی سیاسی تاریخ کے ساتھ ساتھ تلگو زبان، علاقائی شناخت، آب پاشی، تجارت، فنِ تعمیر اور مندر سازی کی تاریخ میں بھی ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ ورنگل کا قلعہ، ہزار ستونوں والا مندر اور رامپا مندر اس دور کی نمایاں تعمیراتی میراث میں شمار ہوتے ہیں۔

19.2.1 ابتدائی حکمران (Early Rulers)

ڈانارنوا (956)، منگلو پلیٹس جو شرقی چالوکیہ بادشاہ، دانارناوا (956ء) نے جاری کی تھیں اور کاکتی میلاما کے بیّرام ٹینک کی انسکرپشن کیشکولا ورنگل کے کاکتیوں کی ابتدائی تاریخ میں انقلابی تبدیلیوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ بعد کے لتھی انسکرپشن کے ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ وینا کاکتیہ خاندان کے بانی تھے۔ یہ اور بھی بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے کاکتیہ کا خاندان قائم کیا۔ آگے کہا جاتا ہے کہ وہ ایک شہر، جس کا نام کاکتی پورا تھا، سے حکومت کرتے تھے جس کی بنا پر ان کے نسلیں کاکتیوں کے طور پر مشہور ہوئیں۔ ان کا بہترین دور بینا 800-815ء میں ممکن ہے۔ ان کا خلافت گنداپہلا اور بعد میں گنداادوم نے حاصل کی۔ ہمیں ان چیفس کی سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں کوئی معلومات فراہم نہیں ہوئیں۔ انہیں 815-865ء میں رکھا جاسکتا ہے۔ گنداادوم کے بعد گنداسوم آیا۔ منگالو پلیٹس سے معلوم ہوتا ہے کہ گنداسوم نے اپنے راشٹر کوٹا اوورلارڈ، کرشنادوم کے ساتھ، اور شرقی چالوکیہ بادشاہ، بھیما اول اور ان کے بیٹے، اریمارٹی گنندا کے ساتھ پیرووونگرو میں جنگ لڑی۔ گنندا بے مثال شدت سے لڑتا رہا اور ایک چمکتی فتح حاصل کیا۔ مگر انہوں نے جنگ کے میدان میں اپنی جان کھودی۔ راشٹر کوٹا ایمپرر نے گنداسوم کے والد، اریا، کو فتح کے جنگ میں ان کے والد کی نمایاں خدمات کی بدولت کوراوی علاقے کی گورنرشپ عطا کی۔ اس طرح کاکتیہ گنداادوم کے دور میں پہلی بار 9ویں اور 10ویں صدیوں میں راشٹر کوٹا امپررز کے کمانڈر کے طور پر آندھرا داخل ہوئے اور بہت جلد خود کو قوتور حکمرانوں کے طور پر کرورواڈی علاقہ میں قائم کیا، جو ورنگل ضلع کے معاصر کوراوی علاقہ سے تشخص کیا جاسکتا ہے۔ منگالو پلیٹس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایریا کے بعد بیٹیا کے بعد ونامقرر کیا گیا، مگر بیّرام ٹینک کی انسکرپشن میں اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ بعض لوگوں کے مطابق، حالت جیسے کہ ناکارہ یا پہلے موت، اس کا نام بیّرام انسکرپشن میں غائب ہو سکتا ہے جو صرف بیان کرتی ہے کہ ونا پنڈی گنندا حکومت کے بغیر آیا۔

بیٹیا کے بعد گنندا چہار آیا۔ انہیں کاکتیہ گنندا یا پنڈی گنندا (950–990ء) کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ ان کے دور میں ایک

اندرونی جنگ کا آغاز ہوا تھا، جب شرقی چالوکیہ امپائر میں امماراجا اول اور ان کے ننھے بھائی دانارناوا کے درمیان۔ راشٹر کوٹا امپرر، کرشنا سوم، نے دانارناوا کی مدد کی درخواست نہ صرف قبول کی بلکہ اپنے جنرل، جو پہلے ہی کوراوی: علاقہ میں قیام کرتے تھے، دانارناوا کی مدد کے لیے فوراً بھیج دیا۔ گنندا چہار کی فعال حمایت سے، دانارناوا نے امماراجا کو شکست دی اور وہاں کی تخت کو اپنے قبضے میں لیا۔ گنندا راشٹر کوٹا کے حامل رہے ،جب تک کہ ان کی اچانک 973ء میں گراوٹ ہوگئی۔ دسویں صدی کے آخری حصے میں دکن کے سیاسی حلقوں میں کچھ نمایاں تبدیلیاں دیکھی گئیں۔ خاص طور پر آندھرا میں یہ تبدیلی دیکھی جاسکتی ہے۔ دانارناوا کی موت، جاتیچوڈا بھیما کی ویگی، اور راشٹر کوٹا کی امارت کا خاتمہ ان میں سے چند تبدیلیاں تھیں۔ معمولی سیاسی ترتیب کو مد نظر رکھتے ہوئے، گنندا چہار نے خود کو موچ کرنے کا موقع حاصل کیا۔ جب مدیگونڈا چالوکیوں کے خرچے میں اپنے حصہ کے خرچے کو کاروبار میں لایا۔ پھر بھی یہ اسے ایک مستقل حکمران نہیں بنا پایا، کیونکہ 995ء میں، چالوکیا ٹیلپادوم تلنگانہ علاقے کا اوورلارڈ بن گئے۔ اس طرح راشٹر کوٹا کی غلامی کا خاتمہ اور چالوکیا کی کاکتیوں پر قابو کے آغاز کو گنندا چہار نے دیکھا۔
گنندا چہار کے بعد بیٹا اول نے خلافت کو سنبھالا۔ ہمیں کازیپیٹ انسکرپشن سے معلوم ہوتا ہے کہ بیٹا نے چولا بادشاہ کی فوج کی دھارا کو چرچ کیا اور لکشمی (فتح) حاصل کی۔



بیٹااول کے بعد ان کے بیٹے پرولااول (1051–1076ء) کی خلافت کا دور رہا۔ ان کے نواسند، ڈگاراجا، کی کازیپیٹ انسکرپشن میں 1097–98ء میں دی گئی مواد کا سیاسی کاموں کے لیے بنیادی ذریعہ ہے۔ کہا گیا ہے کہ پرولا نے چکرا کوٹا وشیہ کے معاملات کو درست کیا اور بھدر نگا نام کے خلاف فتح حاصل کی۔ انہوں نے مجازات میں ہمسایہ چیف انننیہ، کڈاپارٹی دورگا کے بیٹے، اور پروکٹا چیف گونا کا انتہا کیا۔ یہ تمام فوجی عمل پرووالا اول نے مغربی چالوکیا امپرر، سومیسورا کے لیے کیے۔ ان کی بہترین خدمات پر محسور رہتے ہوئے، ایمپرر نے پرووالا اول کو وراثتی زمین ہنوما کونڈا کا وراثتی عطا کیا۔

پرووالا اول کے بعد ان کے بیٹے بیٹا دوم نے خلافت سنبھالی۔ انہیں ہنوما کونڈا انسکرپشن میں، سریمان وکرما چکری اور، سری بیٹا منڈالیکو تھما کہا جاتا ہے۔ وہ تریبھوانامللا وکرمادتیہ سکس وکرمادتی چیف کے تابع تھے۔ بیٹا دوم کے بعد ان کا بیٹا ڈگراجا آیا۔ اس چیف کو تریبھوانامللا اور چلامار ٹیگنڈا کے عنوانات دئے گئے۔ کوتھاپالی انسکرپشن سے معلوم ہوتا ہے کہ پرووالا دوم نے اپنے آپ کو طاقتور کر لیا جب وہ ڈگراجا کو خاتمہ کر کے حاصل کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پرووالا اول کا کتی خلافت معمولی یا امن و امان سے نہیں تھا۔ پرووالا دوم نے 1116ء سے 1157ء تک حکومت کی۔ رودردیو کی ہنوما کونڈا انسکرپشن، جو 1162–63ء میں تاریخی گواہی دیتی ہے، پرووالا اول کی فوجی کاموں کے بارے میں دلچسپ معلومات فراہم کرتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے راشٹر کوٹا ٹیلپدیوا کو جنگ میں قید کیا اور بعد میں انہیں وفاداری اور رحمت کے لیے آزاد کیا۔ وہ گووندراجا کو بھی قید کر کے انہیں رہا کیا، پھر پرووالا نے ان کی بادشاہت کو کچھ عید راجاپر عطا کیا۔ اس ہنوما کونڈا انسکرپشن میں ان مواد کا حوالہ ہے کہ پرووالا دوم نے مخصوص اپنے اوورلارڈ کے موجودگی میں تمام اوپر ذکر کیے گئے فتوحات کو حاصل کیا۔، مغربی چالوکیا امپرر جگدیکمل جی کی۔

19.2.2 رودردیوا (A.D.1158–1195)

رووردرادیوا، پرولا دوم کا بیٹا اور اس کے وارث تھا، کاکاتیہ سلطنت کے ایک بہترین ابتدائی سرداروں میں سے ایک تھے۔ اس کی قابل اور فعال حکومت کے دوران کاکتیہ نے آزادی کا دعویٰ کیا اور اس طرح عہد وسطیٰ کے آندھرا کی تاریخ میں نیا باب کھل گیا۔ اس کی ہانومکونڈا کی انسکرپشن 1162–1163 میں، ایک طویل دستاویز جس کی بہت بڑی تاریخی قدرت ہے، اس کے فوجی کارروائیوں کی واضح بیان فراہم کرتا ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ اس نے ڈومراجا کو شکست دی اور اس کے شہر نگرا کو فتح کیا۔ اس نے میڈراجا کی غرور کو کم کیا اور رقیب سرداروں کی اتحاد کو توڑ دیا۔ اس نے میلیگی دیو کی غرور کو دبایا۔ اس نے دوسرے تھانوں میں بھی حملہ کیا، جیسے کہ بھیما کے بعد خود اپنے آپ کو بادشاہ قرار دینے والا تھا۔ اسے کھوچودائے کے شہر کو جلایا جانے کا بھی بیان دیا گیا ہے اور اس نے اپنی بیٹی، پدما، کے ساتھ شادی کی۔

رودرادیوا نے ان سرداروں پر فتح حاصل کرنے کے بعد اپنی توجہ ساحلی آندھرا کی کے فتح پر مرکوز کی۔ کچھ علماء کا خیال ہے کہ رودرادیوا نے ساحلی آندھرے علاقے پر اپنا کنٹرول قائم کیا۔ یہاں یہ نوٹ کرنا ضروری ہے کہ ہانومکونڈا کی انسکرپشن جو رودرادیوا کی فوجی کارروائیوں کی واضح بیان فراہم کرتی ہے، اس کی ساحلی اندھرے علاقے پر فتح کا کوئی حوالہ نہیں دیتی۔ اگر واقعی، اس نے ساحلی اندھرے

علاقے پر فتح حاصل کی، تو یہ صرف اس انسکرپشن کی تاریخ کے بعد ہو سکتا ہے۔ رودرادیوا فنون اور ادب کے سرپرست تھے۔ ان کے دورِ حکومت میں مشہور ہزار ستون والے مندر جو موڈرن شہر ہانومکونڈا کے مرکز میں واقع ہے، اس کی تعمیر ہوئی۔ انہیں ایک ڈرکشارامہ انسکرپشن میں 'ونیاویبھوشن' کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ نیتیسارا کے عنوان پر لکھی جانے والی کتاب کی شناخت ان کو دی جاتی ہے، لیکن اس کی تصدیق مشکوک ہے۔

19.2.3 مہادیوا (A.D. 1199–1195)

رودرادیوا بچہ رہا اور اس وجہ سے اس کے بھائی مہادیوا کا خلاف ورثہ بنا۔ ہمارے پاس اس بادشاہ کی صرف دو انسکرپشن ہیں، ایک سنڈیلا سے، 1197ء کا تاریخی ہے اور دوسرا ایک ٹوٹا اور تاریخ نہ معلوم ریکارڈ ورنگل کی قلعہ میں ہے۔ مہادیوا کا حکومتی عہد نہیں دمدار تھا اور نہ ہی واقعات سے بھرپور تھا۔ اس کے حکومت کا واقعہ صرف اس کے مقابلے کا ہے جب یادووں کے ساتھ اس کی جنگ ہوئی۔ اس لڑائی میں، مہادیوا نے نہ صرف یادوا بادشاہ کے ہاتھوں ایک شکست کے تھپڑ کھایا بلکہ اپنی جان بھی کھودی۔ کھنڈاولی کا کانپر پلیٹ امانت کے حساب سے بیان کرتا ہے کہ جب دشمن چھاپہ مار رہے تھے تو مہادیوا "خون سے رنگی ہاتھی کے دو مندر پر سوئے جیسا کہتا ہے جیسے موچھ کے لال خشکیوں سے لائے گئے تھے"۔ گراواپاڈواور یانمادلا انسکرپشنز گنپتیدواور یادواز کی مرکزی حکومت کی انسکرپشنز ہیں، اور ان سب کا مواد بھی اس لڑائی کو مختصر کرتا ہے۔ مہادیوا کی موت اور یادواز کی کامیابی پاتنہ اور رمچندردیوا کی بہانواں کرتی ہے۔

19.2.4 گنپتی دیوا (A.D. 1199–1263)

گنپتی دیوا کاکتیہ سلطنت کا بہترین حکمران تھا۔ اس کے حکومت کاکتیوں کی حکومت کی وسعت کانچی تک بڑھ گئی۔ البتہ، اس کے حکومتی دور کا آغاز امنداز نہیں تھا۔ اس کے والد کی شکست اور موت یادوا کی ہاتھوں اور اپنی خود کی گرفتاری کے بعد، کاکتیہ مملکت میں افراتفری شروع ہو گئی۔ ہم جانتے ہیں کہ پلمپٹ کے پلرانسکرپشن جو 1213 ایڈی کی تاریخ کی ہے، کہ بے بازیاب امیران اور ان کے تحت کے اداروں نے سرکش نواب اور نافرمان اعضاء کی سرکشی کی۔ لیکن ریچرلا رودرا سینانی، گنپتی دیوا کے وفادار ادارے نے ان بغاوتوں کو دبایا اور ریاست میں امن و سکون قائم کیا۔ گنپتی دیوا نے اپنی حیثیت کو مضبوط کرنے کے بعد پہلے ساحلیآندھرے علاقے پر توجہ دی۔ مالیالا چوندا سینانی کی قیادت میں کاکتیہ فوج نے دیوی جزیرے کی طرف جانبداری کی اور اسے فتح کیا۔ چونکہ وینگی علاقہ ویلاناڈو چولہ چیف پر ثویشورا کے کنٹرول میں تھا، لہذا اس انجامداد میں کاکاتیا شہزادہ کا ساتھ دیا گیا۔ لگتا ہے کہ پرثویشورا نے صرف شکست نہیں کھائی بلکہ اپنی زندگی بھی اس لڑائی میں گنوائی۔ کچھ ان انسکرپشنز میں، گنپتی دیوا کو 'پرثویشورا سراہ کندوک کریداونوڈا' یعنی پرثویشورا کا سر، یعنی پرثویشورا کا سر بال کھیلنے والا ذکر کیا گیا ہے۔ اس طرح گنپتی دیوا کے دور میں ساحلی اندھرہ علاقہ، کاکتیوں کی سلطنت کا حصہ بن گیا۔ گنپتی دیوا کے دور میں دوسرا اہم واقعہ تھا کہ وکراما سمھاپور کے تیلگو چودا ریاست کو منوما سیدھی دوم کو بحال کیا گیا۔

گنپتی دیوا اپنی حکمت عملی کو ساحلی علاقے پر قائم کرنے کے بعد خواہشمندی سے کاگنگا ریاست کو اپنے کنٹرول میں لانا چاہتا تھا۔

دستیاب اپو گرافیکل ثبوت واضح طور پر ظاہر کرتا ہے کہ گنپتی نے کاگنگا پر اکثر اکثر حملہ کیا۔ راجی نائیکا، انڈولوری سومایا اور جیپ سینانی نے ان مقابلے میں اہم کردار ادا کیا۔ 1236ء کیپو پارا پالی انسکرپشن کہتی ہے کہ راجی نائیکا نے بوکیرا پر کامیابی حاصل کی، عنوان گوڈھارتی کے سردار کو مارا، ادیا گری کو گرفتار کیا اور کچھ پادیرایا کو فراری کر دیا۔ گنپتی دیوا کے کاگنگا کے حملے کا بہترین ثبوت ہوشیار انسکرپشن کے لیے عظیم نمایاں عسکری طاقت تھی جس کی حکمت عملی کی جیت کی گئی اور اس کے سپاہیوں نے اس کے حملے کی سب اثاثے کو اپنے کنٹرول میں کر لیا۔ گنپتی دیوا نے کولانو چیفز کو مضبوط کر دیا۔ انھوں نے یادواز کے ساتھ دوستانہ تعلق رکھا۔ وہ حتی الجزاء ایکیادواشہزادہ کو پناہ دینے گئے جس کا نام پرمادھیدیوا تھا، یعنی سنگھانا کا بیٹا۔

جتاور من سندر پانڈیا، پانڈیہ سلطنت کے سب سے بڑے نمائندے نے منوماسیدھی دوم کے خلاف ایک مہم کا آغاز کیا۔ آخر بادشاہِ وقت نے کاکتیوں کو مدد کے لیے اپیل کی۔ اس طرح کاکتیوں، یادواز اور ایک خاص بانا چیف نے منوماسیدھی دوم کو پورے ساتھ اور تعاون کے ساتھ مدد فراہم کی۔ مٹکوڑو میں ایک لڑائی 1263ء میں ہوئی۔ اس لڑائی میں جتاور من سندر پانڈیا نے بھرپور کامیابی حاصل کی، کاکتیوں، یادواز، بانازاور وکراما سمھاپور کے تیلگو چودا چیف کے خلاف۔ اس عظیم کامیابی کی نشانی کے طور پر، جتاور من سندر پانڈیا نیلور اور کانچی میں ویرابھیشیکا منعقد کیا اور کاکتیوں کے سوار کی عکسی سکیکاز بندوق پر اور پانڈیا کی علامت مچھلی پر مخصوص سکیکاز جاری کی۔ اس طرح سے فوجی ردمراد کاکتیوں کی سیاسی کیریئر کا خاتمہ ہوا۔ گنپتی دیوا کی حکومت کو کاکتیوں کی تاریخ کے شاندار دور میں شامل کیا جاتا ہے۔ اس کی حکومت کا دور مخصوص طور پر پسوپت ساؤیسم کی اوپری مرتبہ کے مشاہدے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس کے دوران، کاکتیہ مملکت کی سرکاری مراکز کے اقدام کا اظہار ہوا اور اس کی انتہائی شاندار ورثا کا پیشہ ورانہ انجام دیا گیا۔

19.2.5 رودرامادیوی (A.D. 1262–1289)

رودرامادیوی کو تاریخ میں مختلف ناموں سے جانا جاتا ہے، مثلاً، رودردیوی، رودرمبا، رودرادیو مہاراجا، رودریو دیو مہاراجا، تریبھوواناد ھیپتی-کاکاتیا-رودرادیو وغیرہ۔ رودرمادیوی کاکاتیہ تخت سے الحاق جنوبی ہندوستان کی تاریخ میں ایک قابل ذکر واقعہ تھا، کیونکہ وہ پہلی خاتون تھیں جنہوں نے مرد کے نام سے تلگو بولنے والے علاقے پر حکومت کی۔ وہ 1259 سے 1260 عیسوی تک ایک شریک ریجنٹ کے طور پر اپنے نامور والد کی شاندار انتظامی انتظامات اور شاندار فوجی فتوحات کا مشاہدہ کرنے کے لیے بہت خوش قسمت تھی۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، گنپتی دیوا کے آخری سال پرامن نہیں تھے۔ نیلور کا علاقہ پانڈیوں کے ماتحت ویرا گنڈا گوپالا کے زیر اقتدار تھا۔ بھوجا بالا ویرانرڈیانا سومیشورا مہاراجہ ملکیناڈو کے علاوہ اور دیگر ملحقہ علاقوں پر حکمرانی کر رہے تھے جس کا دارالحکومت والوری پٹنہ تھا۔ وینگی کے علاقے پر کاکتیہ کے تسلط کو بھی مسترد کر دیا گیا۔ ان اندرونی پریشانیوں کے علاوہ، اگر پرتاپچرترا کی فراہم کردہ معلومات درست ہیں، تو رودرمادیوی کو گنپتی دیو کے بیٹوں ہری ہرا اور مراریدیوا کی طرف سے اس کی دوسری رانیوں کی طرف سے بھی چیلنج کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم، ردرمادیوی نے باغی امرا کو روک کر اپنی پوزیشن مستحکم کی۔ اس کام میں جانیگادیوا اور اس کے بھائی تریپورارای، ویلاما کے سربراہ پرسادتیہ وغیرہ نے اس کی بھرپور مدد کی تھی۔ رودرمادیوی نے اس طرح اپنے آپ کو ایک عظیم باپ کی قابل بیٹی ثابت کرتے ہوئے اپنے لیے اپنے نامور والد کا لقب یعنی 'رایا گجا کیسری

'اختیار کیا۔

رودرمادیوی کو سلطنت کی انتظامیہ کو ہموار کرنے سے پہلے، یادوا بادشاہ مہادیوا کے حملے کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن رودرماوی نے بے مثال شدت کے ساتھ جنگ کی۔ یادوافوج کو تباہ کردیااور یہاں تک کہ مہادیوا کو دیوا گیری قلعے کی دیواروں تک پیچھا کیا۔ رودرمادیوی کی اس عظیم فتح کا بیان کتبوں کے شواہد سے ثابت ہوتا ہے۔ بیدر کتبے میں کہا گیا ہے کہ سند خاندان کے بھیرو کے نام سے ملکہ کاایک ماتحت یادو بادشاہ کے خلاف مہم میں رودرم دیوی کے ساتھ تھا۔ یادوا سلطنت کے جنوبی حصے میں اس ریکارڈ کا وجود واضح طور پر ظاہر کرتا ہے کہ نہ صرف رودرمادیوی نے فتح حاصل کی بلکہ بیدر کے علاقے کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ امکان ہے کہ مہادیو نے شکست کا مزہ چکھنے کے بعد کاکتیہ ملکہ کے ساتھ صلح کرلی ہوگی۔ یہاں یہ کہنا مناسب نہیں ہوگا کہ کچھ یادو شہزادے، جن کا نام سارنگادیوااور یلاندیوا تھا، کاکتیہ سلطنت میں ملکہ رودرمادیوی کے ماتحت حکومت کررہے تھے۔ رودرم دیوی نے بھی اپنی ایک بیٹی کی شادی یلاندیوا کو کرنے کی پیشکش کی۔ دیوگیری کے یادووں پر رودرمادیوی کی فتح نے کاکتیہ سلطنت میں سکون بحال نہیں کیا، کیونکہ وہ فوری طور پر کرنول-کڈپاہ علاقوں کے کیستھ خاندان کے سب سے بڑے رکن امبدیوا کی بغاوت کی طرف اپنی توجہ ہٹانے پر مجبور ہوگئی۔ کاستھاگنگا یا سہنی کے زمانے سے ہی کاکتیہ کے ماتحت بن گئے۔ جننیدیواور تری پورای گنپتی دیوااور رودرمادیوی کے کچھ وفادار ماتحت تھے۔ تری پورای کے بعد، اس کے بھائی امبادیو نے کاکتیہ کے اختیار کی خلاف ورزی کی ۔A.D1250۔ کاتریپورانتاکم نوشتہ امبادیو کے جرات مندانہ فوجی کارناموں کے بارے میں معلومات فراہم کرتا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ امبا دیو کو پانڈیوں اور یادووں سے کافی مدد ملی۔ جو کاکتیہ کے روایتی دشمن تھے۔ وہ ملیکیناڈو، ریناڈو، پیڈ کالو، سکالی، اروواور پوٹاپیناڈو کا حاکم بن گیا۔ اس نے ولوری پٹن کو اپنادارالحکومت بنایا۔ پھر اس نے کاکتیہ ملکہ کے اختیار کو چیلنج کیا۔

رودرمادیوی جس نے امبدیو کی سرگرمیوں کا احتیاط سے مشاہدہ کیا، نے کیستھ سردار کے ساتھ ذاتی طور پر طاقت کی آزمائش کرنے کا فیصلہ کیا۔ A.D.1289 تاریخ کے چندوپتلا نوشتہ میں رودرمادیوی اور اس کے جنرل، ملیکارجن نائکا کی قابلیت کے لیے ایک بنٹو یا جنگجو کے ذریعے بھگوان سومناتھ دیو کو زمین کا تحفہ درج کیا گیا ہے، ان دونوں نے شیولوک حاصل کیا تھا، جو ان کی موت کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس طرح یہ واضح ہے کہ رودرمادیوی اور اس کے جنرل نے اپنی فوج کے ساتھ امبادیو کے خلاف جنگ لڑی اور میدان جنگ میں مارے گئے۔ یہ بہت ممکن ہے کہ رودرمادیوی نے اپنی بڑھاپے کے باوجود، امبادیو کے خلاف فوجوں کی قیادت کی اور اپنے جنرل، ملیکارجن نائکا کے ساتھ ایک مہلک انجام کا سامنا کیا۔ اگرچہ واضح نہیں ہے، لیکن تحریر میں امبادیوا کی فخریہ تعریف، 'سروان آندھرا مہیپتن رانامکھے-جٹا-یاسو-لابدھاون' نمایاں طور پر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اس نے ملکہ سمیت آندھرا کے تمام بادشاہوں کو فتح کیا تھا۔ اس طرح رودرمادیوی کا شاندار دور ختم ہوا۔ رودرمادیوی کی شادی چالوکیوں کی نڈاڈوولو شاخ کے انڈ سکھارا کے بیٹے ویر بھدر نامی چالوکیہ شہزادے سے ہوئی تھی۔ ان کی تین بیٹیاں تھیں، یعنی ممدما، رودرماور رویاما۔ سب سے بڑے کی شادی مہادیو نامی کاکتیہ شہزادے سے ہوئی تھی۔ دوسری بیٹی کی شادی یادو شہزادے کویلندیوا کے نام سے اور آخری بیٹی انڈلوری انیا کو پیش کی گئی تھی۔ رودرمادیوی کے بعد اس کے پوتے پرتاپرودردیوا نے اقتدار سنبھالا، جو مہادیوااور ممدما کا بیٹا تھا۔

19.2.6 پرتاپ رودرادیو (A.D. 1289–1323)

پرتاپارودردیوا کو جنوبی ہندوستان کی تاریخ کی سب سے زیادہ رومانوی شخصیات میں سے ایک سمجھا جاتا تھا۔ وہ کاکتیہ خاندان کا آخری عظیم نمائندہ تھا۔ وہ ایک بہادر جنگجو، مضبوط انتظامی، اور فنون لطیفہ اور خطوط کے عظیم سرپرست تھے۔ لیکن اس کا دور حکومت ایک انتہائی اہم اور نازک وقت پر شروع ہوا، کیونکہ ان کی حکومت اس کی دادی رودرمادیوی کی افسوسناک اور اچانک موت کے فوراً بعد شروع ہوا۔ اگرچہ پرتاپارودردیوا کو بہت کم عمر میں ریاست کی رہنمائی کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا، لیکن اس نے خود کو فوج، انتظامیہ اور قلعوں کی تنظیم نو کا کام سونپا۔ پھر اس نے اپنی توجہ کیستھ کے سردار امبادیو کو دبانے کی طرف موڑ دی۔ یہ اچھی طرح جانتے ہوئے کہ امبادیو یادووں اور پانڈیوں کے ساتھ اتحاد میں تھا، پرتاپرودردیوا سے نکلنے کے لیے بہت احتیاط سے آگے بڑھا۔ اس کام میں اس نے امبادیو کے خلاف تین جہتی حملہ کیا۔ پہلی مثال میں، اس نے کولانو سومنتری کے بیٹے منما گنیا اور ان کے کزن انّائی دیوا، جو اندلوری پیڈ گنیا منتری کے بیٹے تھے، کی کمان میں ایک فوج تریپورانتاکم کے علاقے میں بھیجی۔ اگرچہ ہمارے پاس مہم کی تفصیلات نہیں ہیں، لیکن یہ یقینی ہے کہ کاکتیہ افواج اس سہ ماہی میں کامیاب رہیں۔ نیلور کی تیلگو چوڈا سلطنت جو منما گنڈا گوپال کے زیر اقتدار تھی، اس کی دوسری مہم کا ہدف بن گئی۔ آدیدم ملو کی کمان میں کاکتیہ فوج نے منما گنڈا گوپال کو شکست دی اور اسے قتل کر دیا اور اس کی جگہ ایک مخصوص مدھورانتاکا پوٹاپی چوڈا رنگ ناتھ کو کاکتیہ کے ماتحت کے طور پر تیلگو چوڈا سلطنت کے تخت پر بٹھایا گیا۔ تیسری مہم پرتاپرودردیوا نے ان یادووں کے خلاف بھیجی تھی جنہوں نے امبدیوا کے مقصد کی حمایت کی تھی۔ A.D. 1294. کے رائے چور قلعہ کے نوشتہ میں کہا گیا ہے کہ پرتاپرودردیو کے جاگیردار گوناوٹھلا نے رائے چوردوآب میں ادوانی، تمبلم، منوواور حلووا کے قلعوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس آثار قدیمہ کے ثبوت سے یہ واضح ہے کہ کاکتیہ نے کرشنا-تنگ بھدردوآب کے علاقے کو دیوگیری کے یادووں سے چھین لیا ہوگا۔ پرتاپارودردیوا، اگرچہ کیستھ امبدیوا اور اس کے اتحادیوں کو شکست دینے میں کامیاب ہو گیا، لیکن زیادہ دیر تک امن سے لطف اندوز نہیں ہو سکا۔ انہیں فوری طور پر دہلی کے سلطانوں کی طرف سے سب سے زیادہ طاقتور بیرونی خطرے کا سامنا کرنے پر مجبور کیا گیا، اور اس کے نتیجے میں انہوں نے اپنی باقی زندگی مسلمانوں کے خلاف لڑتے ہوئے گزاری۔

تلنگانہ پر پہلا مسلم حملہ A.D.1303 میں علاؤالدین خلجی کی قیادت میں ہوا۔ اس کے نتیجے میں ان کو ناکامی ہوئی۔ لیکن علاؤالدین خلجی نے بدلہ لینے اور اپنے گرے ہوئے وقار کو بحال کرنے کے لیے ملک نائب کافور کی کمان میں ایک بڑی فوج بھیجی۔ اس مقابلے میں مسلمانوں نے کاکتیہوں پر فیصلہ کن فتح حاصل کی۔ پرتاپرودردیو نے علاؤالدین خلجی کے نائب کے ساتھ صلح کر لی اور اپنی زیادہ تر دولت اور وقار کو ہتھیار ڈال دیا۔ علاؤالدین کی موت کے بعد دہلی سلطنت میں افراتفری کے حالات پیدا ہو گئے۔ ملک نائب کافور نے علاؤالدین کے چھوٹے بیٹے شہاب الدین کو دہلی کے تخت پر بٹھایا اور اس کی طرف سے ایک ریجنٹ کے طور پر سلطنت پر حکومت کرنا شروع کر دی۔ لیکن ملک نائب کافور زیادہ دیر تک اس حیثیت سے لطف اندوز نہیں ہوئے، اور بالآخر انہیں علاؤالدین کے ایک اور بیٹے قطب الدین مبارک شاہ نے قتل کر دیا۔ ان شرائط کو مد نظر رکھتے ہوئے پرتاپارودردیو نے کاکتیہ سلطنت میں اپنی آزادی کا دعوی کیا اور دہلی کے اختیار کی خلاف ورزی کی۔ اس مرحلے کے دوران خسرو خان کی کمان میں کاکتیہ سلطنت کے خلاف ایک اور مہم بھیجی گئی۔ پرتاپرودردیوا نے بغیر کسی مزاحمت کے صلح کا خاتمہ

کیااور آخر کار ہاتھیوں، گھوڑوں، سونے اور قیمتی پتھروں کی شکل میں سالانہ خراج ادا کیا۔

قطب الدین مبارک شاہ کی موت سے دہلی سلطنت پر خلجی کے تسلط کا عملی طور پر خاتمہ ہو گیا۔ تغلقوں نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ منتقلی کی مدت کے دوران پرتاپ ودر نے اپنی آزادی پر زور دیا اور سالانہ خراج ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ غیاس الدین تغلق نے دہلی میں اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے بعد، A.D 1323 میں الغ خان کی کمان میں ورنگل کے خلاف ایک مہم بھیجی۔ یہ مہم ناکام رہی۔ لیکن غیاس الدین نے، مضبوط عزم اور عزم کا حامل ہونے کے ناطے، کوئی وقت ضائع کیے بغیر ورنگل کے خلاف ایک اور مہم بھیجی۔ پرتاپ ودر دیو نے اپنی رعایا، عوام اور سلطنت کی آزادی، سالمیت اور عزت کو برقرار رکھنے کے ارادے سے مسلم افواج کے خلاف شیر کی طرح جنگ کی، لیکن یہ حکمت بے سود ہوئی۔ وہ فاتح مسلمانوں کے ہاتھوں میں قید ہو گیا جنہوں نے فوری طور پر اسے اپنے خاندان کے ساتھ دہلی بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ یہ پرولیا نائکا کے ولاس گرانٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ پرتاپ ودر دیو انے دریائے سومود بھاو، یعنی نرمدا ندی کے کنارے اپنی جان گنوا دی۔ کاکتیہوں کے دارالحکومت ورنگل پر مسلمانوں کا قبضہ تھا اور اس کا نام بدل کر سلطان پور رکھ دیا گیا۔ کاکتیہ سلطنت دہلی سلطنت کا حصہ بن گئی۔ اس طرح کاکتیہوں کی شان و شوکت اسلام کے میں غیر معمولی طور پر ڈوب گئی۔

19.3 فن اور فن تعمیر (Art and Architecture)

کاکتیوں نے فن تعمیر کے شعبے میں پہلوانہ کردار ادا کیا۔ کاکتیوں نے اپنی فن تعمیر کو چالوکیاوں سے حاصل کیا لیکن اس میں مقامی خصوصیت شامل کی۔ چالوکیا فن تعمیر خود اتر اور دکن بھارتی فنون کی ملاپ تھی۔ کاکتیوں نے اسے سادہ بنا دیا اور اسے زیادہ زبردست اور خوشنما بنایا۔ ان کے طویل حکومت کے دوران، کاکتیہ بادشاہ اور نواب نے کئیشاندار مندر بنائے۔ کاکتیہ مندر مختلف قسم کی زمینوں پر بنائے گئے، ان میں مٹی کی قسم کی زمینیں شامل ہیں۔ ان مندروں کی تعمیر میں عام طریقہ اختیار کیا گیا کہ مندر کے منصوبے کے مطابق ایک بڑا خندق کھودا جائے، جس پر پتھر کے تکیے رکھے جائیں۔ پھر اس بستی پر چاروں کناروں کے گرد دو دائرہ دار دیواریں بنائی جائیں اور دیواروں کے درمیان خالی جگہ رکھی جائے یا کبھی کبھار مٹیا مٹی ڈھیر بھری جائے۔ مندر کے گرد ایک پلیٹ فراہم کی گئی جو مندر کو سہارا دیتا ہے اور کنارے میں دیواروں کو مٹی کو محدود رکھنے کی اجازت دیتا ہے۔ اس تکنیک کو "مٹی کا کشن" کہا گیا۔ تاہم، چھت، روف پینلز اور روف بیمز سے آنے والے سپر اسٹرکچر لوڈ کو عمودی ستونوں پر منتقل کیا گیا، جو بعد میں یہ لوڈس بیسمنٹ مٹی بھر کے ساتھ پوری طرح منتقل کرتے ہیں۔ اس طرح، بھاری ستون بھی مٹی بھر یا قدرتی بنیادی مٹی میں گہرے تک پہنچنے والے انفرادی بنیادوں نہیں رکھتے تھے۔ مندر کی دیواریں عموماً بڑے پتھروں سے بنائی گئیں، جن میں دو پرتھوں کی دو فریموں کی عاملیں شامل ہیں۔ ان کی دار میانی جگہ خالی رکھی گئی ہے۔ اس سے مقامی طور پر ہوا کی تنظیم ہوتی ہے۔ اوپر کی چھت بھی ایک مشابہ خصوصیت رکھتی ہے۔ یہ بھاری ساخت کے بوجھ کو کم کرنے کے لیے کیا گیا ہے، بنیادی بیس پر دباؤ کم کرنے کے لیے۔ سکھرا بھاری پتھر کی بنائی گئی ہے تاکہ گربھ گرہ کی سپر سٹرکچر پر بوجھ کم ہو۔ یہ پتھریں کاکاتیوں کے تعمیر کاروں کی انجینئرنگ مہارتوں کا واقعی اظہار ہیں۔

دو قسم کے مندر ہوتے ہیں، ایک ہنگامی مندر اور دوسرا تین ہنگامی مندر، عام طور پر ٹریکوٹہ کہلاتا ہے۔ ہنگامی مندر میں پانچ اقساط ہوتی ہیں۔ پہلی قسم میں گربھ گرہ، انترالا اور منتاپا ہوتی ہیں جس کے تین دیواروں پر تین سمتوں پر بالائیں کے تین پوچھے جاتے ہیں۔ دوسری قسم میں گربھ گرہ، انترالا اور منتاپا ایک ہنگامے کے ساتھ ہوتی ہیں۔ تیسری قسم میں صرف گربھ گرہ اور انترالا ہوتی ہے۔ چوتھی قسم میں گربھ گرہ ایک کھلے منتاپہ کے پیچھے ہوتی ہے اور آخری قسم میں صرف گربھ گرہ ہوتی ہے۔ کاکتیہ مندروں میں پالمپیٹ، ہنامکونڈا، پلامری، اور نگلپد واور دیگر جگہوں پر جیسے مچیرلا، گورزالا وغیرہ میں سنگیتی سرزمینیں بھری ہوئی ہیں، چھت اور کھمبے شاندار طرح سے کاروباری ہوتے ہیں، چھت اور دیواروں کی بہترین کھودائی ہوتی ہے۔ کمرانی اور کھمبے الا بتاجیمشاہدہ کرتے ہیں، سیاق وسباق اور کھمبے کو عمدہ طور پر نقش بندی کی گئی ہے۔ دھڑ کی بیرونی جھیل میں اصطکا کی بینڈوں سے آراستہ ہے جس میں خدا، خداوند، رقصاں، موسیقار، ہاتھی اور پودے کے ڈیزائن شامل ہیں۔ کلون کی بندوقوں کے بیرونی روبرو میں ایک خوبصورت کالے پتھر کیچھبی ہے۔ کھمبوں میں مختلف کام کی بہترین بنیاد ہے۔ ان کے پلاک مختلف اشکال کی زیادہ سے زیادہ تنوع کا مظاہرہ کرتے ہیں، جسے جرات مندی سے چھوٹا یا انجام دیا گیا ہے۔ سب سے نمایاں خصوصیت کے بریکٹ شکلی ہوتی ہے۔ عام طور پر وہ خواتین کے رقص کرنے کے مختلف مواقف میں چھایا گیا ہے۔ شمالی دیواریوں کے کھمبے میں ایک جوڑی خواتین کے رقص کرنے والوں کی چھائیں بنائی گئی ہیں۔ بنیادی سنگیت کی اشیاء میں رقصرات اور کولٹہ سیاق وسباق کی قسمیں شامل ہیں۔ کچھ احکامی موسیقی کے ماہرین کے مطابق، یہ نمونے رقص کی اصلی شیوائیات کو ظاہر کرتے ہیں۔ مندر کے نقشات میں ایک رقاصہ فیگر کی مثالیں شامل ہیں۔ ان کے پریفورم ہاتھوں میں نقصان کی وجہ سے آگے جھکی ہوئیں، اور کمر میں ایک مختصر منحنی ہے۔ چپٹے دھاری کی صورت میں سر کے پاس میں بیدھت کا اشارہ کیا گیا ہے، اور کمر میں ایک اودہتی صورت میں پوزشن کی وجہ سے ایک بائیں ٹانگ کی موجودگی ہے اور دائیں ٹانگ مضبوط طرح زمین پر ہے۔ چیچ بند درمیان کا پر کھا گیا ہے جو مختلف تصویریں میں رقص کرتے وقت مکمل پوزیشن کو ظاہر کرتی ہیں۔

19.4 مذہب (Religion)

تمام کاکتیہ حکمرانوں میں گنپتی دیوا مذہب کا بڑا اسپورٹر تھا۔ انہوں نے براہمنوں کو اگرہارا گاؤں دینے کا فیصلہ کیا اور اپنے براہمنوں کی حمایت کو تانبے کے پلیٹوں پر ریکارڈ کیا۔ کاکاتیوں کے حکومت کے دوران، مذہبی ترقی کے بہت سے مواقع دیکھے گئے، جو جینسم کی کمی اور شیوا سیکٹس کی فروغ اور ویشنوویت کے پھیلاؤ کی وین تھا۔ کچھ عرصہ کی ترقی کا مختصر تجزیہ درج زیر ہے۔

19.4.1 بدھ مت

چھٹی صدی قبل از مسیح میں گنجنہ سیما میں بدھ مت اور جینیزم کی شروعات اور ان کی شاندار کامیابی بہت اہم ہے۔ کرمنگ ڈسٹرکٹ کے پیڈپالی کے قریب دھولیکٹا پر اثرات نمایاں ہیں کہ لوگ اس نئی مذہبی عقیدت کو خوش آمدید کرتے تھے۔ حال ہی میں اس جگہ پر ایک سنگیتی کلپ میں، جیسے کہ انفرادی ثبوت بتاتے ہیں، دوسری صدی قبل از مسیح کی دور کی ماسوائی دھولیکٹا ایک دوسرے کی ڈوم پر مبنی ہے۔ بدھے کا شروع ہوا، جو پوری طرح سے دوم کی چھڑائی پر بنایا گیا ہے۔ ہارمیکا اور چھتراولی کی طرف بھی کریبنگ ممبران کے باقاعدہ اعضا چھپے

ہوئے تھے، جن کیکچھ باقیات کھدائی میں ملیں ہیں۔ مجسماتی نقشوں پر پانچ فوٹی مچھلندا ناگا، بودھی درخت، مہابینسکر میناو غیرہ شامل ہیں،اور کچھ ریلیفس دوسری صدی قبل از مسیح کی لیبل انسکرپشن کی ہیں۔ بدھ مت کا اب مذہب کے عینی وجود کا وقت کے ساتھ ختم ہو گیا تھا۔ مشہور بودھمت کے ارمابھارتی مذہبی مقامات بن گئے تھے، جو بڑی شہرت حاصل کر گئے تھے۔ان مقامات میں گایا کی بڑھتی ہوئی پیدائش کا بڑھتا ہوا اثرات ہے۔چند چارہ گراں مہانت پر ہندوستانی مذہب کے تمام مکاتیب کی خصوصیت ملتی ہے۔

19.4.2 جین مت

ابتدائی کاکتیوں نے جینوں کی سرپرستی کی۔ بیٹ اول کا سنیگارم نوشتہ جو کہ 1051 عیسوی میں جیانابسادی کو تحفہ درج کرتا ہے جسے یودھاملا جنالایا کہا جاتا ہے۔ میڈراجااول کا بناجی پیٹ کا نوشتہ کاکتیہ بیٹادوم کی طرف سے جین بسادی کو ایک تحفہ درج ہے۔ پرولاII کے پدمکشی مندر کا نوشتہ 1117 عیسوی میں کدلالایابسادی کی تعمیراوراس کے وزیر کی بیوی میلمااوراس کے شوہر میڈاراجاII کے ذریعہ اوقاف کوریکارڈ کیا گیا ہے۔ کدلایاپدمکشی کا کتبہ نام معلوم ہوتا ہے۔ہنوماکونڈا کے قریب پہاڑی پر دیوی پدمکشی کسی شک سے بالاتر ہے کہ یہ ایک جین دیوتا ہے حالانکہ اس وقت اس کی پوجا سیوامادر دیوی کے طور پر کی جاتی ہے۔ جین تیرتھکارس کی تصویروں کے درمیان واقع اس دیوی کی شبیہ کو بعد کے کاکتیوں کے سیواجھکاؤ کے مطابق سیوادیوی نہیں مانا جاسکتا۔ مذکورہ جین کاافسانہ بذات خود ایک سیوامیں دوبارہ تخلیق کیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دیوی اصل میں پدماوتی ہو، یاکسسووری یاپارسوناتھ کی ساساناديوی، تئیسویں تیرتھکارہ۔اپپاریانامی ایک جین شاعراپنے جنیندر کلیان ابیودامیں بیان کرتا ہے کہ اس نے کاکتیہ کمارروودر دیوایعنی پرتاپردرا کے دور میں اپناکام مکمل کیا۔ یہ اس بات کا بھی اشارہ ہے کہ کاکتیہ دور کے اختتام تک تلنگانہ میں جین مت کی ترقی ہوئی۔ ان دنوں کے کچھ جین مراکز بیزواڑا، بکاولو، گوڈیواڈا، دھرماورم، بھوگاپورم، پینوگونڈہ، رامتیرتھم (ویزاگ)، ہنمکونڈہ، دانوولپاڈ (کڈپاہ) دھرمااورم (اونگول) وغیرہ تھے۔بیزواڑاایک اہم جین مرکز تھا۔اس جگہ پر سرولوکسریامو، کٹاکبھارانہ جنالاموو غیرہ اچھی حالت میں تھے۔

19.4.3 سیوازم

چلوکیوں کے بعد آنے والے کاکتیہ کم از کم پرولراج دوم کے والد تریبھونامالایتاراج کے زمانے سے ہی شیوا کے عقیدت مند تھے۔ ودیاناتھ کے پرتاپرودرا یاسوبھوشنم کے مطابق، خاندان کو کاکتیہ نام اس لیے ملا کیونکہ وہ کاکاتی کے نام پر دیوی دوا کی پوجا کرتے تھے۔ ورنگل میں دیوی کاکتی کے لیے ایک مندر تھا۔ بہت سے ساؤیت فرقے کاکتیوں کی سرپرستی میں پروان چڑھے۔ بیٹااوراس کے دوبیٹے درگااور پرولادوم رامیشوراپندیتا کے شاگرد معلوم ہوتے ہیں، جوایک عظیم کالمکھ استاد ہیں۔ گنپتی دیوا کے زمانے میں "گولکی مٹھ" نے تلنگانہ میں کئی مقامات پر اپنی شاخیں قائم کیں اوراس کے پوپ وشویشوراشیوادیوا گنپتی کے دیکسا گرو بن گئے۔ایسے خوشگوار ماحول میں ویراسائیوا تحریک نے زمین میں کافی ترقی کی ہے۔ادب اور نوشتہ جات سے، ہم یہ سیکھتے ہیں کہ شیوا کی اس کی خوفناک شکلوں- بھیرواور میلارا- کی پوجا کاکتیہ دور میں بھی مقبول تھی۔ایسا لگتا ہے کہ عبادت کی اس شکل نے لوگوں کو پرجوش عقیدت اور بے باک بہادری کی ترغیب دی ہے۔ سال 1261 عیسوی

میں ملکاپورم کا نوشتہ، چار اہم سیوا اسکولوں کا ذکر کرتا ہے جو تیلگو کے علاقے، پاسوپتا، کلانانہ، سیوا سانا اور سیوا میں پروان چڑھے تھے۔ ان تیلگو کے علاوہ، ادب سدھا اور ویرا سائیوا اسکولوں کا تعارف کراتا ہے۔ 1290 عیسوی کے تریپورانتکم کے نوشتہ جات میں سے ایک میں ویروراتا، مہیشور، سیوا، پاسوپتا، مہاورات، کالمکھ، یاملا اور بھیروا کا ذکر ہے جو ظاہر ہے کہ سیویوں میں مختلف فرقے تھے۔ ویراورات اور مہاورات بالترتیب ویرا سیوا اس اور کپا لیکا کے ساتھ ایک جیسے ہو سکتے ہیں۔ تاہم، یا میلوں کی شناخت فی الحال ممکن نہیں ہے۔ تاہم، زیادہ تر مجموعوں کے درمیان فرق جیسا کہ میسور اس پاسوپاتاس، سیوا س اور کالمکھاس برائے نام دکھائی دیتے ہیں۔

19.4.4 وشنوازم

اس خطہ میں سری رامانوجاچاریہ کے پرچار سے بہت پہلے وشنوزم تلنگانہ میں داخل ہوا۔ دوسری صدی قبل مسیح میں دیوی ناگنیکا کا نہاگھٹ نوشتہ ناگنیکا کی دعا کے ساتھ کھلتا ہے۔ دوسری صدی قبل مسیح دوسرے ویدک دیوتاؤں کے علاوہ سنکرسن واسودیو کی دعا کے ساتھ کھلتا ہے۔ یہ شاید اس خطے میں وشنو مت کا قدیم ترین ثبوت ہے۔ سری وشنوا فرقہ جو ناتھمونی نے شروع کیا تھا، رامونوجاچاریہ کے تروپتی کے دوروں سے بہت پہلے تیلگو خطے میں پھیل گیا۔ 1023 عیسوی کے ایک نوشتہ سے پتہ چلتا ہے کہ باپٹلا میں بھونارائن کا مندر سری وشنواؤں کے قبضے میں تھا۔ ساحلی علاقے میں بھٹار اور کنڈادری خاندان، جو جنوب سے ہجرت کر کے آئے تھے، آباد ہوئے اور سری وشنوزم کا پرچار کیا۔ نیلور سری وشنوزم کا مرکز بن گیا اور اسے تیلگو چوڑوں کی سرپرستی حاصل رہی۔ پالناڈو کے علاقے میں، برہمنایڈو، ہری ہرا بادشاہوں کے وزیر اعظم سری وشنوزم کے سخت پرچارک بن گئے۔ انہوں نے تمام ذاتوں کی مساوات کا پرچار کرتے ہوئے معاشرے میں اصلاح کی تحریک شروع کی۔ اس نے پنچموں کے لیے بھی دروازے کھول دیے تاکہ ان کو وشنو مت میں تبدیل کرنے کے بعد مچھرلا کے چننکیسوا مندر میں داخل ہوں۔

اگرچہ تلنگانہ کا خطہ ساؤیوں کا گڑھ تھا، لیکن ہم اس خطے میں وشنو مت کے دخول کو دیکھ سکتے ہیں۔ لِنگا گیری، برو گو گڈا اور مکتلا میں پائے جانے والے نوشتہ جات کچھ وشنوائی اثر اور لِنگا گیری میں وشنوائی مٹھ کے وجود کی نشاندہی کرتے ہیں۔ Kridabhiramam سے مراد سریکاکولم کے مہاوشنو مندر میں تہواروں کا جشن ہے جہاں سڑکوں پر ڈرامے بنائے جاتے تھے۔ کاکتیہ بادشاہوں نے وشنو کی مورتی تریکوٹہ مندروں میں نصب کی تھی۔ انہوں نے چننا کیسوا کے مندروں کو گرانٹ دی۔ جگتیالا کے علاقے میں، دھرم پوری، بیرپور، ویلولہ، نالہ گونڈہ، نامپلی اور نرسمہلو پلے کے مندر وشنویم کے اہم مراکز ہیں جہاں نرسمہا کی شکل میں وشنو کی پوجا کی جاتی ہے۔ تلنگانہ کے علاقے میں ویلاما سرداروں نے پرتاپردرا کے زمانے میں وشنو مت کی سرپرستی کی۔ سیومت کے پیروکار ہونے کے باوجود کاکتیوں اور ان کے عہدیداروں نے وشنو مندر کی بہت سی گرانٹ دے کر سرپرستی کی۔ مثال کے طور پر، پیڈانڈ پیڈو کیفیات، کاکتیہ کے وزیر گوپاراجو رمنا نے پیدانندی پاڈو گاؤں، ونوکونڈہ پراگنا میں مدنا گوپالاسوامی کے ایک وشنو مندر کا تقدس بخشا اور دائمی روشنی کے لیے ایک میدان عطا کیا۔ ریتورو گاؤں سے ایک اور کیفیات (13 ویں عیسوی)، ونوکونڈہ پراگنا میں بتایا گیا ہے کہ ناگارجو کے ایک مخصوص لکشمی پتی بیٹے نے لکشمی نرسمہا سوامی کی تصویر کو مقدس کیا اور تہواروں اور دائمی روشنی کے لیے کچھ پتیکا زمین عطا کی۔

19.5 ادب کا ارتقا (Growth of Literature)

1100ء–1350ء کے درمیان تلگو علاقہ بڑی ادبی فعالیت کا دور تھا۔ کاویاس، پربھندز اور دیگر قسم کی ادبی کتابیں تصنیف کی گئیں۔ بادشاہ، بادشاہیں، نواب، فوجی حکمران اور دیگر بڑے اشخاص شاعری کو اہمیت دیتے رہے۔ کاویا ادب سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ صرف بادشاہوں نے ادبی افراد کو حمایت دی لیکن شاہی لکھاؤ کی مدد سے، واضح ہوتا ہے کہ بادشاہیں اور دیگر اہم شخصیات بھی شاعروں کی حمایت کرتے تھے۔ ایسی کئی سنسکرت کتابوں اور بہت سی انکرپشنز کی بہترین مثالیں اس دور کی ادبی فعالیت کی تصدیق کرتی ہیں۔ انکرپشنز کی لکھی گئی معلومات بتاتی ہیں کہ کاکاتیوں کی ادب کی حمایت ہوئی۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ ابتدائی طور پر تلگو زبان ایفیشل زبان نہیں تھی اور وہ ابھی بھی سنسکرت پر انحصار کرتے تھے۔ بہت کم تلگو کی کتابیں انکرپشنز کی طرف سے حمایت کی گئی تھیں۔ کاکاتیوں کے راج محکمہ سے کوئی کام نہیں رپورٹ کیا گیا جو تلگو کا تھا۔ کاکتیہ کورٹ میں دو سو تلگو شاعروں کی موجودگی کا حوالہ ہے، جن کے انتہائی اہم حصول اور دیگر تفصیلات معلوم نہیں ہیں۔ کئی ذیلی حکومتی خاندانوں، فیوڈل افسران اور فوجی جنرلز نے اپنی سطح پر تلنگو ادب کو فروغ دینے کی کوشش کی، لیکن ہمیں مرکزی خاندان کی حمایت ہیں پیدا ہونے والی تلگو کی کتابوں کا مکمل علم نہیں ہے۔ اس دوران جاری ریکارڈز کی تعداد اور اس دوران پیش کی گئی ادب، ہمیں سنسکرت اور تلگو ادب کی حیثیت کا تخمین لگانے کی اجازت دیتی ہیں۔

19.5.1 سنسکرت ادب

سنسکرت کی دوسرے الفاظ میں کاکاتیا دور کی ادبی فعالیت میں سب سے پہلی جگہ ہے۔ کاکاتیوں اور ان کے ذیلی حکمرانوں کے کئی ریکارڈز سنسکرت کی افضل حیثیت کی تصدیق کرتے ہیں۔ اس دور میں اچھی صلاحیت کا اظہار کیا گیا اور مختلف سنسکرت ریکارڈز میں چھوٹے کاویوں، سخت کور اندراجی کو مپوزیشنز اور غیر معمولی بندھوں کو فریم کرنے میں عظیم مواہبت دی گئی۔ اچنتیندرا، نرسنگھ، نگادیو، ہرہریا، گنگادھر، میور سوری، ایشورا بھٹو پادھیا، دیوانبھٹا، نادیمتر، بالا بھارتی اور کویچکرورتی اس دور کے اہم انکرپشنل شاعر تھے۔ ادب کی بات کرتے ہوئے، پرتاپارودریامیا پر تپارودریا سوبھوشنم وڈیانا تھا کی رھنمائی میں لکھی گئی ایک مشہور کتاب ہے۔ اس کے علاوہ اس دوران کئی دیگر کتب بھی معروف ہیں۔ سکالیاملہ، جو پرتاپارودریا کے دار بار میں بھی تھے، نے اداتاراہو کو یا اور نیرو شتیارا ماینا لکھیں۔ گندی بھٹو نے ایک ایڈوائٹا کی کتاب کھنڈن-کھنڈ-خدیا پر شرح لکھی۔ وڈیادھر نے ایکاولی لکھی۔

کاکتیوں کے ادبی حامیوں کے علاوہ، فوجی جینرلز، صاحبان وراجے بھی سنسکرت ادب کی فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ جیپ، جنرل اور گنپتی دیوا کے بھائی، نرتر تناولی میں نٹیا، ابھینیا، کرن، انگاہرا وغیرہ پر بات ہوئی۔ انہوں نے موسیقی اور موسیقی کے سازوں پر بھی کتابیں لکھیں۔ بادشاہ پرتاپارودرا خود بھی ایک عالم اور شاعر تھے اور ان کا معلوماتی کتاب، یایاتی چرتر اور اوشا گودیہرا لکھی گئیں۔ کولانی رودرا نے اپنی مخدوم کتاب، سلوکاوارٹی-کویاخوا لکھی۔ روپاتی تریپور ننکا نے ایک وڈھی، پریمبھرمام، لکھی۔

19.5.2 تلگو ادب

تلگو کے مقام کے بارے میں مختلف انکرپشنز تصنیف کی گئیں تھیں تاکہ ان کے شاعروں کی معلومات اوران کی شاعری کی تحصیل کی تصدیق ہوسکے۔ ردردیوہ اور کیتنیاکا، گناپتیدیو کے جنرل، کی زمانے کی بہترین مثالیں ہیں۔ تلگوزبان کے پرانے اور نیاطریقوں کی کئی باتوں کی تصدیق ہوتی ہے۔ ایک گاؤں کی بات ہے کہ "تلگو کو زبان، ثقافت اور ادب کی بہترین مثال کا انقلابی عمل" ملے ہے۔ اس علاقے کی مرکزی حیثیت ڈیکن کی طرف سے اس کی مدد کرتی ہے۔ ٹکانا کی 'نریوچن اٹرارامایانا' اور 'آندھر مہابھارت'، جنہوں نے کاکاتیا کورٹ کا دورہ کیا، اس دور کی تلگو ادب کو تخمینہ لگانے میں پہلے ذکر کے لائق ہیں۔ کمار ردرا، مرایا صاحنی کا بیٹا، جو بادشاہ پرتاپارودرا کے جنرل کا ایک حصہ تھا، بھاسکار رامایان کے ایوڈیہ کانڈا کا مصنف قرار دیا جاتا ہے۔ گونابدراجا، جو کاکاتیوں کی بیٹی کے ذیلی خاندان کا تھا، نے رانگناتھ رامایان لکھا، جو ویراسیوا شاعروں کے ڈوپاڈہ شیل میں تھا۔ کمرا سمبھو وبجنا نشوریام اور داسکمراچرتر تلگو میں کئی کاویوں میں سے پہلی کوششوں کے طور پر ادبی ہیں۔ مارانا اپنے 'مارکنڈیاپرانم' کو بھوت پرتاپارودرا کے ایک جنرل، گنیا، کے نام پر وقف کرتے ہیں، جو مسلمان فتح کے بعد اپنا مذہب تبدیل کرتے ہیں۔ مدیکی سنگانا نے اپنی 'سکالانیتی ساتم' میں حکومت کی گئی سیاست کے بارے میں کئی شاعری کا حصہ شامل کیا۔ اگرچہ مکمل متن دستیاب نہیں ہے، لیکن اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں کئی سیاست کی کتابیں لکھی گئیں۔ نیتیسار، کمنڈکا، پورشار تھسارا، نیتیشاستر مکتاوالی اور سوتساتکا ان معروف کتابوں کی مثالیں ہیں۔ کاکاتیوں کی ریکارڈز میں ذکر ہوتا ہے کہ پرتاپارودرا نے نیتیسار لکھا اور پورشار تھسارا سیوادیوے، پرتاپارودرا کے وزیر نے، لکھی۔ سیوادیوے کے علاوہ انہوں نے 'پراپراوساین' اور سٹاکا کے ساتھ سیوادیوے لکھیں۔ بعد کے لکھنے والوں نے سرابھرجاکوی نے سیوادیوے کی تعریف کیا جو سنکر تنتھر کو یاپتھامہ کہلایا۔

19.5.3 رقص

قبائلی لوگوں، عوام اور افراد کی درجہ بندی میں رقص کی ھنر کو بہترین طریقے سے مزید اہمیت دینے کی ضرورت پیش آئی، جس نے مارگا (بڑے روایاتی) اور دیسی (خفیف روایاتی) دونوں میں رقص کے فن کی تصویر کو شروع کیا۔ کاکاتیا میناروں کی دیواروں پر رقص کرنے والے سنگتوں اور نٹاراجا، رقص کے بادشاہ، کی تصاویر اس کے اہمیت کو ظاہر کرتی ہیں۔ معاصر ادبی اثاثے جیسے 'پنڈیتراڈھیاچارتر' اور 'بسویا پورانم' میں موجود مختلف رقص انداز کی وضاحت کی گئی ہے۔ رقص کے فن کی دو شاخیں، مارگا اور دیسی، جمع کرتے ہوئے خفیف اور قبائلی رقص کو کلاسیکی رقصوں کے مترادف بنایا۔ کلاسیکی رقص کو مردانہ تانداوا اور عورتوں کا لسیہ کو دھیان میں رکھتے ہوئے ترقی دی گئی۔ ٹکانا تلگو مہابھارت میں کئی رقص اندازوں کا ذکر کرتے ہیں جیسے ڈنڈالاساکا، کنڈالی، پریمکھانا اور پرینی۔ اس دوران، دیسی رقص کا انداز بہت مقبول تھا۔ جے پاسینانی نے اپنی 'نرتتر تنوالی' میں دیسی رقص کے انداز کی وضاحت کی ہے جیسے پوشپامجلی، گودھلی پیرنی، پریمکھانا، کارکاری، رساکم، سیواپریا چنتو، کنڈکا، بھنڈریکا، غنٹیسانی، چارو، بہوروپا اور کولاٹا۔ گونڈلی کو کنالیسر تیا کی ایک قسم کہا جاتا تھا۔ یہ ناٹیا دونوں مارگا اور دیسی انداز میں کھیلا جاتا تھا۔ جوان عورتیں اور لڑکیاں اسے ہیلے یا چھریوں میں خود کو رکھ کر کھیلتی تھیں۔ 'نرتتر نوالی' کہتی ہے کہ مغربی چالوکیا بادشاہ، بھلوکا ملا سومیسوارا، اس قسم کے رقص کا ابتدائی موجد تھا۔ چنڈوساویت گروپ رقص ہے جس میں رقاصین دو صفوں میں تقسیم ہوتے ہیں، ہر ایک دوسرے کے مخالف یا گردش کرتے ہیں جبکہ مردانی رقاصین نسوانی رقاصین کی جگہوں کی باریوں میں الٹی روٹیں ہوتی ہیں۔ کولاٹا بسویا

پورانم میں ذکر ملتا ہے۔ اسے مردان اور عورتوں دونوں نے ہاتھ کی چھڑیوں کے ساتھ کھیلا۔ زیادہ تر یہ رقص پروسیشنل دیوتاؤں کے سامنے کھیلا جاتا تھا، کاکتیا میناروں کی دیواروں پر مثالی تصاویر عموماً اس رقص کے فارم کو ظاہر کرتی ہیں۔ کنڈو کرداد وسری قسم کا رقص تھا جس کو بالوں کے ساتھ کھیلا جاتا تھا۔ 'کردا بھرنم' میں جوان لڑکیوں کے بالوں کے ساتھ کھیلنے کا خوبصورت بیان دیا گیا ہے۔ پلنٹیو یر چاریترا میں، اس کھیل کا حوالہ ہے۔ پالا پیٹ کی ایک مدانیکا نے کنڈو کا بھینیا (رقص کا اشارہ) ادا کیا۔ اُس کا دایاں ہاتھ اُس کے سر کے اوپر بلند کیا گیا اور ایک بال (کنڈو کا) پکڑا۔ 'نرتتر نوالی' کے مطابق، یہ بالوں کو سونے، چاندی، پیتلیا لکڑی سے بنائے گئے تھے، جن میں چھوٹے لوہے کے بال بھری ہوتی تھیں جو جھنکارنے کی آواز پیدا کرتے تھے۔

'کردا بھیرامم' دوسری قسم کے رقص کا حوالہ دیتا ہے جس میں ایک نوجوان رقص گرل پیچھے سے قدم رکھتے ہوئے، ایک ناک کے زیور کو پانی کے گھونگھری کے نیچے رکھتی ہے، اپنی ناک کو اس کے ساتھ زیور دینے کے لئے، اور اپنی زبان سے جلدی جلدی چھوٹے سیاہ شیشے کو گردن میں تھراتیہے، جبکہ رقص کے عمل کو منظم کرتے ہوئے۔ پالا پیٹ، غنپور اور بیجا مکی کی مندروں میں موجود مجسمہ جات انتہائی خوبصورتی سے رقص کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ کاکتیا دوران رقص کی فن کی بلندی کی سطح کی تصدیق کرتے ہیں۔ یہ رقصی مجسمات کو عموماً تین اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، یعنی۔ 1. رقصیں، 2. رقص کے موقع پر خدائی اور خدائیاتی اور 3. دیسی رقص کی متنوع اشکال میں مختلف شخصیات۔ پالا پیٹ مندر میں رقص کی شخصیات میں، دروازے کی دھجی کے ساتھ دیگر رقص گرل کے ساتھ ناگنی کے خوبصورت شکلیں موجود ہیں۔ ناگنی کو دائیں ہاتھ میں ایک سانپ پکڑتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ بائیں پاؤں زمین پر مضبوط ہے، کمر کو دائیں طرف شگاف دی گئی ہے اور دونوں ہاتھ سر کے اوپر بلند کیے گئے ہیں۔ اگرچہ یہ مارگار قص کے کسی کارنے کی تصویر نہیں ہے، لیکن یہ ایک خوبصورت مقام کی چند خواتین رقاص کی خوبصورت پوزیشن کو ظاہر کرتی ہے۔ مرکزی شخصیت اور دائیں والی پہلی شخصیت معمول کی طرح بہترین لباس پہنا ہوا ہے؛ بائیں کو لہاُن خواتینی پروسیشنل اُپریٹر کرنے کے لیے بلند کیا گیا ہے۔ دایاں ہاتھ سر کے اوپر بلند کیا گیا ہے، جبکہ بائیں کو ہنی کی جھکائی گئی ہے۔ غنپور مندر کی ایک رقص گرل کی شخصیت، جس کی پہلوانیاں نقصان دار ہوئی ہیں، سر کے ساتھ ایک طرح کا وضاحت کرتی ہے، اور کمر میں اُدواحت کی اصطلاحات؛ بائیں ٹانگ کو مچھلی کی طرح باہر کھینچا جاتا ہے جبکہ دایاں ٹانگ مضبوط طرح زمین پر رکھی جاتی ہے۔ پالا پیٹ مندر کے Sanctum Sanctorum کے سامنے کا چھل نمایاں رقص کی پوری پوزیشن کو مختلف تصاویر میں چھ صفوں میں پیش کرتا ہے۔ رقص گرل کو چھاکوں سے دیکھا جاتا ہے جبکہ مردانی اور عورتوں کو بھی تھپڑوں کے ساتھ رقص کرتے دکھایا گیا ہے۔ مدرس کو دیکھا جاتا ہے کہ ایک مدل سے دوسری میں مدرس کو دیکھا جاتا ہے، جو رقص کی پوزیشن کو مکمل شکل میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

19.6 معاشی حالات (Economic Conditions)

کاکتیہ دور میں کھیتی باڑی لوگوں کا سب سے اہم پیشہ تھا۔ کاکتیہ شاہوں کی معاشی حالات کئی خارجی مسافروں نے اپنی تحریروں کے ذریعے رپورٹ کی۔ امیر خسرو اور مارکو پولو جیسے خارجی مسافروں نے اپنی تحریروں کے ذریعے کاکتیہ شاہوں کی معاشی حالات کی خبریں دیں۔

کاکتیہ کیوں کاٹیاس نے کھیتی کے لئے ٹینک کھودے، جیسے کہ سیٹی سمندرم، کیری سمندرم، جگت کیسری سمندرم، وغیرہ۔ گنپتیدیو کے فوج کے چیف، رودردیو نے پکالا ٹینک کھودا۔ راماپا ٹینک کو رچیرلا رودرا نے کھودا۔ اس دوران، چاول، گندم، جوار، جوار، گنا، تیل کے بیج زیادہ تر کاشت کی جاتی تھی۔ مارکوپولو کی تحریرات سے لگتا ہے کہ خوشبو دار چاول اور گللو میں کاشت کیا جاتا تھا۔ کاکاتیہ سلطنت میں، اندھرا علاقہ خوبصورت کپڑوں اور کلمکاری ساریوں کے لئے مشہور تھا۔ رتنکمبلزاور مخمل کپڑے اور گللو میں اہم تھے۔ گٹھی کونڈااور پلناتیسیما میں لوہے کی صنعتیں تھیں۔ مارکوپولو نے بتایا کہ گولکونڈا میں ہیرے کے کان کھدائے گئے۔ کاکاتیہ دوران، چندن، کھوپر کا تیل، کافور کا تیل، ہاتھی دانت، موتی، مونگے، پنگوگو، کالی مرچ اور کافور کو زیادہ تر برآمد کیا جاتا تھا۔ ریشمی کپڑے، کافور، عطر اور عربی گھوڑے اس دوران درآمد کیا جاتا تھا۔ گنپتیدیو کے ابھیائہ انسکرپشن موٹوپلی میں کاکاتیہ دوران کے برآمد اور درآمد کے بارے میں معلومات فراہم کرتا ہے۔ کاکاتیہ دوران درآمد اور برآمد پر 30/1 واں کرایہ لگایا جاتا تھا۔ خارجی اور داخلی تجارت کو ویشیاس اور بالیجاس کے ذریعے منظم کیا جاتا تھا۔ ان کے دوران، سونے کے سکے جسے گڈیانا یا نشکہ بھی کہتے تھے، میں دائرہ وار تھے۔

19.8 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

کاکتیہ کلیانی کے چالوکیوں کے جاگیر دار تھے۔ اس کے بانی، پرتاپ رودر اول، بارہویں صدی کے دوسرے نصف (1162) کے قریب چالوکیہ حکمران، تلپاسوم کو شکست دینے میں کامیاب ہوئے۔ 1185 کے آس پاس وہ ویلانتی سرداروں سے کرنول ضلع حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہوا۔ گنپتی دیو، رودرمادیوی اور پرتاپ رودر دوم خاندان کے دیگر اہم حکمران تھے۔ ان کی حکمرانی آندھرا کے بیشتر علاقے میں گوداوری، کانچی، کرنول اور کڈپاہ اضلاع تک پھیلی ہوئی تھی۔ الغ خان (بعد میں محمد تغلق) نے تقریباً 1322 میں پورے خطے پر قبضہ کر لیا اور اس طرح کاکتیہ حکمرانی کی قسمت پر مہر لگادی۔ کاکتیہ کی طویل حکمرانی کے دوران ثقافتی ترقی طویل عرصے سے اور مختلف شعبوں میں رہی ہے۔ فن اور فن تعمیر کا ارتقاء ان کے بنائے ہوئے مندروں کی وسیع رینج میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ادب، رقص اور مذہب کی ترقی کے علاوہ کئی صدیوں تک قائم رہنے والے اداروں کی تعمیر میں ان کا بے پناہ تعاون رہا۔

19.9 کلیدی الفاظ (Keywords)

آندھرادیسہ	:	منٹپا
تریکوٹا	:	بسدی
پنچامس	:	پربھنداس
کولادیوتا	:	پاسوپتی
پردکشینا پٹھا	:	گربھا گرہا

19.10 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

19.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. ہنوماکونڈا (Hanamkonda) کا مشہور 1163ء کا کتبہ (Inscription) کس کا جاری کردہ تھا؟

(a) پرووُلادوم (Prola II) (b) رودردیو (Rudradeva)

(c) گنپتی دیو (Ganapatideva) (d) پرتاپ رودر دوم (Prataparudra II)

2. ہزار ستون والا مندر (Thousand Pillar Temple) کس نے تعمیر کروایا؟

(a) گنپتی دیو (b) رودرمادیوی (c) رودردیو (d) پرتاپ رودر دوم

3. ''بسواپورانم (Basava Puranam) '' کے مصنف کون تھے؟

(a) نَنّےچود (b) پالکور کی سوم ناتھ (c) تِکّنا (d) نَنّیا

4. کاکتیہ دور کا مشہور رقص کون سا تھا؟

(a) کتھک (b) بھرت ناٹیم (c) پریِنی شیوتانڈوم (d) کُچی پُڑی

5. رامپا مندر (Ramappa Temple) کہاں واقع ہے؟

(a) ہنمکنڈہ (b) پالم پیٹ (c) ورنگل شہر (d) حیدر آباد

19.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. کاکتیہ حکمران ردر دیو کے بارے میں نوٹ لکھیں۔
2. کاکتیہ ملکہ ردرامادیوی کے فوجی فتوحات کا تفصیلی بیان کریں۔
3. کاکتیوں کا تیلگو زبان اور ادب میں کردار کی وضاحت کریں۔

19.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. گنپتی دیوا کے زیر حکومت کاکتیوں کی سیاسی توسیع کی وضاحت کریں۔
2. کاکتیوں کی فن و معماری میں شراکت کی تفصیلی وضاحت کریں۔

جواب نامہ 1. (b): (b) رودردیو| 2 (c) .رودردیو| 3 (b) . پالکور کی سوم ناتھ| 4 (c) .پریِنی شیوتانڈوم| 5 (b) . پالم پیٹ، تلنگانہ

اکائی 20۔ وجے نگر سلطنت

(Vijayanagara Empire)

اکائی کے اجزا

20.0	تمہید
20.1	مقاصد
20.2	وجے نگر سلطنت
20.2.1	سلطنت کا قیام
20.3	سیاسی تاریخ
20.4	کرشنادیورائے
20.5	سلطنت کا زوال
20.6	غیر ملکی سیاحوں کے بیانات
20.7	وجے نگر حکومت کی نوعیت
20.7.1	عسکری یا جنگی ریاست
20.7.2	ٹکڑوں میں بنٹی ہوئی ریاست
20.7.3	جنوبی ہند میں ہندو دفاع کا آخری قلعہ
20.8	انتظامی، سماجی اور معاشی حالات
20.8.1	انتظامیہ
20.8.2	محصول نظام
20.8.3	کسانوں کی حالت
20.8.4	تجارت اور زراعت
20.9	اکتسابی نتائج
20.10	کلیدی الفاظ

20.0 تمہید (Introduction)

دہلی سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی وجے نگر اور بہمنی سلطنتوں کا عروج شروع ہوا جن میں وجے نگر سلطنت کا اقتدار کرشنا کے جنوب میں رامیشورم تک پھیلا ہوا تھا۔ وجے نگر سلطنت پر کئی حکمراں خاندانوں نے حکومت کی۔ان میں سنگم ،سالو، تلوااور اراویدو خاندان نے وجے نگر سلطنت پر کم وبیش 200 سال تک حکومت کی۔ سنگم دور میں اس کی بنیاد رکھی گئی اور تلوادور میں یہ اپنے عروج کو پہنچی۔اراویڈو خاندان کی حکومت کے دوران اس کا مکمل زوال ہو گیا۔ پہلے تین خاندان کی حکومت کے دوران اس کی راجدھانی وجے نگر تھی جس کے بعد چوتھے خاندان کے دور میں راجدھانی پینو گونڈہ کو بنایا گیا۔وجے نگر سلطنت کو اپنی شروعات سے ہی اپنی ہمعصر طاقتوں سے لڑنا پڑا۔ان میں سب سے اہم اڑیسہ کے گجپتی حکمراں، بہمنی سلطنت کے سلطان ، مدورائی سلطنت اور یورپی طاقت پرتگالی تھے۔تلنگانہ کے ریڈی اور آندھرا کے ویلما موقع پرست تھے جو کبھی بہمنیوں کی طرف تو کبھی وجے نگر کی طرف سے لڑتے تھے۔آندھرا کے ویلما تو دو حصوں میں بنٹ گئے تھے جن میں پہلا دھڑا جنگ میں بہمنی سلطان کے ساتھ تھا تو دوسرا حصہ وجے نگر کے رائے کی طرف سے لڑ رہا تھا۔

متواتر جنگوں کے باوجود حدودِ سلطنت میں امن وامان اور قانون برقرار رہا اور وجے نگر سلطنت مستحکم رہی، جس کے نتیجے میں یہاں تجارت اور بیوپار پوری طرح پھلے پھولے۔ بہت سے حکمرانوں نے زراعت کی طرف توجہ دی اور دارالحکومت اور دوسرے بڑے شہر آباد کیے اور ان میں شاندار عمارتیں بنوائیں۔ کئی حکمراں فن اور ثقافت کے بھی بڑے سرپرست گزرے۔

جب تک بہمنی سلطنت مضبوط اور متحد رہی اس کے سلطان وجے نگر کے رایوں کو اپنے باجگذار کے طور پر سمجھتے تھے اور کئی مرتبہ انہیں شکست دے کر ان کی راجدھانی میں بھی داخل ہو چکے تھے۔ پندرھویں صدی کے آخر میں اندرونی خانہ جنگی اور محمود گواں جیسے قابل وزیر کے قتل کے بعد بہمنی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔اس کا فائدہ وجے نگر ریاست نے اٹھایا اور جنوب کی سب سے عظیم طاقت بن گئی۔ یہ عروج کچھ ہی دن کا تھا۔ عظیم حکمران کرشنادیورائے کے 1530 میں آنکھ بند کرتے ہی وجے نگر کے حکمراں نایکوں کے ہاتھ میں کھلونا بن گئے۔ان نایکوں میں سب سے اہم رام راج تھا جو بہمنی سلطنت کی جانشیں ریاستوں کو آپس میں لڑا کر اپنی طاقت میں اضافہ کرتا رہا۔اس کی یہی پالیسی اس کے زوال کا سبب بنی۔ گولکنڈہ کے قطب شاہی حکمران نے اس کی نیت بھانپ لی اور اس کی پہل پر بیجاپور، گولکنڈہ اور احمد نگر کا ایک فوجی اتحاد عمل میں آیا۔ 1565 میں تالی کوٹا کی جنگ میں ان نئے اتحاد کے ہاتھوں وجے نگر سلطنت کی شکست فاش ہوئی اور اس کی راجدھانی وجے نگر کو کھنڈر میں تبدیل کر دیا گیا۔وجے نگر کے اکثر علاقے کو ان بہمنی ریاستوں نے آپس میں بانٹ لیا۔ چوتھے حکمراں خاندان نے نئی راجدھانی پینو گونڈہ سے کچھ اور عرصے حکومت کی جس کے بعد اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ یہی وہ وقت تھا جب ہندوستان میں ایک یوروپی طاقت یعنی پرتگالی داخل ہوئے اور انہوں نے اپنی بہتر اور ترقی یافتہ بحری بیڑے کے بل پر سمندر اور اس کے آس پاس کے سرحدی علاقوں پر اپنا تسلط جما کر بحری تجارت کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی۔ جنوبی ہند کے کسی حکمراں نے اس نئے خطرے کی طرف توجہ نہیں دی اور نہ ہی

بحری بیڑے کو مضبوط کرنے پر زور دیا۔ایسا لگتا ہے کہ وہ نوآبادیت کی اس لہر کو سمجھ نہیں سکے جو عنقریب سارے ملک ہندوستان کو اپنی آغوش میں لینے والی تھی۔

20.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- وجے نگر سلطنت کے قیام اور اس کی سیاسی تاریخ کے بارے میں جان سکیں گے۔
- عظیم حکمراں کرشنا دیورائے کے کارناموں اور فتوحات کو جان سکیں گے۔
- اس سلطنت کے بارے میں غیر ملکی سیاحوں کے بیانوں پر روشنی ڈال سکیں گے۔
- وجے نگر حکومت کی نوعیت کے بارے میں جان سکیں گے۔
- وجے نگر حکومت کے انتظامی، سماجی اور معاشی حالات کا تجزیہ کر سکیں گے۔

20.2 وجے نگر سلطنت

20.2.1 سلطنت کا قیام

مورخوں میں وجے نگر سلطنت کی ابتدا کے بارے میں اتفاق نہیں ہے۔اس سلطنت کے قیام میں ہری ہر اور اس کے بھائی بکا نے جو اہم کردار ادا کیا اُسے تو عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے لیکن اس خاندان کی اس سے پہلے کی تاریخ واضح نہیں ہے۔عام روایت کے مطابق یہ دو بھائی پانچ بھائیوں کے ایک خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور وارنگل کے کاکتیاؤں کے جاگیر دار رہ چکے تھے۔اس کے بعد انہوں نے آج کے کرناٹک میں کامپلی کے حکمرانوں کے یہاں خدمات انجام دیں جہاں یہ آہستہ آہستہ وزیروں کے عہدوں تک ترقی کر گئے۔ پھر جب ایک مسلم باغی کو پناہ دینے کے سلسلے میں محمد بن تغلق نے کامپلی پر حملہ کر کے اُسے فتح کیا تو یہ دونوں بھائی گرفتار ہوئے اور قیدیوں کی طرح دہلی بھیج دیے گئے۔ یہاں یہ مسلمان ہو گئے۔کچھ دن بعد کامپلی میں ترک حکومت کے خلاف بغاوت ہوئی اور اسے فرو کرنے کے لیے ان دونوں بھایوں کو ہی کامپلی بھیجا گیا۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے اسلام چھوڑ کر پھر اپنا پرانا مذہب اختیار کیا اور خود بھی بغاوت میں شامل ہو گئے۔ بہر طور موجودہ دور کے بہت سے مورخ اس روایتی بیان کو تسلیم نہیں کرتے۔اُن کے مطابق ان کی وارنگل میں خدمات انجام دینے کی بھی بہت کم شہادت موجود ہے اور نہ اس کے بعد قید ہونے اور مذہب کی تبدیلی کی کوئی ثبوت ملتا ہے۔ان کے مطابق ہری ہر اور بکا کرناٹک کے اُن 75 نائکوں میں سے تھے جنہوں نے ترک سلطنت کے خلاف بغاوت کی تھی اور یہ شیو بھکتوں کے ایک مضبوط اور طاقتور خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ مورخ اس بات کو بھی نہیں مانتے کہ اس خاندان کا آندھرا سے پہلے کوئی تعلق موجود تھا۔ بہر حال اس اختلاف سے قطع نظر ہمارے لیے جو چیز اہم ہے وہ یہ ہے کہ وجے نگر کے حکمرانوں نے اپنے انتظامی ڈھانچے کی تشکیل میں صرف تامل علاقے کے چول حکمرانوں سے متاثر نہیں ہوئے بلکہ تیلگو علاقے کے کاکتیہ اور کنڑ علاقے کے ہوئسال حکمرانوں کی روایات اور طریقہ کار کو بھی اپنایا۔اس طرح یہ صرف صوبائی حکمراں یا سردار نہیں تھے بلکہ

ان کی حیثیت پورے جنوبی ہندوستان کے ایک نمائندے کی تھی۔

20.3 سیاسی تاریخ

جنوبی ہندوستان میں تغلق حکومت کے خاتمے سے بڑی پیچیدہ سی صورتِ حال پیدا ہوگئی۔ میسور کے ہوئسال جیسے کچھ باقی ماندہ حکمراں کسی نہ کسی صورت میں برقرار رہے اور کچھ نئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں اُبھر آئیں۔ ان میں سب سے اہم مدورائی کی سلطنت، وارنگل کے ویلمار ریاست اور تلنگانہ کی ریڈی ریاست تھی۔ کچھ عرصے بعد وجے نگر کے شمال کی طرف بہمنی سلطنت قائم ہوئی۔ یہ حکمراں متواتر ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتے تھے یا جب جب ضرورت محسوس ہوتی تھی کسی کے ساتھ صلح کر کے مل جاتے تھے۔ چنانچہ مدورائی کے سلطان کے خلاف جنگ میں ہوئسال کے حکمراں بلال سوم کو شکست ہوئی اور 1342 میں اسے قتل کر دیا گیا۔ ان حالات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہری ہر اور اس کے بھائیوں نے اپنے علاقے کی توسیع شروع کر دی اور جلد ہی پوری ہوئسال ریاست ان کے قبضے میں آگئی۔ اس کے بعد مدورائی کی سلطنت سے ان کی طویل کشمکش کا سلسلہ شروع ہو گیا اور آخر 1377 تک انہوں نے مدورائی کی سلطنت کا بھی خاتمہ کر دیا۔ وجے نگر کی حکومت اب جنوب میں رامیشورم تک پہنچ گئی جس میں کیرالہ کے کچھ وہ حصے شامل تھے جو پہلے مدورائی سلطنت میں تھے۔ اس سے پہلے ہری ہر تنگ بھدرا کے کنارے اپنا نیا دارالسلطنت وجے نگر قائم کر چکا تھا لیکن دوسری روایت یہ ہے کہ یہ شہر اس کے بھائی بکا نے قائم کیا تھا جو 1365 میں اپنے بھائی کا جانشین ہوا تھا۔ بکا نے 1377 تک حکومت کی۔

وجے نگر کو شمال میں ابھرتی ہوئی بہمنی سلطنت کا سامنا کرنا تھا جس کے بادشاہوں کو کبھی کبھی وارنگل کے ویلما حکمرانوں اور تلنگانہ کے ریڈی حکمرانوں کی حمایت بھی حاصل ہو جاتی تھی جو وجے نگر کی ابھرتی ہوئی طاقت سے خوفزدہ رہتے تھے اور بہمنی سلطنت کو ایک توازن برقرار رکھنے والی طاقت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

بہمنی سلطنت کو ایک افغان امیر علاءالدین حسن نے 1347 میں قائم کیا تھا جس کا خاندان علاءالدین خلجی کے یہاں ملازم تھا اور وہیں اس نے ترقی پائی۔ فرشتہ کی سترھویں صدی میں بیان کی ہوئی روایت کے مطابق حسن ایک برہمن گنگو کی خدمات انجام دیتے ہوئے منظر عام پر آیا اور اسی لیے وہ حسن گنگو کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بہر حال اس کا یہ بیان کہاں تک صحیح ہے اس کا علم نہیں ہے۔ تخت نشینی کے بعد علاء الدین نے اپنے خاندان کو باحیثیت اور باوقار بنانے کی غرض سے اس کی جڑی ایرانی ہیرواسفندیار اور بہمن سے جوڑنے کی کوشش کی اور اپنے نام کے آگے ''بہمن شاہ'' کا لقب اختیار کر لیا۔ اسی لقب کی وجہ سے یہ سلطنت بہمنی کہلائی جانے لگی۔ بہمنی سلطانوں اور وجے نگر کے حکمرانوں کے مفادات تین بالکل مختلف اور واضح علاقوں میں ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے۔

1. تنگ بھدرا دوآب میں
2. کرشنا، گوداوری ڈیلٹا میں
3. مراٹھواڑا میدانی علاقے یعنی کونکن میں

تنگ بھدرا دوآب کرشنا اور تنگ بھدرا دریاؤں کے درمیان واقع علاقے میں ہے۔ اپنی دولت اور معاشی ذرائع کی وجہ سے یہ پہلے بھی مغربی علاقے کے چالوکیہ حکمرانوں اور چول خاندان کے حکمرانوں کے درمیان جھگڑے کی جڑ رہا تھا، اس کے بعد یہ یادو حکمرانوں اور ہوئسال حکمرانوں کے درمیان بنائے مخاصمت رہا، کرشنا گوداوری کے تھالے پر قبضہ قائم رکھنے کی جدوجہد جو بہت زرخیز علاقہ تھا اور اس میں کئی بندرگاہوں کی موجودگی کی وجہ سے اس پورے وسیع علاقے کی غیر ملکی تجارت پر بھی یہیں سے گرفت رکھی جاتی تھی، کبھی کبھی تنگ بھدرا دوآب علاقے کے لیے جدوجہد سے جُڑ جاتی تھی۔ اسی وجہ سے اس علاقے کے حکمراں اپنی حفاظت کی غرض سے کبھی بہمنی سلطانوں سے مل جاتے تھے اور کبھی وجے نگر کے حکمرانوں سے جہاں تک مراٹھا علاقے پر قبضے کا سوال تھا یہ جھگڑا کونکن علاقے اور ان علاقوں سے تعلق رکھتا تھا جو کونکن تک پہنچنے کا راستہ تھا۔ کونکن سمندر اور مغربی گھاٹ کے درمیان ایک پتلی سے پٹی کا علاقہ ہے۔ اس کی سب سے اہم بندرگاہ گوا، جنوبی ہندوستان کی حکومتوں کے لیے بے حد اہمیت کی حامل تھی۔

بہمنی اور وجے نگر کی سلطنتوں کے درمیان فوجی جھڑپیں ان دونوں سلطنتوں کے قیام کے دوران لگ بھگ پورے عرصے جاری رہیں۔ ان کے اثرات متعدد رخوں میں نظر آتے تھے۔ ان سے دونوں سلطنتوں کے فوجی روپ کا بھی اندازہ ہوتا تھا۔ کبھی کبھی ان جنگوں کو مذہبی رنگ بھی دے دیا جاتا تھا۔ بہر حال حقیقت یہ ہے کہ مختلف سلطنتوں کا گٹھ جوڑ مذہبی سے زیادہ سیکولر انداز پر ہی ہوتا تھا۔ حالانکہ یہ خود کو ہندو مفادات کا محافظ کہتے تھے مگر وجے نگر حکمرانوں نے مسلمان گھوڑ سواروں کا ایک دستہ رکھنے میں بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔ ہم پہلے بھی دیکھ چکے ہیں کہ اس سے پہلے ان کی جنگ ہوئسال ہندو حکمرانوں سے رہی تھی۔ بعد میں اڑیسہ کے گنج پتی حکمرانوں نے وجے نگر پر حملہ کر کے اس کے کچھ علاقوں پر قبضہ کر لیا، جس کے نتیجے میں بہمنی۔ وجے نگر کا آپسی معاہدہ اور ساتھ ہو گیا اور دونوں نے مل کر گجپتی حکمرانوں کا مقابلہ کیا۔ بہت عرصے تک وارنگل کے حکمراں بھی وجے نگر سے مقابلے کے لیے بہمنی حکمراں کے ساتھ ملے رہے مگر اس کشمکش کا مذہبی پہلو بھی پوری طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی وجہ سے وجے نگر اور بہمنی حکمرانوں کے درمیان جنگوں میں تلخی کچھ اور بڑھ جاتی تھی، جس کے نتیجے میں جنگ کے علاقوں میں تباہی و بربادی بھی زیادہ ہوتی تھی اور ان خاص علاقوں اور اس کے گرد و نواح میں جان و مال کا خاصا شدید نقصان بھی ہوتا تھا۔ دونوں اپنے دشمن کے علاقوں کو لوٹتے تھے اور شہر اور گاؤں کو پھونک دیتے تھے۔ مردوں، عورتوں اور بچوں کو پکڑ کر انہیں غلام بنا کر بیچ دیتے تھے اور مذہب کے نام پر کتنے ہی بربریت کے مظاہرے کرتے تھے۔

تنگ بھدرا دوآب کے لیے سب سے پہلی جنگ 1356 میں ہوئی جب بہمنی فوجوں نے رائے چور پر حملہ کر کے اسے اپنے قبضے میں کر لیا، مگر اگلے سال ہی ہری ہر نے اسے چھین کر پھر اپنے علاقے میں شامل کر لیا۔ ان دونوں کے درمیان یہ جھڑپیں متواتر ایک چکر کے سے انداز میں جاری رہیں۔ اس طرح 1367 میں بکا نے وارنگل کے حکمراں سے مل کر ان علاقوں کو واپس لینے کا منصوبہ بنایا جو پہلے بہمنی سلطنت نے اپنے قبضے میں کر لیے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے جب بکا اول نے تنگ بھدرا دوآب کے نزاعی علاقے کے چھوٹے سے قلعے پر حملہ کیا تو وہاں کے پورے محافظی دستے کو قتل کر دیا، صرف ایک آدمی بچا۔ جب اس واقعے کی اطلاع بہمنی سلطان کو ملی تو وہ بھڑک اٹھا اور یہ عہد کر کے اس طرح بڑھا کہ جب تک ایک لاکھ ہندو نہ قتل کر دے گا اپنی تلوار کو میان میں نہ رکھے گا۔ برسات کے موسم اور وجے نگر کی فوجوں کی مزاحمت کے

باوجود اس نے تنگ بھدرا دریا کو پار کیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی بہمنی سلطان بذاتِ خود وجے نگر کی سرحد میں داخل ہوا تھا۔ اس جنگ کے نتیجے کے متعلق کئی طرح کے بیان ملتے ہیں۔ فارسی ماخذوں کے مطابق وجے نگر کے حکمراں کو شکست ہوئی اور اسے جنگلوں میں روپوش ہونا پڑا۔ ان جنگوں میں دونوں فریقوں کی طرف سے توپوں کے استعمال کو بھی بیان کیا جاتا ہے۔ بہر طور پر بہمنی سلطان فیصلہ کن فتح حاصل نہ کر پایا اور یہ جنگ مہینوں تک کھنچتی رہی جس کے دوران بڑے پیمانے پر مرد، عورت، بچے قتل ہوئے۔ آخر میں کسی نہ کسی طرح ایک ڈھیلا سا معاہدہ کیا گیا، جس کی رو سے پچھلی صورتِ حال کو بحال کیا گیا اور نتیجے میں دوآب کے دونوں فریق حصے دار قرار دیے گئے۔ ایک غیر واضح وعدہ یہ بھی کیا گیا کہ آئندہ جنگوں میں کوئی غیر مسلح اور بے یار و مددگار قسم کے لوگوں کو قتل نہیں کرے گا۔ بہر حال، آنے والی جنگوں میں اس معاہدہ کا مشکل سے ہی کوئی اثر نظر آیا۔

جنوب میں مدورائی سلطنت کے خاتمے نے وجے نگر کے حکمراں ہری ہر دوم (1377 تا 1404) کو یہ موقع فراہم کر دیا کہ اُس نے شمال مشرق اور مغرب میں آگے بڑھنے کی پالیسی بنالی۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں شمال مشرقی حصے میں بہت سی چھوٹی چھوٹی ہندو فرمانروایاں تھیں۔ ان کے شمال میں اڑیسہ کا حکمراں اور دوسری طرف بہمنی سلطان، اس علاقے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ حالانکہ وارنگل کے حکمراں نے دہلی کے خلاف جدوجہد میں حسن گنگو کی مدد کی تھی لیکن اس کے جانشینوں نے وارنگل پر حملہ کر کے کولاس کا مضبوط قلعہ اور گولکنڈہ کا پہاڑی قلعہ اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ اس وقت وجے نگر جنوب میں اتنا پھنسا ہوا تھا کہ اس کی طرف سے کوئی مداخلت نہ ہوئی۔ بہمنی سلطان نے گولکنڈہ کو اپنی سلطنت کی حد مقرر کر دیا اور یہ وعدہ بھی کیا کہ نہ وہ خود نہ اس کے جانشین وارنگل کے اور کسی علاقے میں مداخلت کریں گے۔ اس معاہدے پر اعتماد کی مہر کے لیے وارنگل کے حکمراں نے بہمنی سلطان کو قیمتی ہیرے جواہرات سے مرصع ایک تخت بھی نذر کیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تخت اصل میں محمد بن تغلق کو پیش کرنے کے لیے تیار کرایا گیا تھا۔ بہمنی سلطنت اور وارنگل کا یہ معاہدہ اور میل جول پچاس برس سے زیادہ برقرار رہا۔ تنگ بھدرا دوآب پر وجے نگر کی طرف سے حملہ نہ ہونے اور بہمنی سلطنت کی اس علاقے میں بڑھتی ہوئی طاقت اور جارحیت کو نہ روک سکنے کا ایک اہم سبب یہ معاہدہ ہی تھا۔

عہدِ وسطیٰ کے مورخوں نے بہمنی اور وجے نگر کے حکمرانوں کی جنگوں کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ بہر حال یہ ہمارے لیے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں۔ دونوں فریقوں کی پوزیشن کم و بیش ایک سی ہی رہی۔ جنگوں میں کبھی ایک کا پلڑا بھاری ہو جاتا تھا کبھی دوسرے کا۔ ہری ہر دوم نے بہمنی اور وارنگل کی ملی جلی طاقت کا بھی مقابلہ کیا اور اپنی پوزیشن برقرار رکھی۔ اس کی سب سے اہم فتح یہ تھی کہ اس نے مغرب میں بہمنی سلطنت سے بیلگام اور گوا چھین لیا، اس نے سری لنکا کے شمال حصے کی طرف بھی ایک مہم روانہ کی۔

کچھ عرصے کی سیاسی کشمکش کے بعد ہری ہر دوم کے بعد دیورائے (1404-22) تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں بھی شروع میں تنگ بھدرا دوآب کے لیے ایک اور جنگ ہوئی۔ اس میں بہمنی سلطان فیروز شاہ کے ہاتھوں اسے شکست ہوئی اور اسے دس لاکھ ٹن، موتی اور ہاتھی تاوان کے طور پر ادا کرنے پڑے۔ اُسے سلطان سے اپنی لڑکی کی شادی بھی کرنی پڑی اور جس کے جہیز میں دوآب میں بانکاپور کا علاقہ دیا گیا تاکہ آئندہ اس سلسلے میں کوئی قضیہ یا تناؤ پیدا نہ ہو۔ یہ شادی بڑی دھوم دھام اور شان و شوکت کے مظاہرے کے ساتھ ہوئی۔ جب فیروز شاہ

بہمنی بارات لے کر وجے نگر کے پاس پہنچا تو دیوار یا خود پوری شان و شوکت سے شہر کے باہر آکر اس سے ملا۔ شہر کے دروازے سے محل تک، دس کلو میٹر کے پورے راستے پر طلائی، مخمل اور ساٹن کے کپڑے اور دوسری قیمتی چیزیں بچھائی گئیں۔ دونوں بادشاہ شہر کے مرکزی حصے سے اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ساتھ ساتھ چلے۔ دیوارایا کے رشتے دار سواروں کے دستے کے ساتھ پیدل دونوں بادشاہوں سے آگے آگے چلے اور شادی کی تقریبات تین دن چلیں۔

حقیقت میں جنوبی ہند میں یہ پہلی سیاسی شادی نہیں تھی۔ اس سے پہلے گونڈوانا کے کھیر لا علاقے کا فرنروا امن وامان حاصل کرنے کی غرض سے فیروز شاہ بہمنی سے ہی اپنی لڑکی کی شادی کر چکا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شہزادی فیروز شاہ کی سب سے منظورِ نظر ملکہ تھی۔ بہر حال یہ شادیاں بھی امن وامان کو برقرار نہ رکھ سکیں۔ کرشنا گوداوری تھالے کے مسئلے نے وجے نگر، بہمنی سلطنت اور اڑیسہ کے درمیان دوبارہ اختلافات کھڑے کر دیے۔ ریڈی سلطنت میں اختلال پیدا ہونے کے بعد دیورائے اور وارنگل کے حکمراں نے اس سلطنت کو آپس میں بانٹ لینے کا معاہدہ کر لیا۔ بہمنی طاقت سے وارنگل کی علیحدگی نے دکن میں اقتدار کے توازن میں پھر تبدیلی پیدا کر دی۔ نتیجے میں دیورائے کو ایک موقع مل گیا اور اس نے فیروز شاہ بہمنی کو تباہ کن شکست دے کر اپنی مرکزی حکومت کو دریائے کرشنا کے دہانے تک بڑھالیا۔

بہر حال، دیورائے نے رفاہ عامہ کے کاموں کو نظر انداز نہیں کیا۔ اس نے تنگ بھدرا پر ایک باندھ تعمیر کیا جس کی مدد سے اس نے ایک نہر شہر تک پہنچائی اور یہاں کی پانی کی قلت کے مسئلے کو حل کیا۔ اس سے آس پاس کے علاقوں کی آبپاشی بھی ہوتی تھی، چونکہ پتہ چلتا ہے کہ اس نہر سے اس کے محصول میں 3,50,000 پردا ؤ کا اضافہ ہوا۔ اس نے دریائے ہری درا پر آبپاشی کے لیے ایک بند تعمیر کیا۔

کچھ دن کی سیاسی کشمکش کے بعد دیورائے دوم (46-1425) تخت نشین ہوا جو اس خاندان کا سب سے بڑا بادشاہ مانا جاتا ہے۔ اپنی فوج کو مضبوط بنانے کے لیے اس نے اس میں زیادہ تعداد میں مسلمانوں کو داخل کیا۔ فرشتہ کے بیان کے مطابق دیورائے دوم نے محسوس کیا کہ بہمنی فوج کی بالادستی ان کے زیادہ مضبوط اور توانا گھوڑوں اور بہت بڑی تعداد میں بہت اچھے تیر اندازوں کی وجہ سے ہے۔ اس لیے اس نے 2000 مسلمانوں کی فہرست تیار کی، ان کو جاگیریں دیں اور اپنے تمام ہندو سپاہیوں اور افسروں کو ہدایت کی کہ وہ ان سے تیر اندازی کا فن سیکھیں۔ وجے نگر کی سلطنت نے مسلمانوں کی بھرتی کوئی نہیں نہیں تھی، کیونکہ دیورائے اول کے لیے بیان کیا جاتا ہے کہ فرشتہ کا بیان ہے کہ دیورائے دوم 60,000 ہندو ماہر تیر انداز، 80,000 گھوڑ سوار اور 2,00,000 کی پیدل فوج جمع کی تھی۔ یہ شمار مبالغہ آمیز ہو سکتا ہے۔ بہر حال ایک بڑی سوار فوج رکھنے سے حکومت کے مالی ذرائع پر کافی بوجھ پڑنا یقینی ہے کیونکہ اچھے گھوڑے صرف درآمد کے ذریعے حاصل ہوتے تھے اور عرب، جن کی اس تجارت پر گرفت تھی، ان سے گھوڑوں کی زیادہ قیمت لیتے تھے۔

اپنی فوج کے ساتھ دیورائے دوم نے 1443 میں تنگ بھدرا دریا پار کیا اور مدکل اور بانکاپور وغیرہ کے ان علاقوں کو پھر حاصل کرنے کی کوشش کی جو کرشنا دریا کے جنوب میں تھے اور گذشتہ زمانے میں بہمنی سلطنت کے قبضے میں پہنچ گئے تھے۔ تین سخت جنگوں کے بعد فریقین پھر پچھلی ہی حالت پر برقرار رکھنے کے لیے ہی تیار ہوئے۔

سولہویں صدی کے ایک پرتگالی مورخ کا بیان ہے کہ کولون، سری لنکا، پولی کٹ، پیگو، تیناسیرم (برما) اور ملایا کے فرمانروا دیورائے دوم کو خراج دیتے تھے۔ بہر طور اس میں شبہ ہے کہ وجے نگر کے حکمراں سمندر میں بھی اتنے طاقتور تھے کہ پیگو اور تناسیرم علاقوں سے پابندی سے خراج وصول کر لیتے ہوں۔ شاید اس کے بیان سے یہ مطلب اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ان جگہوں کے حکمراں وجے نگر سے تعلق قائم رکھتے تھے اور ان کی رضا خوشنودی حاصل کرنے کے لیے تحفے تحائف بھیجتے تھے۔ سری لنکا پر بہر طور کئی بار حملہ ہوا تھا جو ایک مضبوط بحری فوج کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔

20.4 کرشنادیورائے

دیورائے دوم کے انتقال کے بعد سلطنت میں کچھ عرصے کشمکش اور اختلال رہا۔ تخت سلطنت کے دعوے کے درمیان خانہ جنگیاں شروع ہوئیں۔ بہت سی جاگیریں اس دوران خود مختار ہو گئیں۔ رائے کا اقتدار و حکومت سُکڑ کر صرف کرناٹک اور مغربی آندھرا کے کچھ حصوں تک باقی رہ گیا۔ کچھ عرصے بعد تختِ سلطنت کو راجا کے وزیر سالووا نے چھین لیا۔ اس طرح پہلے شاہی خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ سالووا نے داخلی امن وامان قائم کر کے ایک نئے شاہی خاندان کی بنیاد ڈالی لیکن یہ سلطنت بھی زیادہ عرصے باقی نہیں رہی۔ اس کے بعد نئے خاندان جسے تُلووا کہا جاتا ہے کی بنیاد کرشنادیورائے (30-1509) نے رکھی، جو خود ہی اس خاندان کی سب سے بڑی شخصیت تھا۔ کچھ مورخوں نے اسے وجے نگر کے تمام حکمرانوں میں سب سے بڑا مانا ہے۔ کرشنادیو کو صرف اندرونِ ملک ہی امن وامان اور استحکام نہیں قائم کرنا تھا بلکہ اسے وجے نگر کے دیرینہ مخالفوں اور دشمنوں کو بھی بھگتنا تھا۔ ان میں بہمنی سلطنت کی جانشین حکومتیں اور اڑیسہ کے گجپتی بھی شامل تھے۔ گجپتیوں نے وجے نگر کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ اسے پرتگالیوں کی طرف بھی توجہ کرنی تھی جن کی طاقت رفتہ رفتہ اس علاقے میں مضبوط ہوتی جارہی تھی۔ پرتگالی اپنی بحری بالادستی کو وجے نگر کی چھوٹی چھوٹی ساحلی ریاستوں کو ڈرا دھمکا کر اُن سے سیاسی اور معاشی فائدے حاصل کرنے میں استعمال کرنا چاہتے تھے۔ یہ رائے کی غیر جانب داری کو خریدنے کی بھی کوشش کر چکے تھے جس کے بدلے میں انہوں نے بیجاپور کے قبضے سے گوا کو آزاد کرانے اور گھوڑوں کی سپلائی کا مکمل اجارہ دے دینے کی بھی پیش کش کی تھی۔

سات سال تک چلنے والی جنگوں کے بعد کرشنادیو اول نے اڑیسہ کے حکمراں کو دریائے کرشنا تک کے تمام علاقے وجے نگر کو واپس کر دینے پر مجبور کر دیا۔ اتنی مضبوطی حاصل کر لینے کے بعد کرشنادیو نے تنگ بھدرا دوآب کی واپسی کی جدوجہد کو پھر سے شروع کر دیا۔ اس کے نتیجے میں دو پرانے حریفوں بیجاپور اور اڑیسہ میں ضرورت کے تحت ایک معاہدہ اور گٹھ جوڑ بھی ہوا۔ کرشنادیو نے اس مہم کے لیے بڑی زبردست تیاریاں کیں۔ اس جنگ کو اس نے سب سے پہلے رائچور اور مدکل پر یلغار سے شروع کیا۔ اس جنگ میں بیجاپور کے حکمران کو 1520 عیسوی میں بری طرح شکست ہوئی۔ اُسے دریائے کرشنا کے دوسری طرف دھکیل دیا گیا اور وہ بڑی مشکل سے اپنی جان بچا سکا۔ وجے نگر کی فوجیں مغرب میں بیلگام بھی پہنچیں۔ بیجاپور پر قبضہ کیا اور کئی دن تک اُسے لوٹا اور معاہدے سے پہلے گلبرگہ کو بھی تباہ کیا۔

اس طرح کرشنادیو کے دور میں وجے نگر جنوب کی سب سے مضبوط طاقت بن گئی۔ بہر طور اپنی پرانی رنجشوں اور دشمنیوں کا بدلا لینے

کے شوق میں جنوب کی طاقتوں نے عام طور پر اُس خطرے کی طرف سے آنکھیں بند رکھیں جو ان کو اور ان کی تجارت کو پرتگال کی ابھرتی ہوئی طاقت سے پہنچنے والا تھا۔ چول خاندان اور شروع کے وجے نگر کے حکمرانوں کے برخلاف انہوں نے بحری فوج کی نشوونما پر بہت کم توجہ دی۔

اس دور میں وجے نگر کے حالات کو بہت سے غیر ملکی سیاحوں نے بیان کیا ہے۔ اٹلی کے پائس نے، جس نے کرشنادیو کے دربار میں کئی سال گزارے تھے، کرشنادیو کی شخصیت کی بڑی شاندار تصویر کھینچی ہے۔ اس کا بیان ہے کہ ''وہ ایک عظیم حکمراں ہے اور کافی عدل و انصاف والا انسان ہے۔ اُن چند اوقات کے علاوہ جب اس پر غیظ و غضب کے دورے پڑیں ''اُسے اپنی رعایا سے محبت تھی اور اپنے عوام کی خوشحالی کی خواہش اور لگن اس کے یہاں ایک مثالی حیثیت رکھتی تھی۔

کرشنادیو عظیم معمار بھی تھا۔ اُس نے وجے نگر کے پاس ایک شہر تعمیر کرایا اور ایک بہت بڑا تالاب کھدوایا جو آبپاشی کے کام بھی آتا تھا۔ یہ تیلگو اور سنسکرت میں خداداد غیر معمولی قابلیت کا عالم تھا۔ اُس کی بہت سی تحریروں میں اب صرف ایک تیلگو تحریر، ملکی سیاست پر، اور سنسکرت میں ایک ڈرامہ موجود ہیں۔ تیلگو ادب میں اس کے عہد سے ایک نیا دور شروع ہوا جس میں سنسکرت کی نقل کے بجائے تیلگو میں آزادانہ تحریریں تخلیق ہونی شروع ہوئیں۔ اس نے تیلگو، کنڑ اور تامل شاعروں کی سرپرستی کی۔ باربوسا، پائس اور نونیز جیسے غیر ملکی سیاح اس کے انتظامیہ کی چستی اور اس کی سلطنت کی خوشحالی کا بھی کافی ذکر کرتے ہیں۔ اُس کا اہم ترین کارنامہ اپنے دور میں عوام میں رواداری اور آپسی میل جول کا ماحول پیدا کرنا تھا جو اس کے دور میں عام تھا۔ باربوسا کا قول ہے: ''بادشاہ نے اتنی آزادی دی ہوئی ہے کہ کوئی شخص خواہ کسی بھی عقیدے کا ہو، اپنے عقائد کے مطابق زندگی گزار سکتا ہے اور جہاں چاہئے آزادی سے آجا سکتا ہے۔ نہ اُسے کسی کی ناراضگی یا ناخوشگواری برداشت کرنی ہوتی ہے اور نہ کوئی اس سے یہ سوال کرتا ہے کہ وہ عیسائی ہے، یہودی ہے، مسلمان ہے یا کافر ہے۔'' باربوسا نے کرشنادیو کے عدل وانصاف اور اس کے دور میں مساوات کی بھی تعریف کی ہے۔

20.5 سلطنت کا زوال

کرشنادیو کی موت کے بعد اُس کے عزیزوں میں جانشینی کے لیے کھینچ تان شروع ہوگئی کیونکہ اس کے سارے لڑکے کم عمر تھے۔ آخر سداشورائے 1543 میں تخت نشین ہوا جس نے 1567 تک حکومت کی۔ مگر اقتدار کی اصلی طاقت مجلسِ ارباب ثلاثہ (تین افراد کی کمیٹی) کے ہاتھوں میں تھی اور ان میں بھی رام راج سب سے اعلیٰ حیثیت کا مالک تھا۔ رام راج اپنی حکومت کے مفاد میں مختلف مسلمان حکمرانوں کو ایک دوسرے سے الجھائے رکھنے میں کامیاب رہا۔ اُس نے پرتگالیوں سے ایک ایسا بیوپاری معاہدہ کیا جس کے تحت بیجاپور کو گھوڑوں کی سپلائی بالکل رُک گئی۔ جنگوں کے ایک متواتر سلسلے میں اُس نے بیجاپور کے حکمراں کو مکمل شکست دی اور گولکنڈہ اور احمد نگر کے حکمرانوں کو بھی بری طرح ہرایا۔ ایسا لگتا ہے کہ رام راج کا مقصد اس سے زیادہ کچھ نہیں تھا کہ اِن تینوں ریاستوں کی طاقت میں ایک ایسا توازن بنائے رکھے جس کا فائدہ وجے نگر کو ملتا رہے۔ بالآخر ان تینوں طاقتوں نے مل کر 1565 میں تالی کوٹا کے پاس بنی ہٹی کے مقام پر بیجاپور کو شکستِ فاش دی۔ اِسے جنگِ تالی کوٹا، یا، راکھشی تنگاڈی، کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس جنگ میں 1,00,000 وجے نگر کے فوجی قتل ہوئے۔ وجے

نگر بُری طرح لوٹااور تباہ کیا گیااور کھنڈر کر کے چھوڑ دیا گیا۔ بنی ہٹی جنگ کو عام طور پر وجے نگر کے عظیم دور کے خاتمے کی علامت مانا جاتا ہے حالانکہ یہ حکومت لگ بھگ سو سال تک کسی نہ کسی طرح کھنچتی رہی لیکن اس کی سرحدیں متواتر سکڑتی چلی گئیں اور اس کے حکمراں جنوبی ہندوستان کے سیاسی معاملات میں کوئی قابل ذکر حیثیت کے مالک نہ رہے۔ وجے نگر کے حکمرانوں میں بادشاہ کی حیثیت کافی اعلیٰ تصور کی جاتی تھی۔ سیاست پر اپنی کتاب میں کرشنادیورائے نے بادشاہ کو مشورہ دیا ہے کہ ''بڑی احتیاط اور اپنی طاقت کے مطابق ہمیں حق کی حفاظت اور بدی کی سرزنش کا کام انجام دینا چاہئے اور جو کچھ تم دیکھو یا سنو اس کی طرف سے کبھی لاپرواہی نہ برتو۔'' اُس نے بادشاہ پر یہ ذمہ داری بھی عائد کی تھی کہ ''اپنی رعایا پر میانہ روی سے محصول عائد کرو۔''

20.6 غیر ملکی سیاحوں کے بیانات

لائق حکمرانوں کے یکے بعد دیگرے سلسلے کے ساتھ وجے نگر حکومت پندرھویں صدی کے پہلے نصف حصے میں سب سے مضبوط اور خوشحال سلطنت کی شکل میں ابھری۔ بہت سے سیاح جو اس دور میں وجے نگر آئے انہوں نے اس شہر اور ملک کا بڑا تفصیلی بیان چھوڑا ہے۔ اٹلی کا سیاح، نکولو کونٹی، جو 1420 میں یہاں آیا اس نے اس شہر کے لیے لکھا ہے کہ ''شہر کا محیط 60 میل ہے۔ اس کی دیواریں پہاڑوں تک ملادی گئی ہیں اور پوری وادی کو نیچے تک گھیرے ہوئے ہیں ...اس شہر میں نوے ہزار لوگ اسلحہ اٹھانے کے قابل موجود ہیں۔ ان کا بادشاہ ہندوستان کے تمام بادشاہوں میں سب سے طاقتور حکمراں۔'' فرشتہ کا بھی بیان ہے کہ ''بہمنی خاندان کے شہزادے صرف بہادری میں اُن سے بالادست تھے ورنہ طاقت واقتدار، دولت اور ملک کی وسعت میں بیجانگر (وجے نگر) کے رایا اُن سے بہت آگے تھے۔''

عبدالرزاق جس نے ہندوستان اور اس سے باہر بہت سفر کیا تھا اور دیورائے دوم کے دربار میں سفیر تھا، اس نے لکھا تھا: ''اس موخر الذکر بادشاہ کے زیر حکومت علاقے میں تین سو بندرگاہیں ہیں، جن میں سے ہر ایک کالی کٹ کے برابر ہے اور خشکی میں اس کی حدودِ سلطنت تین مہینے کی مسافت کے برابر ہیں۔'' تمام سیاح اس بات پر متفق ہیں کہ ملک پوری طرح گنجان آباد تھا اور اُن میں بہت سے شہر اور گاؤں تھے۔ عبدالرزاق کا بیان ہے کہ ''دیہی علاقے کا بڑا حصہ بہت اچھا مزروعہ اور بہت زرخیز ہے۔ فوج کی تعداد گیارہ لاکھ ہے۔''

عبدالرزاق وجے نگر کو اپنی آنکھوں سے دیکھے اور کانوں سے سنے شہروں میں سب سے اچھے شہروں میں ایک مانتا ہے۔ شہر کا حال بیان کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ ''اِسے اس انداز سے بنایا گیا ہے کہ سات گڑھیاں اور اتنی ہی دیواریں ایک دوسرے کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ ہر ات شہر کے بازار کا دس گنا حصہ کا رقبہ۔'' محل سے شروع کر کے اس مین چار بازار تھے ''جو بے حد لمبے اور چوڑے تھے۔'' ہندوستانی دستور کے مطابق لوگ اپنی ذات یا پیشے والوں کے ساتھ شہر کے ایک حصے میں رہتے تھے۔ مسلمان بھی اپنے مقررہ حصے میں زندگی گزارتے تھے۔ بازاروں اور بادشاہ کے محل میں بھی ''نہریں اور بہتے ہوئے چشمے دیکھے جاسکتے تھے جن کے پتھر گھسے ہوئے اور چکنے ہوتے تھے۔'' اس کے بعد کا ایک اور سیاح کہتا ہے کہ یہ شہر روم سے بھی بڑا تھا، جبکہ روم اس وقت مغربی دنیا کے سب سے بڑے شہروں میں ایک شہر تھا۔

وجے نگر کے بادشاہوں کی دولت کی بھی بہت شہرت تھی۔ عبدالرزاق نے اس روایت کا بھی ذکر کیا ہے کہ ''بادشاہ کے محل میں کئی لمبی لمبی کوٹھیاں ہیں جو ٹھوس سونے چاندی سے بھری ہوئی ہیں۔'' دولت جمع کرنا بادشاہوں کی دیرینہ روایت تھی، لیکن یہ ذخیرہ کی ہوئی دولت بازار میں گردش نہیں کرتی تھی اور بسااوقات غیر ملکی حملوں کا سبب بھی بنتی تھی۔

20.7 وجے نگر حکومت کی نوعیت

20.7.1 عسکری یا جنگی ریاست

وجے نگر حکومت کس طرز کی تھی اس سلسلے میں بھی مورخین میں کافی بحث مباحثہ آیا ہے۔ نیل کنٹھ شاستری اسے عسکری یا جنگی ریاست سے قریب ترین کہتے ہیں۔ اُن کا یہ خیال وجے نگر کے ایک حکمراں کے اس نظریے پر مبنی ہے کہ کسی سلطنت کی آمدنی کو چار حصوں میں تقسیم کیا جانا چاہئے: ایک حصہ مختلف قسم کے کاموں میں دو حصے، یعنی نصف، جنگ میں اور بقیہ کو غیر معمولی صورتِ حال کے لیے محفوظ رکھنا چاہئے۔ اُس نے 'امارم' سسٹم پر بھی زور دیا ہے۔ امارم رکھنے والے 'نایک' کو جسے زمین کا ایک حصے دے دیا جاتا تھا، ایک مقررہ تعداد سپاہیوں، گھوڑوں اور ہاتھیوں کی رکھنی ہوتی تھی جو حکمراں کی خدمات کے لیے ہوتے تھے اور نایک کو بادشاہ سے وفادار رہنے کا عہد کرنا پڑتا تھا۔ وجے نگر بھی اسی حد تک عسکری ریاست تھی جتنی اور دوسری ریاستیں جنہیں ہر لمحے جنگ کے لیے تیار رہنا پڑتا تھا۔ اپنے مسلم مخالفوں سے کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرتے رہنے کی بڑی وجہ یہ حقیقت تھی کہ انہوں نے صرف سواروں کی جنگ کے انداز کو ہی نہیں اپنایا تھا بلکہ، جیسا کہ ہم نے دیکھا، انہوں نے اپنی فوج میں ایک بڑی تعداد مسلم گھوڑ سوار تیر اندازوں کی بھی رکھی تھی۔ وجے نگر کے حکمراں ایک کافی بڑی باقدہ فوج مستقل طور پر تیار رکھتے تھے، جسے نقد تنخواہ دی جاتی تھی۔ اس طرح پرانے دستور طریقوں کو اپنائے رہنے کے ساتھ ساتھ وجے نگر کے حکمراں نے کچھ نئے طریقوں کو بھی اپنانے کی کوشش کی تھی۔

20.7.2 ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ریاست

اس سلسلے میں بھی اختلافِ رائے ہے کہ آیا وجے نگر حکومت نیم خود مختار قسم کے فوجی سرداروں اور کچھ علاقائی سرداروں، نایکوں، کا ایک نیم منظم قسم کا گٹھ جوڑ تھی یا دہلی سلطنت کے ماڈل پر ایک باقاعدہ مرکزی حکومت والی ریاست تھی۔ اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جنوب کے امارم نظام کو ہم کسی طرح ترکی کے 'اقطاع' نظام کے برابر نہیں رکھ سکتے۔ نایک اپنے حکمراں کی خدمت میں غلاموں یا ماتحتوں کے روپ میں نہیں ابھرے تھے جس صورت میں حکمراں کو پورا اختیار ہوتا تھا کہ وہ جہاں اور جب چاہے انہیں منتقل کردے یا بالکل معزول کردے۔ نایک اپنے تمام اختیار اور طاقت کے ساتھ موروثی حق رکھتے ہوئے اپنے علاقے کے مالک و مختار ہوتے تھے۔ گو کہ وہ اپنے حکمراں کی وفاداری اور خدمت انجام دینے کا وعدہ کرتے تھے، کیونکہ حکمراں اُن کی حیثیت کو قانونی جواز بخشتا تھا لیکن وہ اپنا داخلی انتظامیہ خود چلاتے تھے اور اپنی آمدنی کا صرف ایک حصہ حکمراں کو ادا کرتے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وجے نگر حکومت میں 200 نایک تھے۔ حکمراں اُن پر گرفت رکھنے کی کوشش کرتا تھا مگر انہیں معزول یا برخواست نہیں کرسکتا تھا۔ جنوب اور مغربی، کچھ دور افتادہ علاقوں میں چند علاقائی حکمراں

بھی تھے جنہوں نے وجے نگر کی فرمانروائی کی بالادستی (سوزرینٹی) تو قبول کرلی تھی مگر اپنے علاقے پر انہیں کی حکومت برقرار تھی۔اس طرح وہ علاقہ جس پر وجے نگر کے حکمراں براہِ راست حکومت کرتے تھے پوری سلطنت کے مقابلے میں یقیناً بہت چھوٹا رہا ہوگا۔ حکومت کے انتظامیہ کو چلانے کے لیے وزیروں کی ایک روایتی کاؤنسل کے علاوہ جس کا سربراہ 'پرادھنی' کہلاتا تھا، ایک مرکزی دفتر یا سیکری ٹریٹ بھی ہوتا تھا جس میں بہت بڑی تعداد میں کلرک (کایستھ) کام کرتے تھے۔ عبدالرزاق کے بیان کے مطابق حکمراں کے محل کے پاس ایک دیوان خانہ تھا جو بہت وسیع تو عریض تھا اور چہل ستون (چالیس کھمبا) ہال جیسا لگتا تھا، اور اس میں سرکاری ریکارڈس رکھے جاتے تھے اور یہیں کارکن یا کلرک بیٹھ کر کام کرتے تھے۔ بہر طور حکومت کے انتظامیہ کے طریقہ کار کے بارے اور اس علاقے کی وسعت کے بارے میں بہت کم معلومات موجود ہیں جو براہِ راست مرکز کے زیرِ انتظام تھا۔

20.7.3 جنوبی ہند میں ہندو دفاع کا آخری قلعہ

وجے نگر حکومت کو ہندو قدامت پرستی اور کٹرپن کا گڑھ بھی کہا گیا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس حکمراں اپنی توجہ اور بہت سا وقت مندروں اور مٹھوں کی تعمیر اور مرمت میں صرف کرتے تھے اور خود کو ویدوں کے محافظ اور ان کی راہ پر چلنے والے کہلائے جانے پر فخر محسوس کرتے تھے۔ یہ برہمنوں پر خصوصی نظرِ کرم رکھتے تھے جنہیں صرف محصول معاف زمینیں ہی نہیں دی جاتی تھیں بلکہ انہیں قلعوں اور فوجوں کا کمانڈر بھی مقرر کیا جاتا تھا۔ برہمنوں کو دی جانے والی ذمے داریاں اور اُن کا اہم سیاسی کردار فی الحقیقت حکمرانوں کی مذہبی تحریک وجذبات پر مبنی نہیں ہوتے تھے بلکہ اصل میں انہیں طاقتور کنڑ نایکوں کی طاقت کے خلاف ایک توازن قائم رکھنے کے سلسلے میں استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ بادشاہ مذہبی معاملات میں تنگ نظر نہیں ہوتے تھے۔ حالانکہ بنیادی طور پر یہ شیو بھکت تھے مگر یہ دوسرے ہندو فرقوں سے کسی قسم کی تفریق وامتیاز نہیں برتتے تھے۔ انہوں نے جین دھرم کی بھی سرپرستی کی۔ عیسائی مشنریاں جو جنوبی ہندوستان میں قائم ہوگئی تھیں انہیں کام کرنے اور ہندوؤں کا مذہب تبدیل کرانے کی بھی آزادی تھی۔ مسلمان سپاہی جو فوج میں بھرتی کیے گئے تھے انہیں نماز ادا کرنے کی اجازت تھی اور عام طور پر ہندو مسلمان سپاہیوں میں اچھے تعلقات رہتے تھے۔ اس سلسلے میں نارواداری کے جس بدترین واقعے کی مثال دی جاسکتی ہے وہ یہ تھا کہ 1469 میں وجے نگر کے حکمراں ملک ارجن رانا نے اُس شدید غصے میں کہ بھٹکل کے تاجروں نے گھوڑے بہمنی حکمراں کے ہاتھ بیچ دیے تھے، شہر کی ساری مسلم آبادی کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکنے کا حکم دے دیا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ 10,000 مسلمان قتل کیے گئے اور بچے کھچے لوگ گوا کی طرف بھاگ گئے۔ اس کی اس غلطی اور جرم کا بہمنی حکمراں کی طرف سے ردِ عمل اس صورت میں ہوا کہ بیلگام اور اس کے اطراف کا علاقہ وجے نگر کی حکومت کے ہاتھ سے نکل گیا۔

20.8 انتظامی، سماجی اور معاشی حالات

20.8.1 انتظامیہ

وجے نگر سلطنت میں بادشاہ کے وزیروں کی ایک کاؤنسل ہوتی تھی جس میں سلطنت کے بڑے بڑے امراء شامل ہوتے تھے۔

پوری سلطنت 'راجیہ' یا 'منڈلم' (صوبوں) میں تقسیم تھی، ان کے نیچے 'ناڈو' (ضلع) ہوتے تھے، 'استھل' (تعلقہ یا سب ڈسٹرکٹ) اور 'گرام' (گاؤں) ہوتے تھے۔ بہر حال، چول دور کی دیہی 'اپنی حکومت' کی روایت وجے نگر دور میں خاصی کمزور ہو گئی۔ موروثی نائکوں کے اُبھرنے سے اِن دیہی حکومتوں کی تحریک اور آزادی سلب ہو گئی۔

20.8.2 محصول نظام

اس بات کا بھی بہت کم اندازہ ہے کہ کسانوں کو اپنی فصل کی پیداوار کا کتنا حصہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ ایک کنبے کے مطابق محصولوں کی شرحیں حسب ذیل تھیں:۔

1. سردیوں میں ہونے والے کوروائی (ایک قسم کا چاول) کا ایک تہائی حصہ
2. تِل، راگی اور گھوڑے کے دانے کا ایک چوتھائی حصہ
3. باجرہ اور خشک زمینوں میں اگائی جانے والی فصلوں کا چھٹا حصہ

اس طرح مختلف قسم کی فصلوں کے لیے شرحیں مختلف ہوتی تھیں۔ زمین، طریقہ زراعت اور آبپاشی کے ذریعوں کی بنیاد پر بھی محصول مختلف ہوتا تھا۔ محصول کے علاوہ بھی اور کئی طرح کے محصول ہوتے تھے جیسے اِملاک ٹیکس، پیداوار پر بِکری ٹیکس، پیشوں کا ٹیکس، فوجی اخراجات کے لیے ادائیگی (جنگ کے دوران)، شادی پر محصول وغیرہ۔ سولہویں صدی کا سیاح نکیتن کہتا ہے: ''زمین لوگوں سے بھری پُری ہے مگر دیہی علاقوں میں لوگ بہت پریشان اور بدحال ہیں جبکہ امراء عیش و عشرت میں مگن ہیں اور بے حد خوشحال ہیں۔''

20.8.3 کسانوں کی حالت

وجے نگر سلطنت میں کسانوں کی حالت کے بارے میں اتفاق نہیں ہے کیونکہ زیادہ تر سیاحوں کو اس علاقے کی دیہی حالت کی کوئی خاص واقفیت نہیں تھی اور انہوں نے اپنے بیانات میں اس کا ذکر بہت معمولی انداز میں کیا ہے۔ مجموعی طور پر یہی فرض کیا جاسکتا ہے کہ اُن کی عام حالت پہلے جیسی ہی تھی اور اس میں کوئی خاص تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اُن کے گھر وہی چھپرے کے ہوتے تھے جس میں چھوٹا سا دروازہ ہوتا تھا۔ وہ عام طور پر ننگے پیر چلتے پھرتے تھے اور کمر سے اوپر کچھ نہیں پہنتے تھے۔ اعلیٰ طبقے کے لوگ کبھی کبھی قیمتی جوتے پہن لیتے تھے اور سر پر پگڑی باندھتے تھے مگر یہ لوگ بھی کمر سے اوپر کا حصہ نہیں ڈھکتے تھے۔ ہر طبقے کے لوگوں کو زیور پہننے کا شوق تھا اور وہ انہیں ''اپنے کانوں، گردن اور بازوؤں پر'' پہنتے تھے۔

20.8.4 تجارت اور زراعت

وجے نگر حکومت میں تجارت اور زراعت دونوں پھلی پولیں۔ جیسے جیسے دیہی 'مقامی حکومت' کا زوال ہوا تو ہر علاقے میں ایک طاقتور زمرہ ابھرا جس نے اپنی اس مضبوط حیثیت کو زیادہ اور بہتر آبپاشی کے ذرائع حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا اور زیادہ ادائیگی کر کے زراعت کو ترقی دی۔ بہت سے مندر جنہیں محصول معاف گاؤں ملے ہوئے تھے، انہوں نے بھی اپنے ذرائع کو اسی کام میں استعمال کیا۔

وجے نگر حکومت کے دور میں شہری زندگی کی نشو ونما ہوئی اور تجارت پھلی پھولی۔ مندروں کے ارد گرد کئی شہر اُبھر آئے۔ مندر بہت بڑے بڑے تھے اور یاتریوں کو 'پرسادم' کے لیے کھانے پینے کے سامان، دیوی دیوتاؤں کے لیے 'بھوگ' اور پجاریوں کی ضرورتوں کا سامان فراہم کرنا ضروری تھا۔ مندروں کے پاس بہت دولت تھی اور یہ ملک کی اندرونی اور بحری دونوں تجارتوں میں حصہ لیتے تھے۔اس طرح، متواتر جنگوں کے سلسلے کے باوجود، چودھویں اور سولہویں صدی کے درمیان جنوبی ہندوستان میں تجارت اور شہر کاری میں ترقی ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ زراعت بھی پھلی پھولی۔اس کا اثر اس دور کی ثقافتی زندگی کی ترقی میں بھی محسوس ہوا۔

20.9 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

دہلی سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی وجے نگر اور بہمنی سلطنتوں کا عروج شروع ہوا جن میں وجے نگر سلطنت کا اقتدار کرشنا کے جنوب میں رامیشورم تک پھیلا ہوا تھا۔ وجے نگر سلطنت پر کئی حکمراں خاندانوں نے حکومت کی۔ان میں سنگم، سالو، تلوا اور اراویدو خاندان نے وجے نگر سلطنت پر کم و بیش 200 سال تک حکومت کی۔ سنگم دور میں اس کی بنیاد رکھی گئی اور تلوا دور میں یہ اپنے عروج کو پہنچی۔اراویڈو خاندان کی حکومت کے دوران اس کا مکمل زوال ہو گیا۔ پہلے تین خاندان کی حکومت کے دوران اس کی راجدھانی وجے نگر تھی جس کے بعد چوتھے خاندان کے دور میں راجدھانی پینو گونڈہ کو بنایا گیا۔ وجے نگر سلطنت کو اپنی شروعات سے ہی اپنی ہمعصر طاقتوں سے لڑنا پڑا۔ان میں سب سے اہم اڑیسہ کے گجپتی حکمراں، بہمنی سلطنت کے سلطان ، مدورائی سلطنت اور یورپی طاقت پرتگالی تھے۔ تلنگانہ کے ریڈی اور آندھرا کے ویلما موقع پرست تھے جو کبھی بہمنیوں کی طرف تو کبھی وجے نگر کی طرف سے لڑتے تھے۔آندھرا کے ویلما تو دو حصوں میں بنٹ گئے تھے جن میں پہلا دھڑا جنگ میں بہمنی سلطان کے ساتھ تھا تو دوسرا حصہ وجے نگر کے رائے کی طرف سے لڑ رہا تھا۔

20.10 کلیدی الفاظ (Keywords)

دریائے کرشنا	جنوبی ہند کا ایک عظیم دریا
رامیشورم	تامل ناڈو میں انتہائی جنوبی سرے پر ایک شہر
وجے نگر	موجودہ ہمپی اور وجے نگر سلطنت کی راجدھانی
پینو کونڈہ	وجے نگر کی دوسری راجدھانی جو آندھرہ کے اننت پور میں واقع ہے۔
تالی کوٹا	راکشسی تانگڑی یا بنی ہٹی
کامپلی	کرناٹک کی سرحد پر واقع ایک مقام

20.11 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

20.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. وجے نگر سلطنت پر کتنے خاندانوں نے حکومت کی؟

2(a) 3(b) 4(c) 5(d)

2. تالی کوٹہ کی جنگ کب ہوئی؟

1526ء (a) 1556ء (b) 1565ء (c) 1576ء (d)

3. وجے نگر کی دوسری راجدھانی کا نام کیا تھا؟

(a)چندراگیری (b) پنکوڈا (c) بیلّور (d)مدورائی

4. مدورائی سلطنت کا خاتمہ کب ہوا؟

1336 (a) 1356 (b) 1371 (c) 1378 (d)

5. وجے نگر سلطنت کا بانی کون تھا؟

(a)کرشن دیورائے (b)ہری ہر اور بُکّا (c)دیورائے دوم (d)سلووانر سمہا

20.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. ٹکڑوں میں بنٹی ہوئی ریاست پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
2. ہندو دفاع کے نظریے کا مختصر جائزہ لیجیے۔
3. تجارت اور زراعت کے حالات پر روشنی ڈالیے۔

20.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. وجے نگر کی سیاسی تاریخ پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. انتظامی اور سماجی و معاشی حالات کا تفصیلی تجزیہ کیجیے۔

1	2	3	4	5
(c) 4 خاندان	(c) 1565ء	(b) پنکوڈا	(d) 1378ء	(b) ہری ہر اور بُکّا

اکائی 21۔ بہمنی سلطنت اور اس کی جانشیں ریاستیں

(Bahmani Sultanate and Its Successor States)

اکائی کے اجزا

21.0 تمہید

21.1 مقاصد

21.2 سیاسی پس منظر اور بہمنی سلطنت کا قیام

21.3 بہمنی سلطنت

21.3.1 علاؤالدین حسن بہمن شاہ

21.3.2 محمد شاہ اول

21.3.3 درمیانی دور

21.3.4 تاج الدین فیروز شاہ

21.3.5 شہاب الدین احمد شاہ ولی

21.4 تلنگانہ کے معاملات

21.4.1 ریچرلا کاویلما خاندان

21.4.2 دیورا کونڈا کی تاریخی جنگ

21.5 خواجہ محمود گاواں

21.5.1 فوجی مہمات اور فتوحات

21.5.2 جدید جنگی حکمتِ عملی

21.5.3 گاواں کی انتظامی اور زرعی اصلاحات

21.5.4 محمود گاواں کا المناک انجام

21.6 سلطنت کا معاشی، سماجی اور تہذیبی ڈھانچہ

21.6.1 بحری تجارت

21.6.2 نظامِ سکہ سازی
21.6.3 افانسی نکیتن کی ڈائری
21.6.4 ادب و ثقافت
21.7 بہمنی سلطنت کا زوال اور دکن کی پانچ جانشین ریاستیں
21.7.1 احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت
21.7.2 بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت
21.7.3 گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت
21.7.4 برار کی عماد شاہی سلطنت
21.7.5 بیدر کی برید شاہی سلطنت
21.8 جانشیں ریاستوں کے دور میں دکن کا ثقافتی ارتقا
21.5 اکتسابی نتائج
21.6 کلیدی الفاظ
21.7 نمونہ امتحانی سوالات

21.0 تمہید (Introduction)

پروفیسر ہارون خان شیروانی (H.K. Sherwani) جو بہمنی تاریخ کے سب سے مستند محقق مانے جاتے ہیں، کا ماننا ہے ہے کہ بہمنی سلطنت کا قیام کسی بیرونی حملے کے بجائے دکن میں تعینات تغلق سلطنت کے افسران، جنہیں 'امیرانِ صدہ' کہا جاتا تھا، کی ایک منظم اور ناگزیر بغاوت کا نتیجہ تھا۔ آغا مہدی حسین (Agha Mahdi Husain)، تغلق تاریخ پر اپنی تحقیق میں بتاتے ہیں کہ محمد بن تغلق کی سخت گیر مرکزیت اور ہر کسی پر شک و شبہ کرنے کی وجہ سے یہ امراء اپنی جان بچانے کے لیے ایک الگ اور خود مختار ریاست قائم کرنے پر مجبور ہو گئے۔ دوسری طرف مورخ پیٹر جیکسن، اپنی کتاب *The Delhi Sultanate* میں یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ چودھویں صدی میں ذرائع نقل و حمل اور مواصلات اس قدر محدود تھے کہ دہلی میں بیٹھ کر دکن اور جنوبی ہند کے وسیع و عریض علاقوں پر کنٹرول برقرار رکھنا ناممکن تھا۔ ان کے مطابق، تغلق سلطنت کا دکن سے انخلا اور وہاں بہمنی جیسی علاقائی سلطنت کا ابھرنا ایک قدرتی جغرافیائی اور انتظامی ضرورت تھی۔ مورخ رچرڈ ایٹن (Richard Eaton) اور ماہر فن تعمیر جارج مائیکل (George Michell) کا نظریہ ہے کہ بہمنی ریاست کا قیام، محض دہلی سے کٹ کر ایک نئی حکومت بنانے کا نام نہیں تھا، بلکہ یہ ایک نئی 'دکنی پہچان' (Deccani Identity)

کا نقطہ آغاز تھا۔ ایٹن کے مطابق، اس ریاست نے شمالی ہند کے مہاجرین، مقامی دراوڑی ہندوؤں، اور ایران سے آنے والے 'آفاقیوں' کو ملا کر ایک ایسا منفرد ثقافتی اور سیاسی امتزاج پیدا کیا جو اس سے قبل جنوبی ہند میں ناپید تھا۔ اسی پس منظر میں 1347ء میں علاؤالدین حسن بہمن شاہ نے 'بہمنی سلطنت' کی بنیاد رکھی، جو دکن کی ایک طاقتور اور خود مختار مسلم ریاست بن کر ابھری۔

روایتی تاریخ میں عموماً بہمنی اور وجے نگر سلطنت کی جنگوں کو 'مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان مقدس مذہبی جنگ' کے طور پر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ برٹن اسٹین (Burton Stein) اور ہرمن کلکے (Hermann Kulke) کے نظریات برصغیر کی اس روایتی اور استعماری تاریخ نویسی کی سختی سے تردید کرتے ہیں۔ ہرمن کلکے کے مطابق بہمنی سلطنت کا قیام اور اس کا استحکام اس بات پر منحصر تھا کہ اس نے وجے نگر سلطنت کے خلاف کس طرح مقامی ہندو ریاستوں (جیسے تلنگانہ کے ویلما، آندھرا کے ریڈی، اڑیسہ کے گجپتی) کو ایک درمیانی ریاست (Buffer Sate) کے طور پر استعمال کیا۔ مزید برآں بہمنی ریاست کی ابتدا سے ہی ہندو اور مسلم ریاستوں کے درمیان تعلقات محض مذہبی بنیادوں پر نہیں بلکہ خالص سیاسی، معاشی (رائچور دوآب پر قبضے) اور اسٹریٹیجک مفادات کی بنیاد پر قائم تھے۔ دوسری طرف برٹن اسٹین نے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ کشمکش قطعی طور پر مذہبی نہیں تھی بلکہ اس کی بنیاد خالصتاً زمینی حقائق پر استوار تھی۔ اسٹین کے مطابق، بہمنی اور وجے نگر سلطنتوں کے درمیان تمام بڑی جنگوں کا اصل محرک 'رائچور دوآب' تھا۔ یہ دریائے کرشنا اور دریائے تنگبھدرا کے درمیان واقع ایک انتہائی زرخیز خطہ تھا، جہاں نہ صرف زراعت کی بے پناہ پیداوار ہوتی تھی، بلکہ یہاں لوہے اور ہیرے کی کانیں بھی موجود تھیں۔ دونوں ریاستوں کی معاشی بقا اور شاہی اخراجات کا انحصار اس دوآب کے خراج پر تھا، اس لیے یہ جنگ مذہبی نہیں بلکہ ایک سیاسی-اقتصادی جنگ تھی۔

لگ بھگ دو سو سالوں تک قائم رہنے والی اس سلطنت نے دکن کے جغرافیائی، سیاسی اور تہذیبی منظر نامے پر انمٹ نقوش چھوڑے۔ اس ریاست کا عروج جہاں خواجہ محمود گاواں جیسے مدبرین کی انتظامی، زرعی اور جدید عسکری اصلاحات کا مرہونِ منت تھا، وہیں اس کا زوال دربار میں 'آفاقی' اور 'دکنی' امراء کی باہمی کشمکش کا نتیجہ ثابت ہوا، جس کے بعد یہ عظیم سلطنت پانچ جانشین ریاستوں میں تقسیم ہو گئی۔

21.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- دکن میں بہمنی سلطنت کے قیام کے تاریخی پس منظر کو سمجھ سکیں گے۔
- اہم بہمنی حکمرانوں کے ادوار اور ان کے کارناموں کو سمجھ سکیں گے۔
- تلنگانہ کی ریاستوں، بالخصوص ویلما خاندان کے ساتھ، بہمنی سلطنت کی طویل سیاسی اور عسکری کشمکش کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- بہمنی سلطنت کی ترقی میں خواجہ محمود گاواں کے کردار پر روشنی ڈال سکیں گے۔
- بہمنی سلطنت کے معاشی، سماجی اور ثقافتی ارتقاء کا جائزہ لے سکیں گے۔
- جانشین ریاستوں کے عروج و زوال اور ان کی تہذیبی خدمات کو سمجھ سکیں گے۔

21.2 سیاسی پس منظر اور بہمنی سلطنت کا قیام

(Political Background and Establishment of Bahmani Empire)

چودھویں صدی عیسوی کا وسطی دور، ہندوستانی تاریخ میں علاقائی خود مختاری اور اہم سیاسی تبدیلیوں کا دور تسلیم کیا جاتا ہے۔ جنوبی ایشیا کی تاریخ میں یہ وہ وقت تھا جب شمالی ہند میں قائم، دہلی سلطنت کی مرکزیت زوال کا شکار ہونے لگی تھی اور اس کے نتیجے میں علاقائی طاقتوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ دہلی سلطنت کے حکمران محمد بن تغلق کی سخت گیر پالیسیوں اور خاص طور پر راجدھانی کو دہلی سے دکن کے شہر دولت آباد (جسے پہلے دیوگیری بھی کہا جاتا تھا) منتقل کرنے کے ناکام تجربے نے دکن کے جغرافیائی اور آبادیاتی منظر نامے کو ہمیشہ کے لیے تبدیل کر دیا۔ اس عظیم ہجرت کے نتیجے میں شمالی ہند کی اشرافیہ، نامور علماء، صوفیاء اور اعلیٰ تربیت یافتہ فوجی بڑی تعداد میں دکن میں آباد ہوئے، جس کی وجہ سے اس خطے میں ایک نئی سیاسی بیداری اور تہذیبی لہر نے جنم لیا۔ جب تغلق سلطنت کی گرفت دکن پر کمزور پڑنے لگی تو مقامی سطح پر تعینات امراء، جنہیں 'امیرانِ صدہ' (سو دیہاتوں یا سو فوجیوں کے انچارج) کہا جاتا تھا، میں شدید بے اطمینانی پھیل گئی۔ 1346ء میں سلطان محمد بن تغلق نے عزیز خمار نامی ایک ادنیٰ پس منظر والے شخص کو مالوہ، دھار اور دولت آباد کے خطے کا گورنر مقرر کیا۔ اسے خصوصی ہدایات دی گئیں تھیں کہ وہ دکن کے امیرانِ صدہ پر کڑی نظر رکھے اور ان کی سرگرمیوں کی جاسوسی کرے۔ اسی دوران گجرات، بڑودہ اور بھروچ میں شدید بغاوت بھڑک اٹھی۔ عزیز خمار نے اس بغاوت کو کچلنے کے لیے گجرات کا رخ کیا، لیکن وہاں باغیوں کے ہاتھوں شکست کھا کر مارا گیا۔

عزیز خمار کی موت کے بعد، محمد بن تغلق نے خود گجرات کی طرف کوچ کیا اور وہاں باغیوں کو شکست دے کر وقتی طور پر امن قائم کیا۔ گجرات میں قیام کے دوران ہی سلطان نے اپنے قاصدوں کے ذریعے دولت آباد کے امیرانِ صدہ کو اپنے دربار میں طلب کیا۔ اپنے بدترین انجام اور ممکنہ سزائے موت سے خوفزدہ ہو کر، دکن کے ان امیروں نے سلطان کے بھیجے گئے قاصدوں کو قتل کر دیا۔ ساتھ ہی انہوں نے مولانا نظام الدین کو قید کر لیا اور دہلی سلطنت کے کئی دیگر عہدیداروں کو موت کے گھاٹ اتار کر دکن میں باقاعدہ بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ بغاوت کے اعلان کے بعد، باغیوں نے دولت آباد کے شاہی خزانے پر قبضہ کر لیا اور گجرات سے آنے والے مزید امیروں کی کمک ملنے کے بعد ایک افغان امیر اسماعیل مخ کو ناصر الدین شاہ کے نام سے اپنا حکمراں منتخب کر لیا۔ اس بغاوت کو کچلنے کے لیے محمد بن تغلق، بھروچ سے دولت آباد پہنچا۔ ایک کھلی جنگ میں شاہی فوج نے باغیوں کو شکست دی جس کے بعد باغی پسپا ہو کر دولت آباد کے قلعے میں محصور ہو گئے۔ سلطان نے قلعے کا سخت محاصرہ کر لیا جو تین ماہ تک جاری رہا۔ لیکن عین اسی وقت گجرات میں طغی نامی باغی کی قیادت میں ایک اور خطرناک بغاوت پھوٹ پڑی۔ اس نئی اور سنگین بغاوت نے سلطان کو ایک انتہائی مشکل فیصلے پر مجبور کر دیا۔ مجبوراً محمد بن تغلق، دکن کی فتح کو ادھورا چھوڑ کر، اپنے جرنیلوں جیسے ملک جوہر، برہان الدین بلگرامی وغیرہ کو محاصرے کی ذمہ داری سونپ کر واپس گجرات کی طرف روانہ ہو گیا۔

سلطان کی دکن سے گجرات کی طرف واپسی، دہلی سلطنت کے لیے ایک فیصلہ کن اور مہلک موڑ ثابت ہوئی۔ سلطان کی غیر موجودگی کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے، منتشر امیرانِ صدہ نے ظفر خان کی زبردست قیادت میں خود کو دوبارہ منظم کیا۔ انہوں نے سلطان کے ایک اہم

جرنیل عماد الملک کو ایک خونریز جنگ میں شکست دے کر قتل کر دیا۔ اس کے بعد ظفر خان کی افواج نے دولت آباد پر دھاوا بولا اور محاصرہ کرنے والی باقی ماندہ شاہی فوج کو فیصلہ کن شکست دے کر دکن سے بھگا دیا۔ ظفر خان کی ان شاندار اور فیصلہ کن فتوحات کے بعد، اسماعیل مخ نے یہ تسلیم کر لیا کہ ظفر خان ہی قیادت کا اصل حقدار اور بہترین حکمران ثابت ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے بڑھاپے کا عذر پیش کرتے ہوئے رضاکارانہ طور پر تخت چھوڑ دیا۔ تمام دکنی امیروں کی تائید کے ساتھ 3 اگست 1347ء کو ظفر خان کی باقاعدہ تاج پوشی کی گئی۔ اس نے 'علاؤالدین بہمن شاہ' کا لقب اختیار کیا اور بہمنی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اس طرح، سلطان کی گجرات واپسی کی مجبوری، دکن کی مکمل آزادی کا سبب بنی، اور یہ خطہ ہمیشہ کے لیے دہلی سلطنت کے ہاتھ سے نکل کر ایک خود مختار مسلم سلطنت بن گیا۔

21.3 بہمنی سلطنت (Bahmani Sultanate)

21.3.1 علاؤالدین حسن بہمن شاہ (Alauddin Hasan Bahman Shah)

علاؤالدین حسن بہمن شاہ نے 1347ء سے 1358ء تک دس سال حکومت کی اور تخت نشین ہونے کے بعد ابتدائی طور پر گلبرگہ کو اپنا دارالحکومت مقرر کیا، جس کا نام تبدیل کر کے 'احسن آباد' رکھا گیا۔ حسن بہمن شاہ کی اصلیت اور اس کے خاندانی پس منظر کے حوالے سے عہدِ وسطیٰ کے مورخین اور جدید محققین میں خاصا اختلاف اور بحث پائی جاتی ہے۔ دہلی سلطنت کے نامور ہم عصر مورخ ضیاءالدین برنی کی تحریروں کے مطابق، حسن گنگو اپنی ابتدائی زندگی میں انتہائی غریب کسان تھا اور اس نے اپنی زندگی کے پہلے تیس سال ایک عام مزدور کے طور پر کھیتوں میں سخت مشقت کرتے ہوئے گزارے تھے، جس کے بعد اس کی دیانت داری سے متاثر ہو کر سلطان محمد بن تغلق نے اسے ایک سو گھڑ سواروں کا کمانڈر مقرر کیا تھا۔ اس کے برعکس، سولہویں صدی کے مشہور مورخ محمد قاسم فرشتہ نے ایک اور مشہور مگر متنازعہ روایت پیش کی ہے جس کے مطابق ظفر خان، دلی کے ایک برہمن نجومی 'گنگو پنڈت' کا ملازم تھا۔ اس روایت کے مطابق جب ظفر خان بادشاہ بنا تو اس نے اپنے محسن برہمن کی یاد اور تکریم میں 'گنگو' اور 'بہمن' (جو کہ برہمن کی بگڑی ہوئی شکل ہے) کا نام اختیار کیا، جس کی وجہ سے اس خاندان کو بہمنی خاندان کہا گیا۔ اگرچہ جدید تحقیق اور انسائیکلوپیڈیا ایرانیکا جیسے مستند ذرائع اسے ایک خراسانی مہم جو قرار دیتے ہیں اور بعض ہم عصر شعراء جیسے عصامی نے اسے افغان نژاد بتاتے ہوئے اس کا شجرہ نسب قدیم ایران کے مشہور افسانوی بادشاہ 'بہرام گور' یا 'بہمن بن اسفندیار' سے جوڑنے کی کوشش کی ہے، جسے فرشتہ نے سراسر خوشامد قرار دیا تھا۔ بہر حال، برہمن والی روایت جدید محققین کے نزدیک متنازعہ ہونے کے باوجود اس بات کی غمازی ضرور کرتی ہے کہ سلطنتِ بہمنیہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان قریبی اور رواداری پر مبنی تعلقات استوار کرنے میں کامیاب رہی تھی۔ بہمنی سلطنت کا قیام محض ایک وقتی سیاسی بغاوت کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ یہ شمال کے مرکز گریز رجحانات کے خلاف دکن کی علاقائی شناخت کو مستحکم کرنے کی ایک باشعور اور منظم کوشش تھی۔ بہمن شاہ نے اپنی نوائیدہ حکومت کو اخلاقی اور روحانی جواز فراہم کرنے کے لیے صوفی بزرگوں، خصوصاً چشتیہ سلسلے کے نامور مشائخ کی زبردست حمایت حاصل کی۔ صوفیاء کی جانب سے اسے ایک خرقہ (روحانی لباس) پہنایا گیا جسے پیغمبرِ اسلام سے منسوب کیا جاتا تھا، اور اس روحانی سرپرستی نے نوائیدہ سلطنت کی سیاسی بالادستی کو عوامی سطح پر ایسی زبردست قبولیت بخشی کہ دکن کی سرزمین لوٹ مار کے بجائے ایک باقاعدہ فلاحی ریاست میں تبدیل ہو گئی۔ اس کے دورِ حکومت کے اختتام تک سلطنت

کا رقبہ بحیرہ عرب کے مغربی ساحلوں سے مشرق میں بھونگیر تک، اور شمال میں دریائے وین گنگا (پین گنگا) سے لے کر جنوب میں دریائے کرشنا تک وسیع ہو چکا تھا۔

21.3.2 محمد شاہ اول (Mohammad Shah I)

بہمنی سلطنت نے اپنی تقریباً دو سو سالہ طویل تاریخ (1347ء سے 1527ء تک) میں کل 18 حکمرانوں کا دور دیکھا، جنہوں نے دکن کے جغرافیائی، معاشی اور سیاسی منظر نامے کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا۔ علاؤالدین حسن بہمن شاہ کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا محمد شاہ اول (1358ء سے 1377ء) تخت نشین ہوا، جسے بجا طور پر بہمنی سلطنت کا اصل منتظم اور عسکری معمار سمجھا جاتا ہے۔ محمد شاہ اول کا دورِ حکومت سلطنت کے انتظامی ڈھانچے کو ایک ٹھوس شکل دینے کے لیے جانا جاتا ہے، جس کے تحت اس نے سلطنت کو انتظامی لحاظ سے چار بڑے صوبوں میں تقسیم کیا، جنہیں 'طرف' کہا جاتا تھا۔ یہ چار اطراف، گلبرگہ، دولت آباد، برار، اور بیدر پر مشتمل تھے۔ ہر صوبے کا مکمل انتظام ایک اعلیٰ درجے کے گورنر کے سپرد کیا گیا جسے 'طرفدار' کہا جاتا تھا۔ یہ طرفدار اپنی ذاتی فوج رکھنے، محصولات جمع کرنے اور اپنے ماتحت علاقوں میں تمام دیوانی و فوجی تقرریاں کرنے کا مکمل اختیار رکھتا تھا۔ یہ نظام اگرچہ ابتدائی دور میں سلطنت کی تیزی سے توسیع اور استحکام کے لیے انتہائی کارگر ثابت ہوا، لیکن بعد ازاں تاریخی حقائق گواہ ہیں کہ یہی لامحدود صوبائی اختیارات سلطنت کے اندرونی انتشار اور حتمی زوال کا سبب بنے۔ محمد شاہ اول نے مرکزی حکومت کو منظم کرنے کے لیے آٹھ وزراء پر مشتمل ایک کونسل بھی تشکیل دی جس میں 'وکیل السلطنت' (وزیرِ اعظم) اور 'امیر الجملہ' (وزیرِ خزانہ) کے کلیدی عہدے شامل تھے۔ اسی کے دورِ حکومت میں بہمنی سلطنت اور اس کی جنوبی پڑوسی طاقتور ریاست، وجے نگر سلطنت (جس پر اس وقت بکا رائے اول کی حکومت تھی)، نیز مشرق میں ورنگل کی ریاست کے درمیان ان طویل اور خونریز جنگوں کا باقاعدہ آغاز ہوا جو سلطنت کے آخری ایام تک جاری رہیں۔ تاریخ دانوں اور محققین کا اس بات پر مکمل اتفاق ہے کہ ان جنگوں کی نوعیت بنیادی طور پر مذہبی نہیں تھی، بلکہ ان کا اصل اور مضبوط محرک دریائے کرشنا اور تنگبھدرا کے درمیان انتہائی زرخیز رائچور (Raichur) دوآب پر معاشی کنٹرول حاصل کرنا، گولکنڈہ اور کرشنا-گوداوری طاس کی ہیرے کی کانوں پر قبضہ اور خلیجِ بنگال کے نفع بخش تجارتی راستوں پر بالادستی قائم کرنا تھا۔ ان جنگی مہمات کی سب سے نمایاں اور تاریخی خصوصیت یہ تھی کہ محمد شاہ اول کی افواج نے وجے نگر اور ورنگل کے خلاف ہندوستانی تاریخ میں پہلی مرتبہ باقاعدہ طور پر بارود اور توپ خانے (Artillery) کا انتہائی موثر استعمال کیا، جس نے دکن کی جنگی حکمت عملیوں میں ایک بالکل نئے دور کا آغاز کیا اور بہمنی افواج کو فیصلہ کن عسکری برتری دلائی۔

21.3.3 درمیانی دور (Interregnum)

محمد شاہ اول کی وفات کے بعد بہمنی سلطنت کو ایک مختصر مگر پر فتن دور کے لیے شدید سیاسی اتھل پتھل اور خاندانی سازشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا بیٹا مجاہد شاہ (1375ء سے 1378ء) تخت نشین ہوا اور اس نے بھی وجے نگر کے خلاف جنگی مہمات کو پورے زور و شور سے جاری رکھا، لیکن بالآخر اسے اس کے اپنے ہی ایک رشتہ دار داؤد خان نے ایک گہری سازش کے تحت قتل کر کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ تاہم، داؤد

خان کا یہ غاصبانہ دور محض چند ماہ ہی چل سکا اور اسے مئی 1378ء میں مجاہد شاہ کی ایک رضاعی بہن کی سازش کے نتیجے میں قتل کر دیا گیا، جس کے بعد محمد شاہ ثانی (1378ء سے 1397ء) نے اقتدار کی باگ ڈور سنبھالی۔ محمد شاہ ثانی کا دورِ حکومت خونریز جنگی مہمات کے بجائے مکمل امن، اندرونی استحکام، ثقافتی ترقی اور رفاہی کاموں کے لیے تاریخ میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ اس نے اپنے تمام پڑوسیوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کیے، عوام کی فلاح کے لیے متعدد ہسپتال، مساجد اور جدید تعلیمی ادارے قائم کیے، اور فنونِ لطیفہ کی دل کھول کر ریاستی سرپرستی کی۔ اس کی وفات کے بعد ایک بار پھر درباری سازشوں نے سر اٹھایا؛ اس کا جانشین غیاث الدین بمشکل چند ماہ ہی حکومت کر پایا تھا کہ تغلبکھی نامی ایک غلام نے اسے دھوکے سے اندھا کر کے معزول کر دیا اور شمس الدین کو کٹھ پتلی کے طور پر تخت پر بٹھا دیا، جسے بعد ازاں تاج الدین فیروز شاہ نے عسکری شکست دے کر اقتدار مکمل طور پر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

21.3.4 تاج الدین فیروز شاہ (Tajuddin Firoz Shah)

تاج الدین فیروز شاہ (1397ء سے 1422ء) کا دورِ حکومت بہمنی سلطنت کا سنہری ترین، روشن، اور عظیم ثقافتی و تہذیبی دور تصور کیا جاتا ہے۔ فیروز شاہ محض ایک عظیم فاتح نہیں تھا جس نے سلطنت کی سرحدوں کو مزید وسعت دی، بلکہ وہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان کے سب سے زیادہ پڑھے لکھے، علم دوست اور روشن خیال حکمرانوں میں شمار ہوتا تھا۔ مورخین کے مستند حوالوں کے مطابق، اسے بیک وقت متعدد علاقائی اور بین الاقوامی زبانوں جن میں عربی، فارسی، ترکی کے علاوہ تیلگو، کنڑ، اور مراٹھی شامل ہیں پر مکمل عبور حاصل تھا اور وہ اکثر ان زبانوں میں فی البدیہہ اشعار بھی کہتا تھا۔ اس نے دکن میں سلطنت کی روایتی تنگ نظری کو یکسر ختم کرتے ہوئے ہندو برہمنوں کو ریاستی انتظامیہ میں بڑے پیمانے پر شامل کیا اور انہیں اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز کیا، جس کے نتیجے میں دکنی برہمنوں کا ریاستی امور میں ایک ایسا گہرا رسوخ پیدا ہوا جو بعد کی صدیوں تک برقرار رہا اور ثقافتی ہم آہنگی کو فروغ ملا۔ فیروز شاہ کی ذاتی دلچسپی قدرتی علوم، فلکیات، منطق، ہندسہ اور نباتیات میں بے حد گہری تھی، اور اسی علمی شوق کی تکمیل کے لیے اس نے دولت آباد کے قریب ایک عظیم الشان رصد گاہ (Observatory) بھی تعمیر کروائی تاکہ دکن میں علمِ فلکیات کو باقاعدہ ریاستی سطح پر فروغ دیا جا سکے۔ عسکری محاذ پر اس نے کھیر لا کے گونڈ راجہ نرسنگھ رائے کو فیصلہ کن شکست دے کر برار کی جانب سلطنت کو وسیع کیا اور خراج کے طور پر بے پناہ سونا اور چاندی حاصل کیا، نیز راجہ کی بیٹی سے شادی کر کے سیاسی اتحاد کو بھی مضبوط کیا۔ جب وجے نگر کے راجہ دیوا رایا اول کے ساتھ جنگ میں اسے فتح حاصل ہوئی تو امن معاہدے کے تحت دیوا رایا نے اپنی بیٹی کی شادی فیروز شاہ سے کر دی، جو دکن کی تاریخ میں ہندو۔ مسلم سیاسی و خاندانی اتحاد کی ایک انتہائی اہم نظیر سمجھی جاتی ہے۔ فیروز شاہ نے مغربی ساحل پر چول اور دابھول کی انتہائی اہم بندرگاہوں کو بھی بھرپور ترقی دی، جس کے نتیجے میں ایران اور مشرقِ وسطیٰ کے ساتھ بحری تجارت میں زبردست اضافہ ہوا۔ تاہم فیروز شاہ کی زندگی کے آخری ایام انتہائی کرب ناک گزرے؛ 1420ء میں اسے وجے نگر کے دیوا رایا اول کے ہاتھوں ایک زبردست اور حیران کن شکست کا سامنا کرنا پڑا جس سے اس کی صحت بری طرح گر گئی اور ریاستی اقتدار پر اس کی گرفت کمزور پڑ گئی، یہاں تک کہ 1422ء میں اس کے اپنے بھائی احمد شاہ نے (بعض تاریخی روایات کے مطابق اسے قتل کر کے) اقتدار پر مکمل قبضہ کر لیا۔

21.3.5 شہاب الدین احمد شاہ ولی (Shahabuddin Ahmad Shah Wali)

تاج الدین فیروز شاہ کے بعد شہاب الدین احمد شاہ ولی (1422ء سے 1436ء) نے تخت سنبھالا، جس کا دورِ حکومت بہمنی سلطنت کے جغرافیائی اور ثقافتی تشخص میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ احمد شاہ نے تخت نشین ہونے کے فوراً بعد وجے نگر کی افواج سے پچھلی شکست کا بدلہ لینے کے لیے ایک زبردست فوجی مہم کا آغاز کیا اور وجے نگر کی راجدھانی کا طویل محاصرہ کر کے انہیں بھاری خراج دینے پر مجبور کر دیا۔ احمد شاہ کے دور کا سب سے اہم اور دور رس فیصلہ 1425ء میں دارالحکومت کو گلبرگہ سے ہٹا کر 'بیدر' منتقل کرنا تھا، جسے نئے دارالحکومت کے طور پر 'محمد آباد' کا نام دیا گیا۔ اس تاریخی منتقلی کی کئی ٹھوس جغرافیائی اور تزویراتی وجوہات تھیں؛ اول تو یہ کہ بیدر جغرافیائی طور پر سلطنت کے بالکل وسط میں واقع تھا جس سے تمام صوبوں پر کنٹرول آسان تھا، دوم اس کا موسم گلبرگہ کی نسبت زیادہ خوشگوار، معتدل اور صحت افزا تھا، اور سوم یہ کہ نئی فتوحات کے باعث سلطنت کی سرحدیں بہت وسیع ہو چکی تھیں اس لیے شمال میں مالوہ اور گجرات، اور مشرق میں تلنگانہ پر بہتر عسکری گرفت کے لیے بیدر کا مقام انتہائی موزوں تھا۔ احمد شاہ نے بیدر میں ایک عظیم الشان قلعہ تعمیر کروایا اور اسے ایرانی اور وسطی ایشیائی طرزِ تعمیر کے بے مثال شاہکاروں سے مزین کیا۔ احمد شاہ کا ذاتی رجحان روحانیت اور تصوف کی جانب بہت زیادہ تھا، جس کی وجہ سے اس نے ایران سے مشہور صوفی بزرگ شاہ نعمت اللہ ولی کو دکن آنے کی خصوصی دعوت دی۔ اس دعوت اور ایرانی صوفیاء کی دکن آمد کے نتیجے میں خطے میں تشیع، ایرانی ثقافت اور علم و ادب کو زبردست فروغ ملا، لیکن ساتھ ہی احمد شاہ کے اسی دور سے دکن میں مقامی مسلمانوں (دکنی) اور ایران و عراق سے نئے آنے والے تارکینِ وطن (آفاقی) کے درمیان اقتدار اور مفادات کی اس طویل کشمکش کے بیج بھی بوئے گئے جس نے بالآخر اس عظیم سلطنت کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا۔

21.4 تلنگانہ کے معاملات (Struggle for Telangana)

21.4.1 ریچرلا کا ویلما خاندان (Velamas of Recherla)

بہمنی سلطنت کی مسلسل جغرافیائی توسیع اور جنگی مہمات میں مشرقی خطے، بالخصوص تلنگانہ کی فتوحات نے ایک انتہائی طویل، پیچیدہ اور خونریز تاریخ رقم کی ہے۔ تاریخی حقائق کے تفصیلی مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ چودھویں صدی عیسوی میں کاکتیہ سلطنت کے حتمی زوال اور 1323ء میں تغلق شہزادے الغ خان (جو بعد میں محمد بن تغلق کہلایا) کے ہاتھوں کاکتیہ راجہ پرتاپ رودر کی شکست کے بعد، نلگنڈہ اور محبوب نگر کے دور افتادہ علاقے ریچرلا میں ایک طاقتور مقامی جنگجو کسان ذات نے سر اٹھایا۔ اس ذات کو 'ویلما' (Velamas) کے نام سے جانا جاتا تھا اور انہوں نے اس سیاسی خلا کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی ایک آزاد اور خود مختار ریاست کی بنیاد رکھی۔ اس ابھرتے ہوئے خاندان کا بانی بیتال نایک (Betala Nayaka) تھا، جس کا تعلق بنیادی طور پر نلگنڈہ کے علاقے آمنگل سے تھا۔ کاکتیہ دورِ حکومت میں یہ لوگ محض وفادار جاگیر دار اور فوجی کمانڈر کی حیثیت رکھتے تھے۔ کاکتیہ سلطنت کے خاتمے کے بعد انہوں نے دہلی کے مقامی گورنر ملک مقبول کی انتظامی کمزوری اور تغلق سلطنت کے زوال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بغاوت کر دی۔ سنگام نایک اول (Singama Nayaka I) نے باقاعدہ طور پر ایک مضبوط اور آزاد ویلما ریاست کی بنیاد رکھی، جس کی سرحدیں بڑی تیزی سے کرشنا اور تنگبھدرا ندیوں کے کناروں تک اور

یلیشورم (Yeleswaram) کے وسیع علاقوں تک پھیل گئیں۔ سنگام نایک کی وفات کے بعد، اس کے جانشین اور بیٹے اناپوتا نایک اول (Anapota Nayaka I) نے سیاسی وجوہات کی بنا پر اپنی راجدھانی آمنگل سے ہٹا کر رچاکونڈا (Rachakonda) کی پہاڑیوں پر منتقل کر دی اور وہاں ایک ایسا ناقابل تسخیر قلعہ تعمیر کیا جو دکن کی فوجی تاریخ میں ایک شاہکار مانا جاتا ہے۔ اپنی مشرقی اور جنوبی سرحدوں کو مزید محفوظ اور مستحکم بنانے کے لیے اس نے اپنے بھائی مادھا نایک کو دیور کونڈا (Devarakonda) کا حکمران مقرر کیا، جس کے بعد یہ دونوں شاخیں تاریخ میں رچاکونڈا اور دیورا کونڈا کے ویلما سرداروں کے نام سے مشہور اور پہچانی جانے لگیں۔ یہ نوزائیدہ ریاست دراصل بہمنی سلطنت اور طاقتور وجے نگر سلطنت کے درمیان ایک انتہائی حساس اور اسٹریٹیجک درمیانی ریاست کی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔

علاؤالدین حسن بہمن شاہ کے لیے اپنی نوخیز سلطنت کی مشرقی سرحدوں کو محفوظ بنانے کے لیے ورنگل کی ریاست کے سرحدی قلعہ، کولاس (موجودہ ضلع کاماریڈی) پر قبضہ کرنا ناگزیر تھا۔ چنانچہ 1350ء میں بہمنی افواج نے کولاس پر قبضہ کر لیا اور قلعہ کی محافظ، وارنگل کے حکمراں کپایا نایک کی فوج کو شکست دی۔ یہ تلنگانہ میں بہمنی سلطنت کی فوجی پیش قدمی کا پہلا اور ٹھوس قدم تھا۔ قلعہ کولاس ہاتھ سے نکلنے کے بعد کپایا نایک نے وجے نگر سلطنت کے ساتھ مل کر بہمنیوں کے خلاف بغاوت کی کوشش کی۔ اس کے جواب میں سلطان محمد شاہ اول نے 1364-1365ء کے لگ بھگ تلنگانہ پر ایک زبردست حملہ کیا۔ اس مہم کے نتیجے میں بہمنی افواج نے گولکنڈہ کے قلعے پر قبضہ کر لیا، جو ایک بہت بڑا اسٹریٹجک سنگِ میل تھا۔ کپایا نایک کو مجبوراً ایک ذلت آمیز امن معاہدہ کرنا پڑا، جس کے تحت اس نے نہ صرف گولکنڈہ کا علاقہ بہمنیوں کے حوالے کیا، بلکہ بھاری تاوان کے ساتھ مشہور 'تختِ فیروزہ' بھی سلطان کو تحفے میں دیا، جو بعد میں بہمنی سلاطین کا شاہی تخت بنا۔ اس معاہدے کے بعد گولکنڈہ بہمنی سلطنت کی مستقل سرحد بن گیا۔ پندرہویں صدی کی شروعات میں بہمنی سلطنت کا دباؤ تلنگانہ پر مزید بڑھ گیا۔ سلطان احمد شاہ ولی نے تلنگانہ کی نیم خود مختار ریاستوں کا مکمل خاتمہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ 1424-1425ء میں اس نے ورنگل پر ایک فیصلہ کن حملہ کیا۔ اس حملے میں ورنگل کی باقی ماندہ طاقت کو مکمل طور پر کچل دیا گیا اور ورنگل کو باقاعدہ طور پر بہمنی سلطنت میں ضم کر لیا گیا۔ یوں کاکتیہ سلطنت کے بعد ابھرنے والی مقامی ریاستوں کا ورنگل سے ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔

21.4.2 دیورا کونڈا کی تاریخی جنگ (Historical War of Devrakonda)

ورنگل کے زوال کے بعد تلنگانہ میں ریچرلا کے ویلما سردار جو راچا کونڈا اور دیور کونڈا سے حکومت کر رہے تھے، بہمنیوں کے سب سے بڑے حریف بن گئے۔ بہمنی سلاطین خاص طور پر فیروز شاہ بہمنی اور احمد شاہ نے ان سرداروں کے خلاف ایک پیچیدہ حکمت عملی اپنائی۔ جب بہمنیوں کو وجے نگر سلطنت پر حملہ کرنا ہوتا، تو وہ اکثر ویلما سرداروں کو اپنے ساتھ ملا لیتے تھے تو کبھی جب ویلما سردار وجے نگر یا اڑیسہ کی گجپتی سلطنت کی طرف جھکتے، تو بہمنی ان کے قلعوں پر حملے کرتے تھے۔ ویلما سرداروں اور بہمنی سلطنت کی اس طویل کشمکش کا نقطہ عروج 1458ء میں لڑی جانے والی دیور کونڈا کی تاریخی اور خونریز جنگ تھی، جس نے دکن اور مشرقی ساحل کے جغرافیائی اور سیاسی توازن کو ہلا کر رکھ دیا۔ ویلما سرداروں کی جانب سے بار بار وجے نگر سلطنت کی فوجی مدد کرنے پر بہمنی سلطان ہمایوں شاہ نے شدید طیش میں آ کر دیور کونڈا

کے ویلما سردار گجراو ٹپا(Gajaravo Tippa) کو مستقل سبق سکھانے اور اس ریاست کا نام و نشان مٹانے کا فیصلہ کیا۔اس مقصد کے لیے اس نے اپنے مایہ ناز کمانڈر سنجر خان کی قیادت میں ایک زبردست فوج دیور کونڈا کی طرف روانہ کی، جس کی فوجی طاقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس میں 100 سے زائد جنگی ہاتھی شامل تھے جو قلعوں کے دروازے توڑنے کے لیے مخصوص تھے۔اس انتہائی نازک موقع پر، محصور ویلما سردار نے اڑیسہ کے طاقتور حکمران گجپتی کپلیندر دیو(Gajapati Kapilendra Deva) سے فوری اور ہنگامی فوجی مدد طلب کی۔کپلیندر دیو نے اس موقع کی نزاکت اور خطے میں اپنا اثر ورسوخ بڑھانے کے سنہری امکان کو بھانپتے ہوئے بنا تاخیر اپنے بیٹے اور سلطنت کے عظیم کمانڈر شہزادہ ہمویرادیو کی قیادت میں ایک انتہائی طاقتور اور تازہ دم اڑیا فوج، دیور کونڈا کے محاذ پر روانہ کر دی۔جنگی حکمت عملی کے تحت، ایک طرف گجپتی فوج نے بیرونی طرف سے بہمنی کیمپ پر انتہائی اچانک، زوردار اور غیر متوقع حملہ کیا، جب کہ ٹھیک اسی وقت قلعے کے اندر محصور ویلما سرداروں نے قلعے کے بھاری دروازے کھول کر پشت سے دھاوا بول دیا۔اس دو طرفہ، اچانک اور انتہائی منظم حملے کے نتیجے میں بہمنی فوج مکمل طور پر محاصرے میں آگئی اور اسے تاریخ کی بدترین اور رسوا کن ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔

اس خونریز جنگ میں تقریباً 6 سے 7 ہزار بہمنی سپاہی مارے گئے، جب کہ جان بچا کر بھاگنے والے باقی ماندہ صحراؤں کی تپش اور پیاس کا شکار ہو کر ہلاک ہو گئے۔ بہمنی فوج کا سارا ساز و سامان، اعلیٰ نسل کے جنگی گھوڑے اور قیمتی جنگی ہاتھی گجپتی فوج کے قبضے میں چلے گئے۔اس عظیم الشان فتح کے فوراً بعد ہمویرادیو نے اپنی پیش قدمی جاری رکھی اور کھمم(Khammam) اور ورنگل کے ناقابل تسخیر قلعوں کو بھی فتح کر لیا، جس کے نتیجے میں دیور کونڈا سمیت پورا تلنگانہ گجپتی سلطنت کا باجگزار بن گیا۔اس جنگ نے اڑیسہ کے کپلیندر دیو کو اس قدر طاقتور اور پراثر کر دیا کہ اس نے فخر سے 'کلاور گیشور' (کلبرگہ کا آقا) کا شاندار لقب اختیار کر لیا۔اگرچہ ویلما سردار گجراو ٹپا نے دیور کونڈا کو بہمنیوں سے بچا لیا تھا، لیکن اس جنگ کے بعد ویلما ریاست کی آزاد اور خود مختار حیثیت عملی طور پر ختم ہو گئی۔اب وہ گجپتی سلطنت کے ماتحت اور باجگزار بن کر رہ گئے۔ گجپتیوں نے تلنگانہ پر اپنا کنٹرول برقرار رکھنے کے لیے ویلما سرداروں کو اپنے نمائندوں کے طور پر استعمال کیا۔

21.5 خواجہ محمود گاواں (Khwaja Mahmud Gawan)

بہمنی سلطنت کی پوری دو سو سالہ تاریخ کا اگر بغور اور تنقیدی جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ کوئی بھی حکمران، سلطان یا منتظم اس عظمت، بصیرت اور تاریخی اہمیت کو نہیں چھو سکا جو 'خواجہ عماد الدین محمود گاواں' کے حصے میں آئی۔وہ دراصل ایک ایرانی نژاد تاجر، مفکر اور عالم تھا جو گیلان (ایران) سے ہجرت کر کے 42 سال کی پختہ عمر میں محض تجارت اور صوفیاء سے ملاقات کی غرض سے 1453ء میں ہندوستان (دکن) کے ساحل دابھول پر اترا تھا۔اس کی بے پناہ ذہانت، حاضر دماغی، سفارتی مہارت اور علمی قابلیت کو دیکھتے ہوئے بہمنی سلطان ہمایوں شاہ نے اسے شاہی دربار میں انتہائی اعلیٰ مقام دیا اور اس کی خدمات کے اعتراف میں اسے 'ملک التجار' (تاجروں کا سردار) کے گرانقدر خطاب سے نوازا۔

ہمایوں شاہ کی ناگہانی وفات کے بعد جب اس کے کمسن بیٹے نظام شاہ کی تخت نشینی کا وقت آیا، تو ریاست کا نظام چلانے کے لیے جو

مجلسِ شوریٰ (Regency Council) تشکیل دی گئی، جس میں ملکہ مخدومہ جہاں (نظام شاہ کی والدہ)، محمود گاواں اور خواجہ جہاں ترک شامل تھے۔ محمود گاواں اس کا سب سے طاقتور اور کلیدی رکن تھا۔ کمسن نظام شاہ کی جلد وفات کے بعد جب اس کے بھائی محمد شاہ سوم (1463ء سے 1482ء) نے اقتدار کی باگ ڈور سنبھالی، تو محمود گاواں کو باقاعدہ طور پر سلطنت کا وزیرِ اعظم (وکیل السلطنت) مقرر کر دیا گیا اور اسے دربار کے اعلیٰ ترین لقب 'خواجہِ جہاں' سے سرفراز کیا گیا۔ گاواں کا یہ 23 سالہ طویل، دورِ وزارت (1458ء سے 1481ء) مورخین کے نزدیک بہمنی سلطنت کا مطلق نقطہ عروج تسلیم کیا جاتا ہے، جس نے دکن کی سیاست، معیشت، فوجی ساخت اور جغرافیہ کو ہمیشگی کی بنیاد پر تبدیل کر کے رکھ دیا۔

21.5.1 فوجی مہمات اور فتوحات

تاریخ دانوں، بالخصوص ایچ کے شیروانی اور رچرڈ ایٹن کے مطابق، خواجہ محمود گاواں بہمنی سلطنت کا سب سے قابل اور طاقتور وزیر اعظم تھا۔ اس کی سیاسی اور عسکری فتوحات کی بدولت بہمنی سلطنت اپنے عروج پر پہنچی اور اس کی سرحدوں میں بے مثال وسعت آئی۔ محمد شاہ سوم کے دورِ حکومت میں، محمود گاواں نے اپنی شاندار فوجی حکمتِ عملی اور سفارت کاری سے سلطنت کو چاروں اطراف سے پھیلایا اور اندرونی و بیرونی خطرات کا بخوبی مقابلہ کیا۔

کمسن سلطان نظام شاہ بہمنی کے دور حکومت میں اڑیسہ کے توسیع پسند اور طاقتور گجپتی حکمران کپلیندر دیو نے کمزور مرکز کو ایک سنہری موقع سمجھا۔ اس نے تلنگانہ کے مقامی زمینداروں (خاص طور پر ویلما سرداروں) کی حمایت حاصل کی اور ایک عظیم الشان لشکر لے کر 1461ء میں سیدھے بہمنی دارالحکومت بیدر کا رخ کیا۔ گجپتی افواج نے راستے میں زبردست تباہی مچائی اور بیدر کے قلعے کے بالکل قریب پہنچ کر خیمہ زن ہو گئیں۔ دارالحکومت پہلی بار اس قدر سنگین بیرونی خطرے کی زد میں تھا، اور گجپتیوں کا ہراول دستہ شہر کے دروازوں پر دستک دے رہا تھا۔ دارالحکومت کے دفاع کی پوری ذمہ داری مجلسِ شوریٰ پر عائد تھی، جس نے محمود گاواں کی قیادت میں انتہائی مشکل حالات میں شاندار عسکری اور سیاسی حکمتِ عملی کا مظاہرہ کیا۔ ملکہ نے قلعے کے اندر سے معاملات کو سنبھالا اور کمسن سلطان کو ساتھ رکھ کر فوج کے حوصلے بلند کیے، جب کہ میدانِ جنگ کی ذمہ داری محمود گاواں اور خواجہ جہاں ترک کو سونپی۔ گجپتی فوج فتح کے نشے میں بے احتیاط ہو چکی تھی۔ محمود گاواں اور خواجہ جہاں ترک نے تقریباً چالیس ہزار شہسواروں پر مشتمل ایک زبردست فوج کو منظم کیا اور گجپتی خیموں پر اچانک اور زوردار حملہ کر دیا۔ اس اچانک اور سخت حملے کی تاب نہ لاتے ہوئے کپلیندر دیو کو بھاری جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ بہمنی مرکز اتنا کمزور نہیں جتنا اس نے سمجھا تھا۔ دوسری طرف اسے خبر پہنچی کے جونپور کے شرقی سلطان حسین شاہ نے اس کے ملک اڑیسہ پر حملہ کر دیا ہے۔ ناچار وہ محاصرہ اٹھانے اور دارالحکومت سے اپنی سرحدوں کی جانب پسپا ہونے پر مجبور ہو گیا۔

بیدر پر ہونے والے اس حملے نے محمود گاواں کو یہ باور کرا دیا تھا کہ جب تک مشرقی سرحدوں (تلنگانہ اور ساحلی آندھرا) کو مکمل طور پر فتح کر کے وہاں مضبوط دفاعی حصار نہیں بنایا جاتا، گجپتیوں کا خطرہ منڈلاتا رہے گا۔ سلطان محمد شاہ سوم (1463–1482ء) کے دور میں

بحیثیتِ وکیل السلطنت، گاواں نے فیصلہ کن کارروائیاں کیں۔ 1470ء میں کپلیندر دیو کی وفات کے بعد، اڑیسہ میں اس کے بیٹوں ہمویرا اور پرشوتم دیو کے درمیان تخت کے لیے خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ محمود گاواں نے اس اندرونی انتشار کا بھرپور فوجی اور سفارتی فائدہ اٹھایا۔ 1471-1472ء کے قریب، محمود گاواں نے بہمنی افواج کی قیادت کرتے ہوئے گوداوری کے ڈیلٹا میں واقع گجپتیوں کے انتہائی اہم اور مضبوط قلعوں، خاص طور پر راجمندری (Rajahmundry) پر چڑھائی کی۔ ایک طویل اور سخت محاصرے کے بعد ان قلعوں کو فتح کر لیا گیا۔ راجمندری کے بعد گاواں نے گجپتیوں کے دوسرے مضبوط ترین گڑھ کونڈاپلی (Kondapalli) پر حملہ کیا۔ پرشوتم دیو نے مزاحمت کی کوشش کی لیکن محمود گاواں کی اعلیٰ جنگی حکمتِ عملی کے سامنے اسے شکست تسلیم کرنی پڑی اور امن کا معاہدہ کرنا پڑا۔ ان زبردست فتوحات کے نتیجے میں گجپتیوں کو اڑیسہ کے اندر تک دھکیل دیا گیا۔ بہمنی سلطنت کی مشرقی سرحدیں پہلی بار خلیجِ بنگال کے ساحلوں کو چھونے لگیں اور پورا آندھرا اور تلنگانہ کا خطہ مستقل طور پر بہمنی تسلط میں آ گیا۔

مالوہ کے حکمران محمود خلجی نے جب بہمنی سلطنت پر تسلط قائم کرنے کی کوشش کی، تو محمود گاواں نے اپنی زبردست سفارتی مہارت کا استعمال کرتے ہوئے گجرات کے سلطان سے اتحاد کیا اور مالوہ کی فوج کو پسپا کر کے برار کے زرخیز شمالی صوبے پر سلطنت کا مکمل کنٹرول قائم کیا۔ اس کی سب سے بڑی کامیابی مغربی ساحل (کونکن) کی فتح کو قرار دیا گیا ہے۔ محمود گاواں نے خلیجِ عرب کے ساحلی علاقوں پر اپنا کنٹرول قائم کرنے کے لیے سنگمیشور کے راجا کو شکست دی۔ جنوبی ہند میں وجے نگر سلطنت کے خلاف اس کی جارحانہ پالیسی کے نتائج بھی شاندار تھے۔ اس نے وجے نگر سلطنت سے گوا اور دابھول جیسی انتہائی اہم اور اسٹریٹجک بندرگاہیں چھین لیں۔ تاریخی حوالوں کے مطابق، اس کی ایک اور نمایاں فتح بلگام کے مضبوط قلعے کا محاصرہ اور تسخیر تھی، جس میں دکن کی تاریخ میں پہلی بار بارود اور توپوں کا بڑے پیمانے پر اور مؤثر استعمال کیا گیا۔ اس کے علاوہ، اس کی افواج نے جنوب میں کانچی پورم (کانچی) تک کامیاب پیش قدمی کی۔ ان فتوحات کے دوررس سیاسی اور معاشی اثرات مرتب ہوئے۔ اس سے نہ صرف ایران اور مشرقِ وسطیٰ کے ساتھ تجارتی تعلقات مضبوط ہوئے، بلکہ وجے نگر سلطنت کو سمندری راستے سے ملنے والی عربی گھوڑوں کی سپلائی بھی کٹ گئی، جس نے حریف سلطنت کی فوجی طاقت کو شدید نقصان پہنچایا۔ دوسری طرف ان فتوحات نے بہمنی سلطنت کو ایک عظیم الشان سلطنت میں بدل دیا، جس کی حدیں ایک طرف بحیرہ عرب اور دوسری طرف خلیج بنگال تک پھیل گئیں۔

21.5.2 جدید جنگی حکمتِ عملی

محمود گاواں نے وجے نگر سلطنت کے خلاف بلگام کی جنگ میں پہلی مرتبہ موثر طور پر بارود (Gunpowder) اور کیمیائی ہتھیاروں کا بڑے پیمانے پر استعمال کیا۔ اس طرح محمود گاواں نے عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی عسکری تاریخ میں ایک نیا باب رقم کیا۔ اس جدید جنگی حکمت عملی کے لیے اس نے خاص طور پر ایران سے کیمیادانوں اور اعلیٰ پائے کے انجینئروں کو مدعو کیا، جنہوں نے بہمنی سپاہیوں کو بارود کی تیاری اور اس کے جنگی و تخریبی استعمال کی جدید تربیت دی۔ ان ہتھیاروں کی بدولت قلعوں کو توڑنا بے حد آسان ہو گیا۔ اس نے فوج کے اندر موجودہ بدعنوانی کا خاتمہ کر کے کڑا نظم وضبط قائم کیا اور عام سپاہیوں کی فلاح و بہبود کے لیے ٹھوس اقدامات کیے۔ فوجی بدعنوانی کو روکنے کے

لیے اس نے تنخواہوں کا ایک سائنسی اور طے شدہ نظام وضع کیا، جس کے تحت ہر فوجی افسر کی تنخواہ اور جاگیر، اس کے ماتحت 500 سپاہیوں کے حساب سے طے کی گئی اور اگر کوئی افسر معائنے کے وقت تعداد پوری نہ رکھتا تو اس کی جاگیر سے کٹوتی کی جاتی تھی۔

21.5.3 گاواں کی انتظامی اور زرعی اصلاحات

تاہم، سلطنت کی اس تیزی سے ہوتی ہوئی زبردست جغرافیائی توسیع نے پرانے انتظامی ڈھانچے کو مکمل طور پر بے اثر اور بوسیدہ کر دیا تھا۔ محمد شاہ اول کے مقرر کردہ پرانے چار صوبے (طرف) اب رقبے کے لحاظ سے اتنے بڑے ہو چکے تھے کہ ان کے طرفدار (صوبیدار)، وسائل اور فوج کے اعتبار سے سلطان سے بھی زیادہ طاقتور ہو گئے تھے، جو آئے دن مرکز کے خلاف بغاوت کے خطرات کو جنم دے رہے تھے۔ اس سنگین اور تشویشناک مسئلے کے مستقل حل کے لیے محمود گاواں نے سلطنت کے انتظامی ڈھانچے میں انقلابی اصلاحات متعارف کروائیں، جنہیں تاریخ میں گاواں کی اصلاحات کہا جاتا ہے۔ اس نے پرانے چار طرفوں (صوبوں) کو از سرِ نو تقسیم کر کے آٹھ چھوٹے صوبے بنا دیے جس میں مشرقی خطے کو سنبھالنے کے لیے 'راجمندری' اور 'وارنگل' کے نام سے دو نئے اور اہم صوبے تشکیل دیے گئے۔ اس اقدام سے راتوں رات گورنروں کا رقبہِ اختیار اور وسائل نصف رہ گئے۔ اس سے قبل طرفدار اپنے وسیع صوبے میں موجود درجنوں قلعوں پر مکمل اور بلا شرکتِ غیرے اختیار رکھتے تھے اور ان کے قلعہ داروں کا تقرر بھی اپنی مرضی سے خود کرتے تھے، جس سے وہ اپنی الگ ریاست بنا لیتے تھے۔ گاواں نے ان کی اس طاقت کو سلب کرتے ہوئے ایک نیا اور سخت قانون نافذ کیا کہ اب ہر صوبائی گورنر کے ماتحت صرف ایک ہی قلعہ رہے گا (جو عموماً صوبائی دارالحکومت کا قلعہ ہوتا تھا)، جبکہ صوبے کے باقی تمام اہم قلعے براہِ راست مرکزی حکومت کی ملکیت (خالصہ) سمجھے جائیں گے اور ان کے قلعہ داروں کا تقرر براہِ راست سلطان کے دربار سے کیا جائے گا، تاکہ بغاوت کے امکان کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جا سکے۔ مزید برآں، اس نے پوری سلطنت میں اراضی کی پیمائش (Land Measurement) کا ایک باقاعدہ اور منظم نظام متعارف کروایا، جس سے نہ صرف کسانوں کا استحصال کم ہوا بلکہ محصولات کی وصولی میں بھی شفافیت آئی اور ریاستی آمدنی میں بے پناہ اضافہ ہوا۔

بہمنی سلطنت کی مرکزی انتظامیہ میں اختیارات کی تقسیم کا ایک انتہائی منظم خاکہ موجود تھا، جسے محمود گاواں نے اپنی بصیرت سے مزید مستحکم کیا۔ سلطنت کا انتظامی سربراہ، وزیرِ اعظم (جسے وکیل السلطنت یا وزیر کہا جاتا تھا) ہوتا تھا، جو تمام شہری اور فوجی محکموں کی کڑی نگرانی کرتا تھا اور براہِ راست سلطان کو جوابدہ ہوتا تھا۔ 'صدرِ جہاں' سلطنت کے مذہبی امور، عدالتی نظام، اور رفاہی اداروں کا اعلیٰ ترین سربراہ تھا، جس کی ذمہ داری شریعت کے نفاذ اور قاضیوں کا تقرر تھا۔ امورِ خارجہ، بیرونی ریاستوں سے سفارت کاری، خط و کتابت اور شاہی دربار کی رسومات کا نگران 'وزیرِ اشرف' کہلاتا تھا۔ فوج کا کمانڈر انچیف 'امیر الامراء' تھا، جس کی کلیدی ذمہ داری جنگی مہمات کی قیادت کرنا اور افواج میں سخت نظم و ضبط برقرار رکھنا تھا، جب کہ صوبائی سطح پر 'طرفدار' (صوبیدار) اپنے ماتحت علاقے میں سول انتظامیہ اور محدود عسکری دستوں کا نگران تھا۔ محمود گاواں محض ایک جنگجو، ماہرِ معاشیات یا سیاست دان ہی نہیں تھا، بلکہ ایک عظیم عالم، مفکر اور فنونِ لطیفہ کا بے مثل سرپرست بھی تھا۔ اس نے بیدر شہر میں اپنے ذاتی خرچ سے ایک عظیم الشان یونیورسٹی قائم کی جسے تاریخ میں 'مدرسہِ محمود گاواں' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ سمرقند اور بخارا کی طرز پر تعمیر کیا گیا ایرانی طرزِ تعمیر کا یہ شاندار شاہکار اپنے دور کا سب سے بڑا اسلامی تعلیمی مرکز تھا، جہاں کی لائبریری

میں ہزاروں نایاب اور قیمتی قلمی نسخے موجود تھے، اور دنیا بھر سے جید علماء یہاں تدریس کے لیے آتے تھے، جن کے قیام و بعام کا سارا خرچ مدرسے کے ذمے تھا۔

21.5.4 محمود گاواں کا المناک انجام

تاہم، دنیا کی یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ گاواں کی یہی بے پناہ کامیابیاں اور اس کی جانب سے گورنروں کے لامحدود اختیارات کو محدود کرنے کی سخت اصلاحات ہی بالآخر اس کے دردناک زوال کا سبب بنیں۔ بہمنی دربار طویل عرصے سے دو بڑے اور متحارب گروہوں میں منقسم ہو چکا تھا: 'آفاقی' (جنہیں پردیسی بھی کہا جاتا تھا، جو بیرونِ ملک بالخصوص ایران، عراق اور وسطی ایشیا سے آنے والے مہاجرین پر مشتمل تھے) اور 'دکنی' (جس میں مقامی امراء، شمالی ہند سے آئے پرانے تارکین وطن، نو مسلم ہندو، اور افریقی حبشی شامل تھے)۔ گاواں چونکہ ایک آفاقی تھا، اس لیے دکنی امراء اس کے بے پناہ اثر و رسوخ، سلطان کی قربت اور سخت اصولوں سے شدید حسد کرتے تھے۔ ان حاسد اور سازشی امراء نے گاواں کو راستے سے ہٹانے کے لیے ایک نہایت مکروہ سازش تیار کی۔ انہوں نے محمود گاواں کے ایک ملازم سے اس کی مہر چرا کر ایک جعلی خط تیار کیا، جو مبینہ طور پر اڑیسہ کے گجپتی راجہ (یا وجے نگر کے راجہ) کو لکھا گیا تھا اور جس میں اسے سلطنت کے کمزور حالات کا حوالہ دے کر حملے کی دعوت دی گئی تھی۔ یہ جعلی خط سلطان محمد شاہ سوم کے سامنے ٹھیک اس وقت پیش کیا گیا جب وہ شدید نشے کی حالت میں تھا اور اس کے حواس کام نہیں کر رہے تھے۔ سلطان نے غصے میں آ کر کسی تفتیش یا گاواں کو اپنے دفاع اور صفائی کا موقع دیے بغیر فوراً اس 73 سالہ عظیم وزیر کے بے رحمانہ قتل کا حکم دے دیا، اور یوں 1481ء میں محمود گاواں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ جب سلطان کا نشہ اترا اور اس نے گاواں کا خزانہ چیک کروایا تو وہاں صرف کتابیں اور انتہائی سادہ زندگی کے شواہد ملے، جس سے اسے حقیقت کا علم ہوا اور وہ شدید احساسِ ندامت کا شکار ہو گیا۔ سلطان اسی غم اور پچھتاوے میں محض ایک سال کے اندر اندر انتقال کر گیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ گاواں کا قتل درحقیقت بہمنی سلطنت کا قتل ثابت ہوا، جس کے بعد مرکزیت دم توڑ گئی اور ریاست تیزی سے طوائف الملوکی، زوال اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئی۔

21.6 سلطنت کا معاشی، سماجی اور تہذیبی ڈھانچہ

کسی بھی عظیم سلطنت کی طویل المدتی بقا، جنگی مہمات کی کامیابی اور تہذیبی ترقی کا انحصار اس کے معاشی وسائل اور اقتصادی پالیسیوں پر ہوتا ہے، اور بہمنی سلطنت اس کلیے سے قطعی مستثنیٰ نہیں تھی۔ بہمنی ریاست کی کامیابی کا سب سے بڑا راز اس کے ایک انتہائی مضبوط، منظم اور متوازن معاشی ڈھانچے میں مضمر تھا جو ریاست کو مسلسل مالیاتی استحکام فراہم کرتا رہا۔ تاریخی شواہد بتاتے ہیں کہ ریاست کی آمدنی کے دو سب سے بڑے اور بنیادی ذرائع تھے: اول زرعی محصولات (Land Revenue) جو کل حکومتی آمدنی کا تقریباً 60 سے 70 فیصد بنتے تھے، اور دوم بین الاقوامی بحری تجارت، جو ریاستی خزانے کو 20 سے 25 فیصد تک کی خطیر آمدنی فراہم کرتی تھی۔ دکن کی سطح مرتفع جغرافیائی لحاظ سے اپنی کالی اور انتہائی زرخیز مٹی (Regur Soil) کی وجہ سے زراعت کے لیے قدرتی طور پر سازگار اور بہترین تھی۔ ریاست کی اہم ترین زرعی پیداوار میں گیہوں، چاول، گنا، اور کپاس جیسی نقد آور فصلیں شامل تھیں جو مقامی ضروریات پوری کرنے کے ساتھ

ساتھ تجارتی مقاصد کے لیے بھی استعمال ہوتی تھیں۔ بہمنی سلاطین نے کسانوں کی سہولت اور زرعی پیداوار کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کے لیے متعدد آبپاشی کے منصوبے شروع کیے، جن میں بڑی نہروں اور پانی کے ذخائر (دیوہیکل تالابوں) کی تعمیر خاص طور پر شامل تھی۔ زراعت کی اس ریاستی سرپرستی کی مثالیں پڑوسی خطوں میں بھی ملتی ہیں، جیسا کہ تلنگانہ میں راچاکونڈا کے حکمران اناپوتانایک نے اپنے علاقے میں 'اناپوتا سمدرم' نامی ایک بہت بڑا تالاب اور کئی کنویں کھدوائے تھے، اور بالکل اسی طرز پر بہمنی حکمرانوں نے بھی دیہی علاقوں میں کسانوں کی سرپرستی کی۔ بعد ازاں محمود گاواں کی جانب سے متعارف کروائے گئے اراضی کی پیمائش کے سائنسی نظام نے محصولات کے تعین کو ایک باقاعدہ دستاویزی شکل دی، جس کی بدولت مقامی جاگیرداروں اور اہلکاروں کی جانب سے کسانوں پر کیے جانے والے مظالم میں نمایاں کمی واقع ہوئی اور ریاست کی زرعی معیشت کو ایک نیا عروج ملا۔

21.6.1 بحری تجارت

زراعت کے شانہ بشانہ، بہمنی سلطنت کو جغرافیائی طور پر یہ زبردست برتری حاصل تھی کہ اس کے قبضے میں بحیرہ عرب کے ساتھ جڑی ہوئی کئی انتہائی اہم اور مصروف بندرگاہیں تھیں، جن میں دابھول، گوا، کلیان اور چول سرِ فہرست ہیں۔ ان بندرگاہوں کے ذریعے ایران، خلیج فارس کے ممالک، اور مصر جیسے دور دراز علاقوں کے ساتھ وسیع پیمانے پر منافع بخش بحری تجارت کی جاتی تھی۔ برآمدات کے شعبے میں مقامی طور پر تیار کردہ سوتی کپڑے کے تھان، خوشبوئیں (عطر)، اور قیمتی مسالے شامل تھے جن کی مشرقِ وسطیٰ اور یورپ میں بے پناہ مانگ تھی۔ بہمنی دور میں کپڑا بننے اور دھات سازی کی صنعتوں نے خوب ترقی کی اور ریاستی سرپرستی میں بڑے کارخانے قائم کیے گئے جہاں ہنرمند کاریگر کام کرتے تھے۔ دوسری جانب درآمدات میں سب سے کلیدی اور مہنگی شے 'جنگی گھوڑے' تھے، اس کے علاوہ لگژری اشیاء اور غلام بھی درآمد کیے جاتے تھے۔ عہدِ وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ میں فوجی بالادستی کا سارا انحصار اعلیٰ نسل کے رسالوں یعنی گھڑ سوار دستوں پر ہوتا تھا۔ چونکہ دکن کا سخت اور چٹانی خطہ عمدہ نسل کے گھوڑوں کی افزائش کے لیے قطعی طور پر موزوں نہیں تھا، لہٰذا بہمنی اور وجے نگر، دونوں عظیم سلطنتوں کی عسکری قوت کا سارا دارومدار ایران، عراق، اور وسطی ایشیا سے درآمد کیے جانے والے ان عربی اور خراسانی جنگی گھوڑوں پر تھا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت تھی کہ جو ریاست مغربی ساحل کی بندرگاہوں پر قابض ہوتی، وہی گھوڑوں کی اس انتہائی منافع بخش تجارت پر مکمل اجارہ داری قائم کر سکتی تھی، اور یہی وجہ تھی کہ بہمنی اور وجے نگر سلطنتوں کے درمیان گوا اور دابھول جیسی بندرگاہوں پر قبضے کے لیے طویل اور خونریز جنگیں لڑی گئیں۔

21.6.2 نظامِ سکہ سازی (Coinage System)

بہمنی ریاست کی مکمل خود مختاری، مالیاتی نظم وضبط اور معاشی استحکام کا ایک اور واضح اور ٹھوس ثبوت ان کی آزاد مانیٹری پالیسی اور نظامِ سکہ سازی (Coinage System) تھا۔ بہمنی دور کے یہ سکے محض لین دین کا ذریعہ نہیں تھے، بلکہ یہ شاہی پروپیگنڈے، مذہبی بالادستی، اور حکمران کی قانونی حیثیت کو ملکی اور بین الاقوامی سطح پر منوانے کا ایک زبردست اور موثر ٹول تھے۔ سلطنت میں بنیادی طور پر تین

قسم کے سکے رائج تھے: سونے کا انتہائی قیمتی سکہ جسے 'ٹکہ '(Tanka) کہا جاتا تھا، چاندی کا سکہ جو 'درہم' کہلاتا تھا، اور روزمرہ کے چھوٹے لین دین اور غریب عوام کی سہولت کے لیے تانبے کا سکہ جسے 'فلوس'(Falus) کہا جاتا تھا۔ محمد شاہ اول کے دور کے بعد سے چند کمزور اور نام نہاد آخری سلاطین کو چھوڑ کر، تقریباً تمام آزاد بہمنی حکمرانوں نے بھاری وزن کے چاندی کے سکے جاری کیے جو ان کی معاشی طاقت کا مظہر تھے۔ معیاری چاندی کا سکہ 'حسن شاہی' کہلاتا تھا جس کا وزن 170 گرینز (Grains) تھا، اور یہ تمام بڑے لین دین کے لیے استعمال ہوتا تھا جسے ابتدائی سلاطین نے دہلی سلطنت کی طرز پر متعارف کروایا تھا۔ مجاہد شاہ اور محمد ثانی کے دور میں 110 گرینز کا سکہ جاری کیا گیا جو دو تہائی ٹکہ کے وزن کے برابر تھا، جسے مالیاتی ایڈجسٹمنٹ کے تحت مارکیٹ میں لایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ مقامی چھوٹے لین دین کے لیے 27 اور 17 گرینز کے چھوٹے چاندی کے سکے بھی رائج کیے گئے۔ تانبے کے سکے (فلوس) کا وزن 57 گرینز سے شروع ہوا، اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہوتا گیا، خاص طور پر تاج الدین فیروز شاہ کے دور کے بعد اس میں انقلابی تبدیلیاں کی گئیں۔ ان تمام سکوں پر عربی اور فارسی زبان میں نہایت خوبصورت اسلامی خطاطی، سلاطین کے شان دار القابات اور مذہبی عبارات درج ہوتی تھیں، جو دہلی سلطنت اور ایرانی اسلوب سے شدید متاثر تھیں۔ بعدازاں، جب عظیم بہمنی سلطنت زوال پذیر ہوئی اور پانچ مختلف ریاستوں میں بٹ گئی، تو حیرت انگیز طور پر کئی دہائیوں تک انہی پرانے بہمنی سکوں (جنہیں Frozen Coins کہا جاتا ہے) کو ہی تجارت کے لیے استعمال کیا جاتا رہا، کیونکہ مقامی تاجروں اور عوام کو نئی ریاستوں کے جاری کردہ سکوں پر فوری اعتماد نہیں تھا، جو اس بہمنی نظام کے گہرے معاشی رسوخ اور اعتبار کا ایک تاریخی ثبوت ہے۔

21.6.3 افانسی نکیتن کی ڈائری

بہمنی دور کے سماجی، ثقافتی، اور انتظامی حالات کا سب سے تفصیلی، واضح اور غیر جانبدارانہ آنکھوں دیکھا حال، ہمیں ایک غیر ملکی، یعنی ایک روسی تاجر 'افاناسی نکیتن'(Afanasy Nikitin) کی ڈائری سے ملتا ہے، جو ہندوستان کی تاریخ کا ایک بے حد قیمتی ماخذ ہے۔ نکیتن روس کے شہر تویر (Tver) کا رہنے والا ایک بیوپاری تھا جو 1466ء میں تجارت کے لیے اپنے وطن سے نکلا تھا۔ راستے میں سمندری قزاقوں کے حملے میں اپنا سارا قیمتی مال لٹ جانے کے باوجود، وہ مقروض ہو کر وطن واپس لوٹنے کی بجائے ہمت کر کے آگے بڑھا اور ایران اور ہرمز سے ہوتا ہوا سمندری راستے کے ذریعے 1469ء میں ہندوستان کے مغربی ساحل کھمبات (گجرات) پہنچا اور پھر بہمنی سلطنت کی بندرگاہ 'چول' (Chaul) کے مقام پر اترا۔ نکیتن نے ہندوستان میں تقریباً چار سال (1470ء سے 1474ء) قیام کیا، جس میں سے زیادہ تر وقت اس نے بہمنی دارالحکومت بیدر اور قریبی شہر جنار (Junnar) میں گزارا۔ یہ وہ دور تھا جب محمود گاواں سلطنت کے وزیر اعظم تھے اور سلطان محمد شاہ سوم کی کمسنی کی وجہ سے قائم مقام حکمراں بھی تھے۔ نکیتن نے اپنے ان تمام مشاہدات کو *A Journey Beyond the Three Seas* کے نام سے قلم بند کیا۔ اس کا سفر نامہ اس لیے بھی اہم ہے کہ نکیتن ہندوستان میں اپنا ایک نہایت قیمتی گھوڑا بیچنے کی غرض سے آیا تھا۔ جب وہ بہمنی زیرِ تسلط قصبے جنار پہنچا، تو مقامی گورنر نے اس کا مہنگا گھوڑا چھین لیا اور ایک شرط رکھی کہ اگر وہ مسلمان ہو جائے تو اسے گھوڑا بھی واپس مل جائے گا اور ایک ہزار سونے کے سکے انعام میں دیے جائیں گے، بصورتِ دیگر گھوڑا ضبط کر لیا جائے گا اور اس سے بھاری تاوان وصول کیا جائے گا۔ نکیتن کو اس فیصلے کے لیے چار دن کی مہلت دی گئی، جو اس کے لیے انتہائی کرب ناک وقت تھا۔ تاہم، اتفاق سے خواجہ محمد خان

خراسانی نامی ایک بااثر ایرانی امیر وہاں پہنچ گیا، جس کی بروقت مداخلت سے نکیتن کی جان بچی اور اسے گھوڑا واپس مل گیا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقامی سطح پر ریاستی عہدیدار کبھی کبھار غیر ملکیوں پر ناجائز دباؤ ڈالتے تھے۔

اپنے سفر نامے میں نکیتن نے دکنی سماج میں موجود زبردست معاشی اور طبقاتی تفریق کی بھی واضح نشاندہی کی ہے۔ اس نے لکھا کہ کسان اور دیہاتی انتہائی غریب ہیں، وہ ننگے پاؤں چلتے ہیں اور ان کے سینے کھلے ہوتے ہیں، جبکہ اس کے برعکس امراء اور شہزادے بے پناہ پر تعیش اور شاہانہ زندگی گزارتے ہیں۔ سردیوں کے موسم میں مقامی لوگ صرف ایک دھوتی باندھتے ہیں اور دوسری کندھے پر ڈال لیتے ہیں، جبکہ دربار سے وابستہ افراد پتلون نما لباس، قمیض اور قفطان پہنتے ہیں۔ وہ دارالحکومت بیدر کی شان و شوکت سے بے حد متاثر ہوا اور محل کے بارے میں لکھا کہ اس کے سات عظیم الشان دروازے ہیں، اور ہر دروازے پر سینکڑوں مسلح گارڈز تعینات رہتے ہیں، جبکہ کم از کم سو (100) کاتب (scribes) محل میں آنے جانے والوں کا نام اور تفصیلی ریکارڈ درج کرنے پر مامور ہیں۔ بیدر کی مصروف منڈیوں میں انسانوں (سیاہ فام غلاموں)، گھوڑوں اور ریشم کی کھلے عام تجارت کا احوال بھی اس نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ نکیتن نے خاص طور پر 'عید' کے دن نکلنے والے شاہی جلوس کا آنکھوں دیکھا حال لکھا، جس میں 300 جنگی ہاتھی، سنہری ملبوسات میں سجے گھوڑے، اور بندوقوں (Muskets) سے لیس سپاہی سلطان کے ہمراہ چل رہے تھے، جو بہمنی ریاست کی زبردست عسکری اور مالیاتی طاقت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ اس کے علاوہ اس نے دیہی ہندوستان کی روزمرہ زندگی کی جھلکیاں بیان کرتے ہوئے لکھا کہ برسات کے چار مہینوں میں کسان گیہوں، چاول اور دالیں بوتے ہیں۔ اس کا مشاہدہ تھا کہ ہندو لوگ گائے کا گوشت نہیں کھاتے، ان کی عام خوراک چاول، کھچڑی، گھی اور سبزیاں ہیں، جبکہ شراب ناریل کے پانی سے کشید کی جاتی ہے۔ مذہبی عقائد کے حوالے سے اس نے درج کیا کہ یہاں تقریباً 84 مختلف مذاہب کے لوگ موجود ہیں جو سب خدا کو مانتے ہیں لیکن ان کی عبادت کے طریقے الگ ہیں، اور وہ ہاتھی نما (Ganesha) اور بندر نما (Hanuman) بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔

21.6.4 ادب و ثقافت

بہمنی دور کے تہذیبی کارناموں میں سب سے نمایاں اور دیرپا کردار زبان اور ادب کے ارتقاء کا ہے۔ اگرچہ ریاست کی سرکاری اور دفتری زبان 'فارسی' تھی، لیکن سلطنت کے روزمرہ کے معاملات، بازاروں، اور خاص طور پر صوفی خانقاہوں میں رابطے کے لیے ایک بالکل نئی مقامی زبان جنم لے رہی تھی جسے تاریخ میں 'دکنی' (Dakhni Language) کہا جاتا ہے۔ دکنی زبان دراصل دہلوی (شمالی ہند کی ابتدائی اردو/ہندوی) کا وہ تسلسل تھی جو محمد بن تغلق کی جانب سے دولت آباد کو دارالحکومت بنائے جانے کے وقت شمالی ہندوستان کے مہاجرین اپنے ساتھ دکن لائے تھے۔ بہمنی دور میں اس زبان نے تیزی سے مقامی دراوڑی زبانوں (جن میں تیلگو، کنڑ، اور مراٹھی شامل ہیں) اور سنسکرت کے اثرات کو قبول کرتے ہوئے ایک بالکل نئی اور منفرد شکل اختیار کر لی، جو جدید معیاری اردو سے کم از کم 200 سال پرانی تسلیم کی جاتی ہے۔ اس زبان کو عوام میں پھیلانے میں چشتیہ صوفیاء، خاص طور پر گلبرگہ کے سید محمد حسینی 'خواجہ بندہ نواز گیسو دراز' نے انتہائی کلیدی کردار ادا کیا۔ انہوں نے اپنے صوفیانہ پیغامات کو غریب اور عام لوگوں تک پہنچانے کے لیے مشکل فارسی کے بجائے دکنی زبان کا استعمال کیا، جس سے یہ زبان دربار کے بند کمروں سے نکل کر عوام کی زبان بن گئی۔ بہمنی دور میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین فرقہ وارانہ ہم آہنگی قائم تھی، جس نے

دکنی ادب کو پنپنے کے لیے سازگار ماحول فراہم کیا۔ دکنی اردو کے ابتدائی اور قدیم ترین تحریری سرمائے کا سہرا فخر الدین نظامی بیدری کے سر ہے، جس نے 1421ء سے 1434ء (یا 1435ء) کے درمیانی عرصے میں (جب احمد شاہ ولی بیدر کو دارالحکومت بنا چکا تھا) ایک طویل مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' تصنیف کی۔ یہ 4,000 مصرعوں پر محیط ایک داستانوی اور صوفیانہ تخلیق ہے جو اردو زبان کا سب سے قدیم دستیاب ادبی مخطوطہ (Manuscript) ہے۔

اس شاہکار مثنوی کی کہانی 'تبدیلیٔ قالب' (Transmigration of Soul) کے روایتی ہندو فلسفے پر مبنی ہے، جو اس دور کے تہذیبی امتزاج کا ثبوت ہے۔ داستان کے مطابق، ایک راجہ جس کا نام 'کدم راؤ' ہے، یوگا کی تعلیم حاصل کرنے کا بیحد شوقین ہے۔ وہ 'اکھر ناتھ' نامی ایک چالاک جوگی سے منتر سیکھتا ہے، جو دھوکے سے اپنا علم استعمال کرتے ہوئے راجہ کی روح کو ایک طوطے کے جسم میں قید کر دیتا ہے اور خود راجہ کے خالی جسم میں داخل ہو کر سلطنت کے تخت پر قبضہ کر لیتا ہے۔ تاہم راجہ کا وفادار وزیر، جس کا نام 'پدم راؤ' ہے، اس فریب کو بھانپ لیتا ہے اور طویل جدوجہد کے بعد طوطے کو ڈھونڈ کر راجہ کی روح کو واپس اس کے اصل جسم میں لانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ یہ داستان دراصل تصوف کی ایک گہری تمثیل (Allegory) ہے، جس میں انسان کی موجودہ روحانی کیفیت اور نفسِ امارہ سے آزادی کی کشمکش کو کہانی کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی انفرادیت اس کی لسانی ساخت ہے؛ نظامی بیدری نے اس میں سنسکرت زبان کے الفاظ کا بے تحاشا استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر، امر کوش (Amarakosa) ڈکشنری میں موجود بے شمار سنسکرت الفاظ جیسے انبر (آسمان)، امرت، گگن (آسمان)، جل (پانی)، نر (انسان)، پون (ہوا)، اور نین (آنکھ) اس مثنوی میں کثرت سے ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ، کہانی میں قدیم ہندو عقائد اور توہم پرستی کو بھی بخوبی پیش کیا گیا ہے؛ مثلاً، جب کدم راؤ جوگی سے منتر سیکھنا شروع کرتا ہے تو مندر کا کلش ٹوٹ کر زمین پر گر پڑتا ہے، جسے ہندو عقائد کے مطابق ایک شدید بدشگونی سمجھا جاتا ہے۔ یہ تمام شواہد ثابت کرتے ہیں کہ بہمنی سلطنت میں ہند-اسلامی کلچر محض سیاست تک محدود نہیں تھا، بلکہ زبان اور ادب کی گہرائیوں میں رچ بس چکا تھا۔ آخر میں، بہمنی سلطنت کی تاریخ، اس کی جنگی مہمات، اور انتظامی و ثقافتی پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے مؤرخین جن بنیادی مآخذ (Historiography) پر انحصار کرتے ہیں ان میں خواجہ عبدالملک عصامی کی 1350ء میں لکھی گئی 'فتوح السلاطین'، سید علی طباطبا کی 1580ء میں لکھی گئی 'برہانِ مآثر'، اور محمد قاسم ہندو شاہ (فرشتہ) کی مشہور 'تاریخِ فرشتہ' شامل ہیں۔

21.7 بہمنی سلطنت کا زوال اور دکن کی پانچ جانشین ریاستیں

کسی بھی عظیم سلطنت کا زوال عموماً بیرونی حملوں سے زیادہ اس کے اندرونی تضادات، درباری سازشوں اور ریاستی اداروں کی شکست وریخت کا نتیجہ ہوتا ہے، اور بہمنی سلطنت کی تاریخ بھی اس مسلمہ تاریخی اصول کی مکمل تصدیق کرتی ہے۔ بہمنی ریاست کو زوال سے دوچار کرنے والا اصل اور کلیدی عنصر وجے نگر سلطنت کی جارحیت یا کوئی بیرونی حملہ نہیں تھا، بلکہ دربار میں موجود نسلی اور علاقائی کشمکش تھی جس نے اس مستحکم ریاست کی بنیادیں اندر سے کھوکھلی کر دیں۔ پندرہویں صدی کے اواخر تک بہمنی دربار کے امراء دو واضح اور متصادم دھڑوں

میں منقسم ہو چکے تھے۔ پہلا دھڑا 'آفاقی' (Afaqis) کہلاتا تھا، جس میں ایران، عراق، ترکی اور وسطی ایشیا سے ہجرت کر کے آنے والے وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ، منتظم اور عسکری ماہرین شامل تھے جنہیں بہمنی سلاطین ان کی صلاحیتوں کی بنیاد پر اعلیٰ عہدوں پر فائز کرتے تھے۔ اس کے برعکس دوسرا دھڑا 'دکنی' (Deccanis) تھا، جس میں مقامی نو مسلم ہندو، شمالی ہندوستان سے آئے ہوئے پرانے تارکینِ وطن، اور افریقہ سے لائے گئے حبشی امراء شامل تھے۔ یہ دکنی امراء خود کو دکن کی سرزمین کا اصل وارث سمجھتے تھے اور آفاقیوں کو ریاستی سرپرستی ملنے پر شدید احساسِ محرومی اور حسد کا شکار تھے۔ آفاقی امراء عموماً فارسی بولتے تھے اور ان کی اکثریت شیعہ مسلک سے تعلق رکھتی تھی، جبکہ دکنی امراء مقامی زبانوں (مراٹھی، تیلگو، کناڑی) سے مانوس اور سنی العقیدہ تھے، جس نے اس تفریق کو مزید گہرا کر دیا۔ دکن کے عظیم آفاقی وزیرِ اعظم محمود گاواں کی دانشمندانہ پالیسیوں نے طویل عرصے تک ان دونوں گروہوں کو توازن میں رکھا، لیکن 1481ء میں دکنی امراء کی ایک مکروہ سازش (جعلی خط) کے نتیجے میں سلطان محمد شاہ سوم کے ہاتھوں اس بے گناہ مدبر کا قتل درحقیقت بہمنی سلطنت کے زوال کا وہ نقطہ آغاز تھا جس کے بعد انحطاط کے سیلاب کو روکنا ناممکن ہو گیا۔ محمود گاواں کے قتل کے بعد دکنی امراء مکمل طور پر بے قابو ہو گئے اور ریاست میں طوائف الملوکی پھیل گئی۔ کمزور سلاطین، بالخصوص محمود شاہ ثانی (1482ء سے 1518ء) کے طویل لیکن نااہل دورِ حکومت میں، ترکی النسل امیر 'قاسم بریدالملک' اور اس کے بیٹے 'امیر علی برید' (جسے دکن کی لومڑی کہا جاتا تھا) نے طاقت کے تمام مراکز پر قبضہ کر لیا اور سلاطین کو محض کٹھ پتلی بنا کر محلات تک محدود کر دیا۔ مرکز کی اس بے بسی کو دیکھتے ہوئے طاقتور صوبائی گورنروں (طرفداروں) نے بغاوتیں کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا، اور 1490ء کے عشرے تک یہ عظیم سلطنت باقاعدہ طور پر پانچ آزاد ریاستوں میں تقسیم ہو گئی۔ 1527ء میں جب نام نہاد اور آخری بہمنی سلطان کلیم اللہ شاہ (جس نے مغل شہنشاہ بابر کو خط لکھ کر مدد بھی مانگی تھی مگر ناکام رہا) وفات پا گیا، تو بہمنی سلطنت کا باقاعدہ اور حتمی خاتمہ ہو گیا۔ اس سلطنت کے بطن سے ابھرنے والی پانچ ریاستوں احمد نگر، بیجاپور، گولکنڈہ، برار اور بیدر کی انفرادی تاریخ دکن کے کثیر الثقافتی اور کثیر النسلی سماج کی شاندار عکاسی کرتی ہے۔

21.7.1 احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت

پہلی نمایاں ریاست احمد نگر کی 'نظام شاہی سلطنت' (1490ء سے 1636ء) تھی جس کی بنیاد ملک احمد نظام شاہ اول نے رکھی۔ ملک احمد دراصل بہمنی سلطنت کے ایک طاقتور دکنی امیر ملک حسن بحری کا بیٹا تھا، جس کا خاندانی اور نسلی تعلق ایک مراٹھی ہندو برہمن گھرانے سے تھا جس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اپنے والد کے قتل کے بعد ملک احمد نے مئی 1490ء میں جہانگیر خان کی قیادت میں آنے والی بہمنی فوج کو فیصلہ کن شکست دی اور اپنی آزادی کا باقاعدہ اعلان کیا۔ اس نے ابتدا میں جُنّار کو اپنا مرکز بنایا مگر بعد ازاں 1494ء میں احمد نگر کا نیا شہر بسا کر دارالحکومت وہاں منتقل کر دیا۔ احمد نگر کی تاریخ عظیم عسکری مزاحمت اور منفرد سیاسی شخصیات سے عبارت ہے۔ ان شخصیات میں ملکہ چاندبی بی کا کردار سنہری حروف میں لکھا جاتا ہے، جس نے 1595ء اور 1596ء میں مغل شہنشاہ اکبر کے بیٹے شہزادہ مراد کی زبردست فوجی یلغار کا انتہائی دلیری سے دفاع کیا اور ریاست کی بقاء کو یقینی بنایا۔ چاندبی بی کے قتل کے بعد پیدا ہونے والے بحران میں 'ملک عنبر' نامی ایک سیاہ فام حبشی غلام (جو ابی سینیا سے لایا گیا تھا) نے ریاست اور فوج کی باگ ڈور سنبھالی اور غیر معمولی اصلاحات متعارف کروائیں۔ ملک عنبر نے مغلوں

کے عظیم لشکروں کو ناکام بنانے کے لیے "بارگیر گیری" (Bargi-giri) یعنی چھاپہ مار اور گوریلا جنگ کی جدید تکنیک ایجاد کی جسے بعد ازاں مراٹھوں نے بھی اپنایا۔ اس کی سب سے شاندار انتظامی کامیابی اس کا زمینی محصول کا نظام تھا، جس میں زمین کی زرخیزی کی بنیاد پر درجہ بندی کر کے نقد ادائیگیاں مقرر کی گئیں، جس نے مغل اور مراٹھا نظامِ محصول کو گہرا متاثر کیا۔ تعمیراتی میدان میں، ملک عنبر نے کھڈکی (موجودہ اورنگ آباد) کا نیا دارالحکومت آباد کیا اور وہاں زیرِ زمین آبی گزرگاہوں پر مشتمل 'نہرِ عنبری' تعمیر کروائی جو فوج اور عوام کو پانی فراہم کرنے کا سولہویں صدی کی انجینئرنگ کا ایک زبردست کمال تھا۔ اس کے علاوہ دفاع کے لیے اس نے مرود کے ساحل پر سمندر کے اندر ناقابلِ تسخیر "جنجیرہ قلعہ" تعمیر کروایا جس نے پرتگالیوں اور مراٹھوں کو روکے رکھا۔ اس طویل اور شاندار مزاحمت کے باوجود، بالآخر 1636ء میں مغل شہنشاہ شاہجہان اور وائسرائے دکن اورنگزیب نے اسے شکست دے کر مغل سلطنت میں ضم کر لیا۔

21.7.2 بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت

دوسری اہم ریاست بیجاپور کی 'عادل شاہی سلطنت' (1490ء سے 1686ء) تھی، جو رقبے اور عسکری طاقت کے لحاظ سے دکن میں ایک مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کی بنیاد 1490ء میں یوسف عادل شاہ نے رکھی تھی، جو محمود گاواں کا خریدا ہوا ایک انتہائی قابل جارجیائی غلام تھا اور اس کا نسلی تعلق ترکمان قبیلے سے تھا۔ بیجاپور کی ریاست اپنی کثیر الجہتی ثقافت، بے مثال مذہبی رواداری اور علم و فنون کی زبردست سرپرستی کے لیے جانی جاتی ہے۔ سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی (1580ء سے 1627ء) کا دورِ حکومت اس سلطنت کا سنہری اور روشن ترین دور تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہ فنِ موسیقی کا ماہر، عظیم شاعر اور روادار حکمران تھا جس نے موسیقی کے راگوں پر مبنی مشہور زمانہ "کتابِ نورس" تخلیق کی۔ اس کے دربار میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ ساتھ عیسائیوں کو بھی خوش آمدید کہا جاتا تھا، جس نے بیجاپور کو ایک سیکولر ریاست کا درجہ دیا۔ عادل شاہی حکمران عظیم الشان معمار بھی تھے؛ انہوں نے بیجاپور کے قلعے کے گرد 10 کلومیٹر طویل فصیل اور 100 سے زائد برج تعمیر کروائے۔ اس دور کا سب سے بڑا تعمیراتی شاہکار محمد عادل شاہ کا مقبرہ 'گول گمبد' ہے، جس کا گنبد (جس کا بیرونی قطر 44 میٹر ہے) جدید دور سے قبل دنیا کا دوسرا سب سے بڑا گنبد مانا جاتا ہے۔ اس گنبد کے اندر موجود "سرگوشی گیلری" (Whispering Gallery) صوتیات اور انجینئرنگ کے علم کی معراج ہے۔ اسی طرح چار باغ طرز پر تعمیر کیا گیا 'ابراہیم روضہ' اپنی نفاست اور دیدہ زیبی میں تاج محل کا پیش رو سمجھا جاتا ہے۔ 1619ء میں ابراہیم عادل شاہ ثانی نے پڑوسی ریاست بیدر کو فتح کر کے بیجاپور کا حصہ بنا لیا تھا، لیکن بالآخر 1686ء میں اورنگزیب عالمگیر کی طویل اور زبردست فوجی مہم نے بیجاپور کی خود مختاری کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا۔

21.7.3 گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت

تیسری اور اقتصادی طور پر دنیا کی امیر ترین ریاست گولکنڈہ کی 'قطب شاہی سلطنت' (1518ء سے 1687ء) تھی، جس کی بنیاد سلطان قلی قطب الملک نے رکھی تھی۔ سلطان قلی کا تعلق ایران کے شہر ہمدان کے ترکمان قبیلے (قراقویونلو) سے تھا، جو ہجرت کر کے دکن آیا تھا۔ اس سلطنت کے حکمرانوں کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ انہوں نے مقامی دراوڑی آبادی کے ساتھ گہرے روابط استوار کیے اور مذہبی

تعصب کو قریب نہیں آنے دیا۔ اس رواداری کی سب سے بڑی مثال آخری سلطان ابوالحسن تانا شاہ کا دور ہے جب مادنا اور اکنا نامی دو ہندو بھائیوں کو ریاست کے اہم ترین اور کلیدی وزارتی مناصب سونپے گئے۔ 1591ء میں سلطان محمد قلی قطب شاہ نے طاعون کی موذی وباء کے خاتمے کی یادگار کے طور پر حیدر آباد کا نیا شہر بسایا اور اس کے بالکل مرکز میں عظیم الشان 'چار مینار' تعمیر کروایا جو آج بھی اس شہر کی عالمی پہچان ہے۔ عسکری لحاظ سے قطب شاہی سلاطین کا تعمیر کردہ 'گولکنڈہ قلعہ' صوتی انجینئرنگ اور دفاع کا ایک ناقابلِ یقین شاہکار تھا؛ اس قلعے کے مرکزی دروازے (فتح دروازہ) پر بجائی گئی تالی کی آواز کئی سو فٹ بلند 'بالا حصار' تک بالکل واضح سنائی دیتی تھی، جو حملے کے وقت ایک موثر ترین انتباہی نظام کے طور پر کام کرتی تھی۔ قلعے کی بقا کا ایک اور اہم راز اس کا پانی کی فراہمی کا نظام تھا جس کا ماخذ 'درگم چیروو' (Durgam Cheruvu) نامی 63 ایکڑ پر محیط ایک وسیع جھیل تھی جو 2.5 ارب سال پرانی گرینائٹ چٹانوں (جن میں خاجا گوڑا کی چٹانیں قابلِ ذکر ہیں) کے درمیان پوشیدہ تھی۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب اورنگزیب کی مغل فوج نے گولکنڈہ کا آٹھ ماہ تک شدید محاصرہ کیا، تب بھی قلعے کے اندر پانی کی فراہمی اسی جھیل سے زیرِ زمین باؤلیوں کے ذریعے بلا تعطل جاری رہی۔ بالآخر 1687ء میں خدوخداع اور طویل محاصرے کے بعد مغلوں نے گولکنڈہ کو فتح کر لیا۔ معاشی اعتبار سے گولکنڈہ کی عالمی شہرت کی سب سے بڑی وجہ دریائے کرشنا اور گوداوری کے طاس میں واقع کلور (Kollur) اور پارتھیالا کی ہیرے کی کانیں تھیں۔ یہ کانیں دنیا کے بہترین اور خالص ترین ہیرے (Type IIa) اگل رہی تھیں جن میں نائٹروجن کی ملاوٹ بالکل صفر تھی۔ گولکنڈہ قلعہ ہیروں کی تراش خراش (Lapidary) اور تجارت کا سب سے بڑا بین الاقوامی مرکز تھا۔ تاریخ کے مشہور ترین ہیرے جیسے کوہِ نور، دریائے نور، ہوپ ڈائمنڈ (Hope Diamond)، اور فلورینٹائن ڈائمنڈ اسی سرزمین کی پیداوار ہیں۔ کانوں سے تقریباً ایک کروڑ کیرٹ ہیرے نکالے گئے۔ مشہور فرانسیسی تاجر ٹیورنیئر نے 1631ء سے 1668ء کے درمیان گولکنڈہ کے چھ سفر کیے اور کولور کی کان سے ایک 116 کیرٹ کا نیلا ہیرا خریدا، جسے اس نے 147 کلو گرام خالص سونے کے عوض فرانس کے بادشاہ لوئی چہاردہم کو فروخت کیا، جو آج 'ہوپ ڈائمنڈ' کہلاتا ہے۔ تجارت کو سنبھالنے کے لیے قطب شاہی ریاست نے سونے کا 'ہن' (Hun)، 'پگوڈا' (Pagoda) اور چاندی کا 'لاری' (Larin) جیسے عالمی سطح پر مستند سکے متعارف کروائے، اور مچھلی پٹنم اور دابھول جیسی بندرگاہوں سے ٹیکسٹائل اور قلمکاری کی تجارت کی۔

21.7.4 برار کی عماد شاہی سلطنت

چوتھی ریاست برار کی 'عماد شاہی سلطنت' (1490ء سے 1574ء) تھی، جس کی بنیاد 1490ء میں فتح اللہ عماد الملک نے رکھی تھی۔ فتح اللہ پیدائشی طور پر ایک کنڑی ہندو تھا جسے بہمنی سلطنت نے وجے نگر کے خلاف جنگ میں لڑکپن میں قیدی بنا لیا تھا، اور بعد ازاں اسلام قبول کرنے پر محمود گاواں نے اسے برار کا طرفدار مقرر کیا تھا۔ عماد شاہی حکمرانوں نے الچپور کو اپنا دارالحکومت بنایا اور گاویل گڑھ اور نرنالہ کے ناقابلِ تسخیر قلعوں کو مزید مضبوط کیا۔ برار کی سیاسی تاریخ پڑوسی ریاست احمد نگر کے ساتھ سرحدی قصبوں 'پاتھری' اور 'ماہرِ' پر مسلسل خونریز تنازعات سے عبارت ہے۔ برہان نظام شاہ کی یلغار سے بچنے کے لیے سلطان علاءالدین عماد شاہ نے گجرات کے سلطان بہادر شاہ کو مداخلت کی دعوت بھی دی۔ بعد ازاں، حکمران خاندان کی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر ریاستی وزیر طفیل خان نے اقتدار پر قبضہ کر لیا، جس کا جواز بنا کر

احمد نگر کے مرتضیٰ نظام شاہ نے 1574ء میں حملہ کیا اور طفیل خان اور برہان عماد شاہ کو قید کر کے برار کو ہمیشہ کے لیے احمد نگر میں ضم کر لیا۔

21.7.5 بیدر کی برید شاہی سلطنت

پانچویں اور سب سے چھوٹی ریاست بیدر کی 'برید شاہی سلطنت' (1528ء سے 1619ء) تھی۔ اس کا بانی قاسم برید تھا جو ایک جارجیائی ترکمان غلام تھا اور محمود شاہ بہمنی کے دور میں میرِ جملہ کے عہدے پر فائز تھا۔ قاسم برید اور اس کے جانشین امیر علی برید نے 1528ء تک آزادی کا باقاعدہ اعلان کرنے سے قبل طویل عرصے تک بہمنی سلاطین کو محض کٹھ پتلی بنا کر قلعے میں مقید رکھا۔ یہ ریاست عسکری لحاظ سے کمزور تھی اور بیجاپور و احمد نگر کے تنازعات میں کچلی جاتی رہی؛ ایک موقع پر امیر علی برید کو اسماعیل عادل شاہ کے سامنے ذلت آمیز شکست کا سامنا کر کے معافی بھی مانگنی پڑی۔ اس ریاست کا سب سے بڑا ثقافتی کارنامہ "بیدری دستکاری" (Bidriware) کی ترویج ہے، جس میں زنک اور تانبے کے مرکب پر چاندی اور سونے کے تاروں سے انتہائی خوبصورت نقش و نگار بنائے جاتے ہیں جو آج تک دکن کی پہچان ہیں۔ سیاسی عدم استحکام کے باعث 1619ء میں ابراہیم عادل شاہ ثانی نے اسے فتح کر کے بیجاپور کا حصہ بنا دیا۔ اگرچہ یہ پانچوں ریاستیں آپس میں مسلسل برسرِ پیکار رہتی تھیں، لیکن جب 1565ء میں وجے نگر کے طاقتور حکمران رام رائے نے دکن کے معاملات میں بے جا مداخلت شروع کی، تو بیجاپور، گولکنڈہ، احمد نگر اور بیدر نے ایک متحدہ محاذ تشکیل دیا اور 'جنگِ تالیکوٹا' میں وجے نگر کی عظیم الشان سلطنت کو فیصلہ کن شکست دے کر اسے ہمیشہ کے لیے تباہ کر دیا، جس سے دکن کا سیاسی توازن مکمل طور پر مسلمانوں کے حق میں ہو گیا۔

21.8 جانشیں ریاستوں کے دور میں دکن کا ثقافتی ارتقا

ان جانشین ریاستوں نے دکن کی ثقافت اور ادب میں وہ لازوال رنگ بھرے جو شمالی ہند کے مغل طرز سے بالکل منفرد تھے اور ہند-فارسی و مقامی دراوڑی روایات کے حسین امتزاج پر مبنی تھے۔ عادل شاہی اور قطب شاہی سلاطین نے فارسی کے شانہ بشانہ 'دکنی اردو' کی زبردست سرپرستی کی جو عربی، فارسی، مراٹھی، کناڑی اور تیلگو زبانوں کے الفاظ کا ایک خوبصورت مرکب تھی۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ دکنی اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر مانا جاتا ہے جس نے مقامی تہواروں اور موسمی موضوعات پر طبع آزمائی کی۔ گولکنڈہ کے ہی عظیم ادیب ملا وجہی نے 1635ء میں 'سب رس' تحریر کی جو اردو نثر کی اولین باقاعدہ کتاب ہے، جس میں 'حسن' اور 'دل' کی تمثیل کے ذریعے تصوف اور اخلاقیات کے پیچیدہ موضوعات بیان کیے گئے ہیں۔ ملا وجہی نے ہی 1609ء میں مشہور مثنوی 'قطب مشتری' لکھی جس میں قطب شاہ اور بھاگ متی کی داستانِ عشق بیان کی گئی۔ مصوری کے میدان میں 'دکنی مکتبہ مصوری' پروان چڑھا، جس میں مغلوں کی حقیقت پسندی کے بجائے صوفیانہ تخیلات، گہرے نیلے اور چمکدار سنہری رنگوں کا غالب استعمال ہوتا تھا۔ اس مکتبہ فکر نے "راگ مالا" مصوری کو عروج بخشا، اور بیجاپور کی 'نجوم العلوم' (1570ء) نامی انسائیکلوپیڈیا میں 876 تصاویر شامل کی گئیں جن میں چہروں کو تھری کوارٹر زاویے سے اور خواتین کو جنوبی ہند کے لباس میں پیش کیا گیا۔ تاریخ نویسی میں محمد قاسم ہندو شاہ عرف 'فرشتہ' (1560ء سے 1620ء) کا نام امر ہے جس نے ابراہیم عادل شاہ ثانی کی سرپرستی میں 1609ء سے 1612ء کے درمیان ضخیم کتاب 'تاریخِ فرشتہ' (گلشنِ ابراہیمی) مرتب کی، جس کا تیسرا مقالہ خصوصی

طور پر دکن کی چھ سلاطینِ ریاستوں اور ہندو سماجی تعلقات کا تفصیلی احاطہ کرتا ہے، اور جسے برطانوی مستشرق جان برگز نے ترجمہ کر کے مستند ترین ماخذ کا درجہ دیا۔ دکن کا ارضیاتی اور روحانی ورثہ بھی اپنی مثال آپ ہے؛ حیدرآباد، خواجہ گوڑا اور درگم چیرو کے گرد موجود 2.5 ارب سال پرانی گرینائٹ کی چٹانیں (جو ہمالیہ سے بھی قدیم ہیں) دکن کے قدرتی دفاع اور پانی کی فراہمی کا مرکز رہیں، جنہیں جدید رئیل اسٹیٹ مافیا سے بچانے کے لیے 1996ء میں حیدرآباد کے دانشوروں نے "سوسائٹی ٹو سیو راکس" کی بنیاد رکھی اور انہیں 'ہیریٹیج راک پریسنکٹس' کا قانونی تحفظ دلوایا۔ روحانی طور پر چشتی صوفیاء (جیسے شیخ برہان الدین غریب اور خواجہ بندہ نواز گیسو دراز) نے درباروں سے دور رہ کر دکنی زبان میں تصوف کا پیغام عوام تک پہنچایا، جبکہ 'قادری شطاری' سلسلے کے بزرگوں (جیسے شیخ بہاء الدین انصاری اور محمد عادل شاہ کے مشیر ہاشم پیر دستگیر) نے وحدت الوجود کے ساتھ ہندو جوگیوں کے پرانا یام اور چکروں کے تصورات کو اپنا کر دکن میں ایک مخلوط اور روادار معاشرہ تشکیل دیا۔ حتمی تجزیے میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ بے پناہ دولت اور ہیروں کی کانوں نے دکن کی ریاستوں کو معاشی خوشحالی تو دی جس سے چار مینار اور گول گمبد تعمیر ہوئے، مگر اسی دولت کی چمک نے اورنگزیب کی توسیع پسندانہ نظریں اپنی طرف مبذول کروائیں جو ان کی تباہی کا سبب بنی۔ اس کے باوجود، ڈیڑھ سو سال تک مغل سامراج کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے والی ان ریاستوں کی تعمیرات، مصوری، بیدری دستکاری اور دکنی ادب کی مٹھاس آج بھی برصغیر کی ثقافتی رگوں میں خون بن کر دوڑ رہی ہے۔

21.9 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو بہمنی سلطنت محض ایک عسکری اور سیاسی تجربہ نہیں تھی، بلکہ یہ ہند-اسلامی اور مقامی دراوڑی روایات کے ایک منفرد اور متوازن تہذیبی امتزاج کا شاندار نمونہ تھی۔ اس سلطنت نے دکن کو معاشی طور پر مستحکم کیا، سمندری بندرگاہوں کے ذریعے بین الاقوامی سطح پر تجارت کو فروغ دیا، اور 'دکنی' زبان جیسی نئی اور شاندار ثقافتی روایات کی بنیاد رکھی۔ اگرچہ اندرونی سازشوں اور امراء کے درمیان نسلی و علاقائی کشمکش کی وجہ سے بہمنی سلطنت بالآخر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر پانچ ریاستوں میں بٹ گئی، لیکن اس کی جانشین ریاستوں نے اس کے تہذیبی، تعمیراتی اور معاشی ورثے کو نہ صرف محفوظ رکھا بلکہ اسے عروج کی نئی بلندیوں تک بھی پہنچایا۔ ان ریاستوں نے مغلوں کی طویل یلغار کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور دکن کی تاریخ میں فنونِ لطیفہ، تصوف، ادب اور فنِ تعمیر کا ایک انمٹ اور لازوال باب رقم کیا۔

21.10 کلیدی الفاظ (Keywords)

امیرانِ صدہ : یہ دکن میں تعینات تغلق سلطنت کے وہ افسران تھے جو سو دیہاتوں یا سو فوجیوں کے انچارج ہوتے تھے۔

رائچور دوآب : دریائے کرشنا اور دریائے تنگبھدرا کے درمیان واقع ایک انتہائی زرخیز خطہ۔

طرفدار : بہمنی سلطنت میں صوبہ کو 'طرف' اور ان صوبوں کے گورنروں کو 'طرفدار' کہا جاتا تھا۔

آفاقی اور دکنی : بہمنی دربار میں موجود دو متصادم گروہ؛ 'آفاقی' بیرونِ ملک (ایران، عراق وغیرہ) سے آئے مہاجرین تھے، جبکہ 'دکنی' میں مقامی نو مسلم، شمالی ہند سے آئے پرانے تارکینِ وطن، اور حبشی امراء شامل تھے۔

بیدری دستکاری :جستہ اور تانبے کے مرکب پر چاندی اور سونے کے تاروں سے خوبصورت نقش و نگار بنانے کا ایک مخصوص فن، جس کی ترویج بیدر کی برید شاہی سلطنت کے دور میں ہوئی۔

21.11 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

21.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. 1347ء میں بہمنی سلطنت کی بنیاد کس نے رکھی تھی؟

(a) محمد شاہ اول (b) علاؤالدین حسن بہمن شاہ c))تاج الدین فیروز شاہ d)) محمود گاواں

2. کس بہمنی حکمران نے دارالحکومت گلبرگہ سے 'بیدر' منتقل کیا؟

(a) شہاب الدین احمد شاہ ولی (b) محمد شاہ اول (c) مجاہد شاہ d)) تاج الدین فیروز شاہ

3. بہمنی سلطنت میں 'وکیل السلطنت' کس عہدے کو کہا جاتا تھا؟

(a) امورِ خارجہ کا نگران (b) وزیرِ خزانہ c)) وزیرِ اعظم (d) فوج کا کمانڈر انچیف

4. 1458ء کی دیورا کونڈا کی جنگ میں کس نے بہمنی فوج کو شکست دی؟

(a) گجپتی اور ویلما اتحاد b)) وجے نگر کی افواج (c) محمود خلجی d)) گجرات کے سلطان

5. احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت (1490ء) کی بنیاد کس نے رکھی؟

(a) یوسف عادل شاہ b)) سلطان قلی قطب الملک c)) قاسم برید (d) ملک احمد نظام شاہ اول

21.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. محمود گاواں نے بہمنی سلطنت کے انتظامی ڈھانچے میں کیا اہم اصلاحات کیں؟
2. روسی تاجر افاناسی نکیتن نے دکنی سماج کے کن اہم پہلوؤں کی نشاندہی کی؟
3. دکنی زبان کے ارتقاء اور اس کے ابتدائی ادب پر مختصر روشنی ڈالیں۔

21.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. بہمنی سلطنت کے زوال اور جانشین ریاستوں میں اس کی تقسیم کے بنیادی اسباب کیا تھے؟
2. بہمنی اور جانشین ریاستوں کے دور میں دکن کے ثقافتی، ادبی اور تعمیراتی ارتقاء کا جائزہ لیں۔

Suggested Learning Resources

1. Abidi, S.A.H., *Sufism in India*, Wishwa Prakashan, New Delhi, 1992.
2. Altekar, Anant Sadashiv, *The Rashtrakutas and their Times; being a political, administrative, religious, social, economic and literary history of the Deccan during C. 750 A.D. to C. 1000 A.D.*, Oriental Book Agency, Poona, 1934.
3. Alvi, Sajida Sultana, *Perspectives on Mughal India: Rulers, Historians, Ulama, and Sufis*, Oxford University Press, Karachi, 2012.
4. Anjum, Tanvir, *Chishti Sufis in the Sultanate of Delhi 1190-1400: From Restrained Indifference to Calculated Defiance*, Oxford University Press, Pakistan, 2011.
5. Aquil, Raziuddin, *Sufism, Culture, and Politics: Afghans and Islam in Medieval North India*, Oxford University Press, New Delhi, 2007.
6. Asher, Catherine B. and Cynthia Talbot, *India Before Europe*, Cambridge University Press, Cambridge, 2006.
7. Asif, Manan Ahmed, *The Book of Conquest: The Chachnama and Muslim Origins in South Asia*, Harvard University Press, Cambridge, 2016.
8. Askari, S.H., *Maktub and Malfuz Literature: As a Source of Socio-Political History*, Khuda Bakhsh Oriental Public Library, Patna, 1981.
9. Avari, Burjor, *India: The Ancient Past. A History of the Indian-Subcontinent from 7000 BC to AD 1200*, Routledge, New York, 2007.
10. Bosworth, Clifford Edmund, 'THE GHAZNAVIDS', in Asimov, M.S. and C.E. Bosworth eds., *History of Civilisations of Central Asia*, UNESCO Publishing, 1998.
11. _____, Clifford Edmund, *The Ghaznavids: Their Empire in Afghanistan and Eastern Iran 994–1040*, Edinburgh University Press, Edinburgh, 1963.
12. Briggs, John, *History of the Rise of the Mahomedan Power in India*, *till the year A.D. 1612*, 4 Vols., Longman, Rees, Orme, Brown, and Green, London, 1829.
13. Chakravarti, Ranabir, *Exploring Early India up to C. AD 1300*, Primus Books, New Delhi, 2016.
14. Chandra, Satish, *Ahd-e-Wusta Ka Hindustan (Sultanate Se Mughal Ahd Tak)*, National Council for Promotion of Urdu Language, New Delhi, 2011.
15. _____, Satish, *History of Medieval India*: *800–1700*, Orient Longman, Hyderabad, 2007.
16. _____, Satish, *Historiography, Religion and State in Medieval India*, Har-Anand Publications Pvt. Ltd., New Delhi, 2013.
17. _____, Satish, *Medieval India: Society, the Jagirdari Crisis, and the Village*, Macmillan, 1982.
18. _____, Satish, *Medieval India,* Vol. I & II, Orient Longman Limited, Hyderabad, 2000.
19. Chopra, P.N., T.K. Ravindran and N. Subrahmanian, *History of South India (Ancient, Medieval and Modern) Part 1*, Chand Publications, New Delhi, 2003.
20. Eaton, Richard M., *A Social History of the Deccan, 1300-1761: Eight Indian Lives*, Cambridge University Press, Cambridge, 2005.
21. _____, Richard M., *India in the Persianate Age: 1000-1765*, Penguin Books, London, 2019.
22. Elliot, H.M. and John Dowson, *The History of India as Told by its own Historians*, 8 Vols., Low Price Publication, New Delhi, 2014 (first pub. 1990).
23. _____, H.M. and John Dowson, *The History of India, as Told by Its Own Historians: The Muhammadan Period*, Vol. 1, Trübner and Co., London, 1867.
24. Fox, Richard Gabriel, *Kin, Clan, Raja, and Rule: State hinterland Relations in Preindustrial*

India, University of California Press, 1971.
25. Ganguly, D.C., 'Origin of the Pratihara Dynasty', *The Indian Historical Quarterly*, Vol. XI, 1935, pp. 167-168.
26. Green, Nile ed., *The Persianate World: The Frontiers of a Eurasian Lingua Franca*, University of California Press, Oakland, 2019.
27. Habib, Irfan ed., *Religious Movements in South Asia, 600-1800*, Oxford University Press, New Delhi, 2008.
28. _____, Irfan, *Medieval India: The Study of a Civilization*, National Book Trust, Delhi, 2008.
29. _____, Irfan, ed., *Religion in Indian History*, Tulika Books, New Delhi, 2007.
30. Habib, Mohammad and Khaliq Ahmad Nizami, *Jame Tarikh-e-Hind*, National Council for Promotion of Urdu Language, New Delhi, 2011.
31. Habib, Muhammad, *Life and Work of Hazrat Amir Khusrau of Delhi*, Aligarh, 1927.
32. Habibullah, A.B.M., *Foundation of Muslim Rule in India*, Central Book Depot, Allahabad, 1961(Revised Edition).
33. Haig, Wolseley ed., *The Cambridge History of India: Turks and Afghans (Vol. III)*, Cambridge UP, 1928.
34. Hasan, Mehdi, *Tughluq Dynasty*, Karachi, 1963.
35. Isami, Abdul Malik, *Futuh-u's-Salatin or Shah Namah-i-Hind*, (ed. Agha Mahdi Husain), Asia Publishing House, Aligarh, 1967.
36. Islam, Sirajul, *Sufism and Bhakti*, USA, 2004.
37. Jackson, Peter, *The Delhi Sultanate: A Political and Military History*, Cambridge University Press, Cambridge, 2003.
38. Jafri, Saiyid Zaheer Husain and Helmut Reifeld eds., *The Islamic Path: Sufism, Politics, and Society in India*, Konrad Adenauer Foundation, New Delhi, 2006.
39. Jha, Bishwambhar, *Kakatiyas of Warangal, Circa A.D. 1000–1323*, Janaki Prakashan, Patna, 1994.
40. Karashima, Noburu, *South Indian History and Society: Studies from Inscriptions, A.D. 850-1800*, OUP, 1984.
41. Kennedy, Hugh, *The Great Arab Conquests: How the Spread of Islam Changed the World We Live In*, Da Capo Press, Philadelphia, 2007.
42. Khan, Mohd. Abdul Wali, *Gold and Silver Coins of Sultans of Delhi*, Government of Andhra Pradesh, Hyderabad, 1974.
43. Kulke, Hermann and Dietmar Rothermund, *A History of India*, Routledge, 2004.
44. Kumar, Sunil, *The Emergence of the Delhi Sultanate*, Permanent Black, Delhi, 2007.
45. Ludden, David, *An Agrarian History of South Asia*, Cambridge University Press, 1999.
46. Maclean, Derryl N., *Religion and Society in Arab Sind*, E.J. Brill, Leiden, 1989.
47. Mahajan, V.D., *History of Medieval India*, S. Chand Group, Bombay, 2001.
48. Majumdar, R.C., 'The Gurjara-Pratiharas', in R.S. Sharma and K.K. Dasgupta eds., *A Comprehensive history of India: A.D. 985–1206*, Vol. 3 (Part 1), Indian History Congress / People's Publishing House, 1981.
49. _____, R.C., *The Age of Imperial Kanauj*, Bharatiya Vidya Bhavan, Bombay, 1955.
50. _____, R.C., *The Struggle for Empire*, Bharatiya Vidya Bhavan, 1966.
51. Mehta, J.L., *Advanced study in the History of Medieval India*, Sterling Publishers Pvt. Ltd., New Delhi, 2004.
52. Mishra, V.B., 'Who Were the Gurjara-Pratīhāras?', *Annals of the Bhandarkar Oriental Research Institute*, 1954, pp. 42-53.
53. Mujib, Muhammad, *Indian Muslims*, London, 1967.

54. Nadvi, Syed Sulaiman, *Indo-Arab Relations: An English Rendering of Arab O' Hind Ke Ta'alluqat*, (trans. M. Salahuddin), Institute of Indo-Middle East Cultural Studies, Hyderabad, 1962.
55. Nizami, K.A., *Some Aspects of Religion and Politics in India 13th century*, Bombay, 1961.
56. Nizami, Khaliq Ahmad, *Religion and Politics in India during the Thirteenth Century*, Department of History AMU, Aligarh, 1961.
57. Puri, Baij Nath, *The History of the Gurjara-Pratiharas*, Munshiram Manoharlal, Delhi, 1986 (first pub. 1957).
58. Qureshi, I.H., *Administration of the Sultanate of Delhi*, Munshiram Manoharlal Publishers, Bombay, 1995.
59. Qureshi, Ishtiaq Husain, *The Muslim Community of the Indo-Pakistan Subcontinent (610-1947): A Brief Historical Analysis*, Mouton, 's-Gravenhage, 1962.
60. Ramakrishna, V. et al eds., *History of Telangana*, EMESCO Books, Hyderabad, 2016.
61. Rao, Somasundara ed., *Comprehensive History and Culture of Andhra Pradesh, Vol. IV: Medieval Andhra Desa, A.D. 1000–1324*, Tulika Books, New Delhi, 2011.
62. Reddy, N. Krishna, *Social History of Andhra Pradesh (Seventh to Thirteenth Century)*, Agam Kala Prakashan, Delhi, 1991.
63. Reu, Pandit Bisheshwar Nath, *History of the Rashtrakutas (Rathodas)*, Publication Scheme, Jaipur, 1997 (first pub. 1933).
64. Rizvi, Saiyid Athar Abbas, *A History of Sufism in India*, 2 Vols, Munshiram Manoharlal, 1978.
65. _____, Saiyid Athar Abbas, *Aadi Turk Kaleen Bharat*, Department of History Aligarh Muslim University, Aligarh, 1956.
66. _____, Saiyid Athar Abbas, *Khalji Kaleen Bharat*, Department of History Aligarh Muslim University, Aligarh, 1955.
67. Sastri, Nilakanta K.A., *A history of South India from prehistoric times to the fall of Vijayanagar*, Oxford University Press, New Delhi, 2002 (first pub. 1955).
68. _____, Nilakanta K.A., *The Cholas*, University of Madras, Madras, 1955.
69. Sastry, Parabrahma P.V., *Kakatiyas of Warangal*, Government of Andhra Pradesh, Hyderabad, 1978.
70. Schimmel, Annemarie, 'Sufi Orders and Fraternities', in *Mystical Dimensions of Islam*, University of North Carolina Press, Chapel Hill, 1975.
71. _____, Annemarie, 'Sufism in Indo-Pakistan', in *Mystical Dimensions of Islam*, University of North Carolina Press, Chapel Hill, 1975.
72. _____, Annemarie, *Mystical dimensions of Islam*, University of North Carolina Press, USA, 1978.
73. Sen, Sailendra Nath, *Ancient Indian History and Civilization*, New Age International, 1999.
74. Sewell, Robert, *A Forgotten Empire (Vijayanagar)*, Asian Educational Services, New Delhi, 2011.
75. Sharma, Dasharatha, *Rajasthan through the Ages*, Rajasthan State Archives, Bikaner, 1966.
76. Sharma, Shanta Rani, *Origin and Rise of the Imperial Pratihāras of Rajasthan: Transitions, Trajectories and Historical Change*, University of Rajasthan, Jaipur, 2017.
77. Sherwani, H.K. ed., *History of Medieval Deccan (1295–1724)*, Two Vols., The Government of Andhra Pradesh, Hyderabad, 1973.
78. Sherwani, Haroon Khan, *The Bahmanis of the Deccan*, Munshiram Manoharlal, 1985.
79. Shyam, Radhey, *The Kingdom of Ahmadnagar*, Motilal Banarsidass, 1966.
80. Sijzi, Amir Hasan, *Fawa'id-u'l-Fu'ad*, (trans. Khwaja Hasan Sani and Ziya-ul Hasan Faruqi), D.K. Printing World, New Delhi, 1996.

81. Singh, Upinder, *A History of Ancient and Early Medieval India: From the Stone Age to the 12th Century*, Pearsons Education, India, 2008.
82. Stein, Burton, *The New Cambridge History of India: Vijayanagara*, Cambridge University Press, 1989.
83. Subbarayalu, Y., *South India under the Cholas*, OUP, New Delhi, 2012.
84. Sundaram, K., *Studies in Economic and Social Conditions of Medieval Andhra (A.D. 1000–1600)*, Triveni Publishers, Machlipatnam, 1968.
85. Talbot, Cynthia, *Pre-colonial India in Practice: Society, Region and Identity in Medieval Andhra*, Oxford University Press, New York, 2002.
86. Tripathi, R.P., *Some Aspects of Muslim Administration in India*, The Indian Press, Allahabad, 1936.
87. Tripathi, Rama Shankar, *History of Kanauj: To the Moslem Conquest*, Motilal Banarsidass, 1959.
88. Vanina, Eugenia, *Medieval Indian Mindscapes: Space, Time, Society, Man*, Primus Books, Delhi, 2012.
89. Veluthat, Kesavan, *The Political Structure of Early Medieval South India*, Orient Blackswan, New Delhi, 2012.
90. Wink, André, *Al-Hind: The Making of the Indo-Islamic World, Volume 1: Early Medieval India and the Expansion of Islam, 7th-11th Centuries*, Brill, Leiden, 1990.
91. Yazdani, G. ed., *The Early History of the Deccan, Parts VII – XI*, Government of Andhra Pradesh, Hyderabad, 2013 (first pub. 1960).
92. वर्मा, हरिश्चंद्र (संपादक), *मध्यकालीन भारत, भाग 1 (750-1540)*, हिंदी माध्यम कार्यान्वयन निदेशालय, दिल्ली विश्वविद्यालय, नई दिल्ली।

اردو کتب

93. بدایونی، ملا عبدالقادر، منتخب التواریخ، (مترجم ڈاکٹر علیم اشرف خان)۔
94. حبیب، محمد اور خلیق احمد نظامی، جامع تاریخ ہند، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2011۔
95. سرہندی، یحییٰ بن احمد، تاریخ مبارک شاہی، (مترجم ڈاکٹر آفتاب اصغر)، مجلس ترقی ادب، لاہور۔
96. شاستری، کے۔اے۔ نیلکنٹھ، چول راجگان، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔
97. شاستری، کے۔اے۔ نیلکنٹھ، جنوبی ہند کی تاریخ، (مترجم آر۔ کے۔ بھٹناگر)، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔
98. علی، ڈاکٹر مبارک، برصغیر میں تاریخ نویسی کے رجحانات، پاکستان اسٹڈی سینٹر، کراچی، 2007۔
99. فرشتہ استرابادی، محمد قاسم ابن ہندو شاہ، تاریخ فرشتہ۔
100. لال، کے۔ایس۔، خلجی خاندان، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔
101. مجیب، محمد، ہندوستانی مسلمان، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔
102. چندرا، ستیش، عہدِ وسطیٰ کا ہندوستان (سلطنت سے مغل عہد تک)، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2011۔

نمونہ پرچہ امتحان

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

بی۔اے۔(آنرس) تاریخ، تیسرا سمسٹر

تاریخ ہندوستان: آٹھویں صدی کے وسط سے سولہویں صدی عیسوی کی ابتدا تک

DSC 3, Mid-8th Century to Early 16th Century CE

Paper Code: BNHS301DCT

وقت: تین گھنٹے Time: 3 hours　　نشانات :Marks 70

ہدایات:

یہ پرچہ تین حصوں پر مشتمل ہے: حصہ اول، حصہ دوم، حصہ سوم۔ تمام حصوں سے سوالوں کا جواب دینا لازمی ہے۔

1. حصہ اول کے تمام سوالات لازمی ہیں۔ ہر سوال کے لیے 1 نمبر مختص ہے۔ (1 0 x 1 =10 Marks)
2. حصہ دوم میں 08 سوالات ہیں۔ طالب علم کو کوئی پانچ سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کے لیے 6 نمبرات مختص ہیں۔(5x6=30 Marks)
3. حصہ سوم میں پانچ سوالات ہیں۔ طالب علم کو کوئی 03 سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کے لیے 10 نمبرات مختص ہیں۔ (3x10=30 Marks)

حصہ اول

سوال: 1

i. ابتدائی عہدِ وسطیٰ میں ''تین طرفہ جدوجہد'' کا بنیادی مقصد کس شہر پر قبضہ کرنا تھا؟

(a) پاٹلی پتر　(b) اجین　(c) قنوج　(d) وارانسی

ii. پال خاندان کا بانی کون تھا؟

(a) دھرم پال　(b) گوپال اول　(c) دیوپال　(d) رام پال

iii. ''کتاب الہند'' کے مصنف کون تھے؟

(a) المسعودی　(b) البیرونی　(c) سلیمان تاجر　(d) ابن بطوطہ

iv. قطب الدین ایبک کو ''امیرِ آخور'' کے عہدے پر کس نے فائز کیا؟

(a) محمد غوری　(b) التتمش　(c) بلبن　(d) یلدوز

v. دہلی سلطنت کی پہلی مسلم خاتون سلطان کون تھی؟

(a) رضیہ سلطان　(b) نور جہاں　(c) مہرالنساء　(d) گل بدن بیگم

vi. خلجی خاندان کا بانی کون تھا؟

(a) علاؤالدین خلجی　(b) جلال الدین خلجی　(c) مبارک شاہ　(d) خسرو خان

vii. محمد بن تغلق نے زرعی ترقی کے لیے کون سا محکمہ قائم کیا؟

(a)دیوانِ کوہی (b)دیوانِ عرض (c)دیوانِ رسالت (d)دیوانِ انشاء

viii. ''چراغ دہلی'' کے نام سے کون معروف تھے؟

(a)نظام الدین اولیا (b)نصیر الدین محمود (c)قطب الدین بختیار کاکی (d)فرید الدین گنج شکر

ix. رامپا مندر کہاں واقع ہے؟

(a)ورنگل (b)پالم پیٹ (c)ہمکنڈہ (d)حیدر آباد

x. وجے نگر سلطنت کا بانی کون تھا؟

(a)کرشن دیورائے (b)ہری ہر اور بکا (c)دیورائے دوم (d)سلووانر سمہا

حصہ دوم

2 راشٹر کوٹ حکومت کی بنیاد اور اہم خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

3 ہندوستان پر عربوں کے حملے کے فوری اسباب بیان کیجیے۔

4 مملوک خاندان کے قیام میں قطب الدین ایبک کے کردار کو بیان کیجیے۔

5 محمد بن تغلق کے دو اہم منصوبوں کا جائزہ لیجیے۔

6 بھکتی تحریک میں کبیر کی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

7 چشتی صوفیوں کی بنیادی تعلیمات بیان کیجیے۔

8 کاکتیہ دور میں فنِ تعمیر کی ترقی پر مختصر نوٹ لکھیے۔

9 وجے نگر سلطنت کے انتظامی نظام کی اہم خصوصیات بیان کیجیے۔

حصہ سوم

10 ابتدائی عہدِ وسطیٰ میں علاقائی ریاستوں کے عروج کے اسباب اور ہندوستان کی سیاسی تاریخ پر اس کے اثرات کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

11 ہندوستان پر عربوں کی آمد کے اسباب، سندھ میں ان کے اقتدار اور اس کے سیاسی و ثقافتی اثرات کا جائزہ لیجیے۔

12 علاؤالدین خلجی کی اقتصادی اور بازار کنٹرول پالیسی کے مقاصد، طریقۂ کار اور نتائج کا تفصیلی تجزیہ کیجیے۔

13 بھکتی تحریک اور تصوف کی تعلیمات کا تقابلی مطالعہ کیجیے اور ہندوستانی معاشرے پر ان کے اثرات بیان کیجیے۔

14 بہمنی سلطنت کے قیام، سیاسی ارتقا اور اس کی جانشیں ریاستوں کے ظہور کا جائزہ لیجیے۔

اہم نکات